ہزار داستان



ایڈیٹر

احمد شجاع

[illegible]

لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے   رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴   قیمت ششماہی ۴ روپے فی پرچہ ۱۰

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:

سید عابد علی عابد بی۔ اے   محمد اسمٰعیل   محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۶   اشاعت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۵ء   نمبر ۱

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

اس مرتبہ "روداد محبت" کی آخری قسط پیش کی جا رہی ہے۔ ہم سید راز صاحب کی خدمت میں اپنی نثر نگاری کے اس نقشِ اولیں کو بعنوانِ حسن انجام تک پہنچانے کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ روداد محبت روس کے اس جادو نگار ادیب کی بہترین کتابوں میں سے ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس کا شمار صرف یورپ کے اعاظم ادیب میں نہیں ہوتا بلکہ جس کے نام کو اس لئے بقائے دوام حاصل ہوئی کہ اُسنے اپنی قوم کو نکبت و ادبار کی حالت سے نکالکر مہذب اقوام کے زمرہ میں ایک ممتاز جگہ دیدی۔ ٹالسٹائی کی تحریریں یوں تو تمامتر گوئٹے اور اناطول فرانس کی تحریروں کی طرح تہذیبِ حاضرہ کے عناصرِ ترکیبی ہی گنی جاتی ہیں لیکن ادبی اعتبار سے اسکی وہ پختہ کار تحریریں جو اس کے دورِ ادبی کا نتیجہ تھیں اس کی کوششوں کے نتائجِ طبع کے مقابلے میں زیادہ وقعت کے قابل ہیں۔ کیونکہ اسکی زندگی کا آغاز تو محض ایک مصلحِ قوم کی حیثیت میں ہوا۔ گوناگوں تاثرات کے زیرِ اثر اواخرِ عمر میں اس کا حلقۂ کار وسیع تر ہو کر تمام نسلِ انسانی کی ذہنی و اخلاقی اصلاح پر حاوی ہو گیا۔ یوں کہئے کہ شروع میں ٹالسٹائی ایک ایسا انشاپرداز تھا جس کی تحریریں ایک محدود اور مادی مقصد کی تابع ہوتی تھیں اس لئے ادیب کی خوبیوں سے پورے طور پر مزین نہ ہوتی تھیں لیکن غیر محسوس طور پر اسکا ذوقِ ادب سلیم تر ہوتا گیا۔ اور آخرکار وہ ایک مصلحِ قوم کے درجے سے بڑھ کر ایک حقیقی صناع بن گیا۔ اس آخری دور میں اُسنے وہ کتابیں لکھیں جو جذباتِ انسانی کی بے نقابی سے تعلق رکھتی ہیں۔ "روداد محبت" میں واقعات زناشوئی کو جس دلچسپ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ٹالسٹائی کی بالغ نظری کے علاوہ اسکی مشاقی اور سحر بیانی بھی ظاہر ہوتی ہے

"جلا وطن" کو بھی ٹالسٹائی کی ایک خالص ادبی تحریر سمجھنا چاہئے۔ سادگیِ بیان جو ہر اُس ادیب کی خصوصیت ہوتی ہے۔ جو دنیا کو کچھ دینا چاہتا ہے ٹالسٹائی کے نمایاں اوصاف میں تھی۔ اس افسانے میں اس نے بالکل یہ کوشش نہیں کی۔ اپنی مہارتِ فن یا خوبیِ تحریر کی موقعہ نمائش کرے۔ جیسا کہ متوسط درجے کے مصنفین کا قاعدہ ہوتا ہے۔ اربابِ نظر جانتے ہیں کہ ایک صاحبِ فن کی ترقی کا معراج یہ ہے کہ اپنے فن کو چشمِ ظاہر سے نمایاں کرے۔ بلکہ اُسے ایک نقابِ جمیل میں پنہاں رہنے دے۔ "جلا وطن" میں نہ الفاظ کی صنعت گری ہے نہ واقعات کی ترتیب، بظاہر بہت اچھی ہے۔ لیکن اس سادگی میں لاکھ بناؤ ہیں، جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتے۔

"ناکام" ایک محرومِ عشق کا رنگین ماجرا ہے۔ اس لئے اول سے لیکر آخر تک جذبات کا ایک مرصع اظہار ہے۔ اور ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جسکی وجہ سے اس پر یہ اعتراض کیا جانا ممکن ہے کہ افرادِ قصہ کی مختلف سیرت و تربیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ اور اُنکے اندازِ گفتگو اور ان کے اختلافات کو نمایاں نہیں کیا گیا لیکن اس اعتراض کی تردید کے لئے یہ دلیل کافی ہے۔ کہ یہ افسانہ تمامتر ایک ایسے شخص کی زبان میں کیا ہے جسکی گفتگو میں تعلیم کا اثر سرایت کر چکا ہے۔ اور پھر چونکہ وہ ایسے جذبات کو بیان کر رہا ہے۔ جو اسکی فطرت کی انتہائی گہرائیوں میں

موجود ہیں۔ اسلئے اُسکا ایک ایک لفظ قدرتی طور پر اُسکی اپنی طبیعت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اگر متکلم کسی ایسے واقعہ کو بیان کرتا جو خود اُس پر نہیں گزرا، تو اُس حالت میں بیشک اُسے جاہل و عالم اور ہندو مسلمان کی گفتگو کے امتیازات کو مدِ نظر رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن بحالتِ موجودہ جبکہ وہ ایک ذاتی معاملے کو اور وہ بھی عشق کے معاملے کو بیان کر رہا ہے۔ اُسکی شخصیت کے رنگ کا ایک ایک لفظ میں جھلکنا خلافِ قدرت نہیں۔

بادی النظر میں شاید یہ خیال پیدا ہو کہ "نوشتہ خونیں" عورت کے فقید المثال ایثار کو بیان کرنے کے لئے لکھا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس افسانے کا مقصد ان کیفیات کی تشریح ہے۔ جو ایک عورت کی محدود ذہنی قوت میں اسوقت پیدا ہوتی ہیں۔ جب وہ محبت کے ہمہ گیر تاثرات سے بے بس ہو رہی ہو۔ اکثر ایسے مواقع پر محبت کی فراوانی ان خصوصیات نسوانی کو بہت بری طرح متاثر کرتی ہے۔ جن کو کھو کر عورت عورت نہیں رہتی۔

امریکہ کے مشہور مصنف ایڈگر ایلن پو کے مختصر افسانے جن کمالِ فن کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ بعض نقادان ادب کے نزدیک دُنیا بھر میں بینظیر ہے۔ وہ اپنے لفظوں اور جملوں سے ایک کاریگر معمار کی طرح ایک عمارت کھڑی کر دیتا ہے۔ اور جس طرح عمارت کی ہر ایک اینٹ اُس کا جزوِ لاینفک ہوتی ہے۔ اسی طرح ایلن پو کے الفاظ میں اگر تغیر و تبدل کر دیا جائے تو افسانے کی ترتیب میں خلل واقع ہو جاتا ہے معمولی الفاظ کی مدد سے وہ جس طرح ہول و ہراس کی ایک غیر معمولی دُنیا پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے والے کو ایک ایسی عجیب و غریب فضائے خیالی میں لیجاتا ہے۔ کہ چند لمحوں کے لئے وہ اپنے ارد گرد کی دُنیا کو فراموش کر کے اپنی ذات سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ حساس طبیعتوں کے لئے اُس کے افسانوں کا تنہائی یا تاریکی میں پڑھنا نہایت خوفناک مشاہدات کا باعث ہوتا ہے۔ "کاسک آف امونٹیلیڈو" جس کے ترجمے کے لئے ہم محمد عظیم الدین صاحب کے ممنون ہیں۔ ایسی خوبیوں سے مملو ہے۔ جن کا اُردو میں صحیح طور پر پیش کرنا امرِ محال ہے۔ لیکن جہانتک مترجم موصوف اُن خوبیوں کی آئینہ داری کر سکے ہیں، وہ بھی اُردو دان طبقے کے لئے (بشرطِ کوشش) استفادے کا موجب ہو سکتی ہیں۔

ایڈیٹر

نوشتۂ خونیں

یہ تحریر مجھے انور مرحوم کے کاغذات میں چند اور خطوط کے درمیان دبی ہوئی ملی
جسے میں نوشتۂ خونیں کے عنوان سے ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ (سعادت علی)

(۱)

یہ میری آخری تحریر ہے لیکن اس داستانِ غم۔
اس افسانۂ شوق کے بیان سے ہذیاناتِ عشق کی رسوائیوں
کا نشر مقصود نہیں۔ بلکہ اپنی زندگی کے اس روح فرسا باب آفرین
کی بے نقابی سے صرف یہ مدِ نظر ہے کہ میرے ساتھ انجمن آرا
کے جو تعلقات تھے انہیں اپنے حقیقی رنگ میں پیش کیا جائے
میں اپنے عمیق حسیات کی ایک جھلک دکھانا بھی گوارا نہ کرتا
اگر مجھے اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ میری شاعری انجمن آرا
کے خونِ عزت سے آلودہ ہوکر نہیں بلکہ جِلا پاکر مستقبل کی
فضا میں جا پہنچیگی۔ لوگ کہیں گے انور نے انجمن آرا سے
محبت کی اپنے چچیرے بھائی کی بیوی سے محبت کی۔
محبت جرم نہیں۔ لیکن لوگوں کے زاویۂ نگاہ ' آہ ' ان
لوگوں کے زاویۂ نگاہ جنہوں نے کبھی محبت نہیں کی۔ جو کبھی
اُس مقدس جذبے سے متاثر نہیں ہوتے۔ جس کی تاثیر
ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان بنا دیتی ہے۔ جو ہر واقعہ کو
اپنے جذبات کی رنگین عینکوں سے دیکھنے کے عادی ہیں
محبت کی ہر کیفیت میں ہوس دیکھتے ہیں۔ ہوس کی ہر حالت
کو محبت سمجھتے ہیں۔

اپنی ذات سے مجھے ان باتوں کی قطعاً کوئی پروا
نہیں۔ شام کے جھٹپٹے میں جب کائنات ظلمت و نور سے
کاڑھا ہوا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اُس وقت شاعر کے دل کی
تاریکیوں میں اُس کے جذبات کی گہرائیوں میں آرزو کی شمعیں
جھلکتی ہیں۔ الہام کے دئے جلتے ہیں۔ صبح صادق کے وقت
ڈوبتے ہوئے تاروں کی اُداسی میں اُفق کی ہلکی ہلکی روشنی
میں اُس کا کیفیات سے لبریز دل کائنات کی دلچسپیوں
کا، محبوبیوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے جسم مادی
کی کثافت کو یہیں چھوڑ کر تخیل کے شفاف پروں پر سوار
ہوکر فطرت کی رُوح میں فطرت کے دل میں مل جاتا ہے
وہ حقیقت کے آفتاب کو اپنے پہلو میں منعکس دیکھتا ہے
اور محبت کرتا ہے۔ جس شخص کو یہ نعمتیں میسر ہوں اُسے
دُنیا کی زبان سے کوئی ہراس نہیں ہو سکتا۔ اس صورت

میں مجھے کوئی خوف نہ ہوتا۔ لیکن جیسا کہ مَیں پہلے کہہ چکا ہوں یہ نوشتہ خونیں محض انجمن آرا کی بے قصوری کو مظلومی کو واضح کرنے کے لئے رقم کیا جا رہا ہے۔ بیشک مجھے اس سے محبت تھی۔ اس طرح محبت تھی جس طرح صرف ایک شاعر کو ہوسکتی ہے۔ دُنیا بھر کی رنگینیاں میرے لئے اُس پیکر یادی میں منتقل ہوگئی تھی۔ کائنات۔ بہار، پھول، موسیقی، عطر، فطرت، قدرت سب کچھ انجمن آرا سے ہم آغوش تھے۔ اور انجمن آرا میری رُوح سے ہم آغوش تھی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے والے ستاروں کی طرح میرے دل میں مُسکراتی تھیں۔ اور میری دُنیائے دل کا ذرّہ ذرّہ عشرت کے ایک رقصِ پیہم عشرت کے ایک احساس وارفتہ سے مُسکراتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں احساس ہوتا گویا وہ میرے دل میں بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ اور پھر میں بھی روتا لیکن اُس رونے میں کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ یہ وہ درد تھا جس میں ٹیس نہ تھی یہ وہ زخم تھا جس کا اندمال تو محال تھا لیکن جس کا رِسنا کوئی اذیت پیدا نہ کرسکتا تھا۔ مجھے انجمن آرا سے اِس طرح کی محبت تھی۔ ہاں اس طرح کی محبت تھی۔

لیکن وقت قریب ہے۔ زہر اپنا پُورا اثر کر چکا۔ میری آنکھیں جھلملا رہی ہیں۔ آہ دُور۔ بہت دُور گنجان درختوں کا ایک جھنڈ نظر آرہا ہے۔ میری کھڑکی میں سے اُن کا صرف ایک تھوڑا سا حصّہ نظر آتا ہے۔ سایہ، اُداس ہیبتناک سایہ اُن پر چھا گیا ہے۔ اُسی طرح چھا گیا ہے۔ جس طرح میری رُوح پر موت کے قدموں کی تاریک چاپ چھا گئی ہے۔ وہاں چند ایک پھول بھی کھلے ہیں۔ رنگوں میں تمیز تو نہیں کیجا سکتی۔ لیکن سُرخ رنگ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ سُرخ، خدا جانے کس کس کی عشرت کے خُون سے سُرخ وہ گیا۔ صورتیں، تھیں، جن کا خاک میں پنہاں ہونا گل طرازی کر رہا ہے۔ موت۔ موت بھی ان سُرخ پھُولوں کی طرح مجھے دُور سے خوشنما معلوم ہورہی ہے۔ خُدا جانے مرکر وصالِ جاوداں کا امکان ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے کم ازکم یہ تو تسلّی ہے کہ جس حالت میں انجمن آرا ہے۔ اُسی حالت میں مَیں ہونگا۔ آہ اس دُنیا سے شعر کہتے ہُوئے اُٹھ جانا کسقدر لطیف ہوتا ہے۔ لیکن خود ایک پُر درد شعر بن کر صفحۂ ہستی سے مٹ جانا اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اب میری رُوح کی شعریت تشنہ کام نہ رہیگی۔ لامتناہی فضا میں پرواز کرتے ہُوئے مَیں یقیناً اپنے تخیّل کی کشش سے انجمن آرا کی رُوح کو مقناطیسی جاذبیت سے اپنی طرف کھینچونگا۔ اور پھر ترنم اور تبسّم کا اجتماع ہوگا۔ مَیں پھر دُور جا پڑا۔ ضروری ہے کہ اس داستان کو اختتام تک بچانے کے لئے مَیں ابتدا سے انتہا تک واقعات کو ایک مسلسل طریقے میں پیش کروں۔ لیکن مَیں مجبور ہوں۔ میرے لئے اس واقعہ کی ابتدا یا

انتہا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ گزرے ہوئے تمام سال میرے
لئے ایک واقعہ ہیں۔ ایک دن ہیں۔ ایک لمحہ ہیں۔ اوقات
کے تعین سے بے نیاز شاعر کی محبت زیادہ نہیں ہو سکتی۔
کم نہیں ہو سکتی بٹ نہیں سکتی۔ اُس کی زندگی شاعری ہے
اور شاعری محبت۔ بس بہت ہو چکا آئندہ سطور مسلسل
نہ ہوں تو نہ ہوں لیکن حقیقت ہونگی۔ اِسلئے دلگداز ہونگی۔

(۲)

وہ پہلے پہل ایک رنگین تبریزی کی طرح معصومیت
کے ایک کیف رقصاں میں سرشار میری زندگی میں داخل
ہوئی۔ میری دنیا کے دل کے دروازے آغوشِ انتظار
کی طرح وا تھے۔ وہ اس مملکت میں داخل ہوئی۔ اور پھر
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ اقلیم تاثر کی ہر صورت احساس کی
ہر حالت کے لئے بند ہو گئی۔ وہ میرے چچیرے بھائی
نثار کے ساتھ اس ناقابلِ فہم رشتے میں منسلک ہو کر آئی
تھی۔ جو انتہائے قرب کے باوجود خلوص پیدا نہیں کر سکتا۔
کمالِ اتصال کے ساتھ بھی حقیقی اشتراک کی تخلیق کا ضامن
نہیں۔ نثار اُسے بیاہ لایا تھا۔ میں نے اسے پہلے پہلے
کس طرح اور کس رنگ میں دیکھا۔ یہ ایک بہت عجیب سوال
ہے۔ کیونکہ اسے دیکھنے سے پیشتر میرے دل میں ایک
رنگین تصور موجود تھا۔ جس کی میں پرستش کرتا تھا۔ انجمن آرا کو
دیکھ کر اُس تصور کی رنگینیاں جاگ اٹھیں۔ روح نے جسم کا
قالب اختیار کر لیا۔ میں نے جی بھر کے اُس کی طرف کبھی نہیں
دیکھا۔ میرے حافظہ میں اُس کی یاد اس طرح محفوظ ہے۔ کہ
ایک شعلہ عریاں نے شرمیلی لجیلی صورت اختیار کر لی ہو دن بھر
وہ ہوا سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی میری نگاہوں کے سامنے
سے تڑپ کر گزر جایا کرتی تھی۔ آہ وہ کسقدر شادمان تھی،
کسقدر مسرور تھی۔ ایک دن میں نے اُسے دیکھا کہ وہ آئینے
کے سامنے بال بنا رہی تھی۔ کمر تک بل کھائی ہوئی سیاہ
مشک بو لٹیں، پاؤں میں مخمل کا ایک سلیپر۔ وہ خود اپنی نگاہوں
سے اُن نگاہوں سے جن میں نثار کی آرزوؤں کا پرتو جھلک
رہا تھا۔ شرمائے جاتی تھی۔ اُس سے ہلکے سبز رنگ
کی ایک شلوار پہن رکھی تھی۔ اتفاق سے جب اُس کے
ہاتھوں سے کنگھی چھوٹ کر نیچے گر پڑی تو وہ اُسے اُٹھانے
کے لئے جھکی۔ جھکنے میں اُس کا پاؤں شلوار کے پائینچے
میں پھنس گیا۔ اور اُس نے اپنی کمر کو ایسا نازک لوچ دیکر
پائینچے میں سے پاؤں نکالا۔ کہ مجھے خوف آنے لگا۔ کہ یہ
نور اور گداز کے خمیر سے گندھی ہوئی پتلی تکلیف کے احساس
سے پگھل کر نہ رہ جائے۔ مجھ سے اُس کی باتیں بہت کم
ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ نثار کی محبت یا وہ جذبہ جسے وہ
اُس وقت محبت سے تعبیر کرتی تھی۔ اس پر اس طرح
چھایا ہوا تھا کہ وہ بمشکل کسی اور چیز کے لئے وقت نکال
سکتی تھی۔ اور نثار ہوس کا پرستار نثار وہ باتیں تنہیں

برس کا جوان تھا۔ خوبصورت، شاید عورتیں اُسے بہت خوبصورت کہتی ہوں گھنی مونچھیں۔ بلند پیشانی۔ چندیا کے بال نسبتاً کم تھے۔ لیکن باقیماندہ بال معمولی گھونگریالے تھے لباس پہننے میں لطافت تو کوئی نہیں برتتا تھا لیکن لباس اُسے کھب ضرور جاتا تھا۔ گہری ہوس انگیز آنکھیں شعر کہنے کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت مجھ سے داد کی توقع رکھتا تھا۔ شادی سے پیشتر وہ بہت عیاش رہ چکا تھا۔ اکثر وہ ایک فخریہ انداز میں ایک مصنوعی شرمگیں تبسم کے ساتھ اپنے دورِ تعیش کے افسانے سُنایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے ایک ناول بھی لکھنا شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ اختتام تک نہ پہنچا۔ ورنہ وہ صحیفۂ سیاہ کاری بہت سے تماشبینوں کے لئے رہبری کا کام دیتا۔ میرا خیال تھا کہ شادی کرنے کے باوجود اُس کی طبیعت میں کوئی اختلاف واقع نہ ہوگا۔ لیکن پہلے ایک دو سال اُس نے واقعی سراسر انجمن آرا کی محبت کی نذر چڑھا دیئے۔ اُن پہلے دو سالوں میں وہ انجمن آرا کے سوا دُنیا کی ہر شے کو فراموش کر بیٹھا۔ حتٰے کہ مجھے بھی اس بات کا یقین ہونے لگا۔ کہ شاید اس کی عادتیں سُدھر جائینگی لیکن معلوم ہُوا کہ یہ سکون اُس عارضی اور خطرناک جمود سے مشابہ تھا۔ جو خوفناک آندھیوں کے جھکڑ سے پیشتر دُنیا پر طاری ہوتا ہے۔ اُس مہیب خاموشی کی طرح تھا۔ جو بادِ پا طوفان بپا ہونے سے پیشتر دریا کی رواں سطح پر ہلکورے لیتی ہے۔ غرضیکہ وہ بہت مسرور تھے بچوں کی طرح وہ اپنی عشرت کی موجودہ احساس میں ماضی کی ہر دردناک یاد کو مستقبل کی ہر روح فرسا توقع کو غرق کرنا چاہتے تھے۔ میں چاہتا تھا ان حالات پر یقین کرلوں لیکن میرے دل میں کوئی آواز کہتی تھی۔ نادان! نادان!! نادان!!! آخر وہ دن آپہنچا۔ مجھے احساس ہُوا۔ نہیں میرے محبت کے لطیف ادراک کو الہام ہُوا۔ کہ نثار انجمن آرا سے اُکتا گیا۔ اب انجمن آرا کی آنکھوں میں وہ اگلی سی چمک نہ رہی تھی۔ اُن آبگینوں میں شبہات کے زہر نے مطمئن شوخیوں کو مکدر کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے خوب غور سے دیکھا۔ کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اس کا سبب دریافت ہونے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ اُس سے دوسرے دن ہی رات کو نثار میرے پاس آیا۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور اُنہیں ہلکے ہلکے ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔

اُس نے میرے قریب آکر میرے شانے پر تھپکی دی اور کہنے لگا۔ "انور!"

میں نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔

اُس نے فلسفیانہ فوقیت کے انداز میں کہا۔ "تم کسی دن پڑھ پڑھ کے پاگل ہو جاؤ گے۔"

میں خاموش رہا۔ کیا جواب دیتا۔ وہ شراب کے

نشے میں مدہوش تھا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا: "آؤ چلیں تم شاعر ہو۔ جذبات کا مطالعہ بھی کیا کرو۔ آؤ میں تمہیں اپنی محبوبہ کے ہاں لے چلتا ہوں، تم نے کسی عورت کو محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا ہوگا۔ آج میں تمہیں دکھاؤنگا۔"

مجھے یوں محسوس ہُوا گویا میں تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں غرق ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈوبتا چلا جا رہا ہوں نیچے نیچے۔ نیچے مجھے غش سا آنے لگا۔ بیچاری انجمن آرا۔ مظلوم انجمن آرا۔ یہ وہی نثار تھا جس کے لئے انجمن آرا جیتی تھی۔ جس کو دیکھ دیکھ کر وہ اپنی زندگی کی گھڑیاں کاٹتی تھی۔

مَیں نے مری ہُوئی آواز میں پُوچھا اور لفظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے۔ "اور۔۔۔ اور انجمن آرا؟"

اُس نے میری طرف پریشاں تعجب سے دیکھا گویا سوچ رہا تھا کہ مجھے انجمن آرا سے یہ ہمدردی کیوں ہے پھر میرے نحیف جسم کی طرف زرد چہرے کی طرف دیکھ کر اُس کے لبوں پر ایک مطمئن تبسّم کھیلنے لگا۔ بیشک وہ درست سمجھا تھا میرا اور انجمن آرا کا واسطہ ہی کیا۔ آخر کار کہنے لگا۔ "یہ ہمدردی یہ نصیحت کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھو۔ انجمن آرا اپنی جگہ ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔"

مَیں فوری جذبات سے متاثر ہوکر کافی سزا پاچکا تھا۔ اب مَیں نے ذرا سنبھل کر کہا "بیشک۔ لیکن مَیں کہیں نہیں جاؤنگا۔"

"کیوں"

"نہیں جاتا"

اُس نے پھر زیادہ زور دیکر کہا۔ "ایک دفعہ چلو انور صرف ایک دفعہ وہ ایک طوائف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن بہت مہذب، بہت شگفتہ رُو اور پھر اُسے مجھ سے محبّت ہے۔ مَیں اس عیش کے بوجھ کو اکیلا برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔ سُنتے ہو جانا ہوگا۔ تُمہیں میرے انتخاب کی اور اُس کی محبت کی داد دینا ہوگی۔"

میرے دل میں آیا کہ مَیں اُسے جھڑک دُوں۔ مَیں یہ لفظ کہنے ہی والا تھا کہ مَیں ہرگز نہیں جاؤنگا کہ یکا یک میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی سرعت سے چمکا۔ اور مجھے مبہوت و ششدر رہنا گیا۔ مَیں سوچ رہا تھا۔ کہ محبت کوئی اختیاری چیز نہیں۔ مجھے انجمن آرا سے محبت تھی تو اس کے یہ معنی کہاں نکلتے ہیں۔ کہ نثار بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ ممکن ہے نثار کو اُس طوائف سے اسی طرح محبّت ہو جس طرح مجھے انجمن آرا سے محبت تھی۔ اس بات کو یقین تک پہنچانے کے لئے مَیں بیتاب ہوگیا۔

تھوڑی دیر ٹھہر کر مَیں نے ظاہری بے پروائی سے

کہا۔" اچھا میں چلتا ہوں۔لیکن زیادہ دیر نہیں ٹھہرنے کا۔"

وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔" آدھ گھنٹہ صرف آدھ گھنٹہ۔ مَیں اُس کے سامنے بے زبان ہو جاتا ہوں تم میری ترجمانی کرنا۔ کاش تمہارے جیسی فصاحت مجھے بھی عطا ہوتی ہوتی۔"

"اور مجھ جیسا نحیف جسم"

وہ مُسکرایا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا لیا۔ اور کہنے لگا۔

"چلو چلیں"

ہم دونوں چل نکلے۔ وہ بہت بیتابی سے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ گویا جلد تر منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے۔ آخر کار وہ ایک تنگ و تاریک مکان میں داخل ہُوا۔ دالان سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں جا پہنچے۔ دیواروں پر معمولی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے کئی اخباروں سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔ زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ لیکن ایک کونے میں ایک چھوٹی سی سفید چادر دری کی بوسیدگی کی پردہ پوشی کر رہی تھی۔ ایک طرف پیکدان اُلٹا پڑا تھا۔ جس میں سے پیک بہ کر فرش پر مکھیوں کے ہجوم کو دعوت دے رہی تھی۔ لیکن ان تمام مکروہ چیزوں سے زیادہ مکروہ اس تمام ڈراؤنی فضا کو اور زیادہ بھیانک بنانے والی چیز کمرے میں ایک طرف

ایک غیر معمولی صاف اور ستھرے پلنگ پر ایک عجیب عریاں انداز میں سو رہی تھی۔ مجھے بیک نظر دیکھنے کے بعد اُس سے سخت نفرت ہو گئی۔ یہی وہ عورت تھی، جو انجمن آرا کی جگہ نثار کی مسندِ دل پر جا بیٹھی تھی۔ نثار اُس کے قریب جا کر اُسے جگانے لگا۔ پہلے اُس کے تلوے گدگداتا رہا۔ پھر اس کا سر دونوں ہاتھوں میں لیکر دبانے لگا۔ اب وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ پان کی پیک باچھوں تک آئی ہوئی تھی۔ وہ نثار کو دیکھ کر ایک عجیب مضمحل انداز میں مُسکرائی اب اُس نے مجھے بھی نثار کے پیچھے کھڑا ہُوا دیکھا پہلے چھلتی ہُوئی نگاہ ڈالی۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مَیں نے مُنہ پھیر لیا۔ نثار بھی اُسے میری موجودگی میں ایسی حالت میں دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ ذرا ترش آواز میں بولا۔" اُٹھو مُنہ ہاتھ دھو آؤ۔"

وہ ایک بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ کپڑوں کو سنبھالتی ہُوئی اُٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا بوئے فحش کا ایک دریا میری طرف بڑھتا ہُوا چلا آ رہا ہے۔ وہ اندر کے ایک کمرے کی طرف جانے لگی۔ دہلیز پر کھڑا ہو کر اُس نے مڑ کر پھر میری طرف دیکھا۔ اور مَیں خُدا جانے کیوں مُسکرا دیا۔ وہ خود بھی مُسکرا کر اندر چلی گئی۔ اب مَیں یہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی باتیں سُننے کا اشتیاق

اور اُن باتوں سے یہ نتیجہ نکالنے کی خواہش کہ آیا اُسے واقعی نثار سے محبت ہے یا نہیں مجھے روک رہی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر اور لباس تبدیل کر کے واپس آگئی۔ لیکن میں نے اُس کی حالت میں کسی نمایاں تفاوت کا احساس نہیں کیا۔ پہلے اگر اس کے انداز سے وحشت خیز پریشانی برستی تھی تو اب اُس کی جگہ ہوس انگیز عریانی نے لے لی تھی۔ اُس نے گہرے سُرخ رنگ کا ایک فراک پہنا ہُوا تھا۔ بال انگریزی طریق سے بنا رکھے تھے لیکن کلپ اس بھونڈے تناسب سے لگا رکھے تھے کہ بہیئت مجموعی کوئی خوشگوار اثر مترتب نہ ہو سکتا تھا۔

نثار نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ میرے چچیرے بھائی ہیں۔ انور صاحب ان کا نام تو آپ سُن چکی ہونگی ظالم شعر بہت اچھے کہتا ہے۔ ہاں انور کیسے ذرا وہ سُنانا تو ۔۔۔ ؎

آغاز آرزو کی جو یاد آگئی ہنسی ۔۔۔ آنسو آ گے گیا۔

میں نے ذرا کرختگی سے کہا۔ "کبھی پھر سہی"

نثار نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر ایک محجوب انداز میں اُس کے بالکل قریب جا بیٹھا۔

میں نے محض اس لئے کہ کچھ نہ کچھ کہنا میرا فرض تھا۔ نہ اس لئے کہ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ذرا سرد مہری سے کہا۔ "مجھے تو آپ نے ان کے نام سے ابھی تک مطلع نہیں کیا۔"

نثار جواب نشے میں بالکل سرشار ہو چلا تھا۔ اور جس کی آنکھیں اُس حسن فروش خبیث انداز ہستی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ذرا چونکا۔ پھر لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "ان کا نام اس قتالۂ عالم اس حسین کافرہ کا نام۔ ہاں ٹھیک ہے میں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ انور نہ سُن سکو گے کسقدر حسین نام ہے۔ اس کا نام عنایت ہے۔"

عنایت! توبہ! میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ واقعی حسین ہوتی تو شاید یہ نام بھی شخصیت سے کسب حسن کرتا اور حسین ہو جاتا۔ لیکن اس صورت میں تو اس کا نام اس کی صورت سے زیادہ مکروہ تھا یا شاید اسکی صورت اُس کے نام سے زیادہ مکروہ تھی۔

عنایت نے میری طرف دیکھا۔ کشادہ۔ سیاہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ اور اپنی سیاہ پتلیوں کی ہر حرکت سے اپنے گنجان ابروؤں کی ہر جنبش سے مجھے وہی پیغام دینے لگی جو پہلے خدا جانے کتنے اشخاص کو دیا جا چکا تھا۔ ہر چند کہ میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے احساس ہُوا کہ اُس نے میری آنکھوں میں پسندیدگی کی کوئی جھلک تاثر کا کوئی ارتعاش ہوس کی کوئی چمک نہیں دیکھی۔ کیونکہ اُس نے بے نیازی کی ایک مخصوص ادا سے اپنی گردن کو خم دیکے گویا میری موجودگی کے خیال کو اپنے ذہن سے یکسر دُور کر کے نثار سے ایک ایسے لہجے میں جس میں

بے تکلفی اور ناراضگی کے عنصر ملے ہوئے تھے سوال کیا "نثار تم وہ ساڑھی نہیں لاتے۔"

"ساڑھی"

اس طرح گویا نثار کو ابھی کوئی بات یاد آئی ہے۔ اُس نے اپنے دماغ پر جس کی قوتیں شراب کے زیرِ اثر کچھ معطل ہو چلی تھیں۔ زور دینے کی کوشش کی۔ "یہ بات میرے ذہن سے بالکل اُتر ہی گئی۔"

یہ فقرہ اس انداز میں ادا ہوا تھا۔ گویا وہ انتہائے تحمل سے اپنی فراموشی کو بھی قصور دار سمجھکر خواہانِ عفو تھا۔

"مَیں نے تمہیں اتنی دفعہ کہا۔ شالامار کا میلہ نزدیک آتا جارہا ہے سوچتی ہوں وہاں کیا پہنکر جاؤنگی۔"

"لیکن عنایت اُس دن تم نے تو میرے ساتھ جانے کا وعدہ کیا ہے۔"

مجھے افسوس ہے کہ مَیں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکتی۔"

نثار نے بہت بیصبری سے کہا۔ "یہ کیوں"

وہ چپ رہی۔ نثار کچھ افسردہ سا ہوگیا۔ نشے کے وفور میں بھی محبت کا نازک احساس عنایت کے الفاظ کے معنی بین السطور کو پڑھ سکتا تھا۔ اچھی طرح پڑھ سکتا تھا۔ لیکن عنایت دانا تھی۔ اُس کی خودغرض زیری کی جو شروع سے ہوسِ زر کی آغوش میں پال پوس کر جوان کی گئی تھی اور جس کو آرزوؤں اور اُمنگوں کے خون نے سینچا تھا۔ اُسے یہ حقیقت سمجھا رہی تھی۔ کہ جس طرح بعض وقت غنیم کو شکست دینے کے لئے ایک مدبر جرنیل غنیم کی فوجوں میں گھس کر بھی عارضی طور پر واپس لوٹ آتا ہے۔ تاکہ دھوکے سے بے خبری کے عالم میں ایک کاری حملہ کیا جاتے۔ اسی طرح ایک عورت کو بھی بہت دیر تک اعتبارِ تمنّا کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ اُس نے نثار کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے اور کہا۔ "تم آج چپ چپ سے کیوں ہو" نثار کی تمام خودفریب آرزوئیں پھر جاگ اُٹھیں۔ اُس کی آنکھوں میں مسرتِ قلب کی ایک آتشیں رو چمک اُٹھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح باطل تاویلوں سے عنایت کی گذشتہ باتوں اور اُس کے موجودہ پیار کے تضاد کو اپنی محبت میں کم کر دے۔ فنا کر دے۔ لیکن وہ اب تقریباً مخمور ہو چلا تھا۔ اس کا دل و دماغ اس کے قابو میں نہ تھے۔ اُس نے عنایت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اُس پر بوسوں کی بارش شروع کر دی۔

عنایت نے کہا۔ "ذرا سنبھلکر بیٹھو۔ تمہارے بھائی کیا کہتے ہونگے۔"

پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولی۔ "آپ نے تو ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی۔"

مَیں نے ایک مصنوعی تبسّم میں اپنے دل کی کیفیات کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ "بات کیا کرتا محبت کی

موجودگی میں عزیز سے عزیز محبوب سے محبوب شے بھی مخل ثابت ہوتی ہے۔"

اُس نے بغیر شرمانے کے کہا۔" کچھ اپنے شعر سنائیے۔"

مَیں نے چند ایک عذر لنگ پیش کئے جنہیں وہ بھی سمجھ گئی۔ دس پندرہ منٹ تک اسی طرح کی معمولی رسمی باتیں کر کے مَیں رخصت ہوا۔

(۳)

واقعات کے اس پے درپے ہجوم نے میرے حواس کو مختل کر دیا۔ مَیں جتنا عرصہ عنایت کے ہاں بیٹھا رہا۔ اپنے آپ پر ضبط کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ لیکن باہر آتے ہی وہ تمام جذبات جو رسمی تہذیب کے بوجھ میں دبے ہوئے انگاروں کی طرح سلگ رہے تھے۔ بے پناہ آگ کی طرح بھڑک اُٹھے۔ مَیں کہہ چکا ہوں کہ مجھے انجمن آرا سے کس طرح کی محبت تھی۔ ایسی محبت جو محبوب کی رضامندی کو مقدم سمجھتی ہے۔ جو اس کی عشرت میں اپنی عشرت کو اُس کی خوشی میں اپنی خوشی کو تحلیل کرنا چاہتی ہے۔ مختصراً ایسی محبت جو محبوب کو حاصل نہیں کر سکتی تو خود محبوب کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ نثار کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اُسی قدر صدمہ ہوا جس قدر انجمن آرا کو ہو سکتا تھا۔ آہ لیکن فطرت بے رحم۔ سنگدل۔ درد آشنا۔ فطرت ابھی میرے لئے ایک اور

سامانِ جراحت بہم پہنچا رہی تھی۔ مَیں گھر پہنچا تو اپنے کمرے میں انجمن آرا کو بیٹھے ہوئے پایا۔ مَیں نے اپنی آنکھوں کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہوئے اس پیکر کو واہمے کی تخلیق سمجھا میں نے کوشش کی کہ مَیں انجمن آرا کی صورت کو اپنے ذہن کی ایک خیالی تصویر سمجھوں اُف وہ کسقدر حسین تھی۔ کس قدر معصوم تھی۔ اُس کا چہرہ پژمردہ تھا۔ اور گالوں پر تازہ آنسوؤں کے نشان تھے۔ لب خشک ہو رہے تھے۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور مجھے یوں معلوم ہوا گویا اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں چمکتے ہوئے ستاروں کی ایک جھلک دیکھ رہا ہوں۔ مَیں نے اپنے دماغ کو اپنے دل کو ایک مافوق الفطرت قوت ضبط سے قابو میں لا کر رسمی لہجے میں پوچھا مگر مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کہ میری آواز بھرّائی ہوئی تھی "انجمن آرا تم یہاں کیسے بیٹھی ہو۔" وہ بے اختیار رونے لگی۔ اُس وقت اگر مَیں اپنی تمام طاقتوں سے کام نہ لیتا تو ممکن تھا کہ مَیں خود بھی دیوانہ وار رونے نہ لگ جاتا مَیں چپ رہا۔ مَیں سمجھتا تھا کہ اس وقت میرے لئے اُس کے جسم کے کسی حصّے کو مس کرنا آگ سے کھیلنا ہوگا۔ مَیں نے پھر پوچھا۔

"کیوں کیا بات ہے۔"

"آپ ابھی کہاں گئے تھے۔"

یہ بات تھی۔ اُسے بھی کچھ شبہ پیدا ہو چلا تھا۔ ٹھیک ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ نثار کی کارروائیاں اُس سے

بہت دیر پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔

مَیں نے جواب دیا۔ "ذرا باہر چلا گیا تھا۔"

"آپ کے ساتھ وہ بھی گئے تھے؟"

"نثار ہاں وہ بھی میرے ساتھ تھا۔" لاکھ کوشش کے باوجود بھی مَیں اُس کے سامنے جھوٹ نہ بول سکتا تھا۔

"آپ کس جگہ گئے تھے؟"

"ایک دوست کے ہاں۔"

ابتک وہ خطرناک سکون سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ میرا پہلا جھوٹ سُنکر برافروختہ ہوگئی۔ اُس نے جوش میں آکر کہا۔ "آپ بھی مجھے دھوکا دیتے ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہ سمجھتی تھی۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا۔ کہ وہ ایک طوائف کے ہاں جاتے ہیں۔ اور . . . . . . "

اس کے چہرے پر محض اس تصوّر سے محض اس خیال سے کہ نثار ایک حُسن فروش طوائف سے محبت کرتا ہے۔ شرم کی سُرخی دوڑ گئی۔

"مَیں اپنے آپ کو کس قدر ذلیل محسوس کرتی ہوں۔ کاش آپ سمجھتے۔"

مَیں اس غیرارادی تیر کے درد سے اس بے پناہ طعنے کی سوزش سے بیتاب ہوگیا۔ مَیں نے جذبات سے لبریز آواز میں جواب دیا۔ "مَیں سمجھتا ہوں اور خوب سمجھتا ہوں۔"

وہ اس غیر متوقع جوش کے اظہار سے پریشان ہوگئی لیکن اپنی کیفیات کی فراوانی اسے بہت جلد میری موجودہ حالت کے احساس سے دُور لے گئی۔

"پھر آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟"

"مَیں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا بیشک نثار ایک طوائف کے ہاں گیا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا۔ مجھے کھینچکر ساتھ لے گیا۔

اُس نے بے اعتباری کے لہجے میں جس کے ہر لفظ سے حقارت برس رہی تھی کہا کیا وہ آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو لے گئے۔"

مَیں نے کہا۔ "ہاں"

وہ پھر رونے لگی۔ میرے اللہ یہ ناقابلِ برداشت تھا خُدا جانے وہ کتنا عرصہ روتی رہی۔ میں خود رو رہا تھا۔ اگرچہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن دل خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔ انجمن آرا نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی۔ مَیں سمجھتی تھی کہ آپ ایسے موقع پر میری مدد کرینگے لیکن میری امید اس . . . . . . "

اُس کی آواز ہچکیوں کے پیہم دفور میں غائب ہوگئی۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں اُن سے پُوچھتا ہوں جو دل کے گداز اور رُوح کے درد سے واقف ہیں۔ میرا روئے سخن اُن کی طرف نہیں جنھوں نے اپنی عمریں اس دُنیا میں ایسے فرسودہ تسلسل سے گزار دی ہیں۔ کہ خود اُن کی گہرائیوں میں

خود اُن کے دل کے گوشوں میں اُنہیں اپنی طرف سے حقارت کا ایک احساس نفرت کا ایک جذبہ معلوم ہوتا ہوگا۔ کہ اُس وقت کیا کوئی شخص استقلال اور ضبط کو قائم رکھ سکتا تھا میں نے ضبط کی ہزار کوشش کی ظاہر میں خاموش تھا لیکن میری رُوح میں ایک ایسا طوفان بپا تھا جس کی خوفناک کشمکش کو میں بہت عرصہ برداشت نہ کر سکتا تھا میرے پاس اُس کے الزامات کی تردید میں صرف ایک جواب تھا ایک ثبوت تھا۔ لیکن میں جانتا تھا۔ کہ اُس جواب کا پیش کرنا اُس ثبوت کا بہم پہنچانا نہ صرف میرے لئے بلکہ انجمن آرا کے لئے مہلک ثابت ہوگا مضر نکلیگا۔

وہ اُٹھ کر جانے لگی۔ میں نے کہا " انجمن آرا "

اُس وقت اُس نے میری آواز میں پہلی دفعہ ٹیس کا ایک شائبہ درد کا ایک عنصر محسوس کیا اور میری آنکھوں میں اُس جذبے کی چمک دیکھی۔ جس کو ایک عورت چشم زدن میں پہچان لیتی ہے۔ وہ اس طرح کانپ گئی جس طرح گلاب کا ایک نازک پودا آغاز بہار کی سرد ہوا کے جھونکوں سے کانپ جاتا ہے۔ لیکن اُس نے ایسی مری ہوئی آواز میں گویا اُس کے سینے پر لاکھوں من سنگ کا بوجھ ہو۔ جواب دیا۔ جی "

" انجمن آرا کیا واقعی تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں نے نثار کو تمہارے متعلق کچھ نہ کہا ہوگا "

" معلوم نہیں "

یہ معلوم نہیں ایسی سرد مہری سے کہا گیا کہ جس طرح وہ میرا پہلا جھوٹ سنکر برافروختہ ہوگئی تھی۔ اسی طرح اُس کا ارادی تجاہل دیکھ کر میرے آگ لگ گئی۔

" میں نے۔ میں نے انجمن آرا میں جو تمہاری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہوں۔ جو تمہاری محبت کو اپنی محبت خیال کرتا ہوں۔ جو تم سے ایسی وارفتگی ایسی مایوسی سے محبت کرتا ہوں جیسے کوئی شخص آسمان پر دُور پورن ماشی کے چاند سے محبّت کرے۔ جو اظہار تعشق کو بھی اپنی محبت کے لئے باعث ننگ سمجھتا ہوں۔"

مجھے اُس وقت محسوس نہ ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت میں میں ایک نامعلوم اذیت سے بیقرار ہوکر چلا چلا کر باتیں کر رہا تھا

" چپ رہو تم اپنی زبان سے اُن خیالات کو جھٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ جن پر تم یقین رکھتی ہو۔ آج اتفاق سے تم نے میرا راز پالیا ہے۔ مجھے کہے جانے دو۔ میرے دل کی بھڑاس نکل جانے دو۔ اتنا عرصہ وہ آتش فشاں پہاڑ جو میرے سینے میں مدفون تھا۔ اسے پھٹنے دو۔ اور مجھ کو جلا کر راکھ کرنے دو۔ میری محبت کا انتہائی کمال یہی ہے۔ کہ میں تمہیں دیکھ لوں۔ لیکن آہ مجھے کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا۔ کہ میں تمہیں اس طرح دُو بہ دُو دیکھوں گا۔ رو برو دیکھونگا۔ اور آہ بدگمان دیکھونگا۔"

میں خاموش ہوگیا زیادہ کہنے کا کیا فایدہ تھا۔ میں

خود اسقدر کہکر اب پچھتا رہا تھا۔

وہ ابتک سر جھکائے حیرانی کے دور میں گم کھڑی تھی۔ گویا غور کر رہی تھی۔ کہ میری باتوں کا کیا جواب دے آخر اُس نے میری طرف دیکھا اور ایک افسردہ سے انداز میں مُسکرائی۔ پھر اُس نے گہری سانس لی۔ گویا مجھ پر اُسے رحم آ رہا تھا۔

"مَیں آپ پر اعتبار کرتی ہوں"

یہ کہکر وہ چلی گئی

(۴)

اس سے دو مہینے بعد کا واقعہ ہے۔ کہ ایک ابر آلود شام کو جب ہر شے پر تاریکی اور اُداسی محیط تھی مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا انجمن آرا سے اپنی پہلی ملاقات کے نقوش کو اپنے تصوّر سے اور زیادہ گہرا کر رہا تھا۔ میرے کمرے کے برآمدے سے نثار کے مکان کا صحن کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ یکایک مَیں نے دیکھا کہ نثار ایک عورت کو اپنے ساتھ لئے ہُوئے صحن میں سے گزرا۔ اسقدر نزدیک سے مجھے اُس عورت کی صورت صاف نظر آ رہی تھی۔ وُہ عنایت تھی۔ مَیں دیوانہ وار اُچھل پڑا۔ اور تمام راستے کو ایک لمحے میں طے کر کے نثار کے قریب جا پہنچا۔ نثار مجھے دیکھ کر ہنسا۔ عنایت نے بھی میری طرف مُسکرا کے دیکھا اور کہا۔ "کہئے انور صاحب مزاج اچھے ہیں۔"

مَیں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے پاس نام نہاد تہذیب کے اصول برقرار رکھنے کے لئے کوئی وقت نہ تھا۔

مَیں نے نثار سے پوچھا۔ "اسے کہاں لئے جا رہے ہو؟"

"اندر"

"اندر کہاں؟"

اُس نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔ "گھر"

مَیں نے دردناک تعجب سے پُوچھا۔ "اسے گھر لئے جا رہے ہو۔"

"ہاں گھر لئے جا رہا ہوں۔ کیوں کیا ہے؟"

وہ اب بہت ناراض معلوم ہوتا تھا۔ مَیں نے بیتاب ہو کر کہا۔ "اسے گھر لئے جا رہے ہو۔ اس عورت کو۔ نثار تمہیں یاد نہیں رہا۔ کہ وہاں تمہاری بیوی موجود ہے۔ جو تم پر بلا شرکت غیرے حق رکھتی ہے۔ جو تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتی ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم اس بدکار حسن فروش عورت کو جسے مجھے عورت کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ انجمن آرا کے پہلو بہ پہلو بٹھاؤ گے تم کس طرح گوارا کرو گے کہ جس نے تمہارے سوا کسی غیر مرد پر نگاہ نہیں ڈالی۔ اس کے سامنے اس کو لیجا کر بٹھا دو۔ جسکے لب جس کی آنکھیں جس کا چہرہ ہوس کے تازہ نشانات سے آلودہ ہے۔"

عنایت خوف کے مارے نثار کے بازو سے چمٹی ہوئی

کھڑی تھی۔ وہ میری طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
نثار بھی چند لمحوں کے لئے مرعوب ہو گیا تھا لیکن بہت جلد
میری باتوں کا تمام اثر زائل ہو گیا۔ وہ میری طرف غور سے
دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میرا انجمن آرا سے کیا واسطہ ہے۔
اُس کے دل میں ایک زہریلا شبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اُسکے دل
میں اس دن کی یاد تازہ تھی، جب پہلی دفعہ عنایت کے ہاں
جاتے وقت اضطراری طور پر میں نے انجمن آرا کا نام ایک
خود فراموش بیتابی سے لیا تھا۔ آخر اُس کے شبہات نے
الفاظ کی صورت اختیار کی۔ اُس نے عنایت کی موجودگی کو قطعاً
فراموش کر دیا۔ اُس نے میری طرف شعلہ بار نگاہوں سے
دیکھا اور پھر رشک سے بھرّاتی ہوئی آواز میں پوچھا "تمہیں
اس سے کیا؟"

مجھے چاہیے تھا کہ اُس وقت سنبھل جاتا لیکن میں
پاگل ہو گیا تھا۔ میں نے کہا "بیشک مجھے اس بات سے
کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن تمہیں یہ حق کب سے حاصل ہے۔
کہ تم ایک معصوم عورت کی زندگی کو یوں تباہ کر دو۔ دُنیا کی۔
مذہب کی کونسی طاقت نے تمہیں یہ اختیار دیا ہے۔ کہ تم
ایک جاندار ہستی کی زندگی کو یوں برباد کر دو۔"

میں نے یہ فقرے ایسے جوش میں کہے تھے کہ اسکے
شبہ کو تقویت ہو گئی۔ اُس نے اب رشک سے بیقرار ہو کر
کہا "تم ہر وقت انجمن آرا کے طرفدار بننے والے کون ہوتے ہو۔
میں تمہاری نگاہیں دیکھ رہا ہوں۔ مُدت سے مجھے شبہ تھا کہ
کہ تم مارِ آستین کی طرح مجھے ڈسو گے لیکن یہ مجھے معلوم نہ تھا
کہ تم نے اسقدر جلدی اپنی نرم آواز اپنی شاعری اپنی فصاحت
سے میرے دل کے آرام کو برباد کر دیا ہے۔"

میں نے چلّا کر کہا۔ "غلط بالکل غلط۔ تمہارے دل
میں جو شبہ ہے۔ اُسے نکال دو۔ ایسے دل کو نکال دو۔ جو
انجمن آرا پر اس قسم کے ذلیل شبہے کرتا ہے۔"

لیکن اب وہ اپنے قابو میں نہ تھا۔ اُس نے جیب سے
شکاری چاقو نکالا۔ اور مجھ پر جھپٹا۔ لیکن ایک لمحے میں انجمن آرا
ہمارے درمیان تھی۔ وہ کواڑ کے پیچھے کھڑی سب کچھ سُن
رہی تھی۔ نثار نے تعجب سے انجمن آرا کی طرف دیکھا۔ جو
میرے آگے کھڑی نہایت سکون سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے مارو۔ میں تمہارے شبہات کی ذلت برداشت
نہیں کر سکتی۔"

نثار انجمن آرا کے اس اطمینان سے مرعوب ہو گیا۔
لیکن اُس نے کہا۔ "جھوٹی"

اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر جا پڑا۔
انجمن آرا نے پھر کہا۔ "میں حلف اُٹھاتی ہوں کہ تمہارا شبہ
بالکل غلط ہے۔ مجھے انور سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں اُسے
اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔"

نثار چپ چاپ اندر چلا گیا۔ ابھی تک اُس کے

دل میں انجمن آرا کی اتنی وقعت تھی۔ کہ وہ اُس کے حلف کا یقین کر لیتا۔ عنایت اس سے بہت پہلے مجھے برافروختہ دیکھ کر اکیلی نیچے اُتر گئی تھی۔ جاتے وقت انجمن آرا نے مجھ پر صرف ایک نگاہ ڈالی۔ گویا مجھ سے عفو کی طالب ہے۔ لیکن اُسوقت مَیں اس نگاہ کا مطلب نہ سمجھ سکتا تھا۔"

(۵)

اس واقعہ کے بعد میرا نثار کے ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ انجمن آرا کے اُن فقروں سے جن میں اُس نے مجھ سے یکسر بے تعلقی کی قسم کھائی تھی مجھے سخت رنج پہنچا۔ مَیں جانتا ہوں کہ مجھے انجمن آرا سے کسی قسم کی توقعات رکھنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن پھر بھی میرا دل عقل کے ہر تاویل آفریں خیال کو رد کرتے ہوئے اس رنج سے کُڑھتا رہا جلتا رہا۔ مَیں جانتا تھا کہ اس قسم کی امید جنون ہے حماقت ہے لیکن مجھے آرزو تھی کہ کاش اس وقت انجمن آرا نسوانیت کی ہر بندش کے خلاف مذہب کی ہر قید کے خلاف اخلاق کے ہر اصول کے خلاف خود اپنی طبیعت کے خلاف کم از کم میری محبت کا اعتراف تو کرتی۔ مَیں اُس شہر کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اور ایسی کشتی کی طرح جو طوفانی سمندر کی باد پا لہروں پر ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔ مُلک بہ مُلک شہر بہ شہر بلا مقصد پھرتا رہا۔ اُس الم فرسا دور کی کیفیات میرے لئے تو شاید ایک دردناک عشرت ہو لیکن ناظرین اس اندوہ فرسا تسلسل کا بیان سُننے کے لئے غالباً وقت نہ نکال سکیں گے۔ اس کے علاوہ مَیں محسوس کرتا ہوں۔ کہ اب زہر میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اور شاید اس افسانے کے اتمام سے پیشتر فوری طور پر اثر کر جائے۔ اس لئے مَیں بہت جلد اس سرگزشت کے انجام تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ایک سال کی ہرزہ گردی کے بعد مَیں لاہور واپس آگیا۔ میرے زخم مندمل تو نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اُن پر انگور آچکا تھا۔ ہر چند کہ انجمن آرا میری رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ مگر وقت نے اس اضطراب کو جو پہلے پہلے اس کے تصور سے قائم رہتا تھا۔ ایک یاس انگیز سکون میں تبدیل کر دیا۔

ایک شام میرا ایک قدیم دوست جو اس تمام واقعہ کا رازدار تھا۔ میرے پاس آیا۔

اُس نے کہا۔" اور ایک عجیب واقعہ رونما ہوا ہے تم تو ایک شاعر ہو۔ اور اس لئے جذبات کے ارتقا اور اُن کی نشو و نما سے ذاتی طور پر اچھی طرح واقف ہو۔ بھلا دیکھوں تم اس بات کی کیا تحلیل کرتے ہو۔"

مَیں نے ایک مصنوعی سے اشتیاق میں پوچھا۔

"کیا بات ہے۔"

"یہاں کے ارباب نشاط میں ایک نئی حسن فروش کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے متعلق عجیب عجیب روایات

مشہور ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آئی ہے یا
کس کی لڑکی ہے۔ حتیٰ کہ خود اس کے سازندے بھی
اس راز سے ناواقف ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز یہ
بات ہے۔ کہ کئی تماشبین گناہ کے بدترین پہلو کے ارتکاب
کے لئے اُس کے ہاں گئے۔ اور ناکام واپس آئے۔ رات کو
کوئی شخص اس کے ہاں نہیں آسکتا۔ وہ کم بولتی ہے۔ بہت
کم مُسکراتی ہے۔ اور بہت کم باہر جاتی ہے۔"

مجھے ان باتوں پر یقین نہ آیا۔ لیکن میرے دوست نے مجھے
ہر ایک طرح کی یقین دلانے کی کوشش کی۔ آخر کار میں
نے اُس سے وعدہ کر لیا۔ کہ میں کسی دن وہاں ضرور جاؤنگا
اور واپس آکر اپنے تجربات اور اُن تجربات سے جو نتائج اخذ
کئے ہونگے اُن کے ماحصل سے اُسے مطلع کرونگا۔ میں نے
اُس کا نام دریافت کیا تو معلوم ہُوا کہ جہاں افروز تھا۔
دوسرے دن میں کسی نامعلوم سی کشش سے بیتاب آخر
جہاں افروز کے مکان پر جا ہی پہنچا۔ میں سیڑھیوں میں تھا
کہ مجھے گانے کی آواز سُنائی دی۔ ہارمونیم بج رہا تھا اور کوئی
عورت نہایت باریک اور شیریں سُروں میں گا رہی تھی۔

میرے کانوں میں ایک مصرع اچھی طرح پڑا۔ ع

کچھ پھول اہل شوق پہ برسا کے رہ گئے

اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرے قدم جہاں تھے وہیں
تھم گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ مصرع میں نے کہیں
سُنا ہے۔ اور ایسے حالات میں سُنا ہے جو انجمن آرا کی زندگی
سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور پھر یکایک مجھے یاد آ گیا۔ یہ میری
اپنی غزل تھی، جو میں نے ایک دفعہ نثار کو لکھ کر دی تھی۔
میرے ذہن میں ایک عظیم کشمکش ایک پریشان کن جدوجہد
ہونے لگی۔ میری غزل یہاں کس طرح پہنچی۔ یہ عورت کون
تھی۔ اس کا نثار سے کیا تعلق تھا۔ اور اس قسم کے کئی سوالات
میرے دل میں آنے لگے۔ میں اس ذہنی اذیت کو برداشت
نہ کر سکا۔ باقیماندہ سیڑھیوں کو میں دو چھلانگوں میں طے
کر کے اُوپر جا پہنچا۔ میرا گمان درست نکلا۔ سامنے ہارمونیم
کے قریب کچھ متعجب۔ کچھ مخوف ایک ہاتھ باجے کی سروں پہ
رکھے۔ ایک اپنی چھاتی پر رکھے انجمن آرا کھڑی تھی۔

بے اختیار میرے منہ سے نکلا "تم انجمن آرا۔ تم
یہاں۔ آہ۔"

میرا سر بے اختیار چھاتی پر ڈھلک پڑا۔ اور گویا
کائنات کی ہر ایک چیز میرے لئے بیجان ہو گئی بیچین
ہو گئی۔ تاریک ہو گئی۔ لیکن وہ اُسی بھولپن کے پرانے انداز
سے میرے قریب آگئی۔ اُس نے میرا بازو اپنے دونوں ہاتھوں
سے تھام لیا۔ اور صرف ایک لفظ کہا۔ "انور"

میں نے اُس کے دونوں ہاتھ سختی سے جھٹک دیتے
اور حقارت سے کہا۔ "تمہیں وہ عورت ہو جس سے میں
محبت کرتا تھا۔ نہیں ہیں ایک معصومیت کی دیوی بھولپن

کی تصویر۔ عصمت کے پیکر سے محبت کرتا تھا۔ اس حسن فروش ہستی سے نہیں۔"

اُس نے نہایت لجاجت سے کہا۔ "میں اب بھی وہی انجمن آرا ہوں۔"

"جھوٹی"

اُس نے اپنی گردن کو اس طرح بلند کیا۔ جس طرح ایک شیرنی اپنے بچوں کو کچلتے ہوئے دیکھ کر سر بلند کرتی ہے۔ "تمہیں یاد ہے: نثار نے بھی مجھے ایک دفعہ جھوٹی کہا تھا۔ میں اُس وقت بھی سچی تھی۔ اب بھی سچی ہوں۔"

"اے کاش تم اس وقت جھوٹی ہوتیں۔ اے کاش اُس وقت کچھ تمہیں میرا خیال ہوتا۔"

میری آواز گلوگیر ہوگئی تھی۔

اُس نے نہایت آہستہ سے کہا۔ "مجھے اُس وقت بھی تمہارا خیال تھا۔"

میں بیتاب ہوگیا۔ "ایک اور جھوٹ۔"

وہ اب بالکل میرے قریب آگئی۔ اُس کا سانس مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہونے لگا۔

"میں نے بیشک اُس وقت حلف اُٹھایا تھا۔ جھوٹ اُٹھایا تھا۔ خدا مجھے اس گناہ کے لئے معاف کرے میں نے محض تمہارے بچانے کے لئے ایسا کیا تھا۔ نثار اُس وقت پاگل ہوگیا تھا۔ خدا جانے کیا کر بیٹھتا

مجھے تمہاری جان اپنے ایمان سے زیادہ عزیز تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے نثار سے محبت ہے لیکن تھوڑے عرصے کے بعد مجھے محسوس ہوا۔ کہ یہ محبت نہ تھی۔ تمہیں دیکھ لینے کے بعد تم سے یہ سُن لینے کے بعد کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میرے دل میں نثار کی کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ آہ میں نے دُنیا کی نگاہ میں گناہ کیا۔ مذہب کے لحاظ سے گناہ کیا۔ اور تم۔ تم بھی مجھے جھوٹا بناتے ہو۔"

وہ اب رونے لگی۔ جذبات کے زیر اثر اتنا کچھ کہہ کر جو اس کی نسوانیت کے منافی تھا۔ اُسے اپنی تذلیل کے احساس نے رونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میرے دل میں اُس کے جذبات کی کوئی صدائے بازگشت نہ پیدا ہوئی تھی۔ میں نے بے اعتباری کے لہجے میں کہا۔ "پھر تم یہاں اِس جگہ کیسے آئیں۔"

اُس کا رونا یکقلم بند ہوگیا۔ اُس نے جوش سے لبریز آواز میں کہا۔ "تم اپنے آپ کو شاعر کہتے ہو۔ اور محبت جو شاعری کی جان ہے۔ اُس سے ناواقف ہو۔ میں نے تمہارے لئے قربانی کی۔ اپنی زندگی۔ اپنی عزت کی، اپنی نسوانی وقار کی قربانی کی۔ میں سمجھتی تھی۔ کہ تم اپنی محبت سے مجبور ہو کہ آخرکار تم پھر لاہور آؤ گے۔ مجھے دیکھنا چاہو گے۔ اور اس کا نتیجہ رسوائی ہوگا بدنامی ہوگا۔ اور اس رسوائی سے اس بدنامی سے تمہاری عزت کو۔ ہاں اُس عزت کو جسے

تم دُنیا کی ہر ایک شے پر مقدم سمجھتے تھے صدمہ پُہنچیگا۔ تم لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ مَیں نے مجبور ہو کر یہ طریقہ اختیار کیا۔ تاکہ نثار غیرت کی وجہ سے مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ اور تم مجھ سے مِل سکو۔"

اتنا کہکر وہ ایک کُرسی پر بیٹھ گئی۔ گویا انتہا کی تھک گئی ہو۔ مَیں کچھ کہے سُنے بغیر واپس آگیا۔ دوسرے دِن مجھے اس کا خط موصول ہُوا۔

"مَیں یہ بے اعتباری کی زندگی نہیں جینا چاہتی۔ مَیں نے جو کچھ کیا' تمہارے لئے کیا۔ اور تمہیں مجھ پر یقین نہیں رکھتے۔ مَیں اپنی انگشتری کا ہیرا چاٹ رہی ہوں۔ خُدا مجھے معاف کرے۔ یہ خط تمہیں اُس وقت ملیگا۔ جب مَیں اس دُنیا میں نہ رہونگی۔"

یہ خط پڑھ کر میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ آہ مظلوم انجمن آرا۔ اُس دن مجھے اُسکے عظیم الشان ایثار پر یقین نہ آتا تھا۔ اب مجبوراً یقین کرنا پڑا۔ ہم دونوں ساری عمر میں صرف دو دفعہ ملے۔ اور مل کر باتیں کیں۔ اس کے علاوہ ہماری شاہ راہ حیات ایکدوسرے سے بالکل مختلف رہی۔ اس کے بعد ایسی عمر بسر کرنا جس کا انجام و آغاز سراسر کلفت ہو۔ میرے لئے ہر طرح ناممکن تھا۔ مَیں نے بھی زہر پھانک لیا۔ دُنیا کچھ کہے لیکن انجمن آرا کے متعلق . . . . . . "

عابد

غزل

ہوس نے لطفِ بے پایاں میں بھی رنگِ ستم دیکھا
ستم میں بھی نگہ چشمِ محبت نے کرم دیکھا

ترے حسنِ جنوں انگیز کو گو دمبدم دیکھا
بہت دیکھا مری آنکھوں نے لیکن پھر بھی کم دیکھا

تری راہِ محبت میں بھی کیا کیا راہزن دیکھے
کہیں دامِ حرم دیکھا کہیں بیت الصنم دیکھا

بُرا کیا ہے؟ اگر دیکھیں اسے ناز آفرینوں میں
جسے سنگِ سیہ میں تونے اے شیخِ حرم دیکھا

لبوں پر کچھ نہ تھا' بجز نعرۂ "اللہ!" اے زاہد!
جو دیکھا بھی کبھی تو اس طرح روتے صنم دیکھا

یہ کیا اعجاز ہے اے فتنۂ برہم زنِ عالم!
تری محفل میں رند و شیخ کو ہم نے بہم دیکھا

"جنوں میں جو بھی دامن کھینچ لے ساقی اسی کا ہے"
یہی اسی میکدے میں اے اثر ہم نے رقم دیکھا

اثر صہبائی

سکونِ یاس

اضطرابِ آرزو، وہ التہابِ جاں گسل
عمر بھر جس نے مجھے رکھا ملول و دلفگار
دل کہ تھا سرگشتۂ صد اضطرابِ آرزو
روز و شب رہتا تھا یکساں مضطرب اور بیقرار

اک ہجومِ آرزو، برہم کنِ صبر و سکوں
مدتوں سے ہو چکا تھا میرے دل میں جاگزیں
مضطرب رکھتا تھا مجھ کو صورتِ برقِ تپاں
اک شرر آباد تھا میرا دلِ اندوہگیں

آرزوئیں خوبصورت تھیں، تمنائیں حسیں
اور دلِ وحشی ازل سے حسن کا دیوانہ تھا
حسن کی نیرنگیاں تھیں کیف افزائے جنوں
یعنی وحشت جوش پر تھی، عقل سے بیگانہ تھا

دل کی خواہش تھی کہ بر آئیں تمنائیں تمام
اور اس پر آرزوئے "جلد تر" تھی مستزاد
لیکن اس دنیائے فانی میں کہاں ممکن ہے یہ
ہر تمنائی کی بر آتے ہمیشہ ہر مراد

اس لئے ہر لمحہ میرا دل تھا صرفِ اضطراب
میں رہا کرتا تھا سوزِ دل سے آتش زیرپا
عقل تھی واماندۂ تدبیر، قسمت برخلاف
میری جانِ زار تھی زحمت کشِ رنج و بلا

مطلعِ امید پر جب چھائے بادل یاس کے
شکر ہے وہ اضطرابِ قلب سب جاتا رہا
آس کی ہنگامہ آرائی سراسر مٹ گئی
یاس کے آنے سے حاصل اک سکونِ دل ہوا

اب نہیں دل میں مرے مطلق وہ جوشِ اضطراب
اب خدا کے فضل سے رہتا نہیں میں سوگوار
یاس ہے میرے لئے سرمایۂ کیف و سکوں
نامرادی کے تصدق اب نہیں میں بے قرار

راز

حسنِ انتقام

فارچونیٹو نے مجھے ہزاروں نقصان پہنچائے اور میں صبرو تحمل سے کام لیتا رہا لیکن جب وہ توہین پر اتر آیا۔ تو میں نے آخرکار انتقام کا عہد کر لیا۔ تم جو مجھے جانتے ہو بخوبی اندازہ کر سکتے ہو کہ میں نے ہرگز کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالا ہوگا جس پر دھمکی کا گمان ہو سکے۔ میں نے دل ہی دل میں اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ جب کبھی موقعہ ملا بدلہ لونگا۔ اور ذاتی نقصان کا خیال اس ارادے کے استحکام کو متزلزل نہ کر سکتا تھا تاہم میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اُسے اپنے کئے کی سزا دونگا۔ تو اس طرح دونگا کہ خود اُس کی پاداش سے محفوظ رہوں۔ وہ انتقام ہی کیا جس میں لینے کے دینے پڑ جائیں؟ اس کے ساتھ ہی میں خفیہ طور پر انتقام لینے کا بھی قائل نہیں جس سے انتقام لیا جائے۔ اُسے اگر اس کا پورا احساس نہ کرا دیا جائے تو کچھ لطف نہیں۔

جاننا چاہیئے کہ نہ قولاً اور نہ فعلاً میں نے کبھی فارچونیٹو کو اس بات کا موقعہ دیا تھا کہ وہ میری خیر خواہی سے بدگمان ہو سکے۔ میں اس سے پہلے کی طرح خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ اور اُس کو مطلق خبر نہ تھی کہ میرے دل میں کیا ہے۔

فارچونیٹو [illegible] تو ہر لحاظ سے احترام کے قابل تھا۔ لیکن اُس میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ اُسے شرابوں کے خواص پہچاننے میں ید طولےٰ رکھنے کا بہت ناز تھا۔ اطالوی لوگوں میں گنتی کے ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ جنہیں فطرت نے جوہر شناسی کا مادہ ودیعت کیا ہو۔ عموماً ان کے دعوے باطل ہوتے ہیں۔ اور ان کی سرگرمیاں محض عقل کے سیدھے کروڑپتیوں کو دھوکا دینے کے لئے ہوتی ہیں۔ جواہرات اور نقاشی سے فارچونیٹو کو جو مس تھا اُس سے میں خوب واقف تھا۔ لیکن پرانی شرابوں کے معاملے میں وہ فی الحقیقت کافی مہارت رکھتا تھا۔ اور اس میں میں اس کی رائے کا لوہا مانتا تھا۔ اطالوی شرابوں سے خود میری طبیعت کو کچھ لگاؤ تھا اور میں موقعہ بموقعہ انہیں خریدتا رہتا تھا۔

ایک شام جبکہ موسم نشاط کی جنوں سامانیاں فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میری اُس سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ وہ بیحد گرمجوشی سے مجھ سے ملا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ضرورت سے زیادہ نوشانوش کا شغل کرتا رہا ہے۔ اُس نے کئی رنگ کی دھاریوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ اور اُس کے سر پر مخروطی وضع کی گھنگھروؤں والی ٹوپی تھی جو جشن وطرب میں شامل ہونے والوں کا امتیازی نشان ہے۔ میں اُس سے ملکر اتنا خوش

ہوا کہ مصافحہ کرتے کرتے میری طبیعت سیر نہ ہوتی۔۔۔

مَیں نے اُس سے کہا۔ "خوب ہوا کہ تم سے ملاقات ہوگئی۔ آج تم کتنے ہشاش بشاش نظر آرہے ہو۔ مجھے تم سے ایک کام تھا۔ مَیں نے شراب کا ایک مٹکا خریدا ہے۔ یہ یہ سمجھ کر کہ وہ اموٹنلیڈو کا مٹکا ہے۔ لیکن مجھے شک ہے۔

اُس نے کہا "کیا کہا تم نے؟ اموٹنلیڈو کا ایک مٹکا۔ اور اس موسم میں؟ ناممکن!"

مَیں نے جواب دیا۔ "خود مجھے شک ہے۔ اور مَیں نے بیوقوفی کی کہ تم سے مشورہ کئے بغیر مُنہ مانگے دام ادا کر دیئے۔ تم کو مَیں نے بہت ڈھونڈا، مگر تمہارا کہیں پتہ نہ تھا اور مجھے ڈر تھا۔ کہ یہ موقعہ جاتا رہا تو پھر ہاتھ آنے کا نہیں۔"

"اموٹنلیڈو!"

"مجھے شک ہے۔"

"اموٹنلیڈو!"

"اور مَیں اپنا شک دُور کرنا چاہتا ہوں۔"

"اموٹنلیڈو!"

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں فرصت نہیں۔ اس لئے مَیں لیوکسی کی طرف جاتا ہوں۔ اگر کسی کی رائے اس بارے میں مسلّم ہے تو اُس کی۔ وہ مجھے ضرور بتا دیگا۔۔۔۔۔"

"لیوکسی! وہ اناڑی کیا جانے؟ بیچارا اموٹنلیڈو اور شیری میں بھی تو تمیز نہیں کر سکتا۔"

"سچ مچ؟ تو پھر بعض احمق لوگ کس لئے کہتے ہیں۔ کہ اُس کا مذاق ایسا ہی صحیح ہے جیسا تمہارا۔"

"خیر آؤ چلیں۔"

"کہاں؟"

"تمہارے تہ خانے میں۔"

"نہیں، میرے دوست نہیں۔ مَیں تمہاری نیک طینتی سے ناجائز فایدہ نہیں اُٹھانا چاہتا۔ تم کسی کام سے جا رہے ہو لیوکسی۔۔۔۔۔"

"نہیں، نہیں، مجھے کوئی کام نہیں۔ چلو آؤ چلیں۔"

"مَیں کہتا ہوں، بھئی، مَیں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ مجھے تمہاری فرصت یا عدم فرصت کا خیال نہیں، تمہاری صحت کا خیال ہے۔ دیکھو تمہیں زکام ہو رہا ہے۔ اور میرے تہ خانہ میں حد درجے کی سیل ہے۔ اُس کی دیواریں تمام کلّر سے ڈھکی ہوئی ہیں۔"

"پھر کیا حرج ہے؟ یہ زکام تو یونہی ہے۔ اس کا کچھ خوف نہیں۔ — اموٹنلیڈو! واہ! تم نے صریح دھوکا کھایا! اور لیوکسی کی کیا پوچھتے ہو! وہ اموٹنلیڈو اور شیری میں بھی تو تمیز نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر فارچونیٹو نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور میں اُس کے ساتھ ہو لیا مگر پہنچا تو میری امید کے مطابق کوئی نوکر چاکر وہاں موجود نہ تھا۔ سب میرے پیچھے موقعہ پاکر غائب ہوگئے تھے۔

میں نے آتے وقت اُن سے یہ کہا تھا۔ کہ میں صبح سے پہلے نہیں آؤنگا۔ اور اُن کو حکم دیا تھا۔ کہ گھر سے باہر قدم نہ رکھنا میں جانتا تھا کہ میرا یہ حکم اُن کے فوراً بھاگ نکلنے کی کافی ضمانت ہے۔

میں نے دو مشعلیں اٹھالیں۔ اور اُن میں سے ایک اپنے ہاتھ میں رکھ کر اور ایک فارچونیٹو کو دیکر متعدد کمروں میں سے ہوتا ہُوا اُس محرابدار سرنگ میں پہنچا۔ جو تہ خانے کو جاتی تھی میں ایک طویل طویل اور پیچ در پیچ زینے سے اُترا۔ اور اُترتے راہ میں اُس کو بار بار احتیاط کی تاکید کرتا جاتا تھا۔ آخر کار ہم مانٹریسرز کے زمین دوز قبرستان کے مرطوب فرش پر جا کھڑے ہُوتے۔

میرا دوست قدم قدم پر لڑکھڑاتا ہُوا چلتا تھا اور اُس کی ٹوپی کے گھنگھرو ہل ہل کر بجتے تھے۔

اُس نے پوچھا "وہ مشکا کہاں ہے؟"

میں نے جواب دیا "وہ تو ابھی بہت آگے ہے۔ مگر ذرا دیکھنا، ان دیواروں پر کیا چمکیلی سفیدی جم رہی ہے!"

وہ میری طرف متوجہ ہُوا۔ اور میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ جو نشے سے گلابی ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اُس نے پوچھا "یہ کلّر ہے، کلّر؟"

میں نے جواب دیا "ہاں ---- مگر یہ کھانسی تمہیں کب سے ہے؟"

"کھوں! کھوں! کھوں! ---- کھوں! کھوں! کھوں! ---- کھوں! کھوں! کھوں! ---- کھوں! کھوں! کھوں!"

بیچارے کے لئے کئی منٹ تک جواب دینا محال ہو گیا۔

آخر کار جب اُس کی کھانسی نے ذرا دم لیا تو وہ بولا۔ "کچھ بھی نہیں یونہی معمولی کھانسی ہے۔"

میں نے ایک فیصلہ کن لہجے میں کہا "آؤ بھئی، یہیں سے لوٹ چلیں۔ تمہاری صحت لاکھوں کی ہے۔ تم دولت والے ہو، عزت والے ہو، لوگوں میں تمہارے نام کا ڈنکہ بجتا ہے۔ تم خود خوش ہو۔ اور دوسروں کے لئے خوشی کا باعث ہو۔ جیسا کسی زمانے میں میں تھا۔ دنیا کو تمہاری ضرورت ہے۔ اُس کے کئی کام تمہارے دم قدم سے وابستہ ہیں۔ میری مانو، آؤ لوٹ چلیں۔ میں تمہاری صحت کی عظیم ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اور پھر اس کے علاوہ لیوکسی ...."

اُس نے بیصبری سے قطع کلام کرتے ہُوئے کہا۔ "بس رہنے بھی دو۔ میں اتنا ہی گیا گزرا نہیں کہ کھانسی سے مر جاؤنگا۔"

میں نے جواب دیا "ہاں، ہاں یہ بیشک درست ہے

میرا مطلب یہ نہ تھا کہ بیوجہ تمہیں خوفزدہ کر دوں۔ مجھے صرف اتنا کہنا مقصود تھا۔ کہ ہر مناسب احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس میڈک کا ایک گھونٹ حفظِ ماتقدم کے طور پر کافی نہ ہوگا؟"

یہ کہکر مَیں نے بوتلوں کی ایک طویل قطار سے جو منوں مٹی کے نیچے دبی ہوئی فرش پر پڑی تھی۔ ایک بوتل اُٹھائی اور اُس کا مُنہ کھولا۔

پھر مَیں نے بوتل کو اُس کے سامنے پیش کر کے کہا۔ "لو، پیو۔"

اُس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھ کر بوتل کو منہ سے لگالیا۔ پھر اُس کو ہٹا کر ایک معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ اور اُس کے سر کے گھنگھرو ایک دھیمی اور سُریلی آواز سے بجنے لگے۔

اُس نے کہا۔ "مَیں اُن خفتگانِ لحد کی یاد میں اسے پیتا ہوں۔ جن کی خوابگاہ میں ہم اس وقت آتے ہیں۔"

"اور مَیں تمہارا جامِ صحت نوشجان کرتا ہوں۔"

اُس نے پھر میرا بازو تھام لیا۔ اور ہم آگے بڑھے۔

وہ اپنے چاروں طرف کی تاریک وسعت پر نظر دوڑا کر بولا۔ "یہ تہ خانہ تو بہت لمبا چوڑا ہے۔"

مَیں نے جواب دیا۔ "مانٹریسروں کا خاندان بہت بڑا خاندان تھا۔"

"مجھے تمہارا خاندانی نشان یاد نہیں رہا۔"

"ایک بہت بڑا انسانی پاؤں ایک سانپ کو کچل رہا ہے جو پھن اُٹھائے ہوئے ہے اور اپنے دانت ایڑی میں گاڑے ہوئے ہے۔" "اور اس پر کیا لکھا ہے؟" "جس نے مجھے چھیڑا بچکر نہ گیا۔" "خوب!"

اُس کی آنکھوں میں شرابِ آتشیں کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اور اُس کے گھنگھرو ایک مسلسل جھنکار کے ساتھ بج رہے تھے۔ خود میرے تخیّل میں اس وقت ایک گرمی پیدا ہو رہی تھی۔ ہم مُردوں کے انبار در انبار پنجروں کی اونچی اونچی دیواروں کے درمیان سے، جن کے برابر پیپوں اور مٹکوں کی دیواریں چُنی ہوئی تھیں۔ گزر کر تہ خانے کی انتہائی گہرائی میں پہنچ گئے تھے۔ مَیں پھر رُک گیا۔ اور اب کے مَیں نے اتنی جرأت کی کہ فارچونیٹو کا بازو تھام لیا۔

مَیں نے کہا۔ "دیکھو، کلّر قدم قدم پر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ دیواروں پر اس طرح تو بر تو جما ہوا ہے جس طرح پانی پر کائی جم جاتی ہے۔ ہم اس وقت دریا کی تہ سے بھی نیچے پہنچ گئے ہیں۔ نمی کے قطرے ہڈیوں کے درمیان ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ خدا کے لئے اپنی حالت پر رحم کرو۔ آؤ اب بھی وقت ہے۔ واپس چلے چلیں۔"

اُس نے جواب دیا۔ "کچھ مضائقہ نہیں۔ تم بڑھے چلو۔ ہاں بڑھے چلو۔ مگر ذرا پہلے مجھے میڈک کا ایک اور

لطیف گھونٹ پلا دینا۔"

اس مرتبہ میں نے دیگریو کی ایک بوتل کھول کر اُس کے حوالے کی۔ وہ اُسے غٹ غٹ چڑھا گیا۔ اسکی آنکھوں میں اس طرح شرارے چمکنے لگے۔ گویا دو مشعلیں جل رہی ہیں۔ وہ ہنسا، ایک عجیب ہنسی ہنسا، اور ایک نامعلوم اشارے کے ساتھ بوتل کو ہوا میں اُچھال دیا۔

میں اُس کے اشارے کا کچھ مطلب نہ سمجھا۔ اور حیرت سے اُس کا مُنہ تکنے لگا۔ اُس نے پھر اُس کا اعادہ کیا پھر بھی کچھ میری سمجھ میں نہ آیا۔

وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "تم اس اشارے کا مطلب نہیں سمجھے؟"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں، میں نہیں سمجھا۔"

"پھر تم ہماری جماعت کے رُکن نہیں؟"

"کیا معنی؟"

"یعنی تم فرامشن نہیں؟"

"میں؟ میں؟ — کیوں نہیں؟"

"تم اور ایک فرامشن! ناممکن!"

"کیوں؟"

"اچھا کوئی نشانی تو دکھاؤ۔"

میں نے اپنے لبادے کی لپیٹ میں سے ایک کرنی نکال کر دکھائی۔

وہ کئی قدم پیچھے ہٹ کر تعجب کے لہجے میں کہنے لگا۔

"تم تو ہنسی اُڑاتے ہو۔ مگر خیر، آؤ اس مٹکے کی تلاش کریں۔"

میں کرنی کو اپنے لبادہ میں چھپا کر اور اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیکر اُس کے ساتھ ہولیا۔ اُس نے اپنے سارے جسم کا دباؤ مجھ پر ڈال دیا۔ اور ہم اس انداز سے مٹکے کی تلاش کرنے لگے۔ ہم تنگ اور پست محرابوں کے نیچے سے گزر کر، اور ایک مختصر سے زینے سے اُتر کر، آگے بڑھے۔ اور پھر ایک زینے سے اُتر کر ہم ایک تیرہ و تاریک کوٹھڑی میں پہنچے۔ جہاں ہوا کچھ اس قدر غلیظ تھی کہ ہماری مشعلیں جلنے کی بجائے بُجھی ہوئی چنگاریوں کی طرح سُلگنے لگیں۔

اس کوٹھڑی سے پرے ایک اس سے بھی زیادہ تاریک کوٹھڑی نظر آرہی تھی۔ اُس کی دیواروں کے متوازی فرش سے لیکر چھت تک انسانی ہڈیوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ جس طرح پیرس کے زمین دوز قبرستانوں کا قاعدہ ہے۔ تین دیواریں اس خوفناک زیور میں اس طرح ڈوبی ہوئی تھیں۔ کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ البتہ چوتھی دیوار کے برابر ہڈیوں کی جو دیوار چُنی گئی تھی، وہ گر چکی تھی۔ اور اس کے اجزائے ترکیبی زمین پر پریشان و پراگندہ پڑے تھے پھر بھی ایک جگہ اتنی ہڈیاں جمع ہوگئی تھیں کہ ایک ٹیلا بن گیا تھا۔ جو دیوار اس ہڈیوں کی دیوار کے گرنے سے ننگی ہوگئی تھی اُسمیں

ایک اور کوٹھڑی کا دروازہ نظر آرہا تھا۔ جو تقریباً چار فٹ اس کوٹھڑی کی سطح سے نیچی تھی۔ طول وعرض میں تین فٹ تھی۔ اور بلندی میں چھ یا سات۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوٹھڑی بذاتِ خود کسی خاص غرض کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ بلکہ صرف اُن جسیم وجسیم ستونوں کا درمیانی فاصلہ تھی جو تہ خانے کی چھت کو سہارے کھڑے تھے۔ اور اُس کی پشت پر سنگ سفید کی ایک دیوار تھی۔

فارچونیٹو نے اپنی مدھم مشعل کی روشنی سے اس کوٹھڑی کی تاریکی میں دیکھنے کی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوشش کی۔ لیکن بے سود۔

مَیں نے کہا" چلو، آگے چلو، بس اُس کوٹھڑی میں مٹکا رکھا ہے۔ اور لیوکسی کے بارے میں . . . . . ."

اُس نے بات کاٹ کر کہا۔" وہ جاہلِ مطلق ہے" اور پھر اُس نے ڈگمگاتی ہوئی چال سے قدم اُٹھایا اور مَیں بھی اُس کے ساتھ لگا رہا۔ ذرا سی دیر میں وہ کوٹھڑی کے دوسرے سرے تک جا پہنچا۔ اور جب اُس نے دیوار کو اپنی راہ میں حائل دیکھا۔ تو حیرت سے نقش دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں جو اسی موقع کا منتظر تھا' اسے حیرت کی بیدست وپائی میں دیکھ کر جھپٹا۔ دیوار میں لوہے کے دو کنڈے تھے۔ جو افقی طور پر ایک دوسرے سے دو فٹ کے فاصلے پر لگے ہوئے تھے اُن میں سے ایک کنڈے سے ایک زنجیر معلق تھی۔ اور دوسرے میں ایک تالہ پڑا ہُوا تھا۔ زنجیر اُس کی کمر میں ڈال کر مَیں نے پلک جھپکنے کی دیر میں تالہ لگا دیا۔ وہ اس ناگہانی یورش سے اس قدر حیرت زدہ ہو گیا کہ اُس نے ہاتھ تک نہ ہلایا کنجی تالے سے نکال کر مَیں کوٹھڑی سے باہر چلا آیا۔

مَیں نے کہا" ذرا دیوار پر ہاتھ پھیرنا۔ کلّر کس قدر کثرت سے ہے! واقع میں یہاں رطوبت کی کچھ حد نہیں ہَیں تم سے پھر ایک بار التجا کرتا ہوں کہ آؤ واپس چلے جائیں ـــ نہیں؟ تم کو منظور نہیں؟ تو پھر مجھے قطعی طور پر تم کو یہیں چھوڑ جانا چاہیئے۔ مگر جانے سے پہلے بہتر ہو گا کہ تمہاری جو خدمت مجھ سے بن پڑے کر جاؤں۔"

میرے دوست نے چلّا کر کہا۔" ارے وہ مٹکا!"

ابھی اُس کی حیرت دُور نہ ہوئی تھی۔

مَیں نے جواب دیا" ذرا دم لو۔"

اور مَیں ہڈیوں کے اُس ڈھیر کو اپنی جگہ سے ہٹانے میں مصروف ہو گیا۔ جس کا مَیں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اُس کے نیچے سے اینٹ گارے کی ایک بہت سی مقدار نکل آئی اُس کرنی اور اس مسالے کی مدد سے مَیں نے کوٹھڑی کے دروازے میں دیوار اُٹھانا شروع کر دی۔

ابھی مَیں نے اینٹوں کی پہلی ہی قطار پوری کی تھی کہ مجھے معلوم ہوا کہ فارچونیٹو کا نشہ اُترنے لگا ہے۔ اس کا اوّلیں ثبوت مجھے یہ ملا کہ کوٹھڑی کی تاریک گہرائی میں سے مَیں نے ایک

ہلکی سی چیخ کی آواز سنی۔ یہ ایک بدمست شخص کی چیخ نہ تھی۔ پھر
ایک طویل اور وحشت انگیز خاموشی طاری ہوگئی میں نے دوسری
تیسری اور چوتھی قطار پوری کی۔ تو زنجیر کی پرشور جھنجھناہٹ
سنائی دی۔ یہ آواز کئی منٹ تک آتی رہی۔ اور میں اسکو زیادہ
اطمینان سے سننے کے لئے اپنا کام چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ جب
آخرکار یہ آواز آنا بند ہوگئی تو میں نے اپنا کام از سرِ نو شروع
کردیا۔ اور بغیر رُکے تھمے پانچویں چھٹی اور ساتویں قطار
کی چنائی کرلی۔ دیوار اب میرے سینے تک اٹھ چکی تھی۔
میں پھر رُک گیا۔ اور مشعل کو دیوار سے بلند کرکے میں نے چند
مدھم کرنیں اپنے قیدی پر ڈالیں۔

یکایک رعد خیز چیخوں نے اُس کال کوٹھڑی کی محدود
فضا میں ایک زلزلہ بپا کردیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دیواروں
کی بنیادیں ہل جائینگی، اور چھت میں شگاف ہوجائے گا۔
ایک غیر محسوس ہاتھ نے دھکیل کر مجھے کئی قدم پیچھے ہٹا دیا۔
چند منٹ تک میں خوف کی تصویر بنا ایک جگہ کھڑا رہا۔ اور
میرے پاؤں ہزار ہزار من کے ہوگئے۔ آخر جب میرا
قدم اُٹھا تو میں نے اپنے خنجر کو میان سے باہر کرلیا۔ اور
ٹٹول ٹٹول کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ لیکن ایک لحظہ کے
غور و فکر کے بعد میری دلجمعی ہوگئی۔ میں نے تہ خانے کی دیواروں
کو ہاتھ سے مس کرکے دیکھا۔ اور مجھے اطمینان ہوگیا۔ کہ وہ اپنی
جگہ پر قائم ہیں۔ میں پھر دیوار کے قریب آیا۔ وہ ابتک گلا پھاڑ
پھاڑ کر چیخ پکار مچا رہا تھا۔ میں نے اُس کے جواب میں چلّانا
شروع کیا۔ دونوں آوازیں آپس میں ٹکرائیں اور ٹکرا ٹکرا کر
گونجنے لگیں۔ میں چیخا، چلّایا، یہانتک کہ میرا مدِ مقابل
تھک کر ہار گیا۔ اور میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔

اب آدھی رات کا وقت تھا۔ اور میرا کام ختم ہونے
والا تھا۔ میں آٹھویں، نویں اور دسویں قطار سے فارغ ہوچکا
تھا۔ گیارھویں کے ایک حصّے کی چنائی کی تھی۔ بس ایک پتھر
رکھنے کی کسر تھی۔ اور میں اُسے اُٹھا کر رکھنے کی کوشش کر رہا
تھا۔ پتھر غضب کا بھاری تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے
اُٹھایا۔ لیکن پورے طور پر اپنی جگہ نہ رکھ سکا۔ یکایک کوٹھڑی
کے اندر سے ایسی ہنسی کی آواز آئی۔ جس نے میرے جسم پر
رونگٹے کھڑے کردیئے۔ اس کے بعد ایک غم میں ڈوبی ہوئی
آواز سنائی دی۔ میں اُسے بمشکل پہچان سکا۔ وہ فارچونیٹو کی
آواز سے بہت مختلف تھی۔

"ہاہاہا! ہاہاہا! — اوہوہوہو! اوہوہوہو! —
کیا کہنا! کیا کہنا! اس دل لگی کی ایک ہی رہی۔ گھر میں لوگ
سُنیں گے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائینگے۔ اور لیڈی
فارچونیٹو کی تو حالت دیکھنے کے قابل ہوگی۔ آؤ چلیں، خوب
لطف رہے گا۔"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں آؤ چلیں۔"

"مانٹریسر! تجھے خدا کی قسم!"

"واقعی، خدا کی قسم؟"

لیکن ان الفاظ کا اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ مَیں انتظار کرتے کرتے تنگ آگیا۔ مَیں نے چلّا کر کہا "فارچو نیٹو! کوئی جواب نہ مِلا۔ مَیں نے پھر پکار کر کہا۔

"فارچونیٹو!"

پھر بھی کوئی جواب نہ مِلا۔ مَیں نے سوراخ میں سے ایک مشعل کوٹھڑی کے اندر داخل کر کے پھینک دی۔ اُس کے جواب میں صرف گھنگھروؤں کے بجنے کی ہلکی سی آواز آئی اور پھر چپ چاپ کا عالم ہو گیا۔ میرا جی گھبرانے لگا یہ سب نہ خانے کی مرطوب ہوا کا اثر تھا۔ مَیں نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا۔ مَیں نے آخری پتھر کو جوں توں کر کے اپنی جگہ پر اٹکا دیا۔ ہڈیوں کی جو دیوار مَیں نے ڈھا دی تھی اُس کو مَیں نے پھر کھڑا کر دیا۔ پچاس سال ہونے کو آئے۔ آج تک کسی بشر کا ہاتھ اُس کو نہیں لگا۔ خدا مرنے والے کی رُوح کو ابدی راحت نصیب کرے۔

محمد عظیم الدین

عشق و محبّت

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ۔۔۔ اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

(شیفتہ)

عشق سُنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید ۔۔۔ خود بخود دِل میں ہے اِک شخص سمایا جاتا

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جاتے ۔۔۔ اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

عشق بڑھتا گیا جُوں جُوں رکے اس شوخ سے ہم ۔۔۔ یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

عشق کی آنچ اس میں پاتا ہُوں ۔۔۔ دِل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

(حالی)

زیشِ عشق ہنوز ار نے بری ذوقے ۔۔۔ بباش تا قدرے آشنائے جاں گردد

باما بہ ہر معاملہ بدگماں نہ بود ۔۔۔ خوش بود آنکہ رازِ محبّت عیاں نہ بود

(شبلی)

ترسم گراز محبتِ خویشش خبر کنم ۔۔۔ با خویش سرگرانیِ او بیش تر کنم (یمیلی یزدی)

غزلیات

(۱)

میری وفا نچے گی کیا چشمِ جفا طراز میں
حسن کو دخل ہی نہیں عشق کے سوز و ساز میں

ایک غریب وقفِ دردِ کشمکشِ فراق سے
اور حضور محو ہیں نغمۂ جاں نواز میں

منزلِ حسن و عشق کا ایک یہی ہے راستہ
پاؤں تو رکھ کے دیکھ تو رہگذرِ مجاز میں

قصۂ درد کہہ تو دُوں، شکوۂ غم سُنا تو دُوں
اور جو شکن عیاں ہوئے اُن کی جبینِ ناز میں

خیر نہیں دلوں کی اب، ہوش میں آئیں اہلِ بزم
کھیل رہی ہیں شوخیاں چشمِ فسوں طراز میں

شامیِ خستہ کا علاج ہو نہ سکا بجز اجل
آگیا ضعف آخرش ہمّتِ چارہ ساز میں

محمد معراج الدین شامی

(۲)

جب کسی کو دیکھتا ہوں بے قرارِ آرزو
یاد آتا ہے وہ آئینِ وفا کوشی مجھے

صورتِ پروانہ خاکستر بنا دے گی ضرور
شمع رویوں سے تمنائے ہم آغوشی مجھے

تنگنائے دہر سے چھوٹا بہت اچھا ہُوا
لے اُڑی آخر ہوائے خود فراموشی مجھے

کیا دکھاتی ہے خدا معلوم اقدسؔ دیکھنا
اس کی خود داری اسے میری ہوس کوشی مجھے

اقدسؔ

۳

دورۂ حسن و عشق کی آہ وہ شادمانیاں
طبع کی گلفشانیاں اشک کی خونچکانیاں

جوشِ بہار و ابر میں بادۂ ناب دیکھکر
آگئیں یاد ہجر میں بھُولی ہوئی کہانیاں

دل میں تو آپ آگئے، آنکھ میں تو سما گئے
آپ کی اب بلا کرے پہلی سی مہربانیاں

احسنؔ

وجدانیات

مہماں ہے وہ مہرِ درخشانِ تمنّا — لو آج تو روشن ہے شبستانِ تمنّا
لے دے کے یہی دل تو ہے سرمایۂ ہستی — پھر وہ بھی ہے محوِ غمِ پنہانِ تمنّا
دیکھو نہ ادھر شیوۂ کافر نظری سے — بڑھ جائے نہ اندوہِ فراوانِ تمنّا
برسائیں کبھی آپ جو گلہائے تبسّم — کس شوق سے پھیلا دوں میں دامانِ تمنّا
جب آپ سے ملکر بھی نہ تسکیں ہو میسّر — کس چیز کو ٹھہرائیے پایانِ تمنّا
اب دیکھئے کس وقت جلا پائیگا سینہ — روشن تو ہوئی شمعِ فروزانِ تمنّا
شاداب محبت ہے مرے شوق کی دُنیا — آغوشِ تصوّر میں ہے وہ جانِ تمنّا
افسانۂ فرقت پہ وہ ہنس ہنس کے یہ بولے — اُف مر نہ گئے حوصلہ مندانِ تمنّا
کرنے سے رہے آہ وہ پہلی سی نوازش — آنے سے رہا آہ وہ دورانِ تمنّا
یہ دیکھ کہ ہے شیوۂ احسان و عطا کیا — مانا کہ مرا دل نہیں شایانِ تمنّا

ہر ظلم پہ ارشاد یہ کرتے ہیں وہ عابدؔ
"کہ دیں تو سہی تجھ کو پشیمانِ تمنّا"

عابدؔ

جلاوطن

اکسنیف شہر ولیڈی میر کا ایک نوجوان سوداگر تھا۔ اس کی کل ملکیت ایک مکان اور چند دو کانیں تھیں۔ اسکے چہرے کی رنگت سُرخ اور بال گھنگھریالے تھے۔ وہ نہایت زندہ دل اور موسیقی کا ماہر تھا۔ شادی کرنے سے پہلے وہ اس کثرت سے شراب پیا کرتا تھا کہ مدہوش ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد اس نے شراب چھوڑ دی تاہم کبھی کبھی پی لیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ موسم گرما میں اکسنیف نیزنہنی (روس کے ایک قصبے کا نام ہے) ایک مشہور تہوار پر جا رہا تھا۔ جب وہ رخصت ہونے لگا۔ تو اس کی بیوی بولی " اکسنیف! پیارے آج نہ جاؤ۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ تم پر کوئی آفت نازل ہوگی۔

اکسنیف اپنی بیوی کی اس بات پر ہنسا اور کہنے لگا۔ "تم ہمیشہ ڈرتی رہتی ہو۔ کہ میں میلے میں شراب پیونگا" اسکی بیوی نے جواب دیا" میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں کس بات سے ڈرتی ہوں لیکن میں نے ایسا عجیب خواب دیکھا ہے کہ جیسے تم قصبے سے گھر آ رہے ہو۔ اور تم نے اپنی ٹوپی اتاری ہے تو میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے سر کے بال سفید ہیں"

اکسنیف پھر ہنسا۔" اس سے مراد خوشی ہے . . . . تو اب میں جا رہا ہوں اور تمہارے لئے اچھی اچھی چیزیں لاؤنگا۔"

اس نے الوداع کہی اور چلا گیا۔ جب اس نے آدھا راستہ طے کر لیا' تو اپنا ایک واقف سوداگر ملا جو اسی تہوار پر جا رہا تھا۔ دونوں رات بسر کرنے کے لئے ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔ اور اکٹھے ہی بیٹھ کر چائے پی۔ اور پھر دو ایسے کمروں میں جن کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی سونے کیلئے چلے گئے۔ اکسنیف زیادہ دیر نہ سویا۔ وہ آدھی رات کے وقت جاگ اٹھا۔ اور اس خیال سے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے آسانی سے سفر کر سکیگا۔ اس نے اپنے کوچوان کو جگا کر گاڑی تیار کرنے کے لئے کہا۔ اور سرائے کے مالک کا حساب بیباق کر کے روانہ ہو گیا۔

جب اس نے ساڑھے چھبیس میل کی مسافت طے کر لی تو وہ پھر سستانے اور کچھ کھانے پینے کے لئے ٹھہر گیا۔ اور سرائے کی ڈیوڑھی میں آرام کیا۔ جب دوپہر کا وقت ہوا تو وہ اندر گیا۔ اور چائے تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور خود ستار لے کر بجانے لگا۔

دفعتہً ایک ٹرئیکا گاڑی گھنٹی بجاتی ہوئی سرائے کی طرف آئی۔ اور دروازے پر آ کر رُک گئی۔ ایک افسر اور دو سپاہی

گاڑی سے باہر نکلے۔ وہ سیدھے اکسنیف کی طرف گئے۔ اور اس سے پوچھنے لگے۔ "تم کون ہو، کہاں سے آتے ہو؟" اکسنیف نے اپنا پتہ نشان بتایا۔ اور ازراہ تواضع اُن کو چاے میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ لیکن افسر سوالات کئے جاتا تھا "تم نے رات کہاں بسر کی؟ کیا تم اکیلے تھے۔ یا تمہارے ساتھ کوئی سوداگر بھی تھا؟ کیا تم نے اسے صبح دیکھا بھی تھا؟ تم اسقدر جلدی وہاں سے کیوں چلے آئے؟"

اکسنیف حیران تھا کہ افسر اسقدر سختی سے سوال کیوں کر رہا ہے؟ تاہم اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "آپ مجھسے اسقدر سوال کیوں کر رہے ہیں؟ مَیں کوئی چور یا بدمعاش نہیں ہوں۔ اپنے کام سے جا رہا ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس طرح کرید کرید کر مجھ سے باتیں پوچھیں۔" افسر نے سپاہیوں کو بُلایا اور اکسنیف سے کہنے لگا۔ "مَیں پولیس انسپکٹر ہوں۔ مَیں نے تم سے اس لئے سوالات کئے ہیں۔ کہ وہ سوداگر جس کے ساتھ تم نے رات بسر کی تھی بستر پر قتل کیا ہوا پایا گیا۔ ہے۔ اپنا سامان دکھاؤ" اور ساتھ ہی سپاہی کو حکم دیا۔ "تم دونوں اس کی تلاشی لو" دونوں سپاہی سرائے کے اندر گئے اور بیگ اور ٹرنک اُٹھا لائے۔ اور پولیس کے انسپکٹر کے سامنے انہیں کھولکر دیکھنا شروع کیا۔ یکایک پولیس انسپکٹر نے ایک بیگ میں سے چاقو نکالا۔ اور شاہانہ انداز تحکم سے کہنے لگا۔ "یہ چاقو کس کا ہے؟" اکسنیف خوفزدہ ہو کر چاقو کی طرف دیکھنے لگا جو خون سے رنگا ہوا تھا۔ اور اس کے بیگ سے برآمد ہوا تھا۔

"چاقو پر یہ کس کا خون لگا ہوا ہے؟"

اکسنیف نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن صاف طور پر بول نہ سکا۔

"مَیں .... مَیں ... نہیں ... جانتا .... مَیں ... یہ میرا ... چاقو ... نہیں ہے۔"

انسپکٹر بولا "آج صبح سوداگر اپنے بستر پر قتل کیا ہوا پایا گیا ہے۔ اور تمہارے سوا یہ کسی کا کام نہیں ہو سکتا کیونکہ سرائے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور تمہارے سوا اور کوئی سرائے میں نہیں تھا۔ اور یہ خون آلود چاقو بھی تمہارے ہی بیگ سے نکلا ہے اور اسکے علاوہ تمہارا چہرہ تمہارے جرم کی شہادت دیتا ہے مجھے صاف صاف بتلاؤ کہ تم نے کس طرح قتل کیا ہے اور کتنا روپیہ چرایا ہے؟

اکسنیف نے قسم کھائی کہ اس نے یہ کام نہیں کیا۔ اور اُس نے سوداگر کے ساتھ چاے پینے کے بعد اسے نہیں دیکھا۔ اور جو آٹھ ہزار روبلس (روس کا ایک سکّہ) اس کے پاس ہیں وہ خود اس کے ہیں اور چاقو اس کا نہیں۔ اسکی آواز کانپ رہی تھی۔ اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور سارا جسم ایک مجرم کے مانند خوف سے کانپ رہا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اکسنیف کو حراست میں کرلیں اور گاڑی میں لے جائیں۔ جب وہ اسکے ہاتھ پاؤں باندھ کر لے چلے تو اکسنیف بے اختیار رونے لگا۔ انہیں

نے اکسنیف کا روپیہ اور سامان ضبط کرلیا۔ اور اسے دوسرے شہر میں لے جاکر حوالات میں بند کر دیا۔

اُنھوں نے ولیڈی میر میں اکسنیف کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی۔ تمام سوداگروں اور شہر والوں نے بیان کیا کہ اکسنیف عہدِ جوانی میں شراب پیتا تھا اور اتنی پیتا تھا کہ بیہوش ہوجاتا تھا لیکن آجکل وہ نہایت شریفانہ زندگی بسر کرتا ہے جب وہ عدالت میں لایا گیا تو اس پر قتل اور بیس ہزار ربل چرانے کے جرم لگائے گئے۔

اکسنیف کی بیوی نے جب اس واردات کا حال سُنا تو دُنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کرے۔ اسکے بچے ابھی بالکل چھوٹے تھے۔ ایک دودھ پیتا تھا وہ سب بچوں کو لیکر جس شہر میں اس کا شوہر قید تھا گئی۔ اوّل اوّل اسے شوہر سے ملنے کی اجازت نہ ملی لیکن بعد ازاں داروغہ نے اسے اجازت دیدی۔ اور وہ اکسنیف کے پاس پہنچ گئی جب اُسنے اکسنیف کو قیدیوں کے لباس میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ پابہ زنجیر دیکھا تو وہ غش کھاکر زمین پر گر پڑی۔ اور بڑی دیر کے بعد ہوش میں آئی۔ اسنے بچوں کو اپنے گرد بٹھالیا۔ اور آپ اُنکے درمیان بیٹھ گھر کے حالات بیان کرنے لگی۔ اور پھر اکسنیف سے کُل ماجرا بیان کرنیکو کہا۔ اس نے سارا قصہ من وعن سُنا دیا۔ بیوی نے پوچھا " اسکا انجام کیا ہوگا؟" اس نے جوابدیا ہمیں شہنشاہ زار کی خدمت میں عرضی بھیجنی چاہیے۔ یہ ایک غیر ممکن بات ہے کہ کسی بیگناہ شخص کو سزا ملے۔"

بیوی نے جوابدیا کہ اس نے زار کی طرف ایک عرضی لکھی تھی لیکن وہ منظور نہ ہوئی۔ اکسنیف نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کا دل اس ناقابلِ برداشت صدمہ سے ٹوٹ گیا۔ اس کی بیوی بولی " اب تو تم نے خواب کی تعبیر دیکھ لی؟ جب میں نے خواب دیکھا تھا کہ تمہارے سر کے بال سفید ہوگئے ہیں۔ تو میرے دل میں اسی وقت خیال آیا تھا کہ خدا نہ کرے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو کر رہیگی۔ اب تمہارے بال غم کی وجہ سے سفید ہونے شروع ہوگئے ہیں۔ تم کو چاہیے تھا کہ اسوقت گھر رہتے "۔

وہ اپنے بال نوچ نوچ کر رونے لگی۔ پھر اُسنے پوچھا " میرے پیارے شوہر اپنی بیوی سے سچ سچ کہدو۔ کہ تم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہو یا نہیں؟" اکسنیف نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا " آہ.... تم بھی مجھ پر شبہ کرتی ہو؟" یہ کہکر وہ زار و قطار رونے لگا اتنے میں ایک سپاہی آیا اور اکسنیف کے بیوی بچوں کو چلا جانے کا حکم دیا۔ اس نے آخری بار اُن کو الوداع کہی۔

جب اسکی بیوی چلی گئی تو وہ اسکی باتوں پر غور کرنے لگا جب اسے خیال آیا کہ اسکی بیوی نے بھی اسکا اعتبار نہیں کیا اور پوچھا کہ تم نے سوداگر قتل کیا ہے یا نہیں تو وہ اپنے جی میں کہنے لگا " یہ ظاہر ہے کہ سوائے خدا کے اور کوئی اصل واقعہ کو نہیں جان سکتا۔ خدا ہی ہے۔ جو میں بیگناہ اس آفت سے بچ نکلوں "۔

اسوقت سے اکسنیف نے عرضیاں لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور رہائی کی امید چھوڑ دی وہ صرف خدا کی عبادت کرتا رہا۔ اکسنیف

کو سزا سے تازیانہ اور جلاوطنی کا حکم ہوا۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اس کو تازیانے لگائے گئے۔ اور جب زخم بھر گئے تو دوسرے قیدیوں کے ساتھ سائبیریا بھیج دیا گیا۔"

وہ زمین دوز قید خانے میں چھبیس برس رہا۔ اس کے سر کے بال برف کی مانند سفید ہو گئے تھے۔ اور اس کی ڈاڑھی بھی گھنی لمبی اور سفید ہو گئی تھی۔ اسکا دل جو ہمیشہ خوشی اور زندہ دلی سے لبریز رہتا تھا بجھ گیا تھا۔ وہ بہت کم بولا کرتا تھا۔ اور کبھی نہیں ہنستا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت عبادت میں صرف کیا کرتا تھا جیل خانے میں اکسینف نے بوٹ بنانے سیکھ لئے تھے اور جو روپیہ اس نے اس کام میں کمایا تھا اس کی "کتاب الشہدا" خرید لی تھی۔ جب جیلخانہ میں کافی روشنی ہوتی تو وہ اس کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور مقدس ایام میں جیل کے گرجا میں جا کر انجیل کی تلاوت کرتا اور خدا کی تعریف میں گانے والوں کے ساتھ مل کر گاتا۔

تمام حاکم اس کے انکسار کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اور اسکے ساتھ کے تمام قیدی اس کی تعظیم کرتے، اور اسے "دادا" اور "خدا کا نیک بندہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ اور جب انہیں کوئی عرضی حاکم کے پیش کرنی ہوتی تھی تو وہ اکسینف کو منتخب کرتے تھے۔ کہ ان کی گزارشوں کو حاکموں کے پاس لیجاتے اور جب قیدیوں کا آپس میں جھگڑا ہو جاتا تو وہ ہمیشہ اکسینف کو ثالث بناتے تھے اکسینف کو گھر سے کوئی خط نہیں ملا تھا۔ اور اسے معلوم نہیں تھا کہ اسکی بیوی بچے زندہ ہیں یا نہیں۔

ایک دفعہ چند نئے قیدی جیلخانہ میں داخل ہوئے۔ شام کو سب پرانے قیدی نئے قیدیوں کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے سوالات کرنے لگے۔ کہ وہ کس ملک یا گاؤں سے آئے ہیں۔ اور کن جرائم کی پاداش میں سائبیریا بھیجے گئے ہیں؟

اس وقت اکسینف، نو آمد قیدیوں کے نزدیک ایک سٹول پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ ان نئے قیدیوں میں سے ایک آدمی جو نہایت مضبوط اور جسیم تھا، جس کی عمر کوئی ساٹھ سال کے قریب ہوگی اور جس کی ڈاڑھی، نہایت گھنی اور سفید تھی۔ بتلا رہا تھا۔ کہ وہ کیوں پکڑا گیا ہے ---- "اے بھائیو میں یہاں بیگناہ بھیجا گیا ہوں۔ میں ایک پوسٹ مین کی گاڑی سے ساز اتار رہا تھا کہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا کہ میں چرا رہا تھا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میں صرف تھوڑی دور جانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے گھوڑے کو چابک لگائی تھی۔ اس کے علاوہ کوچوان میرا دوست تھا میں کہتا ہوں، نہیں وہ کہتے تھے کہ تم چوری کر رہے تھے لیکن انہیں معلوم ہی نہیں کہ میں نے کیا کیا جرم کئے ہیں میں نے وہ وہ کام کئے ہیں کہ آج سے مدتوں پہلے یہاں ہوتا۔ لیکن میں پکڑا نہیں گیا۔ اب انہوں نے بلا انصاف مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ اور انہوں نے مجھے زیادہ مدت تک نہیں رکھا۔ اگرچہ . . . . . . "تم کس جگہ سے آتے ہو؟" ایک قیدی

نے پوچھا۔

"ہم ولیڈی میر سے آتے ہیں۔ اور ہم وہیں کے باشندے ہیں۔ میرا نام میکار ہے۔ اور میرے باپ کا نام سیمتین تھا۔"

اکسنیف نے سر اُٹھا کر پوچھا" مجھے بتاؤ کیا تم نے اکسنیف کے بیٹوں کی نسبت بھی کچھ سُنا ہے۔ جو ولیڈی میر کے سوداگر ہیں؟ ...... کیا وہ زندہ ہیں؟"

"بیشک میں نے ان کی نسبت سُنا ہے وہ مالدار سوداگر ہیں۔ اگرچہ ان کا باپ سائبیریا میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی ہم جیسا گنہگار ہے ...... اب دادا مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے؟"

اکسنیف اپنی بدقسمتی کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "چھبیس برس سے اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

میکار نے پوچھا۔ "لیکن آپ کا جرم کیا ہے؟"

اکسنیف نے جوابدیا۔ "مجھے ضرور اس سزا کا مستحق ہونا چاہیے تھا۔"

اکسنیف نے اس سے زیادہ ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکالا۔ دوسرے قیدیوں نے بتلایا کہ کس طرح اکسنیف سائبیریا آیا۔ اور کس طرح ایک سوداگر کو کسی نے قتل کر کے چاقو اکسنیف کے اسباب میں رکھ دیا تھا۔ اور کس طرح اسے بے انصافی سے سزا ملی۔ جب میکار نے یہ سُنا تو اس نے اکسنیف کی طرف دیکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "خوب یہ نہایت عجیب معاملہ ہے۔ دادا آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہونگے۔

قیدیوں نے میکار سے پُوچھنا شروع کیا۔ کہ وہ کس خیال سے متعجب ہو رہا ہے؟ اور کیا اُس نے اکسنیف کو پہلے کہیں دیکھا ہے؟"

لیکن میکار نے ان الفاظ کے سوا کچھ نہ کہا۔ "دوستو! ایک اچنبھا!! کسقدر عجیب بات ہے کہ ہم دوبارہ آپس میں ملے ہیں۔"

جب اُس نے یہ الفاظ کہے تو اکسنیف نے خیال کیا۔ کہ یہ شاید سوداگر کے قاتل کو جانتا ہو۔ اس لئے اس نے پوچھا" کیا تم نے کبھی اس واردات کی نسبت کچھ سُنا ہے یا کبھی تم نے مجھے دیکھا ہے؟"

"ہاں میں نے سُنا تھا۔ تمام شہر میں یہی چرچا تھا۔ لیکن یہ مُدت کی بات ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا سُنا تھا۔"

"شاید تم نے قاتل کی نسبت بھی سُنا ہو؟"

میکار ہنسا اور کہنے لگا۔ "کیوں، بے شک جس شخص کے بیگ میں چاقو تھا اسی نے قتل کیا۔ بھلا تمہارے اسباب میں کوئی چاقو رکھ دے اور پکڑا نہ جاتے ـــــ

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ کس طرح تمہارے بیگ میں چاقو رکھ سکتے تھے۔ کیا تمہارے سر کے قریب کوئی کھڑا ہوا نہیں تھا؟ کیا تم نے اس کے متعلق نہیں سنا؟"

جیسے ہی اکسنیف نے یہ الفاظ سنے اُسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ شخص ہے۔ جس نے سوداگر کو قتل کیا تھا۔ اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ وہ نہایت مغموم ہو گیا۔ اور گزشتہ واقعات کو یاد کرنے لگا۔ تخیّل میں اسے اپنی بیوی نظر آئی۔ اس کی حالت بالکل ویسی ہی تھی۔ جبکہ وہ آخری مرتبہ اسے دیکھنے کے لئے جیلخانہ میں آئی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ اسے اس کی آنکھیں اور چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ پھر اس نے تخیّل میں اپنے بچوں کو سامنے کھڑے ہوتے دیکھا۔ ایک لڑکا سمور کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا ماں کی گود میں تھا۔ پھر اسے وہ وقت یاد آیا۔ جبکہ وہ خوش اور نوجوان تھا۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح وہ سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اُس وقت اسکی روح کس قدر بشاش تھی۔ جب وہ اپنی ستار بجا رہا تھا۔ پھر اُسے وہ جگہ یاد آئی۔ جہاں پر اُسے تازیانے لگائے گئے تھے۔ پھر چھبیس برس جیل میں کاٹنے کے واقعات یکے بعد دیگرے یاد آتے۔ اس کے بعد اسے اپنا بڑھاپا یاد آیا۔ وہ رنج کی وجہ سے اس درجہ بیقرار ہو گیا کہ زندگی کو موت پر ترجیح دینے لگا۔ اور "یہ سب کچھ اس بدمعاش کی وجہ سے" اس نے اپنے دل میں کہا۔ پھر اسے میکار پر اسقدر غصّہ آیا کہ اگر اُسکا اختیار ہوتا تو وہ اس کو اسی وقت مار ڈالتا۔ وہ انتقام لینے کیلئے بہت بیقرار تھا۔ وہ ساری رات عبادت میں مصروف رہا۔ لیکن اس کی روح کو تسلّی نہ ہوئی۔ جب دن چڑھا تو وہ میکار کے پاس سے گزر گیا۔ لیکن اس کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ لیکن اکسنیف کو اس عرصہ میں بالکل نیند نہ آئی۔ اس کا اضطراب اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔

ایک رات جب وہ کسی ضرورت سے جیل خانہ میں ہو کر گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے بوٹ کی ایڑی ایک تختہ پر پاؤں رکھنے سے ہل رہی ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لئے ٹھہر گیا۔ دفعتہً میکار تختہ کو سرکا کر نیچے سے نکل آیا۔ اور اکسنیف کی طرف خوف اور غصّہ کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

اکسنیف آگے بڑھنے ہی کو تھا۔ کہ میکار نے اس کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اور اُسے بتایا کہ کس طرح وہ دیوار میں گزرنے کے لئے راستہ بنا رہا ہے۔ اور کس طرح ہر روز مٹی کو اپنے بوٹوں میں بھر کر لے جاتا ہے۔ اور کس طریق پر وہ کام کرنے کے لئے باہر جاتا ہے۔ اور بازار میں مٹی

پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا۔ "بوڑھے آدمی اگر تم صرف اپنی زبان بند رکھو، تو میں تمہیں بھی باہر نکال لونگا۔ لیکن اگر تم نے کسی سے کہہ دیا تو مجھے کوڑے لگیں گے۔ لیکن بعد ازاں میں تمہاری اچھی طرح خبر لونگا۔ . . . . میں تم کو جان سے مار ڈالوں گا۔"

جب اکسنیف نے اپنے دشمن کو دیکھا تو اسکا سارا جسم غصّے اور جوش سے کانپنے لگا۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنے بازوؤں کو چھڑا لیا۔ اور کہنے لگا۔ "کوئی وجہ نہیں۔ کہ میں بھاگنے کی کوشش کروں۔ اور مجھے مارنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچیگا۔ تم مجھے عرصہ سے مار چکے ہو۔ رہا تمہارا راز کسی سے کہنے یا نہ کہنے کے متعلق میں وہی کروں گا، جو خدا کو منظور ہوگا۔"

دوسرے دن جب قیدی باہر کام پر گئے ہوئے تھے۔ تو سپاہیوں کو اس جگہ کا پتہ معلوم ہوگیا۔ انہوں نے تلاش کرنا شروع کیا۔ اور ایک شگاف کا کھوج لگا لیا۔ چیف جیل خانہ میں آیا۔ اور ہر ایک قیدی سے پوچھنے لگا۔ "وہ شگاف کس نے کیا ہے؟" لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ وہ قیدی جو جانتے تھے۔ انہوں نے بھی میکار کا نام نہ بتایا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس قسم کے قصور پر اسے اس قدر کوڑے لگیں گے کہ ادھ موا ہو جائے گا۔ چیف اکسنیف کے پاس آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اکسنیف راست گو آدمی ہے۔ اس سے اس نے پوچھا۔ "بوڑھے آدمی خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو یہ کس کی کارروائی ہے؟"

میکار پاس ہی نہایت پریشان صورت بناتے کھڑا ہوا تھا۔ اسے اکسنیف کی طرف دیکھنے کا حوصلہ بھی نہ پڑتا تھا۔ اکسنیف کے ہاتھ اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ کہہ سکتا تھا۔ مگر اب نہیں۔ اس نے اپنے دل میں کہنا شروع کیا۔ "اگر میں اسے بچا لوں ——— لیکن کیا میں اسے معاف کر سکتا ہوں؟ کیا وہ میری بربادی کا باعث نہیں ہوا؟ جب میں نے اتنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے ضرر نہ پہنچے۔ لیکن کیا میں اس کا نام بتا دونگا؟ کیا یہ مجھ سے ہو سکیگا؟ کیا وہ اسے یقیناً مارینگے۔ کیا اس سے کچھ فایدہ ہوگا؟ کیا میرے لئے کچھ آسانی ہو جائیگی؟"

دوبارہ چیف نے تحکمانہ انداز سے پوچھا ——
"ہاں پیرمرد سچ بتاؤ۔ کس نے دیوار میں شگاف کیا ہے؟"

"میں ہرگز نہیں بتاؤنگا۔ آپ جو چاہیں کریں۔ میں آپ کی طاقت میں ہوں۔" چیف کی تمام کوششوں کے باوجود اکسنیف نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ اور وہ چور کو معلوم کرنے میں ناکام رہے۔

دوسری رات اکسنیف اپنے تختہ پر لیٹا اونگھ رہا

تھا' تو اسے ایسا محسوس ہُوا کہ کوئی اس کے پاس آیا ہے۔ اور اسکے پاؤں میں بیٹھ گیا ہے۔ اس نے اندھیرے میں نظر اٹھا کر دیکھا' تو میکار دکھائی دیا۔ اکسنیف نے پوچھا" تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میکار خاموش رہا۔

اکسنیف کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا" تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ چلے جاؤ۔ نہیں تو مَیں پہرہ دار کو بلا لونگا"

میکار اس کے اور قریب ہو گیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔" اکسنیف مجھے معاف کر دو۔"

اکسنیف بولا" تم نے میرا کیا قصور کیا ہے جو مَیں تمہیں معاف کر دُوں۔"

"وہ مَیں ہی تھا جس نے سوداگر کو قتل کیا اور چاقو تمہارے بیگ میں چھپا دِیا۔ اور خود کھڑکی کی راہ سے کود کر بھاگ گیا۔"

اکسنیف نے کچھ جواب نہ دیا۔

میکار اس کے تختہ سے نیچے اُتر آیا۔ اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہنے لگا" مجھے معاف کر دو۔ خُدا کے لئے معاف کر دو۔ مَیں اقرار کر لونگا۔ کہ مَیں نے سوداگر کو قتل کیا تھا ـــــ وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تم گھر جاسکو گے۔"

اکسنیف بولا" تمہارے لئے یہ کہہ دینا آسان ہے۔ لیکن مَیں اسے کیا کروں ..... اب مَیں کہاں جاسکتا ہوں ..... میری بیوی مرگئی ..... میرے بچّوں نے مجھے بھلا دیا ..... میرے لئے جانے کو کوئی جگہ نہیں۔"

میکار نہ اُٹھا۔ اُس نے اپنے سر کو زمین پر دے مارا۔ اور کہنے لگا" اکسنیف مجھے معاف کر دو۔"

جب وہ مجھے باندھ کر تازیانے لگائیں گے۔ تو مَیں بہ آسانی برداشت کر لونگا۔ اب تمہیں دیکھنے کے ..... اور تم نے باوجود ان باتوں کے مجھ پر رحم کیا ہے ..... تم نے میرا نام نہیں بتایا۔ خُدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ اگرچہ مَیں ایک بدبخت گنہگار ہوں۔

میکار سسکیاں لینے لگا۔ جب اکسنیف نے اس کو اس طرح روتے دیکھا وہ خود بھی رو پڑا اور کہنے لگا" خدا تم کو معاف کر دیگا۔ مَیں تم سے سو درجہ بُرا ہوں۔"

دفعتہً اس کی رُوح کو عجب قسم کی راحت محسوس ہوئی۔ اُسنے گھر جانے کے لئے غم کرنا چھوڑ دیا۔ اور اسے جیلخانہ چھوڑنے کی کوئی خواہش نہ رہی۔ مگر صرف اسے اپنے آخری وقت کا خیال تھا

میکار نے اس کی ایک نہ سُنی اور جرم کا اقرار کر لیا لیکن جب سپاہی اکسنیف کو آزاد کرنے آئے تو اُسکو دُنیا کی ہر قید سے آزاد پایا۔

(ٹالسٹائی) غلام عباس

مُصوّر

دیوانۂ رنگ و بو مُصوّر
پروانۂ جستجو مُصوّر

ہے فلسفۂ حیات میں غرق
شادابی کائنات میں غرق

بُتخانۂ آذری نظر میں
اسرارِ شگفتگی نظر میں

مینوش جمال ہیں نگاہیں
شاداب خیال ہیں نگاہیں

اُلفت کے خمیر سے بنا ہے
ہر چیز میں حسن دیکھتا ہے

موہوم و ظہور کی حقیقت
پروازِ سرور کی حقیقت

معدوم و وجود کے سب اسرار
مشہود و شہود کے سب اسرار

انجم کا خرامِ لاأبالی
خورشید فلک کی استواری

معمور ہے ان رموز سے وُہ
مخمور ہے ان رموز سے وُہ

جب موئے قلم کو دے وہ جنبش
تخئیل سے جب کرے وہ کاوش

تاریکیِ غم کو دُور کر دے
ظلمت کے اثر کو نور کر دے

قرطاس کو زرنگار کر دے
پھولوں کو سدا بہار کر دے

فانی کو دوام حسن بخشے
اِک ماہ تمام حسن بخشے

تخئیل کو بیقرار کر دے
تصویر کو جاندار کر دے

دُنیا میں ثباتِ حُسن یکسر
ہے اس کے نقوش کو میسّر

عابدؔ

ناکام

ہجوم کی کثرت اور اُس پر شور و غل کی حشر انگیز صداؤں نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ وہ خوبصورت پلنگ اور اُس کا شاہانہ بستر آنکھوں کے سامنے تھا۔ عطر اور گلاب کی خوشبو سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی۔ جلیل القدر زمیندار کے تمام ملازم اور خدام اور شاگرد پیشہ پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ زمیندار کے دونوں بیٹے اپنی تمام مُدّت حیات میں شاید آج اوّلیں مرتبہ برہنہ پا چل رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً روپوں کی بارش نہایت فیاضی اور کشادہ دلی سے کی جا رہی تھی۔ اور مفلوک الحال اور قلّاش گداگروں کا ایک انبوہ اُن گدھوں کی طرح جو شکار کو دیکھ کر جھکے پڑتے ہیں۔ وحشت خیز چیخوں کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر اُن پر گر رہا تھا۔ "ہری بول! ہری بول" کی صدا متصل بلند ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ازدحام کثیر جمع ہو چکا تھا۔ اس شوکت و عظمت کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ یہ جلوس کسی تیوہار کی تقریب پر آراستہ کیا گیا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ بالکل بجا اور برمحل تھا اور شکوہ و شان اور طنطنہ و طمطراق کے جس قدر بھی مظاہر برپا کئے جاتے کم تھے۔ کیونکہ یہ جلیل القدر زمیندار کی بی بی کے جنازہ کا ماتمی جلوس تھا۔

مگر پھر بھی تم تو ایک مفلس باپ کے گھر میں پیدا ہوئیں اور جس ماں نے تمہارے لئے اپنی اُلفت بھری آغوش پھیلائی۔ اُس کے پاس تو خود آرائی کی فطری خواہش کی تسکین کے لئے فقط کانچ ہی کی چوڑیاں تھیں۔ اور اُس کے لباس کی حسرت انگیز سادگی تو زبان حال سے اُس کی بے مائگی اور بے نوائی کا اقرار کیا کرتی تھی۔ بچپن میں والدین اور اعزّہ و اقربا کی اُلفت ہی تمہاری کل کائنات تھی۔ شادی کے دن بھی تمہارے پاس آرائش جمال کا کوئی سامان نہ تھا اور تمہارا ذوق خود آرا بجز اس حسن کے جو تم اپنے خالق کے خزانۂ قدرت سے اپنے ہی ساتھ لیکر آئی تھیں اور کسی چیز کا رہین منتِ احسان نہ ہو سکا۔ پھر مجھے بتاؤ کہ کس اتفاق سے یا کس استحقاق سے جو تم نے کسی پچھلے جنم میں حاصل کیا۔ آج تمہیں پر شکوہ مرصّع اور زرتار کفن میسر ہے۔ جس کے سنہرے اور روپہلے رنگ جگمگا جگمگا کر آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن تھا کہ تمہاری آخری ساعت اُس سیدھے سادے گاؤں میں اُسی غریب شخص کے گھر میں جہاں تم نے پہلی دفعہ سورج کی روشنی دیکھی تھی ختم ہوتی اور آنکھیں بھی نظارہ دیکھ سکتیں؛ شاید آہ و بکا کی جگہ خواہش

آوازیں بھی سُنی جاتیں۔ اور اُس مسکن افلاس پر رنج والم کے سیاہ بادل بھی محیط نظر آتے۔ شاید چند متنفس ایسے بھی ہوتے جن کی متاعِ صبر و قرار تمہاری چتا کے ساتھ ہی جلکر راکھ ہوجاتی۔ اور باقی تمام عمر کے لئے ان کے زخم خوردہ دلوں پر تمہاری یادِ عزیز نمک پاشی کیا کرتی۔ لیکن کیا پھر بھی اپنے آخری مسکن کی طرف تمہاری رُخصت اتنی ہی شاندار ہوتی۔ اور تمہارے ساتھ ایسا ہی ہنگامہ خیز اجتماع ہوتا۔ کہ اس عظیم الشان دارالسلطنت کے رہنے والوں کی استعجاب آمیز نگاہیں بے اختیار تمہاری طرف اُٹھ جاتیں اور پھر یہ زہرہ شگاف چیخ پکار! جو شاید آسمان کے پردوں کو بھی پھاڑ کر نکل جاتی۔ کیا کوئی ایسی چیز بھی موت کی سرحد کی طرف تمہاری محشر خیز جادہ پیمائی کی نقیب ہوتی؟ آج یقیناً تمہاری قسمت قابلِ رشک نظر آتی ہے۔ تم خاندانِ امرائے کے امیرالامرا سرتاج پاربتی چرن رائے کی چہیتی بیوی تھیں پھر کیوں نہ میرے دل کی آگ بھی اُسی آگ کے ساتھ سرد ہوجاتے۔ جس کے خوفناک شعلے طرفۃ العین میں تمہارے نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم کو نگل جائیں گے۔ وہ کونسی زنجیریں ہیں جنہوں نے مجھ نابکار اور بدنصیب کی برگشتہ طالعی کو تمہاری قسمت سے اس طرح وابستہ کر رکھا ہے۔ کہ آج موت کے تفرقہ پرداز ہاتھ بھی عاجز نظر آرہے ہیں۔ میری ملکہ! تم خود اب نہیں رہیں۔ لیکن تمہارے لئے میرے دل میں اب بھی آگ بیتابی کے ساتھ بھڑک رہی ہے۔ کیا یہ ایک حقیر اور کس مپرس مدرس کی کوتاہ اندیشانہ بیباکی نہیں؟

جلوس برابر آگے آگے بڑھا چلا جارہا ہے۔ مَیں بھی دوسرے لوگوں کی طرح پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔ مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ تمہارے ذی حشمت واقبال شوہر کے خاندان کے بلند مرتبت ارکان کے دوش بدوش چل سکوں۔ کوئی اتفاقی واقعہ پیش آیا۔ اور جلوس ایک لحظہ کے لئے ٹھہرا۔ کوئی ٹرام یا سواری کی کوئی اور گاڑی سامنے رُک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم سب وہاں کھڑے رہے۔ اور ہجوم تمہیں اچھی طرح دیکھنے کے لئے دونوں طرف سے اُمڈے ہوئے طوفان کی طرح راستہ نکالتا ہُوا تمہاری طرف بڑھا۔ دو نوجوان لڑکے جو دیکھنے میں کالج کے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے سیدھے آگے کو نکل گئے۔ اور پھر جلد ہی متحیر چہروں کے ساتھ پیچھے ہٹ آئے۔ ایک دھیمی آواز میں دوسرے سے کہا۔ "مرنے پر بھی اس قدر حسن! محوِ حیرت ہوں کہ زندگی میں کیا عالم ہوگا؟ مجھے اب تک معلوم نہ تھا۔ کہ بجز تصویروں کے کہیں اور بھی ایسا حُسن دیکھنے میں آسکتا ہے۔ خدا جانے آج کس بدنصیب کا گھر ویران ہوا ہے؟"

دوسرے نے قطع کلام کیا۔ اور میری طرف اشارہ

کہہ کے آہستہ سے کہا۔ "خاموش! شاید یہی اس کا شوہر ہے۔" پھر وہ دونوں اس جمِ غفیر میں کہیں غائب ہو گئے۔ اب ٹرام چل چکی تھی۔ اور جلوس پھر آگے روانہ ہو رہا تھا۔

"اُس کا شوہر!" لڑکے نوعمر تھے۔ ورنہ میری نسبت کس کو یہ گمان ہو سکتا تھا۔ کہ مَیں اُس کا شوہر ہوں دُنیا کے سمجھ بوجھ والے اگر کہیں یہ بات سُن پاتے تو انہیں بے اختیار اس پر ہنسی آ جاتی کیا اس لئے کہ میری آنکھیں سُرخ ہیں۔ میرے بال بکھرے ہُوتے ہیں۔ اور مَیں دیوانہ وار اُس کے جنازہ کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ تم نے مجھی کو اُس کا شوہر سمجھا؟ تمہیں ابھی یہ بات معلوم نہیں ہُوتی۔ کہ اس دُنیا میں محبت کے حقوق کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور اُس کا یہاں کسی چیز پر کسی قسم کا دعویٰ نہیں۔ دولت اور جاہ و حشم اور نام و نمود کے مقابلہ میں محبّت کی حقیقت ہی کیا ہے؟ وہ ایک ملکہ ہے اور مَیں ایک غریب مُدرّس۔

آخر ہم نمتولا بھی پُہنچ گئے۔ صندل کی لکڑی سے بہت بلند چِتا تیار کی گئی تھی۔ اُس کا جسم چِتا پر رکھ دیا گیا ہاں! اب یہ تبسّم کیسا ہے؟ کیا تم آسمانوں کی ملکہ ہو۔ جو یہاں جلاوطن ہو کر آئی تھیں۔ اور اب اپنے اصلی گھر کو واپس جا رہی ہو۔ کیا کسی دیوتا نے ناراض ہو کر تمہیں بددُعا دی تھی۔ جس کے باعث تمہیں ہماری اس زمین پر آنا پڑا۔ شاید یہی وجہ تھی۔ کہ جبتک تم ہمارے ساتھ رہیں۔ مَیں نے کبھی تمہارے لبوں پر تبسّم نہ دیکھا تھا۔ اور آج جبکہ موت کا دیوتا تمہیں عروسِ نو بناتے۔ تمہارا خیر مقدم کر رہا ہے تم مُسکرا رہی ہو

آگ سُلگا دی گئی۔ اس کے سیاہ بالوں کے درمیان ہزاروں آتشیں اژدہا نمودار ہُوتے۔ جن کی درانتی سی زبانیں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ چاروں طرف پھرنے لگیں۔ مَیں نے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے ڈھانپ لیں اور وہاں سے بھاگ گیا۔

(۲)

جب مَیں ابتدائی امتحان سے فارغ ہو کر اوّل اوّل کالج میں داخل ہُوا۔ یہ بات میرے یا گھر کے کسی اور شخص کے وہم و گمان میں بھی نہ گزری تھی۔ کہ مجھے اپنی زندگی ایک تہی دست مدرس کی حیثیت میں بسر کرنی ہو گی۔ مَیں اپنے خاندان کا سرمایۂ ناز سمجھا جاتا تھا۔ امّاں کو خود تو کبھی سونے کا ایک بھی زیور نہ جڑا تھا۔ لیکن انہیں پُورا یقین تھا کہ اُن کی بہو کی آراستگی و تزئین کے لئے جواہر کار زیوروں کی کمی نہ ہو گی۔ اُن کے پیارے امر نے پہلے ہی امتحان میں وظیفہ حاصل کر لیا تھا۔ پھر اس بات میں شبہ کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی تھی۔ کہ کم از کم وہ ایک جج کے عہدہ پر تو ضرور ہی فائز ہو گا؟

مَیں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جج کا جو عہدہ میرے لئے مخصوص ہُوا تھا کس کے حصّہ میں آیا۔ البتہ جواہرات کے

زیور صرف میں نے کسی کے جسم پر دیکھ لیے۔ لیکن وہ میری بی بی نہ تھی۔

اماں کا ایمان آخر دم تک متزلزل نہ ہو سکا۔ وہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی دل میں یہ خیال نہ لا سکتی تھیں۔ کہ تقدیر اُن کے فریدِ روزگار فرزند کی محیّر العقول قابلیتوں کے ساتھ اس قسم کی بخیلانہ حق ناشناسی روا رکھ سکیگی۔

والد کو اپنے آبائی ترکہ میں ایک بوسیدہ و فرسودہ مکان ایک تالاب اور کئی محتاج اور غریب رشتہ دار ملے تھے۔ یہ لوگ ہمارے مکان سے فایدہ اُٹھانے اور ہم سے لیکر کھانے کے باوجود کبھی ذرّہ برابر بھی ہمارے ممنون نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ خود انہیں بھی یہ حقوق اپنے بزرگوں سے ترکہ میں پہنچتے تھے۔ اور ہمیں تو کبھی خواب میں بھی اُن سے اظہارِ امتنان کی توقع نہ ہوتی تھی۔ والد سخت جانکاہ محنت کے بعد کچھ روپیہ کما کر لاتے اور اماں اس محدود آمدنی میں مداخل و مخارج کا توازن قائم رکھنے کے لئے اور بھی زیادہ جانکاہی سے کام لیتیں۔ دوسرے لوگ فقط کھانے یا ہل من مزید کا نعرہ لگانے سے کام رکھتے تھے۔ میرے والدین کو کلکتہ میں میری تعلیم کے مصارف برداشت کرنے کی مقدرت نہ تھی لیکن اماں کو یہ بات کب گوارا ہو سکتی تھی۔ کہ اُن کا بیٹا اُس تعلیم و تربیت سے جو ایک رئیس کے شایانِ شان ہے۔ محروم ہو ہے پس

اُنہوں نے بہ خندہ پیشانی اپنا تھوڑا بہت زیور بھی اُتار کر میرے حوالہ کر دیا۔ اور اُسی کے بل بوتے پر میں اقلیم علم کی طرف قدم بڑھانے کی جرأت کر سکا۔ اُس زمانہ میں میرا خیال تھا۔ کہ میں ایک دن نہ صرف یہ زیور بلکہ اس کے علاوہ اس پر سود بھی ادا کرنے کے قابل ہو سکونگا۔ لیکن اماں کو اب زیور کی ضرورت نہیں۔ اور میں بھی اپنے دل کو اس خیال سے ڈھارس دے لیتا ہوں۔ کہ اگر وہ زیور پہننا چاہتیں تو میں نے بھی ضرور لوٹا دیا ہوتا۔

وہ تین منزل کا مکان جس کے مرطوب کمروں میں میں نے اپنے شباب کے ابتدائی ایام گزارے۔ ایک تنگ و تار کوچہ میں واقع تھا۔ یہی ہمارے کالج کے طلباء کا اقامت خانہ تھا۔ میرے بعض خوشحال ساتھی جن کے پاس روپیہ کی کمی نہ تھی۔ سیر و تفریح کی غرض سے تفریح گاہوں میں چلے جاتے تھے۔ لیکن وہ جو اپنے والدین کی تہی مایگی کے صدقہ میں میرے ہی شریک حال تھے بجز اسکے کہ اپنے ذی استطاعت ساتھیوں پر حقارت آمیز پھبتیاں کہدیا کریں۔ یا وقتاً فوقتاً "دنیا ئے دوں" کے متعلق گوناگوں بیش بہا اور معرکتہ الآرا خیالات کا اظہار کر دیا کریں۔ تفنّنِ طبع کا اور کوئی سامان نہ رکھتے تھے۔ امرا ایک دفعہ دار السلطنت کی زندگی کے لطف سے آشنا ہو کر اپنے دیہاتی گھروں کو آسانی سے بھول سکتے ہیں۔ لیکن

میرے لئے جس کے اوقات کا زیادہ حصّہ کتاب ہاتھوں میں لئے ایک تنگ حجرہ میں گزرتا تھا۔ یہ بات اس قدر آسان نہ تھی۔ مجھے اپنے گھر کی آزادی اور بے فکری کی زندگی کی یاد ہمیشہ بے قرار رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کلکتہ میں ایک عرصہ تک مقیم رہنے کے باوجود میری طبیعت میں کوئی تغیّر واقع نہ ہوا۔ مَیں آخر تک پورا دیہاتی رہا۔ اور گرد و پیش کے اثرات میری توجہ کو بہت کم جذب کر سکے۔

چند سال اسی طرح گزرے۔ آخر ایک دن چمڑے کا ایک چھوٹا سا صندوق جو میری کُل دُنیوی متاع کا گنجینہ دار تھا۔ ہاتھوں میں لئے تھکا ماندہ ہوڑہ کے اسٹیشن پر پہنچا۔ اب مَیں امتحان سے فارغ ہو چکا تھا۔ مَیں گاڑی میں بیٹھ گیا امّاں کے زیور نے یہاں تک تو میرا ساتھ دیا۔ لیکن اب میری جیبیں خالی ہو چکی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ امتحان میں کامیاب ہونے پر ملازمت اختیار کر لوں۔ اور اپنے طور پر ایم۔ اے کی تیاری کے لئے مطالعہ بھی جاری رکھوں۔ گاڑی میں میرا تمام وقت اسی قسم کے خیالات میں گزرا۔

شام کے قریب مَیں اپنے گاؤں پہنچا۔ ہمارا گاؤں اسٹیشن سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر تھا۔ لیکن تاریکی پھیل چکی تھی۔ اور نگاہ اس قدر کم فاصلہ پر بھی کام کرنے سے عاجز تھی لیکن چشم تصوّر نے میرا ساتھ دیا۔ اور مَیں نے اپنے مکان کا نقشہ صاف صاف دیکھ لیا۔ اس وقت امّاں ہاتھوں میں چراغ اُٹھائے مقدس تلسی کے سامنے جھک رہی ہونگی اُن کے بال گھونگٹ میں سے نکل نکل کر زمین پر گر رہے ہونگے۔ میرے چھوٹے بہن بھائی دادی امّاں سے کہانی سُننے کے لئے مچل رہے ہونگے۔ شام کے تاریک آسمان کے مقابلہ میں باورچیخانے کی گھاس پھونس کی چھت کا نقشہ بہ آسانی آنکھوں کے سامنے کھنچ سکتا تھا۔ شاید میری چچی چولہے کی تپش کی تاب نہ لا کر برآمدہ میں اِدھر اُدھر ٹہل رہی ہونگی۔ اور میرا چھوٹا بھائی پروبودھ مطالعہ کے لئے بیٹھ چکا ہوگا۔

میرے خیر مقدم کے لئے سب باہر نکل آئے۔ امّاں جب مجھ سے ملتیں۔ اُن کے چہرہ پر رنگ تبسّم جھلکنے لگتا۔ لیکن اس مرتبہ اُن کی مسرت اور بھی زیادہ تھی۔ تا کہ گھر میں کسی بات کے متعلق غیر معمولی ہیجان و اضطراب پیدا ہو رہا تھا اور مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس ہیجان و اضطراب میں ایک خوشگوار راز پنہاں ہے۔ بنگال کے غریب دیہاتیوں کی افسردہ زندگی کا تکلیف دہ سکون ایسا لا متناہی ہوتا ہے کہ عمر بھر میں عموماً دو ہی چار ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ جن کا ہنگامہ خیز تنوع ایک قلیل مدت کے لئے اسے توڑ سکتا ہے۔ اس لئے مجھے اس بات سے مطلع ہونے کیلئے زیادہ عرصہ تک منتظر نہ رہنا پڑا۔ کیونکہ میرے چھوٹے بہن بھائی

خود مجھے اطلاع دینے کے لئے سراپا اضطراب تھے معلوم ہوا کہ میری شادی کے لئے سلسلہ جنبانی کی جارہی تھی۔ اور ایک دلہن کا انتخاب بھی عمل میں آچکا تھا اُس کا باپ بالکل مفلس اور نادار تھا۔ لیکن حسن وجمال کے اعتبار سے وہ اطراف واکناف میں یکتا شمار کی جاتی تھی۔ اماں یہ رشتہ قبول کرنے کے لئے ہر طرح سے آمادہ تھیں۔ انہیں جہیز وغیرہ کی پرواہ نہ تھی۔ وہ اُس کے حُسن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ جب اُن کا بیٹا ایک دن جج ہونے والا تھا۔ تو وہ کیوں اس کے لئے کوئی ایسی دلہن بیاہ کرلاتیں۔ جو متمول تو ہوتی۔ لیکن جس کی صورت بھی دیکھنے کو جی نہ چاہتا۔ تقریباً تمام معاملات طے ہوچکے تھے۔ اب صرف دلہن کو دیکھنے کے لئے رسمی طور پر جانا اور والد کو مطلع کرنا باقی تھا۔

شاید اس بات پر تعجب کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ والد کاروبار کے باعث سال کا بیشتر حصّہ گھر سے باہر گزارتے تھے۔ اماں خود تو لکھنا جانتی نہ تھیں۔ اس لئے گھر کے معاملات سے اُن کو باخبر رکھنے کا فرض پرو بودھ کے ذمہ تھا۔ لیکن اس معاملہ پر اماں پرو بودھ پر اعتبار نہ کرسکتی تھیں۔ اس کے لئے ایسے اہم معاملہ کی اطلاع کے فرض سے بوجہ احسن عہدہ برا ہونا محال تھا۔ اماں کو ڈر تھا کہ اس کی تحریر سے والد کہیں انہیں کوتاہ فہم سمجھ کر طیش میں نہ آجائیں۔ اور بنی بنائی بات بگڑ نہ جائے۔ اس لئے وہ نہایت صبر کے ساتھ والد کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ تاکہ اپنی زبانی انہیں تمام حالات سے آگاہ کردیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور والد کو اپنے نقطۂ نگاہ سے متفق کرلینگی۔

والد کے آنے میں ابھی چند روز باقی تھے۔ لیکن دُلہن کو دیکھنے کے لئے جانے میں کسی قسم کے توقف کی ضرورت نہ تھی۔ اس تقریب کے لئے ایک یوم سعید کا تقرر عمل میں آیا۔ اور اُس دن میں نے پرو بودھ اور اپنے دو دوستوں کو ساتھ لیکر اُس گاؤں کا رُخ کیا۔ اماں نے شادی کے متعلق ہم لوگوں کے نوزائیدہ خیالات کا احترام کرتے ہوئے مجھے وہاں بھیجنے میں کسی قسم کا تامل ظاہر نہ کیا۔

ہم لوگوں سے دو باتیں کہی گئی تھیں۔ پہلی یہ کہ لڑکی کا باپ مفلس ہے۔ دوسری یہ کہ لڑکی نہایت خوبصورت ہے پہلی بات کی تصدیق تو گھر میں داخل ہوتے ہی ہوگئی۔ جس کمرہ میں ہم لائے گئے۔ اس میں صرف دو پرانے پلنگ تھے۔ جن پر پھٹی پرانی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ گھر کا مالک اور اُس کے چند رفقا اپنے خلق اور انکسار اور فروتنی سے اس افلاس کی تلافی کے لئے انتہائی کوشش صرف کر رہے تھے۔ لیکن وہ جس کی ذات ان تمام عیوب کی پردہ پوش ہو جاتی۔ ابھی تک پردۂ خفا میں تھی۔ صاحب خانہ ہم سے رخصت لے کر وقتاً فوقتاً دوسرے کمرہ میں چلا جاتا۔ اس

سے ہمیں معلوم ہوتا۔ کہ ابھی دُلہن کو اس اہم تقریب کے لئے لباس پہنایا جا رہا ہے۔ دفع اوقات کے لئے کچھ دیر تک ہم تفریح کے طور پر اکل و شرب میں مصروف رہے۔ لیکن اب میرا صبر و قرار زیادہ انتظار کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ میں مضطرب تھا کہ آخر اس تکلیف دہ تمہید کا سلسلہ کہاں تک طول کھینچتا جائیگا۔ آج کل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے پہلے شادی کرنا قرینِ دانش خیال نہ کرتا تھا۔ لیکن دُلہن کے ہوش ربا حسن کی جس اطلاع نے میرے اس اصول کے پرخچے اڑا دیتے اُس کی تصدیق ابھی باقی تھی۔ اس لئے میرا اضطراب کچھ بے جا نہ تھا۔

دفعتاً برابر والے کمرہ میں مجھے عورتوں کی آمد کا علم ہُوا۔ زیور کی دھیمی جھنکار کپڑوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ اور اسی قسم کی دوسری غمّاز صدائیں کانوں میں آ رہی تھیں۔ ٹھیک اس وقت جبکہ شفق کے دلفریب سُرخ اور سنہرے رنگ دُنیا کے سالخوردہ چہرہ پر ایک مسحور کر دینے والی نقاب ڈال رہے تھے۔ دروازہ کھُلا اور ایک نوخیز لڑکی کمرہ میں داخل ہُوئی۔

ہماری پہلی اطلاع کو جو لڑکی کے باپ کی مفلسی کے متعلق تھی۔ ہماری تصدیق سے بہت تقویت حاصل ہو چکی تھی لیکن اب دوسری اطلاع کی صداقت میں بھی کلام نہ رہا شاید اس تقریب کے لئے اس نے کچھ روپیہ قرض لیا ہو۔

لیکن اس کا قدرتی حسن اس طرح جلوہ پاشی کر رہا تھا۔ کہ اُس کی ہوش رُبا تجلیوں کے سامنے دوسری چیزیں خود بخود نظر انداز ہُوئی جاتی تھیں۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا۔ کہ وہ اس تنگ جھونپڑے میں پیدا ہوئی ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اُس وقت اگر وہ کسی محل میں بھی ہوتی تو اُس کا حُسن اس قدر حیرت افزا نہ ہو سکتا۔ مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ چشم زدن میں شفق کے تمام نورانی جلوے میری مسحور نگاہوں کے سامنے آگئے۔ اور زہرہ کی تابانیاں آسمانوں سے اُتر کر اُس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں آگئیں۔

مجھے بتایا گیا تھا۔ کہ لڑکی ابھی محض بچّی ہے۔ اور اُس کی عمر گیارہ بارہ سال سے زیادہ نہیں۔ لیکن دیکھنے پر مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ایک غلط بیانی تھی جس پر اُس کے والدین قدیم خیالات کی پاسداری کے لئے مجبور ہوتے تھے۔

میرے ایک دوست نے لڑکی سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب میں کہا۔ "سراپا" اُس کی آواز نے دوسروں کو فقط اُس کا نام بتایا۔ لیکن اس سے مجھ پر یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی۔ کہ اس کے عارضِ درخشاں کی طرح اُس کا ضمیر بھی روشن ہے۔

آخر لڑکی سامنے سے ہٹالی گئی۔ اور اُس کے باپ کو اطلاع دی گئی کہ اُس کی بیٹی امتحان میں پُوری اُتری ہے

جب ہم سڑک پر واپس گھر کو جا رہے تھے۔ شفق غائب ہو چکی تھی لیکن میرا دل ابھی تک ایک نورانی شفق کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔

دلہن کے متعلق ہماری رائے سنکر اماں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور پربودھ تمام دن گھر کی لڑکیوں کے سامنے اس کے حلیہ کی کیفیت بیان کرتا رہا۔ لیکن اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرتیں۔ تو شاید میں انہیں مایوس کر دیتا۔ اس کے حسن کی تشریح سے میری زبان عاجز تھی۔ اس کی نورانی تصویر سے میرا دل تو یقیناً کسبِ فروغ کر رہا تھا لیکن اگر میں دوسروں کو بھی اپنے اس تصور میں شریک کرنا چاہتا۔ تو اس کے لئے میرے پاس الفاظ مطلق موجود نہ تھے۔

جہانتک میرا خیال ہے شادی کا مسئلہ بڑی حد تک طے شدہ قرار دیا جا چکا تھا۔ کیونکہ ہمارے گھر میں روز بروز غیر معمولی سرگرمی اور مستعدی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ان دنوں میرا قلب اور میرے خیالات تمام اس کبھی نہ بھولنے والی شفق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور میں بے قرار دل کے ساتھ ایک اور ویسی ہی سہانی شام کا انتظار کر رہا تھا۔ جو پہلی شام کے کام کو تکمیل تک پہنچانے والی تھی۔ اس اضطراب میں میں امتحان کے نتائج کے متعلق بھی اپنے تمام افکار فراموش کر چکا تھا والد ناگاہ اور غیر متوقع طور پر گھر پہنچ گئے۔ اماں نے بکمالِ احتیاط انہیں تمام معاملہ کی اطلاع دی۔ اور سرآما کی گوناگوں خوبیوں کی مدح سرائی میں اپنی تمام قوتِ گویائی صرف کر دی۔ لیکن والد کو جل دینا ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ وہ حسن کے مقابلہ میں دولت کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے اس رشتہ پر قطعاً نارضامندی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد کچھ دن تک ہمارے گھر میں بحث اور تکرار اور شکر رنجیوں کا دور دورہ رہا۔ اور میرے دل کے وہ تمام نشاط آہنگ نغمے اس نافرجام خانگی جھگڑے سے مغلوب ہو کر دفعتاً دب گئے۔

اماں کا آخری حربہ آنسو تھے۔ وہ دلہن کے باپ کو اپنا قول دے چکی تھیں۔ اب انکار کیونکر ممکن تھا؟ اس میں ان کی سخت خفت تھی۔ والد کا دل ان کو پریشانی کی حالت میں دیکھ کر کسی قدر پسیج تو گیا۔ لیکن اتنا نہیں جس سے کوئی کام نکل سکتا۔

آخر اس تماشا گاہ میں والد کے چچیرے بھائی چچا مادھو رام نمودار ہوئے۔ اور انہوں نے ہماری رہبری کا کٹھن فرض اپنے ذمہ لیا۔ انہوں نے اماں سے کہا۔ "بہن بس اب تم خاموش رہو۔ میں چند لمحوں میں سب کچھ طے کئے لیتا ہوں۔ میرے بھائی مزاج کے بہت ہٹیلے ہیں وہ تو ہر بات کی مخالفت کیا کرتے ہیں۔" مجھے معلوم نہیں، چچا مادھو رام نے والد سے کیا کہا تھا۔ بعد میں البتہ میں نے

کچھ اِدھر اُدھر قیاس دوڑاتے۔

آخر وہ ساعت سعید بھی آپہنچی۔ اماں کے چہرہ پر مسرت کے پھول کھل رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے خوش خوش رخصت کیا۔ ہمارے گھر میں اعزّہ و احباب کا جمگھٹا تھا۔ وہ سب اُس دلہن کو دیکھنے کے لئے جو اس قدر سراہی جا چکی تھی۔ بے صبری کے ساتھ منتظر تھے۔ اور میں ایک فاتح سپہ سالار کی طرح نازاں تھا۔ گویا سراپا کا حسن بھی میرا ہی کوئی کمال تھا۔

دونوں گاؤں ایک دوسرے سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع نہ تھے۔ اس لئے ہم غروب آفتاب سے کچھ عرصہ قبل ہی وہاں پہنچ گئے۔ راستہ میں والد اور چچا را دھارام کا تمام وقت سرگوشیوں میں کوئی مشورہ کرتے گزرا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اُن کی گفتگو سُن سکتا تھا لیکن اس وقت مجھے یکسوئی حاصل نہ تھی۔ اور میری توجہ کسی بات پر نہ جم سکتی تھی۔ اِس مفلس گھر سے کسی کو زیادہ دھوم دھام یا تکلفات کی توقع تو نہ تھی لیکن جو تھوڑی بہت توقع تھی۔ وہ بھی پوری نہ ہوتی وہاں فقط دلہن کے چند اعزّہ و اقربا موجود تھے۔ روشنی کے لئے صرف دو تین مشعلیں جل رہی تھیں۔ اور صحن میں ایک پھٹا پرانا میلا کچیلا شامیانہ نصب تھا۔

لیکن ہمارا خیر مقدم بہت تپاک اور گرمجوشی سے کیا گیا۔ والد اور چچا نہایت متین اور سنجیدہ چہروں کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئے۔ دلہن کا باپ اپنے معزّز مہمانوں کی تواضع اور مدارات کے لئے ہاتھ باندھے اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔

پھر مجھے ایک اندرونی کمرہ میں لے گئے۔ جو عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں مسرت و شادمانی کے حقیقی آثار ہویدا تھے۔ ہم مردوں کو خوش ہونے کے لئے ہر قسم کا سامان درکار ہوتا ہے۔ لیکن خوشی عورتوں کے پاس خود بخود اس طرح کھنچی چلی آتی ہے۔ کہ وہ ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی خوش رہ سکتی ہیں۔

دلہن کو جب باہر مردوں میں لاتے میں نے نگاہ اُوپر اُٹھائی۔ لیکن میں بجز اس کے سُرخ ریشمی لباس کے اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ اگرچہ رسم و رواج کی ظاہری نمائش کے بعد علی رؤس الاشہاد وہ مجھے اب ملنے والی تھی لیکن اپنے خیال کے مطابق مجھے وہ پہلے ہی کسی شفق کی لالہ رنگ جلوہ پاشیوں سے ارمغان مل چکی تھی۔ وہ جس نے ایک سکوت افزا شام کو میرے دل میں چوری چوری اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اب پھر اس چراغاں اور شور و غل کے درمیان میرے پاس آرہی تھی۔

جس وقت وہ باہر لائی گئی۔ والد اور چچا نے فوراً اُٹھ کر اس کا سر سے لیکر پاؤں تک بغور معائنہ شروع کر دیا۔ آخر میرے چچا نے چلّا کر کہا۔ "دلہن کا زیور کہاں ہے؟ باہر لاؤ۔ تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں۔"

دُلہن کے باپ نے رُکتے رُکتے جواب دیا۔ "بس زیور اسی قدر ہے جو اُس نے پہن رکھا ہے۔ مجھ سے بمشکل اسی قدر بن پڑا۔"

میرے چچا کے لبوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ نظر آئی اور تھوڑی سی خاموشی کے بعد اُنہوں نے پھر سلسلۂ کلام یوں جاری کیا۔ "بیشک ہنسی ٹھٹھے اور مذاق کا نہیں حق حاصل ہے۔ ہمارا رشتہ اس کی اجازت دیتا ہے لیکن معاملہ کی بات پہلے طے ہو جانی چاہیئے۔ اچھا جاؤ اب زیور باہر لاؤ۔ ذرا رسوم سے فراغت حاصل ہو لینے دو۔ اُس کے بعد دل کھولکر مذاق کر لینا۔"

دُلہن کے باپ نے انتہائی عاجزی سے اپنے ہاتھ جوڑ لئے اور کہا۔ "اس سے زیادہ کی مجھے مقدرت نہیں مہربانی کیجئے اور اسی کو قبول کر کے ایک غریب آدمی کو تباہی سے بچا لیجئے۔"

تبسّم چچا کے چہرہ سے غائب ہو گیا۔ اُنہوں نے بآواز بلند کہا۔ "اچھا تو گویا تم ہم سے چھل فریب کھیلنا چاہتے ہو۔ تم یہی غنیمت نہیں سمجھتے۔ کہ تمہیں ایک پیسہ نقد دئے بغیر ایسا دُولہا مل گیا ہے۔ بلکہ اب تم اُس کے سر وہ دُلہن منڈھنا چاہتے ہو۔ جس کے جسم پر سونے کا ایک تولہ بھی نہیں۔ دُولہا کی گھڑی اور زنجیر کہاں ہے؟ اگر تمہیں اپنی بیٹی کی خیر منظور ہے تو فوراً زیور اور تحفے تحائف حاضر کرو۔ ورنہ ہم دُولہا کو ابھی یہاں سے لے جائینگے۔

لڑکی کے باپ نے والد کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ اور عاجزی سے گڑگڑا کر کہا۔ "خُدا کے لئے مجھے بچا لو۔ رحم سے کام لو۔ اور ایک غریب برہمن کو تباہ و برباد نہ ہونے دو۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اسی قدر زیور کافی ہوگا۔"

اس پر والد خاموش رہے۔ لیکن میرے چچا نے چلّا کر کہا۔ "تم سے کس نے کہا تھا۔ ہمیں اس کا مطلق علم نہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ جب ہم نے تم سے ایک پائی بھی نقد نہیں لی۔ تو کم از کم تم دُلہن کو تو سونے کے زیور سے آراستہ کر دو گے۔ اور دُولہا کو واجبی طور پر تحائف پیش کرو گے کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمیں اپنے لڑکے کے لئے اور دُلہن نہیں مل سکتی؟"

دفعتاً فریقِ ثانی میں سے ایک شخص نے بآواز بلند کہا۔ "کسقدر اُجڈ اور گنوار ہیں۔ اب اس نازک ساعت میں اپنے وعدوں سے روگرداں ہو کر ایک غریب آدمی کو تباہ کرنے کے حیلے تراش رہے ہیں!"

اس پر ہماری جماعت نے شور و غل کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ "خوب پہلے تم نے ہمیں دھوکا دیا! اور اسکے بعد ہماری توہین کرتے ہو؟ اُٹھو! اُٹھو!! ایک لحظہ کیلئے بھی کوئی شخص یہاں نہ ٹھہرے!"

ہماری جماعت ایک تند جھکڑ کی طرح نکل کر گھر کو خالی کر چکی تھی۔ دو آدمی مجھے جبراً اپنی جگہ سے اُٹھا کر گھسیٹتے ہوئے کمرہ سے باہر لے گئے۔ اس طوفانِ بدتمیزی میں دو تین چراغ بھی گر کر ٹوٹ گئے۔ عورتوں کے کمرہ سے رونے پیٹنے کی آوازیں بلند ہو کر مردوں کے بے پناہ شور و غل کے ساتھ ملنے لگیں۔

دِن بھر مَیں نے کچھ نہ کھایا تھا۔ میرے تمام قویٰ تکان محسوس کر رہے تھے۔ اس پر اس حادثہ نے میری رہی سہی طاقت بھی سلب کر لی۔ اگرچہ اُس وقت میرے حواس بجا نہ تھے۔ لیکن پھر بھی مَیں سرآما کو ایک آخری بار دیکھنے کے لئے مُڑا۔ وہ اپنی جگہ پر بالکل سیدھی ہو کر بیٹھی تھی۔ نقاب اُس کے چہرہ سے اُلٹ چکی تھی۔ اُس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے مجھ پر ٹکٹکی جما دی۔ اور ایک ثانیہ کے لئے ہم دونوں کی آنکھیں مِل گئیں۔ اُس کے بعد مَیں گھر سے باہر تاریکی میں تھا۔

سواری کی گاڑیاں کچھ فاصلہ پر ہمارے انتظار میں کھڑی تھیں۔ گاڑی والے یہ سمجھ کر کہ ابھی بہت دیر تک اُن کی ضرورت نہ ہوگی۔ اِدھر اُدھر چلے گئے تھے۔ جوش کی حالت میں سب لوگ جھنجھلاتے اور چیختے چلّاتے تھے خصوصاً والد اور چچا نے تو آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ صرف میرا بھائی پردبودھ خاموش اور غمگین نظر آتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے حواس کا انتشار کچھ کم ہوا اور مَیں نے سوچا کہ مَیں نے کیا کر دیا؟ مَیں نے انہیں کیوں اجازت دی کہ اس وحشی پن میں مجھے اپنا آلۂ کار بنائیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ مَیں تاریکی کے پردوں کے پار سے سرآما کی گھبرائی ہوئی غم آلود آنکھیں دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ مجھے ملامت کر رہی ہے۔ اس خیال نے میری قوتِ عمل کو تحریک دی۔

ابھی لوگ چیخنے چلانے اور گالیاں دینے میں مصروف ہی تھے کہ مَیں چپکے سے نکل گیا۔ والد اور چچا اور اُن کے جوش و خروش کا خیال میرے ذہن سے بالکل اُتر چکا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں سرآما کے گھر کے پاس پہنچ گیا وُہ شور و غل اب رفع ہو چکا تھا۔ عورتوں کے رونے کی آواز بند تھی۔ جب مَیں دروازہ کے نزدیک پہنچا۔ دو تین آدمی گھر سے نکلے۔ اُن کے چہروں سے دلچسپی اور اطمینان کے آثار مترشح تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ "بھئی انت بھلا سو بھلا۔ لڑکی کا ستارہ دیکھو۔ اس غریب بابو کے بیٹے کی بجائے اس کی قسمت جلیل القدر زمیندار پاربتی چرن رائے سے جا لڑی۔ وہ تھوڑے سے زیور کے لئے اتنی شورش برپا کر رہے تھے۔ اور لڑکی اب ہیروں اور موتیوں سے لد جائیگی۔"

ایک اور شخص نے کہا۔ "اس میں شک نہیں۔ کہ شوہر

ذرا بڈھا ہے۔ مگر جیبر مردوں میں عمر کا سوال ہی کیا؟ میرا خیال ہے کہ بڈھا لڑکی کو دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا۔ اور یہ تمام کھیل صرف اپنی مقصد براری کے لئے کھیلا۔ تم نے دیکھا نہیں؟ اسی نے تو دولہا کے باپ کی اہانت کی تھی۔" اس کے بعد وہ مجھ سے دور نکل گئے۔

جس وقت میں واپس اپنے ہمراہیوں میں پہنچا گاڑی والے بمشکل جمع ہو چکے تھے۔ اس کھلبلی میں کسی کو میری غیر حاضری محسوس نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم واپس گھر پہنچ گئے۔

دوسرے ہی دن میں پھر کلکتہ روانہ ہوگیا۔ اماں بہت روئیں۔ لیکن اُن کے آنسو میرے ارادہ میں حائل نہ ہوسکے۔ امتحان میں بھی میں کامیاب تو ہوگیا۔ لیکن آئندہ کے لئے تعلیم کے متعلق میں نے اپنے تمام ارادے فسخ کر دئے۔ اور ملازمت اختیار کرلی۔

(۴)

اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ کچھ مدت تک تمام کنبہ گاؤں والے مکان ہی میں مقیم رہا۔ اور میں دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد کسی نہ کسی طرح سے اُن کے نان و نفقہ کا سامان کرتا رہا لیکن یہ کام تنہا میرے لئے بہت زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ میرے ذمہ اپنے بھائیوں کی تعلیم کے مصارف کی کفالت بھی تھی۔ چنانچہ بالآخر گاؤں کا مکان خالی ہوگیا۔ اماں اور چھوٹے بچے تو میرے پاس کلکتہ آگئے۔ اور وہ غریب رشتہ دار بھی جہاں کہیں ان کے سینگ سمائے چلے گئے۔ ہم لوگ تو اب انہیں اپنے پاس رکھنے کے قابل نہ تھے۔

ہمارا گاؤں کا مکان اگرچہ پرانا ہو چکا تھا لیکن فراخ اور روشن اور ہوادار تھا۔ کلکتہ میں مکان کی تلاش کرتے کرتے ہماری جوتیوں کے تلے بھی گھس گئے۔ لیکن اس پر بھی جو مکان ہمیں ملا۔ اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی پھر بھی میرے پہلے مکان کے مقابلہ میں غنیمت تھا۔ اپنی بیوگی کی حالت میں اماں اگرچہ بہت کم خوش نظر آتیں لیکن پھر بھی انہیں کے دم سے مجھے یہ سیاہ خانہ آباد نظر آتا تھا۔

کہتے ہیں۔ کہ کلکتہ میں بڑی آبادی ہے لیکن وہاں دوست اور غمگسار تو کوئی نہیں ملتا۔ ہمارے غریبانہ مسکن کے چاروں طرف رفیع الشان قصر نما عمارتیں سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ ہم دروازوں پر دربانوں کو دیکھتے تھے۔ اُن کے آقاؤں کی موٹر گاڑیوں کا شور سنتے تھے۔ کبھی کبھی ان محلوں کے ساکنوں کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتے تھے لیکن ہمارے لئے یہ لوگ تماشے کی متحرک تصاویر سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ ہم انہیں زندہ مرد اور عورتیں نہ سمجھ سکتے تھے۔

ہمارا مکان ایک تنگ کوچہ میں واقع تھا۔ اُس کے
بالمقابل سنگ سُرخ کی ایک بہت بڑی عمارت کھڑی
تھی۔ جس کے ساتھ ایک باغ بھی ملحق تھا۔ بڑا دروازہ تو
سڑک کی طرف واقع تھا۔ لیکن پچھواڑے میں ملازموں
کی آمدورفت کے لئے ایک چھوٹا سا دروازہ ہماری
طرف کوچہ کے اندر بھی نکلتا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی اور
بہن نے بہت جلد باغبانوں سے بے تکلفانہ رسم وراہ
پیدا کرلی۔ اور وقتاً فوقتاً باغ سے پھول اور پھل لے کر
آنے لگے۔ مجھے اس گھر کے مالک کا مطلق علم نہ تھا اور
جن دریچوں کا رُخ ہمارے کوچہ کی طرف تھا وہ کبھی نہ
کھولے جاتے تھے۔

ایک دن مدرسہ سے واپس آنے پر میں نے دیکھا
کہ منّو اور تارا (میرے چھوٹے بہن بھائی) رو رہے ہیں۔
پُوچھنے پر معلوم ہُوا کہ اُس بڑے مکان میں خوشی کی کسی
تقریب پر بڑی دھوم دھام سے دعوت دی جانیوالی
تھی۔ مہمانوں کی مدارات کے لئے انواع واقسام کے سامان
ہو رہے تھے۔ اور ناچ اور گانے بجانے کی تیاریاں بھی
کی جا رہی تھیں۔ ناخواندہ مہمانوں کی حیثیت سے منّو اور
تارا بھی وہاں جانے پر ہمہ تن آمادہ تھے۔ اور امّاں شدومد
سے اُن کو روکنے پر تُلی ہُوئی تھیں۔ میں نے مصالحت
کی طرح ڈالی۔ اور اُنہیں پروبودمہ کے ساتھ عجائب خانہ
کی سیر کے لئے بھیج دیا۔

مدرسہ سے آکر ابھی میرے دماغ کی کوفت بھی
زائل نہ ہوئی تھی کہ میں اپنے شاگردوں کی معلّمی کے فرائض
انجام دینے کے لئے گھر سے نکلا۔ کوچہ میں نکل کر میں نے
دیکھا کہ بڑے زور کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ گھاس کے
سرسبز تختہ پر ایک بہت بڑا درباری شامیانہ ہزاروں
برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ جن کی روشنی اُس تمام نواح
میں شام کے دھندلکے کو کافور کر رہی تھی۔ محفلِ رقص میں
شریک ہونے والی نوجوان لڑکیوں پر گُل باری کرنے
کے لئے باغ کی تمام بہار لوٹ لی گئی تھی۔ متعدد ملازم اور
خدمتگار جلسہ کی تیاریوں میں مشغول اِدھر اُدھر پھر رہے
تھے۔ لیکن میں ان باتوں کو دیکھنے کے لئے زیادہ وقت
نہ صرف کر سکتا تھا۔ کیونکہ اقلیدس کا ایک سبق اور تین
لڑکے میرے منتظر تھے۔

جب میں واپس آیا۔ محفل خوب گرم ہو چکی تھی عورتوں
کی شیریں آوازیں شام کے سکوت کو توڑ رہی تھیں۔ اور تمام
ہوا پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ کوچہ میں تماشائیوں
کے ہجوم کی وجہ سے پاؤں رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ اور میں
بدقت تمام اپنا راستہ نکال سکا۔ قلیل وقفوں کے بعد یہ
لوگ موسیقی کی داد دینے کے لئے اپنے گلوں کی پوری طاقت
سے تحسین وآفرین کا شور مچا دیتے تھے۔ لیکن خود وہ لوگ

جو بطورِ خاص اس تقریب پر مدعو کئے گئے تھے۔ اس طرف کچھ زیادہ توجہ صرف نہ کرتے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے۔ کہ اُن میں سے اکثر کی عمر بھی ایسی چیزوں کی قدردانی کے زمانہ سے بہت تجاوز کر چکی تھی۔

چونکہ اس قدر ہجوم میں حرکت کرنا نہایت مشکل تھا۔ اس لئے مجھے مجبوراً کچھ دیر کے لئے رُکنا پڑا۔ تمام عمارت پر قطار در قطار شمعیں روشن ہو رہی تھیں۔ اور کمرے برقی روشنی سے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ تمام دروازے اور دریچے کھُلے تھے۔ اور روشنی کا ایک طوفان باہر کی تاریکی کو بہاتے لئے جا رہا تھا۔

دفعتاً میری آنکھیں فرطِ حیرت سے کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ وہ یہاں کہاں؟ یہ عجیب پُراسرار مکان کس طرح اُس آتشیں حسن کی جلوہ گاہ ہو گیا۔ جس سے میرا دل اسقدر آشنا ہے؟ اور پھر اسقدر قریبی ہمسائگی کے باوجود مجھے ابتک اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ دریچے کے بالمقابل کھڑی تھی۔ اُس کا شاہانہ انداز دیکھ کر اُس پر آسمانوں کی ملکہ کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن مَیں نے اس کو پہچان لیا۔ وہ سرآما تھی اگرچہ مَیں نے اُس کو آخری بار اُس کے باپ کے جھونپڑے میں دیکھا تھا۔ اور اب وہ ایک قصر میں تھی۔ اگرچہ اُس سادہ لباس کی جگہ اب یاقوت و مرجان کی چمک سے اس کا جسم جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اور اُس کے چہرہ کی وہ پہلی نرمی اب ایک سنگِ مرمر کے مجسمہ کی سختی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لیکن مَیں دھوکا نہ کھا سکا۔ اُس کی چمکنے والی آنکھوں میں اب وہ پہلی سی سادگی اور بھولا پن نہ رہا تھا۔ لیکن یقیناً وہ وُہی تھی۔ چند لمحوں تک وہ نیچے باغ کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں سے سخت آزردگی اور بیزاری مترشح تھی۔ اُسکے بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔ اور کھڑکی زور سے بند ہو گئی۔

ایک شخص سے میں نے پُوچھا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟

مجھے جواب دیا گیا کہ آج راجا پاربتی چرن رائے کے خورد سال پوتے نے پہلی دفعہ اناج مُنہ لگایا ہے۔ اس خوشی میں اُس نے اپنے دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ وُہ دیکھو۔ راجا کا بڑا بیٹا وہ سامنے کھڑا ہے۔ مَیں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی نظر آیا۔ وہ قوی ہیکل اور تنومند تھا۔ اُس کا رنگ گورا تھا۔ اور سر پر بال نہ ہونے کی وجہ سے اس کی چاند چمک رہی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس سے سرآما ماں کا رشتہ رکھتی تھی۔ پھر مَیں نے سوال کیا۔ راجا خود کہاں ہے؟ اس پر وہ شخص بولا "صاحب خدا کا نام لیجئے راجا یہاں کہاں۔ آپ جانتے نہیں وہ فالج کے مرض کے باعث دو تین سال سے صاحبِ فراش ہے۔ اور ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہیں؟"

جن شعلوں کی چمک میں نے سرآما کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اب وہ میرے دل میں بھی بھڑک اُٹھے مَیں کسی نہ کسی

طرح سے راستہ نکالکر اپنے گھر پہنچا۔ لیکن تمام رات محفل کا شور غل اور بدمست مہمانوں کی بلند اور مکروہ چیخیں میرے کانوں میں آتی رہیں۔

اس سے قبل میں اُس سُرخ عمارت کو بالکل غیر آباد سمجھتا تھا۔ اب چونکہ مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ درحقیقت ایک کھڑکی کسی کسی وقت کھلتی تھی۔ کبھی اُس میں کوئی ماما اور کبھی کوئی بچہ کھڑا نظر آتا۔ لیکن وہ جس کی ایک جھلک کے لئے میری نگاہیں ہر وقت کھڑکی پر جمی رہتی تھیں۔ صرف ایک بار نظر آئی۔ وہ وہاں کھڑی بغور ہمارے مکان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس وقت مجھے خیال آیا۔ کہ خدا جانے اُسے علم بھی ہے یا نہیں؟

لیکن اگر ہوتا بھی تو پھر کیا ہوتا؟ وہ اب ایک رانی تھی اور میں ایک غریب محنت کش مدرس۔ مگر یہ بات بہ ہزار مشکل بھی میرے دل سے نہ نکلتی تھی۔ کہ اس تمام بدبختی کا ذمہ دار خود میں ہوں۔

زمانہ گزرتا گیا۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ پرَبودھ اب ایم۔ اے ہوچکا تھا۔ اور اماں اُس کے لئے کسی اچھے رشتہ کی تلاش میں تھیں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہُوا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا۔ کہ اس دفعہ میرمجلسی کے فرائض انجام دینے کی چچا راودھارام سے درخواست نہ کی جائیگی۔

کئی لڑکیوں کے متعلق بات چیت ہوئی لیکن کسی خاص کے متعلق فیصلہ نہ ہوسکا۔ بعض لڑکیوں کو اماں پسند کرتیں۔ لیکن پرَبودھ رضامند نہ ہوتا۔ اور بعض کو پرَبودھ پسند کرتا۔ لیکن اماں رضامند نہ ہوتیں۔ ہمارے ایک ہمسایہ کی لڑکی کنواری تھی۔ اُس کے متعلق بھی ہمیں خیال پیدا ہُوا اُس کا باپ غریب تھا۔ لیکن اگر لڑکی خوبصورت ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر چونکہ وہ سیدھی سادی تھی۔ اماں نے یہ رشتہ پسند نہ کیا۔

یہ زمانہ بیساکھ کے وسط کا تھا۔ اور اگرچہ مدرسہ موسم گرما کی تعطیل کی وجہ سے بند ہوچکا تھا۔ لیکن میرے خانگی شاگرد ابھی تک کلکتہ میں موجود تھے۔ اور میں صبح وشام انہیں پڑھانے کے لئے جاتا تھا۔ اُس دن دوپہر کی تیز دھوپ بدن کو جھلس دینے والی تھی۔ اور مجھے باہر جانا بالکل گوارا نہ تھا۔ لیکن بایں ہمہ اتالیقی کے فرائض انجام دینے کے لئے جانا ضروری تھا۔ اسی رات ہمارے ہمسایہ کی اس سیدھی سادی لڑکی کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ اس تقریب سعید کے مصارف کے لئے باپ کو اپنے مکان رہن رکھ کر روپیہ قرض لینا پڑا۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ جو اماں کے برخلاف دولت کو حسن پر ترجیح دیتے تھے۔ کوچہ سے نکل کر میں نے دیکھا کہ وہ اپنے مکفول مکان کو گیندے کے پھولوں اور دیودار کے پتوں سے آراستہ کر رہے ہیں۔ سامنے کے برآمدہ میں چند

پیشہ ور مطرب اور مُغنی گانے بجانے میں مصروف تھے اور محلہ کے چھوٹے چھوٹے بچے جمع ہو کر ان کے میٹھے سُروں کو نہایت توجہ سے سُن رہے تھے۔ نَنتو اور تارا بھی اپنے بہترین لباس میں پہلے ہی سے وہاں پُہنچ چکے تھے۔ مَیں اور پروبودھ بھی مدعو کئے گئے تھے۔ اور ہمارا ارادہ تھا۔ کہ شام کو ذرا دیر سے وہاں پہنچیں۔ جس وقت مَیں کوچہ میں سے گُزر رہا تھا۔ مَیں نے سُرخ عمارت کے پچھواڑے کا دروازہ کُھلتا دیکھا۔ جہاں سے ایک خادمہ ریشمیں کپڑے پہنے چند تحائف اُٹھائے نکلی۔ اُس کے ساتھ زمیندار کے خاندان کا ایک بچہ تھا۔ وہ اُس غریب آدمی کے گھر کو اپنی آمد سے سرفراز کرنے جا رہے تھے۔ جس کی توقع بڑوں سے نہ ہو سکتی تھی۔ چونکہ وقت زیادہ ہو چکا تھا اس لئے مَیں تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا گیا۔

لڑکوں کو پڑھا کر مَیں نے واپس گھر کی راہ لی۔ اس وقت تک بازاروں میں روشنی ہو چکی تھی۔ اس لئے گھر جانے کی بجائے میں سیدھا اپنے ہمسایہ کے مکان پر چلا گیا۔

لیکن مَیں نے ایک عجیب حالت دیکھی۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ مَیں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنی زندگی کی اُس ہمیشہ یاد رہنے والی رات کا نقشہ کھنچا ہُوا تھا۔ دُولہا کے ہمراہیوں کا وہی وحشیانہ شور وغل، دُلہن کے متعلقین کی طرف سے وہی عاجزانہ التجائیں اور عورتوں کے کمرہ سے وُہی رونے پیٹنے کی آوازیں سُنی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد مجھے یاد آگیا کہ بنگال میں یہ واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

جب مَیں وہاں پُہنچا۔ تماشا اپنے آخری کھیل تک پُہنچ چکا تھا۔ دُولہا اور اُس کے براتی چلاتے اور شور مچاتے گھر سے نکلے۔ اور آن کی آن میں نظروں سے غائب ہو گئے یہ فتنہ اس لئے اُٹھا۔ کہ اُن کو دُولہا کی موعودہ قیمت ادا نہ کی گئی تھی۔ لڑکی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت مُنہ کے بل گری ہُوئی تھی۔ لیکن اُس کی طرف کوئی متوجہ نہ ہو سکتا تھا۔ سب لوگ نہایت مضطربانہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ کہ کوئی شخص دُولہا بننے پر رضامند ہو کر گرتے ہوؤں کو سنبھال لے۔ کیونکہ اگر اس وقت شادی نہ ہو جاتی۔ تو گھرانا ہمیشہ کے لئے ذلیل و رُسوا ہو جاتا۔

ایک لمحہ کے لئے مجھے خیال آیا۔ کہ مَیں اپنے آپکو پیش کر دوں۔ شاید اسی طرح میرے گناہ کے کفّارہ کی صورت نکل آئے۔ لیکن میرے قدم جنبش نہ کر سکے۔ مَیں کیوں لڑکی کو بچانے کے حیلہ سے اُس کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے عذاب بنا دیتا؟ مَیں مجبور تھا۔ لیکن پھر بھی اندوہ و غم کی یہ دلخراش آوازیں مجھ سے سُنی نہ جاتی تھیں۔

یکایک سانولے چہرے والے ایک دُبلے پتلے نوجوان نے آگے بڑھ کر دُلہن کے باپ سے کہا۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوجیئے۔ اگر آپ کو منظور ہو تو میں آپ کی بیٹی سے عقد کرنے کو تیار ہوں۔

اُس وقت ایسا معلوم ہُوا کہ کسی ساحر نے اپنی جادو کی چھڑی کے ایک اشارہ سے تمام نقشہ بدل دیا ہے۔ گویا مُردوں میں جان پڑ گئی۔ مَیں نے نوجوان جادوگر پر نگاہ ڈالی۔ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ اُٹھ کر اُسے اپنے سینہ سے لگالوں۔ میرے پیارے بھائی اگر مَیں نے کبھی تمہارے لئے کوئی تکلیف اُٹھائی تھی۔ تو آج تم نے اس ایک ساعت میں میرے تمام حقوق ادا کر دیئے۔ تم نے میرے تھکے ہُوئے دل سے گناہ کا بار اُٹھالیا۔

جب رسوم ادا ہو چکیں۔ پرو بودھ دُلہن کو ساتھ لیکر فوراً گھر کو روانہ ہُوا۔ وہ اس معاملہ کے متعلق سب سے پہلے خود ہی امّاں کو اطلاع دینا چاہتا تھا۔ مَیں بھی اس کے ساتھ گیا۔

امّاں نے دروازہ کھولا۔ تو وہ ہمیں دیکھ کر سکتہ کے عالم میں رہ گئیں۔ ایک نظر میں اُنہوں نے اصل معاملہ کو بھانپ لیا۔ اُن کے چہرہ سے سختی اور درشتی مترشح ہونے لگی۔ پروبودھ کا سر جُھکا ہُوا تھا۔ اور غریب دُلہن جس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ خوف وہراس سے زمین میں دھنسی جارہی تھی۔

میری نگاہ دیر تک اس نظارہ کی تحمل نہ ہوسکی آخر مَیں نے کہا۔ امّاں میری خاطر سے انہیں معاف کر دیجئے۔ اگر آپ نے میری درخواست کو رد کر دیا۔ تو مَیں اِس وبال کی وجہ سے جو میری ناشاد زندگی پر پڑ چکا ہے۔ ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا رہونگا۔ آپکے چھوٹے بیٹے نے آپ کے بڑے بیٹے کے گناہ کا کفّارہ ادا کر کے اُس کے دل کو تسکین دی ہے۔ آپ کو اس پر خوش ہونا چاہیئے۔

اب امّاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور پروبودھ اپنی دُلہن کے ساتھ آگے بڑھ کر اُن کے قدموں پر گرا۔ بچّے اپنے بزرگوں کے طرزِ عمل سے خوف زدہ ہو کر اب تک ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ مطلع صاف دیکھ کر اب وہ بھی دُلہن کے خیر مقدم کے لئے خوشی کے نعرے مارتے ہُوئے آئے۔ دوسرے دن قرب وجوار کی تمام نسوانی آبادی دُلہن کی چہرہ کشائی کے لئے جمع ہونے لگی۔ اُن کی آمدورفت کا سلسلہ صبح سے لیکر رات گئے تک برابر جاری رہا۔ میرے لئے عجیب مشکل تھی۔ مکان کی تنگی اور ملنے والیوں کے پردہ کی پاسداری کے خیال سے میرا تمام دن بازاروں میں گھومتے گزرا۔

لیکن اب ہجوم کی کثرت کی وجہ سے بازاروں

میں گشت جاری رکھنا ذرا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ وقت بہت گزر چکا تھا۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ اب میں گھر چلا جاؤں۔ اس وقت دُلہن کو دیکھنے کے لئے کون آسکتا ہے؟ لیکن ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے کسی کو بنارس کے ریشمیں کپڑوں میں ملبوس سامنے کھڑا پایا۔ اس کے باریک کپڑوں میں سے زرو جواہر کی جھلملاہٹ نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ میری طرف اس کی پشت تھی۔ لیکن میں نے اسے پہچان لیا۔ میں حیران تھا کہ رانی نے ایک غریب آدمی کو یہ اعزاز کس طرح بخشا۔

سرآما نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ جب وہ پرو بودھ کے کمرہ کے دروازہ پر پہنچی۔ اُس کی خادمہ نے چلّا کر پوچھا۔ گھر والی بی بی کہاں ہیں۔ ہماری رانی ماتا دُلہن کو دیکھنے کے لئے آئی ہیں۔

ہماری ایک ہی ماما تھی۔ اُس نے جلدی سے باہر آکر کہا۔ " ماتا اندر تشریف لائیے۔ ہماری بی بی ابھی ابھی پوجا کے لئے کالی کے مندر کو گئی ہیں۔ آپ اندر تشریف رکھئے۔" اب میری چھوٹی بہن بھی اس واجب الاحترام مہمان کے خیر مقدم کے لئے باہر نکل آئی۔ جس وقت وہ کمرہ میں داخل ہوئیں۔ میں بھاگ کر اپنے کمرہ میں چلا آیا۔ جو اُسی کمرہ کے ساتھ ملحق تھا۔ مجھ پر سرآما کی آمد کا راز اب تک نہ کھلا تھا۔

دفعتاً میرے کانوں میں سرآما کی آواز پڑی۔ وہ اپنی خادمہ کو باہر جانے کا حکم دے رہی تھی۔ وہ اور ہماری ماتا دونوں باہر چلی آئیں۔ اور باورچی خانے میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں محو ہوگئیں۔ اس کے بعد میں نے پھر سرآما کی آواز سُنی۔ اُس کے لہجہ میں اس قدر تلخی اور وحشت تھی۔ کہ مجھ پر خوف سا طاری ہوگیا۔ اس نے دُلہن سے چلّا کر کہا۔ " اپنا گھونگٹ اُٹھاؤ تاکہ میں دیکھوں۔ تم کتنی خوبصورت ہو۔ تمہیں اس گھر میں داخل ہونے کا حق کس طرح حاصل ہوا؟ کیا تم مجھ سے زیادہ حسین ہو؟ مجھے تو اُس نے حقارت سے ٹھکرا کر عمر بھر جلنے کے لئے جہنم کی آگ میں جھونک دیا۔ لیکن تمہیں وہ اپنے گھر میں لایا ہے۔ تاکہ تمہیں چاہے اور تمہاری پرستش کرے۔ آخر کیوں؟ کس بات میں تم مجھ سے افضل ہو؟ کیا تم بڑی دولتمند ہو؟ تمہارے پاس لعل و جواہر ہیں؟ وہ مجھے دکھاؤ۔ تاکہ مجھے معلوم ہو کہ اُس نے تمہیں کیوں ترجیح دی۔

تارا کی خوف سے چیخیں نکل گئیں اور میں اُٹھ کر دوسرے کمرہ میں آیا۔ نئی دُلہن ایک کونہ کی طرف سکڑی اور سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرہ کا رنگ خوف سے بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ سرآما اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں غریب لڑکی پر شعلے برسا رہی تھیں۔

مَیں نے کمرہ میں داخل ہوکر اُسے مخاطب کیا۔ "سراما"

وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہُوئی۔ اور پھر چلّا کر بولی۔

"اچھا چونکہ تمہاری بی بی بات نہیں کرسکتی۔ تم خود ہی مجھے بتاؤ۔ کہ وہ کس بات میں مجھ سے افضل ہے۔ حسن؟ دولت؟ سیرت؟ آخر کس بات میں اُسے مجھ پر فوقیت حاصل ہے؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "سراما تمہیں غلط فہمی ہُوئی ہے۔ وہ میری بی بی نہیں میرے بھائی پروبودھ نے اُس سے شادی کی ہے۔"

سراما نے پھر ایک وحشت خیز چیخ مار کر کہا۔

"اچھا تو پھر وہ تمہاری نہیں ہے؟"

اُس کی خادمہ باہر سے بھاگتی ہُوئی آئی۔ اور ساڑی کا پلّو جو اس کے سر سے کھسک گیا تھا۔ پھر اُس کے سر پر ڈال کر کہنے لگی۔ "بابو آپ بُرا نہ مانئے۔ گزشتہ چند دن سے رانی صاحبہ کی صحت قابلِ اطمینان تھی۔ اسی لئے مَیں اُنہیں یہاں لانے کی جُراَت کرسکی۔ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ گذری تھی۔ کہ یکایک پھر مرض کا اسقدر شدید دورہ ہوگا۔ دن بھر وہ مجھ سے کہتی رہیں بڈھو! چلو مجھے نئی دلہن دیکھنے کے لئے لے چلو۔ اور چونکہ مجھے اُن کی طبیعت میں سکون اور قرار نظر آتا تھا۔ مَیں دل بہلانے کے خیال سے انہیں لے آئی۔ اور اب دیکھئے اُنھوں نے کیا کیا ہے۔"

پھر وہ سراما کو بازو کا سہارا دیکر دروازہ کی طرف لے چلی۔ مَیں پیچھے گیا۔ اور اس سے پُوچھا۔ "تمہاری رانی کی یہ حالت کب سے ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "جب سے میں انکے ہاں آئی ہوں۔ ان کی یہی حالت ہے۔ مجھے آتے بھی دو تین سال کا عرصہ گزر رہا ہے۔ راجہ صاحب علاج پر روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ لیکن سب بالکل اکارت جاتا ہے۔"

وہ چلی گئیں اور مَیں واپس اپنے کمرہ میں آیا۔ اب مَیں بارِ گناہ سے سبکدوش نہ ہوسکتا تھا۔ وُہ وقت جب دوسروں کے عمل کسی کے گناہوں کا کفّارہ ہوسکتے ہیں۔ گزر چکا تھا۔ پھر آخر کیونکر اپنے گناہ کی تلافی کرتا؟

زمانہ گزرتا گیا۔ آخر ایک دن مَیں نے سُرخ عمارت میں شور و غل کی آوازیں سُنیں۔ سب گھبراتے ہُوتے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ اس کے بعد لوگ بڑے دروازہ کے سامنے جمع ہونے لگے۔ مَیں نے باہر جاکر سبب دریافت کیا۔

مجھے بتایا گیا کہ گزشتہ شب سراما کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ موت بالکل ناگہانی طور پر واقع ہُوئی نہ کوئی طبیب بُلایا گیا۔ اور نہ کسی کو اطلاع ہوسکی۔ اب

اُس کے جنازہ کا اہتمام ہو رہا تھا۔

مَیں وہیں منتظر کھڑا رہا۔ ہماری راہیں زندگی میں بالکل الگ الگ رہیں۔ لیکن جب وہ اپنے آخری سفر کو روانہ ہوئی۔ مَیں نے ایک سچّے رفیق کی طرح جہانتک مجھ سے ہو سکا۔ اُس کا ساتھ دیا۔ اور پھر موت کے بھیانک اور ڈراؤنے پردوں نے اُسے ہمیشہ کے لئے میری نظروں سے اوجھل کر دیا!

(ترجمہ)　　**حامد علی خاں**

غزلیات

(۱)

دِل آشنائے کاوشِ سود و زیاں نہیں　　اچھی گزر رہی ہے کوئی بدگماں نہیں

کس حوصلے پہ ترکِ وفا کا خیال ہو　　سینے میں دِل ہے وہ بھی میرا ہمزباں نہیں

قائم ہے سلسلہ ستم روزگار کا　　تو مہربان ہے تو فلک مہرباں نہیں

کیا کیجے سرد مہریِ احباب کا گلہ　　بیچارگی میں کوئی کسی کا یہاں نہیں

حُسنِ نگار چھپ نہ سکیگا نقاب میں　　مینا میں رنگ موجۂ مے کا نہاں نہیں

(۲)

ہوگئی ہے جس کو اُلفت گلشن ایجاد سے　　اُس کا وابستہ ہے دامن حسنِ بے بُنیاد سے

اُس طرف کی خاک میں کیا جانے کیا تاثیر ہے　　لوٹ کر آتا نہیں کوئی عدم آباد سے

زندگی کٹتی ہے کیونکر دامن گُل چھوڑ کر　　کوئی پُوچھے تو سہی یہ نگہتِ برباد سے

اللہ اللہ مجھ سے بے رُخ ہیں بگولے دشت کے　　خانہ بربادوں کو وحشت خانماں برباد سے

ضبط چپکے سے یہ کہتا ہے کہ احسن حُسن و عشق
دونوں ہو جائیں گے رُسوا نالہ و فریاد سے

احسن

پارہ ہائے دِل

جب وہ قسمت کا ہماری فیصلہ دینے لگے
ہم اُنہیں سُننے سے پہلے ہی دُعا دینے لگے

اب وفا کا بھی نہیں معلوم کیا پہلو رہے
اب تو دِل کو رنج وہ بے انتہا دینے لگے

کوئی دیکھے تو محبت کا فریبِ اعتبار
تیغ جب اُس نے اُٹھائی ہم دُعا دینے لگے

کاش آہیں کر دیں اس رازِ نہاں کو آشکار
کاش سوزِ دل مِرا بوئے وفا دینے لگے

اُس کے دامن کو اُڑاتی تو ہے اے بادِ صبا
پھر مجھے دھوکا نہ دستِ نارسا دینے لگے

سازِ دل میرا بھرا ہے نغمہائے درد سے
کیا تعجب ہے کہ چھوتے ہی صدا دینے لگے

شوق کے ہمراہ کیوں رہتے ہیں دل میں رنج و غم
آشنا کا ساتھ کیوں نا آشنا دینے لگے

ہم تو ہیں دریوزہ گر ہم کو دیارِ حُسن میں
مِل گیا جو در کھڑے ہو کر صدا دینے لگے

عشق میں پنہاں ہیں ہادی کس غضب کے انقلاب
اب تو طعنے درد کے دردآشنا دینے لگے

دُنیا مِری جب ٹھہری خود وسعتِ پیمانہ
ڈھونڈھوں مَیں کہاں تجھ کو اے ہستی بیگانہ

اے حسن قیامت ہے اندازِ کشش تیرا
اِک شمع کے پہلو میں یہ کثرتِ پروانہ

معلوم نہیں مجھ کو کیا میری تمنّا ہے
اپنے سے نہ ہو یارب آشنا کوئی بیگانہ

مدہوشِ تمنّا کو اوروں کی خبر کیا ہو
پروانے سے محفل میں بیگانہ ہے پروانہ

احساسِ نوازش کا ہر دل میں ہے اِک طوفاں
ہے شکر بلب ساقی ہر نعرۂ مستانہ

کیا ہوش مجھے آتا جب ہوش کا دشمن تھا
ساقی تری آنکھوں کا اندازِ حریفانہ

آباد ہے یہ تجھ سے آباد ہے وہ مجھ سے
تو ساکنِ دل ساقی مَیں ساکنِ میخانہ

جلوہ ہو جہاں تیرا معبد ہے وہی میرا
ہے مجھ کو غرض تجھ سے کعبہ ہو کہ بُتخانہ

معلوم نہیں کیا ہے مقصد مرے جینے کا
تقدیر سے ناواقف۔ تدبیر سے بیگانہ

مَیں رندِ تمنّا ہوں۔ ہاں دیکھ مجھے ساقی
نظریں تری صہبا ہیں آنکھیں تری پیمانہ

قطرے تھے یہ دو ہادی دریائے حقیقت کے
جب غور کیا دیکھا کعبہ تھا نہ بُت خانہ

ہادی مچھلی شہری

نوائے آشفتگی

(۱)

نغمۂ امید سے پُر ہے کبھی سازِ جہاں
نالۂ غم ہے کبھی ہر ایک آوازِ جہاں

ہے کبھی سینے میں نوکِ خارِ صحرائے حیات
مشک افشاں ہے کبھی گیسوئے لیلائے حیات

ہے کبھی ہر اک نفس بادِ بہارِ جاوداں
ہے کبھی ہر ایک صورت نقش بر آبِ رواں

رشکِ صد فردوس ہے نظّارۂ امکاں کبھی
دیدۂ حیراں کبھی ہے دیدۂ گریاں کبھی

ایک حالت پر نہیں ہے لالہ زارِ زندگی
بادِ صرصر ہے کبھی بادِ بہارِ زندگی

بزمِ ہستی ہے اسیرِ حلقہ ہائے انقلاب
ہے کبھی خورشید جلوہ گر کبھی ہے ماہتاب

ایک چکّر سا ہے پائے توسنِ ایّام میں
ہے سحر میں شام اور نورِ سحر ہے شام میں

یہ زمیں چکّر میں ہے یہ آسماں چکّر میں ہے
الغرض سارے کا سارا ہی جہاں چکّر میں ہے

(۲)

کیوں مری قسمت ہے لیکن بے نیازِ انقلاب
کیوں نہیں اس کی شبِ غم میں نجوم و ماہتاب

ظلمتِ غم کے لئے صبحِ درخشاں کیوں نہیں
کیوں مرے لب مائلِ ماتم ہیں خنداں کیوں نہیں

صحنِ گلشن میں مرے جوشِ مسرت کیوں نہیں
برگہائے گل میں وہ شوخی، وہ رنگت کیوں نہیں

چھاگئی ہے مُردنی کیوں غنچۂ دلگیر پر
خونفشاں کیوں ہے وہ اپنی شومیٔ تقدیر پر

کیوں نہیں اس کے لئے رنگینیٔ فصلِ بہار
کیوں نہیں اس کے لئے موجِ نسیمِ مشکبار

کیوں لبِ جوئے رواں پر نالۂ دلگیر ہے
وہ بھی کیا گلشن کی اِک نوحہ گرِ تقدیر ہے

وہ نوا سنجِ چمن وہ نغمہ زارِ آرزو
وہ سراپائے ترنّم وہ بہارِ آرزو

وہ شرارِ عشق وہ سوز و گدازِ زندگی
وہ سرودِ زندگی وہ تارِ سازِ زندگی

برگہائے زرد کے پردوں میں اب روپوش ہے
سازِ داؤدی ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

موسمِ گل کیوں نہیں میری خزاں کے واسطے
کیوں نہیں نغمے مری آہ و فغاں کے واسطے

گردشِ ایّام کا مجھ پر اثر کچھ بھی نہیں
دن ہی جب تاریک ہو شام و سحر کچھ بھی نہیں

اثر صہبائی

خوابگاہ

شباب کی بیداری

سبز پوش سروؤں کے نظار در قطار تسلسل میں تنوع پیدا کرنے والے خوشبو و خوشرنگ پھولوں کی طرف دیکھ دیکھ کے وہ اپنی معصومیت میں ایک لا احساس مسرت سے مخمور ہو گئی تھی۔ سامنے ایک فوّارہ جس کا پانی اُچھلتے وقت ایسی ترنم ریز آواز پیدا کرتا گویا نقرئی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اس کی نگاہ کے سامنے تھا۔ دور افق کے قریب کسی بلند عمارت کے نازک اور نفیس مینارے شفق کے دھندلکے میں مبہم ہیئتوں کا لباس پہنے ہوئے نظر آرہے تھے۔ آسمان پر کہیں کہیں اُودی گھٹاؤں کے رنگین لکّے تیر رہے تھے۔ ایسی متناسب نزاکت اور ایسے خوش انداز خرام سے تیر رہے تھے۔ جس طرح کسی چشمے میں اُودے پروں کا کوئی خوبصورت راج ہنس اپنی ہمجنس کی معیت میں تمام وسیع سطح آب کو اپنی واحد مملکت سمجھ کر گردن کو غرور و تفاخر کے ایک ناقابل اتباع انداز میں بلند کئے ہوتے تیرتا ہے۔ اس کی خواصیں ہاتھوں میں بربط و عود لئے ایک طرف سبزے کی کیاریوں میں پھولوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُس میں سے ایک نے راگ چھیڑا۔ نغمے بربط میں سے اس طرح بیتاب ہو کر نکلنے لگے جس طرح کوئی خود رو چشمہ ایک پہاڑ کے دامن میں سے رنگین وادیوں میں گزرتا ہوا گنگناتا ہوا بہ نکلے۔ لَے پہلے پست تھی۔ گویا اس بلند آہنگی کو اس جوش کو جو موسیقی میں پیدا ہونے والا تھا۔ زیادہ نمایاں کرنے کے لئے قصداً پست کی گئی تھی۔ پھر نغمے ایک ذخار سمندر کی طرح بہ نکلے۔ بہتے ہوتے بہاتے ہوتے اپنے عظیم سیلاب میں جوانی کی تمام رنگین ماجرائیوں، حسن کی تمام کافرادائیوں، عشق کی تمام دل افروزیوں۔ زندگی کی تمام محبوبیوں کو ساتھ لئے ہوتے بہ نکلے۔ وہ گا رہی تھی۔

"جوانی ـــــ شیریں کار جوانی ـــــ

پُر اسرار جوانی ـــــ

ـــــ عشق کی دلہن حُسن کی ملکہ"

وہ ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہی تھی۔ بربط کے پردے ایک پیہم لرزش کے ساتھ خاموش ہو گئے لیکن اس کی رُو

کے جو تار موسیقی کے تاثرات کی وجہ سے تھرتھرا اُٹھے تھے۔ تھرتھراتے رہے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا جس قدر مسرت وہ اب تک ان چیزوں میں محسوس کرتی رہی ہے۔ آج کچھ اس سے زیادہ مسرت جو دُنیا کی تمام مسرتوں سے کوئی علیحدہ سی چیز ہے۔ اس کے دل پر چھائی جا رہی ہے۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھولوں اور نغموں کا اس ہجوم میں اس پر ایک کیف سا طاری ہو گیا۔ اور اسے نیند سی آنے لگی۔ وہ اپنی خوابگاہ میں جا کر ان زردوزی مخملی تکیوں کے سہارے جن پر انتہائی عرق ریزی سے کشیدہ کاری کی گئی تھی بیٹھ گئی۔ اور پھر سرِ شام ہی اُس نے خواب دیکھنا شروع کیا۔

اس کا جسم بیدار تھا۔ مگر رُوح سو رہی تھی۔ تخیل کے پروں پر سوار ہو کر وہ ——

جوانی ——

شیریں کار جوانی —— پُراسرار جوانی

کے شفاف کرّے میں پہنچ گئی۔ جس کی یاد نغموں نے اس کے دل پر ثبت کر دی تھی۔ وہ ایک خلشِ مضطرب کی طرح اسے اپنی رُوح کی گہرائیوں میں ایک میٹھا سا درد پیدا کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خُدا جانے وہ کتنا عرصہ خیال کی شاداب آفرین مملکت میں حُسن کے تخت پر بیٹھی رہی۔ لیکن آخر کار ذہنی کاوش جو اس عشرت میں بھی باقی تھی۔ اس کے جسم پر غالب آ گئی۔ اس کی رُوح اور جسم دونوں سو گئے۔ صبح کو وہ اُٹھی اور اسنے اپنی صبیح باہوں کو گردن کے پیچھے رکھ کر ایک خمار آلود انگڑائی لی۔ اور شباب بیدار ہو گیا۔ جو خواص اسے جگانے آئی تھی۔ اس نے اپنی مالکہ کے انداز میں ایک ایسا کیف دیکھا۔ جو اُس نے آج تک پہلے نہ دیکھا تھا

عابد

روداد محبّت

مُصنّفہ ٹالسٹائی		حِصّہ دوم		مترجمہ رازؔ چاندپوری

چوتھا باب (۴)

نکولسکوی کے ویران و تنہا مکان میں پھر چہل پہل نظر آنے لگی لیکن جو رونق پہلے تھی اب اس کا نام نہ تھا۔ ٹاٹیانا اب موجود نہ تھی اور صرف ہم دونوں میاں بیوی رہتے تھے۔ لیکن اب تنہا رہنا صرف ناگوار ہی نہ تھا بلکہ پریشان کن تھا تمام موسم افسردگی اور بے لطفی میں گزر گیا۔ میں بیمار ہو گئی اور دوسرے بچہ کے پیدا ہونے تک میری صحت درست نہ ہوئی۔ میرے اور میرے شوہر کے درمیان بدستور تعلقات قائم تھے۔ مگر یہ تعلقات اسی طرح بے کیف تھے جیسے کہ شہری زندگی میں رہ چکے تھے در و دیوار اور فرش و فروش مجھے گزشتہ زمانے کی یاد دلاتے تھے اور بتاتے تھے کہ میں کسی چیز سے محروم ہو گئی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ناقابل عفو قصور نے ہم کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہے۔ اور وہ مجھے میرے اعمال کی سزا دے رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے اس طرز عمل کو چھپانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ میرے لئے اس سے معافی مانگنا بیکار تھا کیونکہ میرا کوئی قصور ہی نہ تھا۔ وہ خود مجھ سے جُدا ہو گیا تھا اور مثل سابق میرے ساتھ محبت کا برتاؤ نہ کر کے مجھے سزا دے رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس نے کسی دوسرے سے بھی محبت کا برتاؤ نہ کیا تاکہ میں سمجھ لوں کہ اُس کا دل جذبۂ محبت سے خالی ہے۔

بعض اوقات مجھے یہ خیال ہوتا کہ وہ صرف مجھے اذیت دینے کے لئے اپنے جذبات کو چھپاتا ہے۔ اور اس کے دیرینہ جذبات اس کے دل میں موجود ہیں میں ان کو بھڑکانے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر ہر مرتبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری راستبازی کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ مجھے ظاہر دار سمجھتا ہے اور میرے کسی جذبہ سے متاثر ہونے پر ہنستا ہے۔ اس کی آواز اور نگاہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اس کو سب باتیں معلوم ہیں اور مجھے اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، وہ میرے مدعائے دل سے باخبر ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کیا کہتی ہوں اور کیا کرتی ہوں۔

اوّل اوّل مجھے اپنی راستبازی سے خوف معلوم ہوا۔

مگر بعد میں میں اس خیال کی معتقد ہو گئی کہ یہ سچائی اور سادگی نہیں ہے۔ بلکہ سچائی اور سادگی کی کمی ہے۔ اب میں اس سے بیساختہ اظہار محبت نہ کرتی تھی۔ نہ اس کو اپنے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے بلاتی تھی۔ اور نہ اس کو اپنے نغمے سننے کی دعوت دیتی تھی۔

ہم سفرہ اخلاقی اصول پر کاربند تھے۔ اور جداگانہ طور پر اپنی اپنی زندگی گزارتے تھے۔ وہ اپنے مشاغل میں مصروف رہتا تھا جن میں حصہ لینے کی مجھے ضرورت نہ تھی۔ اور میں اپنی دلچسپیوں میں منہمک رہتی تھی جن سے اس کو مثل سابق شرمندگی اور تکلیف نہ ہوتی تھی۔ ہمارے بچے ہمارے درمیان صلح کرانے کے لئے ابھی بہت ہی کم عمر تھے۔

موسم بہار آ گیا۔ کاٹیا اور سونیا موسم گرما کا لطف اٹھانے کے لئے دیہات میں واپس آ گئیں۔ ہمارے نکولسکوئی کے مکان کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے ہم پوکروسکوئی کے مکان میں چلے گئے۔ یہ وہی قدیم مکان تھا جس میں چبوترہ تھا۔ توت کی میز اور صاف وشفاف ملاقاتی کمرہ میں پیانو رکھا ہوا تھا۔ اور میرا قدیم کمرہ نقرئی سفید پردوں سے آراستہ اور میری نوعروسی کے زمانے کے ان خواب ہائے پرکیف سے لبریز تھا۔ جو اب خواب وخیال ہو گئے تھے۔ اس کمرہ میں دو چھوٹی سہریاں تھیں جن میں سے ایک کبھی میرے لئے مخصوص تھی اور جہاں میں ہر شام کو اپنے فربہ اندام اور شوخ گلگوشا کی پیشانی پر صلیب کا نشان بنایا کرتی تھی۔ دوسری سہری اور بھی چھوٹی تھی اور یہاں دانیا کا خوبصورت ذہین چہرہ لبادہ میں سے ظاہر ہوا کرتا تھا۔

رات کے وقت میں ان کو الوداع کہکر اکثر اپنے خاموش کمرہ میں چلی جاتی اور یکایک ہر ایک گوشہ، در و دیوار اور پردوں سے اپنی نوجوانی کے زمانے کے بھولے ہوئے خواب یاد آتے قدیم آوازیں میری دوشیزگی کے ترانے گاتیں۔ کہاں یہ خواب ہائے پرکیف اور یہ دلکش ترانے اب خواب وخیال ہو گئے تھے۔

بہت سی باتیں، جن کی ڈرتے ڈرتے میں نے امید کی تھی۔ مجھے حاصل ہو گئی تھیں۔ بیہودہ پریشان تمناؤں نے میرے دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور حقیقت میں میری زندگی افسردہ اور ناخوشگوار ہو گئی تھی۔

لیکن تمام ظاہری باتیں مثل سابق موجود تھیں۔ وہی باغ تھا جس کو میں کھڑکی سے دیکھا کرتی تھی۔ وہی سبزہ زار تھا اور وہی روشیں جہاں بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہی تالاب کی فضا میں ترنم پیدا کر دینے والے بلبلوں کے نغمے تھے۔ اور وہی مکان پر پھیلی ہوئی چاندنی تھی۔ مگر سب چیزیں بالکل افسردہ نظر آتی تھیں۔ اور سب کی سب متغیر ہو چکی تھیں۔ ہر چیز جو دلخوش کن اور راحت افزا ہونی چاہئے تھی۔ پژمردہ اور اداس تھی۔

مثل سابق کاٹیا اور میں کمرہ میں ایک جگہ بیٹھ کر اسکے

متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ مگر کاٹیا اب ضعیف ہوگئی تھی۔ اور اس کے چہرہ پر جھریاں پڑگئی تھیں۔ مسرت و امید کی روشنی سے اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ اور اُن سے ایک ہمدردانہ رنج وملال کا اظہار ہوتا تھا۔ ہم اس کے ذکر سے پہلے کی طرح ازخود رفتہ نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اب ہم اس کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ ہم کو اس بات پر تعجب نہ ہوتا تھا کہ ہم مسرور ہیں۔ اور ایّامِ گزشتہ کی طرح اب ہم کو یہ آرزو نہ تھی کہ ہم اپنے خیالات کو ساری دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ ہم سازش کرنے والوں کی طرح آہستہ آہستہ آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور اکثر ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ افسردگی کیوں پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا طرزِ عمل وہی اگلا سا تھا۔ البتہ اس کی داڑھی میں سفید بال نظر آنے لگے تھے۔ اور اس کے چہرہ پر ضعیفی کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ لیکن اس کی گہری اور سنجیدہ نظریں برابر مجھ سے جدا رہتی تھیں۔ میں بھی ہنوز ویسی ہی تھی۔ مگر اب میرے دل میں نہ محبت تھی نہ محبت کی خواہش۔ کسی کام کو کرنا میں ضروری نہ سمجھتی تھی۔ اور میرا دل اطمینان وسکون سے خالی تھا۔ میرا وہ ابتدائی مذہبی جوش اس کی محبت کا وہ پہلا دور اور وہ اگلے لمحات حیات اب خواب وخیال ہوگئے تھے۔ اب وہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں جو پہلے صاف اور سیدھی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اب میں اس عقیدہ کی قائل نہ رہی تھی۔ کہ "دوسروں کے لئے زندہ رہنا ہی موجب مسرت ہے۔" میں سوچتی تھی کہ مجھے کسی دوسرے کی خاطر کیوں زندہ رہنا چاہیئے۔ جبکہ مجھے خود اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے۔

اسی وقت سے جبکہ ہم پیٹرسبرگ گئے تھے میں موسیقی سے دست کش ہوگئی تھی۔ مگر اب اپنے قدیم پیانو اور نغموں کی کتابوں کو دیکھ کر میرے دل میں پھر اسکی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک دن جبکہ میری طبیعت خراب تھی اور میں مکان میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ کاٹیا اور سونیا میرے شوہر کے ہمراہ مکان دیکھنے کے لئے نکولسکوئی چلی گئی تھیں میں نے چائے پی اور بالاخانہ سے نیچے اُتر آئی۔ ان کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے میری طبیعت گھبرائی میں پیانو کے پاس جا بیٹھی اور ایک دلکش نغمہ چھیڑنے لگی۔ اس وقت مکان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو مجھے دیکھتا یا میری آواز سُنتا۔ باغ کی جانب کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اور میری دلکش تانیں اندوہگینی اور سنجیدگی کے ساتھ کمرہ میں گونج رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر تک باجا بجا کر خاموش ہوگئی۔ اور غیر ارادی طور پر اپنی قدیم عادت کے مطابق اس گوشہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں وہ میرے نغمے سُننے کے لئے بیٹھا کرتا تھا۔ مگر آہ! وہ وہاں موجود نہ تھا۔ کرسی بدستور اپنی جگہ پڑی ہوئی تھی۔ مغربی جانب چمکدار آسمان کے مقابل سوسن کی جھاڑیاں کھڑکی سے نظر آرہی تھیں۔ اور ڈھلتے ہوئے

سورج کی روشنی کھڑکیوں کی راہ سے کمرہ میں آرہی تھی۔

میں نے اپنا سر پیانو پر جھکا دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر اپنے خیالات میں محو ہو گئی۔ میں عرصہ تک اسی حالت میں بیٹھی ہوئی حیرت و افسوس کے ساتھ گزشتہ زمانے کو یاد کرتی رہی جس کا واپس آنا غیر ممکن تھا اور نامعلوم مستقبل سے ڈرتی رہی کہ دیکھوں آئندہ قسمت کیا دکھاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا مستقبل غیر دلچسپ ہے۔ اور میرے دل میں کوئی آرزو اور کوئی تمنا نہیں ہے۔

میں نے اپنا سر اٹھا کر ڈرتے ڈرتے اپنے دل سے سوال کیا۔ "کیا یہ ہوسکتا ہے۔ کہ میری زندگی برباد ہو گئی ہ؟" اور اس خیال کو اپنے دل سے دور کرنے اور اپنے خیالات کو اس طرف سے ہٹانے کی غرض سے میں نے پھر اسی پہلی سی آہستگی کے ساتھ پیانو بجانا شروع کیا۔

میں نے اپنے دل میں کہا "خداوندا! اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہے تو معاف کر اور مجھے وہ تمام آسودگیاں پھر عنایت فرما جن سے میری روح لطف اندوز ہوتی رہی ہے۔ مجھے بتا کہ میں کیا کروں اور اب کس طرح اپنی زندگی بسر کروں؟"

سبزہ پر گاڑی کے پہیوں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کے سامنے آکر گاڑی رکی اور پھر چبوترہ پر احتیاط کے ساتھ کسی کے چلنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ جس سے میرے کان آشنا تھے۔ لیکن ان قدموں کی آواز سے میرے دل میں وہ دیرینہ جذبات پیدا نہ ہوتے۔ جو پہلے ہوا کرتے تھے۔ جب میں نے پیانو بجانا بند کر دیا تو پاؤں کی چاپ مجھے اپنی پشت کی جانب معلوم ہوئی۔ اور کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے کہا۔ "او ہو! تم نے یہ ترانہ کیسے دلکش انداز سے بجایا ہے۔ تم بہت ہوشیار لڑکی ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے پوچھا "کیا تم نے چاے پی لی؟"

میں نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اور اس کی طرف نظر نہ اٹھائی۔ تاکہ وہ میرے چہرے سے میرے دلی جذبات نہ معلوم کر سکے۔

اس نے کہا۔ "وہ ابھی واپس آئینگی۔ راستہ میں ایک گھوڑا شوخی کرنے لگا تھا۔ اس لئے وہ براہ راست پیدل آرہی ہیں۔"

میں نے کہا "ہمیں ان کا انتظار کرنا چاہئے۔ اور یہ کہکر اس امید سے چبوترہ پر چلی گئی۔ کہ وہ بھی میرے ساتھ آئیگا لیکن اس نے بچوں کی خیریت دریافت کی۔ اور ان کے پاس چلا گیا۔

اس کی موجودگی اور اس کی غیر موثر نرم آواز سے ایکبار

پھر مجھے محسوس ہوا کہ ہنوز میرا لطف زندگی تمام و کمال برپا نہیں ہوا ہے۔

میں نے اپنے دل میں کہا "آخر میں مسرتوں سے کیوں محروم ہوں؟ وہ نیک اور مہربان ہے۔ وہ ایک نیکدل شوہر اور ایک صاف باطن باپ ہے مجھے معلوم نہیں کہ میری ذاتی بہبودی کے لئے اور کس چیز کی ضرورت ہے۔"

میں برآمدہ میں چلی گئی۔ اور شامیانے کے نیچے چبوترہ پر اُسی بینچ پر بیٹھ گئی۔ جہاں میں اُس دن بیٹھی تھی جیسا ہم دونوں نے ایک دوسرے سے پیمان محبت باندھا تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی بڑھتی جاتی تھی اور ایک ابر سیاہ پانی سے لدا ہوا مکان اور باغ پر چھایا ہوا تھا۔ درختوں کے درمیان سے، مغربی جانب نیچے کیطرف شفق آلود آسمان اور شام کے تاروں کی مدھم روشنی نظر آرہی تھی۔ ہر چیز پر ابر سایہ فگن تھا۔ اور ہر شے ابر کے لطیف پر کیف چھینٹوں کی منتظر تھی۔

ہوا بند تھی، درخت، پتّیاں اور سبزہ زار ساکن تھے۔ سوسن اور جنگلی شاہ دانوں کی خوشبو سے دامن باد لبریز تھا۔ اور فضائے باغ معطر تھی۔ ہوا کے جھونکے کبھی تیزی اور کبھی آہستگی کے ساتھ آرہے تھے۔ اور لوگوں پر ایک عالم محویت طاری تھا۔ اور خوشبو مشام رُوح کو معطر کر رہی تھی۔

لیمو اور گلاب کی جھاڑیاں، جن میں ہنوز کلیاں نہ پھوٹی تھیں۔ تاریکی میں غیر متحرک کھڑی تھیں اور سفید لکڑیوں کے سہارے آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں مینڈک بارش ہونے سے پہلے پانی میں پہنچنے کیلئے امکانی کوشش کر رہے تھے میں بھی کسی کی منتظر تھی، اور میرے دل میں بھی کوئی آرزو تھی وہ بالاخانہ سے اُتر کر آیا اور میرے نزدیک بیٹھ گیا اُس نے کہا "مجھے خوف ہے کہ وہ بھیگ جائینگی" میں نے کہا "ہاں" اور ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

اگرچہ ہوا بند تھی۔ مگر ابر برابر چھا گیا۔ اور اب ہر چیز پہلے سے زیادہ ساکت معطر اور غیر متحرک ہو گئی یکایک آسمان سے ایک قطرہ گرا اور چبوترہ پر تنے ہوتے شامیانے پر رقص کرتا ہوا معلوم ہوا۔ دوسرا قطرہ ناہموار روش پر گرا اور چھینٹے اڑانے لگا۔ پھر سرد مدوّر قطروں کا تار بندھ گیا اور زور سے بارش ہونے لگی بلبلیں اور مینڈک بالکل خاموش ہو گئے۔ صرف بارش کے اُس طرف فاصلہ پر آبشار کی ترنم ریزی ہوا میں پرواز کر رہی تھی۔ اور ایک چڑیا جو یقیناً چبوترہ کے نزدیک خشک پتّیوں کی آڑ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بول اُٹھتی تھی۔ اتنے میں وہ کھڑا ہو گیا اور جانے لگا۔

میں نے اس کو روک کر کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟

دیکھو یہ وقت کسقدر خوشگوار ہے!"

اُس نے کہا "مجھے اُن کے لئے چھتری اور جوتے بھیجنے چاہئیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک لمحہ کے بعد بارش بند ہو جائیگی۔"

اس نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ میں نے بھیگے ہوئے چکنے کٹہرے پر ہاتھ پھیرا اور اپنا سر باہر کی طرف نکال دیا بارش کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے بے ترتیبی کے ساتھ میرے سر اور گردن پر پڑنے لگے۔ بارش ہونے کے بعد ابر ہلکا ہو گیا تھا اور ہمارے سروں پر سے گزر رہا تھا مینہ برسنے کی تیز آواز شامیانے اور پتیوں سے قطرے ٹپکنے کی ہلکی صداہیں تبدیل ہو گئی مینڈکوں نے پھر غل مچانا شروع کیا اور بلبلوں کی صدائیں ہر طرف سے بھیگی ہوئی جھاڑیوں میں سے آنے لگیں۔ اور ہمارے سامنے کا منظر صاف ہو گیا۔

اس نے کٹہرے پر بیٹھ کر اور اپنے ہاتھ سے میرے بھیگے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا" اوہو! موسم کس قدر خوشگوار ہے!"

اس سیدھی سادی بات کا میرے قلب پر ملامت آمیز اثر ہوا اور میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

اس نے کہا" اس سے زیادہ انسان کو کیا چاہئے؟ اب میں بالکل مطمئن ہوں۔ مجھے کسی بات کی آرزو نہیں ہے۔ میں پورے طور پر مسرور ہوں۔"

میں نے اپنے دل میں کہا" تم اس طرح تو اپنی مسرتوں کا اظہار نہ کیا کرتے تھے۔ خواہ تم کتنے ہی مسرور کیوں نہ ہوتے۔ مگر تم کہا کرتے تھے کہ ابھی اور کسی چیز کی ضرورت ہے۔ مگر اب تم مطمئن ہو۔ حالانکہ میرے دل میں ہنوز وہ تاسف موجود ہے جو ابھی زبان پر نہیں آیا ہے۔ اور وہ آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ جو ابھی تک دامن و آستین کے منت گزار نہیں ہوتے ہیں۔

میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا" میں بھی اس کو پسند کرتی ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا افسوس بھی ہے کہ میرے اردگرد ہر شے کیوں خوبصورت ہے؟ یہاں سکون و لطافت ہے اور میرا دل رنج والم اور حسرت و آرزو سے بھرا ہوا ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے۔ کہ حسنِ فطرت کی ان ضو پاشیوں میں تمہارے لئے کوئی شے الم انگیز نہیں؟ مثلاً کیا تمہارے دل میں کسی ایسی چیز کے حاصل کرنے کی تمنا نہیں ہے۔ جو ہمارے پاس موجود نہیں ہے؟"

اُس نے میرے سر سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا اور ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

اُس نے اپنے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے کہا" ہاں موسم بہار میں خصوصاً مجھے ایسا محسوس ہوا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات میں رات بھر آرزوؤں اور امیدوں کے بحرِ بیکراں میں غوطے کھایا کرتا تھا۔ وہ راتیں بہت ہی

خوشگوار ہوتی تھیں لیکن اُس وقت ہر چیز کی بنیاد امید پر قائم تھی۔ اور اب وہ سب کچھ ایک خواب و خیال کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اب مَیں اپنی موجودہ حالت میں مطمئن ہوں اور میرے لئے یہی بہتر ہے۔" اُس نے آخری الفاظ ایسی بے ساختگی کے ساتھ کہے کہ اگرچہ مجھے ان کا سُننا ناگوار ہُوا۔ مگر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سچ کہتا ہے۔

مَیں نے پُوچھا۔" اب تو تمہارے دل میں کوئی تمنّا نہیں ہے؟"

اُس نے میرے خیالات کا اندازہ کر کے جواب دیا۔

"ہاں میرے دل میں کوئی ناممکن الحصول آرزو نہیں ہے۔"

پھر اُس نے میرے بھیگے ہُوئے بالوں کو درست کرتے ہُوئے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔" دیکھو تمہارا سر بھیگ رہا ہے۔ تم خیال کر رہی ہو کہ کاش تم بھی پتّیاں، سبزہ اور پانی ہوتیں! کیونکہ تم دیکھ رہی ہو کہ پتّیوں اور سبزہ پر ترشح ہو رہا ہے۔ مگر ان کو دیکھ کر ہی مسرت حاصل کرتا ہوں۔ جو دنیا کی اور حسین اور مسرت بخش چیزوں کو دیکھ کر حاصل ہوتی ہے۔"

مجھے محسوس ہُوا کہ میرا دل بھر آتا ہے۔ مَیں نے اس سے پُوچھا۔" تو کیا تم کو گزشتہ زمانے کا افسوس نہیں ہے؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ اور ایک لمحہ تک غور کرتا رہا مجھے اس امر کا احساس ہُوا۔ کہ وہ میرے سوال کا مکمل اور سچّا جواب دینے کی فکر کر رہا ہے۔

اُس نے مختصر جواب دیا۔" نہیں"

مَیں نے اس کے نزدیک ہو کر اور اُس کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر کہا۔" جھوٹ، قطعاً جھوٹ۔ کیا تم کو گزشتہ زمانے کے واپس آنے کی آرزو نہیں ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔" نہیں۔ مَیں خدا کا ممنون ضرور ہوں۔ کہ وہ نعمت مجھے حاصل ہو گئی تھی لیکن مجھے اب پھر اُس کے واپس آنے کی آرزو نہیں ہے۔"

مَیں نے دریافت کیا۔" آخر تم اس کو واپس بلانا کیوں نہیں چاہتے؟"

اُس نے اپنا مُنہ پھیر لیا۔ اور باغ کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر اُس نے کہا۔" مجھے اب اس کی مطلق آرزو نہیں ہے یہ ناممکن ہے۔"

"تو کیا تم اپنی زندگی کو خوشگوار بنانا پسند نہیں کرتے؟ کیا تم مجھے یا اپنے آپ کو ملامت نہ کرو گے؟"

"یقیناً نہیں، کیونکہ سب باتیں اطمینان بخش ہیں"

مَیں نے اس کو متوجہ کرنے کے لئے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ اور کہا۔" سنو! میری بات سُنو!! اور بتاؤ کہ تم نے کبھی اپنی مرضی کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ تاکہ مَیں تمہارے منشاء کے مطابق کاربند ہوتی۔ تم نے مجھے مطلق العنان کیوں بنایا؟ جبکہ تم کو معلوم تھا کہ مَیں اس آزادی کو بہترین طور پر استعمال نہ کر سکتی

تھی۔ تم نے مجھے نصیحت کرنا کیوں چھوڑ دیا؟ اگر تم چاہتے۔ اور مجھے دوسرے راستہ پر لگا دیتے۔ تو اس قسم کی کوئی بات کبھی نہ ہوتی۔" میں نے یہ سب باتیں بہت ہی افسردہ، پریشان اور ملامت آمیز لہجہ میں کہیں۔ جن میں دیرینہ محبت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اُس نے میری طرف مخاطب ہو کر متعجبانہ انداز سے پوچھا۔ "کیا بات نہ ہوتی؟ میرے خیال میں تو کوئی نامناسب بات نہیں ہوئی ہے۔" پھر اُس نے مسکرا کر کہا۔ "جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اور بہت اچھا ہوا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ وہ میرا مطلب نہیں سمجھا۔ یا یہ کہ وہ اُس کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟" اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

میں نے مضطربانہ کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے۔ کہ اگر میں تمہاری نظر میں قصوروار نہ ہوتی تو تم ایسی بے پروائی اور ملامت آمیز طریقہ سے میرے ساتھ پیش آتے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بغیر کسی خطا کے تم یکبارگی مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیتے جو مجھے بہت پیارا تھا؟"

دراصل وہ میرا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اُس نے پوچھا۔ "دلربا! کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "تم نے مجھ سے اپنا بھروسہ، اپنی محبت حتیٰ کہ اپنی عزت بھی چھین لی ہے۔ کیونکہ جو واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔ کہ تم اب بھی مجھ سے محبت رکھتے ہو۔" اُس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر میں نے اُس کو روک کر کہا۔ "مجھے اس تمام واقعہ کو پورا بیان کرنے دو۔ جس نے مجھے اسقدر طویل مدت تک پریشان رکھا ہے۔ کیا مجھے الزام دیا جا سکتا ہے کہ میں مراحل حیات سے ناواقف تھی۔ اور تم نے مجھے ان سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا؟ کیا میں ملزم قرار دی جا سکتی ہوں۔ کہ میں ان سب باتوں کو سمجھ کر جو ضروری تھیں۔ ایک سال سے تم سے صلح کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ اور تم پھر بھی بے پروائی سے کام لے رہے ہو؟ گویا تم سمجھتے ہی نہیں کہ میرا مقصد کیا ہے اور تم ہمیشہ ایسا برتاؤ کرتے ہو کہ تم کو الزام دینا ناممکن ہے، مگر تمہارے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہے۔ کہ تم مجھے خطاوار، اور بدنصیب سمجھتے ہو۔ بیشک تم مجھے اس حالت کو پہنچا رہے ہو، کہ میری اور تمہاری دونوں کی زندگی تلخ ہو جائیگی۔"

اُس نے حقیقی تاسف اور تعجب سے پوچھا۔ "مگر میں نے ایسا کب کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "کیا تم نے کل شام نہیں کہا تھا اور کیا تم ہمیشہ نہیں کہتے ہو کہ میرے لئے یہاں رہنے پر قناعت کرنا ناممکن ہے۔ اور ہم کو موسم سرما میں پیٹرسبرگ چلا جانا چاہیے حالانکہ وہاں جانا مجھے پسند نہیں ہے۔ تم نے بجائے میری امداد کرنے کے مجھ کو ہر ایک آزادی اور محبت آمیز گفتگو

کرنے سے باز رکھا۔ تاکہ ایسی حالت میں اگر مَیں بالکل مایوس
ہو جاؤں تو تم مجھے ملامت کرو۔ اور میری بدنصیبی پر خوش ہو۔"

اس نے سختی اور افسردگی کے ساتھ کہا۔ "بس بس خاموش
ہو جاؤ۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو بالکل غلط ہے۔ تمہاری گفتگو سے
ظاہر ہے۔ کہ تم کو میری نسبت ایسی بدگمانیاں ہیں کہ تم ——"

"ہاں ہاں کہو کہو کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"
مَیں نے اُس کے مُنہ کی بات چھین لی۔ اور مَیں بے اختیار رونے
لگی۔ مَیں نے بینچ پر بیٹھ کر رومال سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

مَیں نے ضبطِ گریہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے
جس سے میرا دم گھٹ رہا تھا اپنے دل میں کہا۔ "اوہو! وہ
مجھ سے اسقدر بدگمان ہے۔" اور میرے دل میں یہ خیال پیدا
ہُوا کہ ہماری دیرینہ محبت ختم ہو گئی ہے۔

وہ نہ میرے پاس آیا نہ مجھے تسلّی دینے کی کوشش کی۔
مَیں نے جو کچھ کہا تھا۔ اس سے وہ ناخوش ہو گیا تھا اور خاموش تھا۔

اس نے کہا۔ "مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ تم مجھے کیوں ملامت
کر رہی ہو۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ مَیں تم سے مثل سابق محبت
نہیں کرتا تو ——" وہ خاموش ہو گیا۔

مَیں نے اپنے چہرہ سے بغیر رومال ہٹاتے ہوئے
جو گرم آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا کہا "محبت ——"

اُس نے کہا۔ "اس کے لئے وقت اور ہم دونوں
قابلِ الزام ہیں۔ زندگی کے ہر دور میں مختلف قسم کی محبت
ہوتی ہے۔"

اتنا کہکر وہ خاموش ہو گیا۔

پھر اُس نے کہا۔ "اگر تم کو جیسا کہ تم کہتی ہو صفائی اور
سچائی کی خواہش ہے۔ تو مَیں تم سے صاف صاف بیان
کرتا ہوں۔ سُنو، جب مَیں پہلی بار تم سے روشناس ہُوا تو
راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ مَیں تمہارے خیال میں محو رہتا
تھا اور مَیں نے اپنی محبت کا خیالی نقشہ اپنے ذہن میں بنا
لیا تھا۔ پھر پیٹرسبرگ اور دوسرے مقامات پر مَیں نے
جاگ جاگ کر راتیں نہیں گزاریں اور اس نقشِ محبت کو اپنے
دل سے مٹا دیا۔ کیونکہ وہ میرے لئے تکلیف دہ تھا۔ مَیں
نے اس محبت کو بالکل ضائع نہیں کیا۔ بلکہ اس کے اس
حصّہ کو برباد کر دیا۔ جو میرے لئے موجبِ ملال تھا۔ اور
اس طرح مَیں نے اپنے دل کو مطمئن بنا لیا۔ مجھے اب بھی
تم سے محبت ہے۔ مگر دوسری قسم کی۔"

مَیں نے کہا۔ "ہاں تم اس کو محبت کہتے ہو لیکن مَیں
تو اس کو عذاب سمجھتی ہوں۔ تم نے مجھے سوسائٹی میں کیوں
شریک ہونے دیا۔ جبکہ تم کو معلوم تھا کہ وہ میرے حق میں
مضر ہو گی۔ اور تمہاری محبت نفرت سے بدل جائیگی۔"

اُس نے جواب دیا۔ "میری دلنواز! اس خرابی کا
باعث سوسائٹی نہیں ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "تو تم نے مجھ پر اپنی طاقت کا استعمال

کیوں نہیں کیا؟ تم نے مجھے قید کیوں نہ کر دیا؟ اور تم نے مجھے کیوں نہ مار ڈالا؟ اب جبکہ میں ان سب باتوں سے محروم ہوں جو میری مسرتوں کی روحِ رواں تھیں۔ تو میرے حق میں وہی بہتر ہوتا کہ تم میری زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔ ہاں میرے لئے مرجانا ہی بہتر تھا تاکہ مجھے یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔" میں پھر سسکیاں بھر کر رونے لگی اور رومال سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

اس وقت کاٹیا اور سونیا بھیگتی بھاگتی، خوش و خرم قہقہہ مارتی ہوئیں چبوترہ پر آ پہنچیں۔ مگر ہم کو دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ اور اُلٹے پاؤں واپس چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک ہم خاموش رہے میں خوب رو چکی تھی۔ اور اس لئے میرا دل کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ پر سر رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے میری نگاہ کے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر صرف ایک آہ کر کے سر جھکا لیا۔

میں اس کے نزدیک گئی۔ اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے غور سے میرے چہرہ پر نظر ڈالی۔ اور اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ہاں ہم سب کے لئے عموماً اور عورتوں کے لئے خصوصاً یہ لازمی ہے۔ کہ زندگی کا علم حاصل کرنے کے لئے دنیائے فانی کی ہر شے کا خود تجربہ کریں۔ اور صرف دوسروں کے اقوال ہی پر اکتفا نہ کریں۔ تم اس وقت تک زندگی کے خوبصورت اور فریبندہ

پہلو سے ناواقف تھیں۔ اور مجھے تمہاری اس عدم واقفیت پر تعجب تھا۔ اس لئے میں نے تم کو آزادی دیدی تھی تاکہ تم ذاتی طور پر کیفیات حیات سے لطف اندوز ہو اور سمجھ لیا تھا کہ تم کو اس سے باز رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگرچہ میرے لئے ان مشاغل سے لطف اٹھانے کا موقعہ نکل چکا تھا۔"

میں نے کہا: "اگر تم کو مجھ سے محبت تھی تو تم نے مجھے ان فریبوں میں کیوں مبتلا ہونے دیا۔ جن کا مجھے تجربہ نہ تھا مگر تم کو ان کا پورا تجربہ حاصل تھا۔"

اس نے جواب دیا "صرف اس لئے کہ باوجود اپنی خواہش کے تم کو میری باتوں پر یقین نہ تھا۔ اور اس لئے اس بات کی ضرورت تھی۔ کہ تم خود ان کا تجربہ حاصل کرو۔ اور اب تم کو ان کا تجربہ ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا: "تمہارے دلائل ضرور قوی ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری محبت بہت ہی کمزور تھی۔"

ہم خاموش ہو گئے۔

وہ یکایک اُٹھا اور چبوترہ پر ٹہلنے لگا۔ اس نے کہا۔ "جو کچھ تم نے ابھی کہا ہے۔ سراسر ناانصافی ہے۔ ظلم ہے لیکن ٹھیک ہے۔ بیشک تمہارا خیال درست ہے۔ اور میں قابلِ الزام ہوں" وہ میرے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ اور کہنے لگا۔ "ہاں یا تو مجھے تم سے محبت ہی نہ کرنا چاہئے تھی۔ یا محبت کرنی چاہئے تھی تو بہت زیادہ۔"

مَیں نے نرمی سے کہا۔ "اچھا آؤ ہم اس کو بھول جائیں"
اس نے جواب دیا "نہیں۔ جو گزر چکا وہ اب واپس نہیں آسکتا۔ اور نہ تم وہ ہو سکتی ہو۔ جو پہلے تھیں" اتنا کہکر اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔
مَیں نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں نہیں، سب باتیں ویسی ہی ہو جائیں گی۔" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اور کہنے لگا۔ "جب مَیں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے ماضی کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ تو میرا بیان صحیح نہ تھا بیشک مجھے اس کا ملال ہے۔ مجھے تمہاری محبت کے زوال پر رنج ہے۔ جو اب کبھی ترقی پذیر نہ ہوگی۔ مَیں نہیں جانتا کہ اس کیلئے کون قابلِ الزام ہے۔ محبت اب بھی موجود ہے۔ مگر اگلی سی نہیں۔ اس کی جگہ ایک کمزور محبت اور افسردگیِ خیالات نے لے لی ہے۔ جوش، خیالات اور جذبات اب بھی باقی ہیں لیکن ---"
مَیں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "کیا ایسا ہونا ناممکن ہے؟" اس کی آنکھوں سے اطمینان وسکون ٹپک رہا تھا۔ ان میں افسردگی کا نام نہ تھا اور وہ میرے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔
جس وقت مَیں نے اس سے یہ کہا۔ تو مجھے محسوس ہُوا کہ جو کچھ مَیں چاہتی ہوں اور جس بات کی اس سے امیدوار ہوں وہ غیر ممکن ہے۔ وہ سنجیدگی اور دلکشی سے مُسکرایا۔ اور مجھے اس کے تبسم میں دیرینہ محبت کی جھلک نظر آئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اس کے پاس کھڑی رہی۔ اور میرا قلب اطمینان وسکون سے لبریز ہو گیا۔
اُس نے کہا۔ "اب ہم کو اپنی زندگی کے تجربات نہ دُہرانے چاہئیں۔ اور ایک دوسرے کو فریب نہ دینا چاہئے اب وہ اگلی سی پریشانیاں رونما نہ ہونگی۔ اور اس کے لئے ہمیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ ہمارے دل میں کوئی آرزو باقی نہیں ہے۔ اور ہم کو کسی چیز کے لئے تکلیف اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم پہلے ہی بہت سے تجربے حاصل کر چکے ہیں اور کافی مسرت ہمیں حاصل ہو چکی ہے۔" پھر اُس نے دایہ کی طرف اشارہ کرکے جو وانیا کو لئے ہُوئے برآمدہ کے دروازہ میں کھڑی ہُوئی تھی کہا۔ "اب ہم کو اس راستہ کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اور دوسروں کو اس سے گزرنے کی اجازت دینا چاہئے۔" بالآخر اس نے سلسلۂ گفتگو ختم کرتے ہُوئے میرے سر کو اپنے سینہ سے لگاکر اور میرے بالوں پر بوسہ دیکر کہا۔ "دلنواز! بس ہمارے لئے یہی بہتر ہے۔" اب اس کی حالت ایک عاشق کی سی نہ تھی۔ بلکہ صرف ایک خیر خواہ دوست کی سی تھی۔
باغ سے رات کی خوشگوار، معطر اور رُوح پرور ہوائیں آنے لگیں۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی اور آوازیں صاف سُنائی دینے لگیں۔ ستارے صفائی سے آسمان پر چمکنے لگے۔
مَیں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور میرے دل کو اطمینان ہُوا

سکون حاصل ہوا۔ وہ اخلاقی تکلیف وہ کمزوری جو موجب ملال تھی۔ یکایک مسرت سے بدل گئی۔ اور مجھے پورے طور پر احساس ہوا کہ اس وقت کے تمام محسوسات وقت کے ساتھ فنا ہو چکے تھے۔ اور یہ کہ اب ان کا واپس آنا نہ صرف ناممکن ہے۔ بلکہ تکلیف و مصیبت کا پیش خیمہ ہو گا۔ لیکن کیا دراصل وہ وقت بہت خوشگوار تھا، جو مدتوں پہلے گزر چکا تھا؟

اُس نے کہا" چلو اب چائے پی لیں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہم دونوں ایک ساتھ نشستگاہ میں جا بیٹھے۔ دروازہ پر وانیا کو لئے ہوئے دایہ ملی۔ میں نے اپنے بچہ کو گود میں لے لیا۔ اس کی سُرخ برہنہ ٹانگیں ڈھکیں اور اس کو گلے لگا کر آہستگی سے اس کا بوسہ لیا۔ بچہ نے ایک خوفناک خواب کی سی حالت میں اپنا چھوٹا سا ہاتھ پھیلایا اور آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گویا اس کو کسی چیز کی تلاش تھی یا کسی بات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر میرے چہرہ پر پڑی۔ ذہانت کی چمک اس کی آنکھوں سے نکلنے لگی۔ اس کے کھلے ہوئے لب سُکڑنے لگے۔ اور تبسّم کی ہلکی ہلکی لہریں ان پر کھیلنے لگیں۔

ایک جوشِ مسرت میں میری زبان سے نکلا۔

" میرا پیارا! میرا پیارا!!" اور میں نے اس کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ میری رگ رگ میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ اور میں نے اس کے تمام اعضائے جسم پر بے اختیارانہ بوسے دینے شروع کئے۔ میرا شوہر میرے نزدیک آیا۔ میں نے جلدی سے بچہ کا مُنہ ڈھانپ لیا۔ اور پھر فوراً کھول بھی دیا۔

میرے شوہر نے اپنی اُنگلی سے بچہ کی ٹھوڑی کو گُدگُدا کر کہا۔" ایوان سرجیائی!" مگر میں نے کمسن ایوان کا چہرہ جلدی سے ڈھک دیا۔ گویا میرے سوائے کسی دوسرے کو اس کے دیکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ پھر میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس کی متبسّم نگاہیں میرے چہرہ پر جم گئیں۔ اور مدت کے بعد آج پہلی بار اس سے نگاہ ملا کر مجھے روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

اُس دن سے میرے شوہر کی اجنبیت دُور ہو گئی دیرینہ جذبات، بیش بہا اور غیر فانی یاد کی صورت میں منتقل ہو گئے۔ مگر اپنے بچوں اور اُن کے باپ کے ساتھ محبّت کا ایک نیا جذبہ میرے دِل میں پیدا ہو گیا۔ جس نے میری زندگی میں ایک ایسے نئے دور کی طرح ڈالی۔ جو دراصل مسرتوں سے لبریز تھا۔ مگر اگلے جذبات سے بالکل مختلف تھا اور اس نئے طرز زندگی پر میں آج تک قائم ہوں۔

نقد و نظر

لیلےٰ یا محاصرۂ غرناطہ: ۔ لارڈ بلورلٹن جس کی کتابیں اب ادب العالیہ (کلاسکس) کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ایک نہایت بالغ نظر اور کامیاب مصنف تھا۔ اس نے اپنی تصانیف متعددہ میں جہاں فلسفۂ حیات کے رموز کو بے نقاب کیا ہے۔ وہاں چند ایک مشہور تاریخی واقعات کو بھی ناولوں کے پیرائے میں لکھا ہے۔ انہیں میں سے "لیلیٰ" ایک مشہور کتاب ہے۔ ناظرین ہزار داستان واقف ہونگے۔ کہ سید امتیاز علی تاج نے ہزار داستان میں شیکسپیر کی مشہور عالم بزمیہ تمثیل (کومیڈی) اے مڈسمر نائٹس ڈریم اور لیلیٰ کا ترجمہ علی الترتیب ساون رین کا سپنا' اور" لیلےٰ " کے عنوانات سے شروع کیا تھا۔ جن کے متعلق کچھ عرصہ بعد مدیر ہزار داستان کو لکھنا پڑا۔ کہ دونوں چیزیں کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ اس نے ان کی اشاعت کا سلسلہ منقطع کیا جاتا ہے۔ ساون رین کا سپنا تو تا حال غالباً زیر اشاعت ہے۔ لیکن لیلےٰ کو سید صاحب موصوف نے شائع کر دیا ہے۔ ہر چند کہ لیلےٰ کے پہلے صفحے پڑھ کر ہی ناظرین ہزار داستان نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ بہ اعتبار معیار تراجم لیلیٰ ایک" انکشافِ ادبی" ہوگی۔ لیکن میری عشرت متحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے اسی کتاب کے اوّل سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ لیلیٰ ان کتابوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ جو مترجمین کے لئے ایک روشن دلیلِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ کتاب کا پلاٹ ایشیائی زمین میں رکھا گیا ہے۔ اور پھر زمین بھی ایسی جہاں سلطنت اندلس کے ستونوں کو مسلمانوں کے خون سے سینچ سینچ کر بلند کیا گیا تھا۔ ہسپانیہ میں تاریخ اسلام کے اس دور کے واقعات بہت دردناک ہیں کیونکہ یہ وہی دور ہے جب ہسپانیہ والوں نے نہ صرف عربوں کو یکسر مٹا دیا۔ بلکہ ساتھ ہی ان کے جاہ وجلال اور علم و فضل کے تاثرات کو بھی ملیامیٹ کر دیا۔ لیلےٰ اسی تباہی کی آئینہ دار ہے۔ ایک تو واقعات اتنے دلگداز۔ پھر سید صاحب موصوف کا قلم۔ یہ شراب یکسر دو آتشہ ہوگئی ہے۔

ترجمے کی وہ خوبیاں جو بادی النظر میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مواقع کی اہمیت کے لحاظ سے سید صاحب موصوف بے دھڑک ایسی اجنبی مگر وسیع المعانی اور ترنم ریز تراکیب استعمال کرتے ہیں کہ منظر کی کیفیت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ کئی دفعہ میں نے یوں محسوس کیا۔ گویا میں بھی اس سرزمین میں پہنچا ہوا ہوں۔ جہاں کے واقعات بیان کئے جا رہے ہیں دیباچے میں وہ خود اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

ان تراکیب سے کہ حسنِ قبول کی دلیل ان ادیبانِ سحر نگار کے استعمال کو قرار دیتے ہیں۔ جو حقیقت میں اردو کے رکن رکین ہیں اور " اس کا فیصلہ اہل دہلی و لکھنؤ کی رائے سے زیادہ " انہیں پر منحصر رکھتے ہیں۔ ہماری رائے میں ایسی تراکیب نہ صرف ادبِ اُردو کو مالا مال کرتی ہیں۔ بلکہ صحیح ترجمے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ لیکن خیال رہنا چاہئے کہ اس قسم کی تراکیب کا ترجمہ کرنے کے لئے جن سے اُردو دان اصحاب مانوس نہ ہوں اور جو کسی دوسری زبان کے ادب سے مخصوص ہوں بہت مشق اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے۔ ہر کہ ومہ اگر ایسی جرآت کرے تو یقیناً ناکامیابی ہوگی۔ تراکیب تو ایسی ہیں کہ محض ان کے استعمال سے واقعہ آنکھوں کے آگے مجسم ہو کر آجاتا ہے۔ مثلاً "چاندنی شفاف فضا میں سے چھن چھن کر ۔ ۔ ۔ ۔ چپ چاپ برس رہی تھی "

" لیلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ گویا اس مرمریں بت میں ایک روح بیدار تھی "

" سوختہ اختر بادشاہ نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا "

" شاندار دیوانگی خیال میں مبتلا ہو کر یہ سمجھنے لگے "

مندرجہ بالا فقروں میں تراکیب کیسے وسیع المعانی طریق سے واقعے کی تمام جزئیات پر حاوی ہوگئی ہیں !!

کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے۔ اور میں نے تو جب تک اسے دو دفعہ ختم نہیں کر لیا چین نہیں حاصل ہوا۔ ہر چند کہ دوسری دفعہ پڑھنا میرے لئے دشوار ہو گیا تھا۔ کیونکہ واقعات کی دلگدازی آنسوؤں کا خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہی کتاب کے آخری فقرے ہے جہاں عبداللہ (معزول بادشاہ) اپنی بربادی اور ناکامی پر روتا ہے اور اس کی کنیز اسے ان الفاظ میں تسلی دیتی ہے " ابو عبداللہ کچھ پروا نہ کر۔ مصیبت میں تو مجھ کو جتنا عالی نظر آرہا ہے۔ پہلے کبھی معلوم نہ ہوا تھا۔ اے میری آنکھوں کی روشنی نواب بھی ایک کنیز کو اپنی رعایا تصور کر " کسقدر دلگداز ہیں قیمت ۱ر صفحات ۳۰۰ کے قریب تقطیع بڑی کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ سید ممتاز علی ۱۹۵ ریلوے روڈ لاہور سے طلب کیجئے۔

صورت گری عورتوں کے مقصد کی چیز ہے۔ صحت کے اصل جسم کو سڈول بنانے کی تراکیب اور مختلف عوارضات جسم کے متعلق نسخہ جات بھی درج ہیں۔ شروع میں مولنا بشیر الدین احمد صاحب ایم آر اے ایس کی ایک مختصر ظریفانہ تقریظ بھی ہے۔ قیمت ۸ر مجلد ۱۰ر حکیم مظفر حسین صاحب مالک گنجینۂ لطفِ زندگانی اندرون موچی دروازہ لاہور سے طلب فرمائیے

ریاست ہندوستانی ریاستوں کا واحد ہفتہ وار اخبار ہے۔ جو دیوان سنگھ صاحب مفتون کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا ہے اغراض و مقاصد میں ہندوستانی ریاستوں کے مظلوم باشندوں کے حقوق کی حفاظت کرنا اور انہیں بیداری کی روح پیدا کرنا شامل ہے اکثر نوابوں اور راجاؤں کے متعلق مفید اور دلچسپ مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں حکمت عملی میں اعتدال پسندی کا عنصر غالب ہے۔ طباعت مرغوب چندہ پانچ روپیہ سالانہ۔

رعایتی اعلان

قصص القرآن چونکہ اکثر مسلمان بوجہ عدم واقفیت علم عربی مسائل قرآن و انبیاء علیہم السلام کے قصوں سے جو خداوند تعالیٰ نے بندوں کے فائدہ کیلئے اپنے کلام پاک میں بیان فرماتے ہیں ناواقف محروم رہتے ہیں۔ اور مشاغل دنیوی کی تعب کیسی باہر استاد سے سبقاً پڑھنے کی فرصت نہیں پاتے عام مسلمانوں کی آسانی اور فائدہ کیلئے قرآن مجید کے تمام قصوں عام فہم اور سلیس اُردو زبان میں تفصیل اور ربط کیساتھ بیان کئے ہیں۔ تمام مسلمان بھائی گھر بیٹھے اس کے مطالعہ سے اپنی واقفیت حاصل کر کے محظوظ اٹھاویں قصے نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں جو ناول یا حکایات پڑھنے کے شائق ہیں انہیں چاہیئے کہ فضول اور فرضی قصوں کی بجائے قصص القرآن دیکھیں

کلام شبلی ۔ باتصویر۔ اس مجموعہ میں مولینا شبلی (مرحوم) کی قومی اور تاریخی نظمیں درج کی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ سرورق رنگدار قیمت..

رباعیات سرمد ۔ سرمد شہید رحمتہ اللہ علیہ کی رباعیات کا مجموعہ ہے جو بڑی تلاش سے دستیاب ہوئی ہیں۔ اور شرح مع الخمری دی گئی ہے لکھائی چھپائی عمدہ پاکٹ سائز کاغذ ولایتی۔ قیمت..

مسدس حالی ۔ مصنفہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی کا یہ مجلد پاکٹ ایڈیشن نہایت خوبصورت ہے۔ اس میں حسب موقع رنگین نقشے بھی چھاپے گئے ہیں شروع میں مولینا کا فوٹو بھی دیا ہے قیمت صرف..........

انتخاب جدید کامل یہ مختلف قومی نظموں کا مجموعہ ہے جتنی قومی نظمیں آجتک کہیں بھی ہند میں چھپی ہیں انہیں سے اس مجموعہ میں کوئی نظم نہیں ہے۔

قومی ترانے یعنی نامی گرامی شعراء کے قومی جذبات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مشہور و معروف شعراء کے قومی ترانے درج کیے گئے ہیں۔ سائز وہی ہے جو تمام کتابوں کا ہے۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ باوجود اتنی خوبیوں کے قیمت صرف

غزلیات اُردو ۔ یہ مجموعہ اپنی خوبیوں میں لاجواب ہے۔ اس میں مشہور و معروف شعراء کے چیدہ چیدہ غزلیات اُردو درج ہیں :۔ مثلاً۔ اقبال حالی۔ اکبر وغیرہ اس مجموعہ کی ایک ایک غزل قابلدید ہے۔ حصہ اول چھپ کر تیار ہے۔

کتاب	اصلی قیمت	رعایتی
قصص القرآن	عہ	۱۲
کلام شبلی	۱۲	۹
رباعیات سرمد	۴	۳
مسدس حالی	۴	۳
انتخاب جدید کامل	۴	۳
قومی ترانے	۸	۶
غزلیات اُردو	۸	۶

ملنے کا پتہ :۔

مرغوب ایجنسی لاہور (چوک متی)

قیمت سالانہ چھ روپے — رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ — قیمت ششماہی عہ فی پرچہ ۱۰ر

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔اے (علیگ)

ایڈیٹرز:

سید عابد علی عابد بی۔اے — محمد اسمٰعیل — محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۶ — اشاعت ماہ فروری ۱۹۲۵ء — نمبر ۲

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

ادب اردو نے اپنے موجودہ دور میں جو فروغ حاصل کیا ہے۔ اُس کا تقاضا تھا کہ مختلف اصول و فروعِ ادب کے پہلو بہ پہلو تنقید کا بھی کوئی معقول معیار قائم ہوتا۔ کیونکہ جس طرح کسی قوم کی ترقی کا نتیجہ ایک مسلّمہ معیارِ اخلاق کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی مُلک کے جمہور میں ادب کی اشاعت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک رائے عامہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس رائے عامہ کے نمائندے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں رسائل و جرائد کی عنانِ ادارت ہوتی ہے۔ اور ان کے لئے نیک نیتی اتنی ہی ضروری ہے جتنی مصلحینِ اخلاق کیلئے کیونکہ عوام اپنے خیالات و آرا کی تکمیل و تہذیب کا فرض اُن کے ذمے کر دیتے ہیں۔

لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے یہاں بسم اللہ ہی غلط ہوتی۔ رسالے کثیر تعداد میں جاری ہونا شروع ہُوئے تو اُردو کے خیر خواہوں نے اُن کو شگونِ نیک سمجھ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ لیکن ان رسالوں کے اربابِ حل و عقد اس سے ناجائز فایدہ اُٹھا کر اور اخلاق کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر باہمی خصومتوں اور خداواسطے کی دشمنیوں میں پڑ گئے۔

خود غرضی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی زبان اور اپنے ادب کی آئندہ کی بہبودی کا خیال کرتے ہُوئے ہم اس غیر ذمہ دارانہ فعل کی ایک مثال آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔

ہزار داستان کی کسی گزشتہ اشاعت میں نوبہار پر ایک مخلصانہ تنقید کی گئی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جمہور کچھ فایدہ حاصل کر سکیں۔ اور ساتھ ہی ہمارا ایک معاصرانہ فرض ادا ہو جائے۔ اس تنقید سے متاثر ہو کر معزز ہمعصر نوبہار نے خلاصۃ الرسائل کے تحت میں ہزار داستان پر بیجا اعتراضات کا ایک جھاڑ باندھ دیا ہے۔ "نوشتہ خونیں" کے متعلق نوبہار رقمطراز ہے۔ "انور عیاش نہ تھا۔ اسے طوائفوں میں جانے کا مرض نہ تھا۔ پھر انجمن آرا کو اس سے ملنے کے لئے طوائف بننے کی کیا ضرورت تھی" افسوس ہے کہ مدیر نوبہار تعصباتِ ذاتی سے اسقدر متاثر ہوئے کہ اعتراض کرتے وقت آپ کو ان سطور کا بھی خیال نہ رہا۔ جو وہ خود اپنے رسالے میں نقل کر چکے ہیں۔ اور جنھیں انجمن آرا کے طوائف بن جانے کی کافی وجہ موجود ہے۔ "تاکہ نثار غیرت کی وجہ سے مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ اور تم مجھ سے مل سکو۔"

ایک بالغ نظر مدیر کے لئے یہ کورچشمی باعثِ ننگ و عار ہے۔

آگے چلکر لکھتے ہیں۔ "اس افسانے کا آخری حصّہ بہت کمزور ہے۔ زبان بھی بہت بے تکی ہے۔ عابد صاحب بھی اُردو ئے جدید کے پرستاروں میں معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد افسانے میں سے چند جدّت آمیز تراکیب نقل کی گئی ہیں۔

پھر رقمطراز ہیں۔"اس کے علاوہ اور بہت سی زبان کی غلطیاں بھی ہیں" بہ اعتبارِ فن مندرجہ بالا اعتراضات کو جو وقعت حاصل ہے، وہ اربابِ بصیرت پر روشن ہے۔کاش مدیر صاحب موصوف تصریح فرماتے کہ "آخری حصّے کے کمزور ہونے" کے کیا معنے ہیں۔ اس طرح ہم لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی یہ سمجھ نہ سکے۔کہ زبان "بے تکی" کس طرح ہو جاتی ہے۔اگر مدیر موصوف کے نزدیک جدت آمیز تراکیب کا استعمال زبان "بے تکی" کر دیتا ہے۔تو ہم ان کے متعلق صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔اس قسم کی تراکیب نفس موضوع اور ترتیب واقعات کے مختلف عناصر میں رنگ آمیزی کرنے کے لئے اشد ضروری ہیں۔اور یہ اعتراض کہ اس قسم کی تراکیب سے زبان "بے تکی" ہو جاتی ہے۔اس قسم کا اعتراض ہے جیسے کوئی کہے کہ روٹی کھانے سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔اور اس محیر العقل نظریے کی صداقت کے متعلق کوئی استدلال پیش نہ کرے۔باقی رہا زبان کی غلطیوں کے متعلق تو سردست مدیر موصوف نے کوئی غلطی نکال کر نہیں دکھائی۔جس وقت وہ کوئی فقرے ایسے پیش کرینگے جو محاورے کے خلاف ہوں تو جواب دینے کی طرف اعتنا کیا جائیگا۔لیکن ہم اس جگہ جتا دینا چاہتے ہیں۔کہ اب پنجاب اُردو کا مخزن ہے۔اور اہل پنجاب پر سرحد پنجاب کے اس پار رہنے والوں کو قطع نظر اس سے کہ وہ دہلی اور لکھنؤ کے باشندے ہوں یا میرٹھ اور علیگڈھ کے رہنے والے محض اس وجہ سے کوئی تفوق نہیں پہنچتا۔کہ وہ اتفاق سے ان مقامات میں پیدا ہوگئے۔اور کسب علم وفضل کے بغیر "اہل زبان" بن بیٹھے۔ہم اس جگہ اس بحث کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتے۔کیونکہ ہمارے مکرم دوست جناب "ڈرامی" کا ایک "طنزیہ افسانہ" "ایک کہانی کی رام کہانی" کے عنوان سے شریکِ اشاعت ہے۔

(جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔کہ جناب ڈرامی کا روئے سخن صاحبِ مذاق "اہلِ زبان" سے نہیں)

غزلیات کے جلی ہونے کے متعلق عملہ ادارت کو کلی طور پر اختیارات حاصل ہیں۔اور مدیر نوبہار کا مشورہ اگر ذاتی حملے کی صورت میں نہ ہوتا تو ہزار داستان کا عملہ ادارت شاید اس پر غور کرنا ضروری خیال کرتا۔

"مصوّر" کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔کہ "کوئی شعر ایسا نہیں جس کا مفہوم صاف ہو" ہمیں مدیر موصوف سے توقع تھی۔کہ فنون لطیفہ کے مبادیات سے وہ ضرور واقف ہونگے۔یہی فرض کر کے "ہیگل کے فلسفۂ فنونِ لطیفہ" کا ترجمہ شروع کیا گیا تھا۔ لیکن جیسا انہوں نے عملی طور پر اپنی تنقید سے ثابت کر دیا ہے۔مدیر موصوف اس علم کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کے باعث اس سے استفادہ کی صلاحیت نہیں رکھتے۔اور اس لئے نظم "مصوّر" کے معانی سمجھنے سے قاصر رہے۔

"شباب کی بیداری" میں مدیر موصوف کو صرف "اہ۔ جی" نظر آتی ہے۔یعنی آپ اس نفسیاتی نکتے سے بے خبر ہیں۔کہ خاص خاص موقعوں پر انسان کے جذبات میں کئی چیزوں مثلاً خوشبو۔موسیقی وغیرہ کے تحرک سے ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے

یہی نکتہ شباب کی بیداری میں مرکوز ہے۔

" حسن انتقام " کے متعلق بھی اسی طرح کا بیجا اعتراض کیا گیا ہے۔ کہ ایسے افسانوں کو ایشیائی رنگ میں رنگ لینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اُردو دان پبلک اُن سے مستفید نہیں ہو سکتی۔ شاید مدبر موصوف کے نزدیک تمام اردو دان پبلک سمٹ سمٹا کر محض ان کی ذاتِ مبارک میں سما گئی ہے۔ کیونکہ ان کے علاوہ ہر ایک شخص اس افسانے سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ اور اس قسم کی شکایت اور کہیں سے موصول نہیں ہُوتی۔ ہم اس افسانے کے متعلق دریا بہ حباب اندریں کافی طور پر وضاحت کر چکے تھے۔ لیکن شاید مدبر موصوف ان " فن کی باتوں " کو سمجھ نہیں سکتے۔

'**شہزادہ مسرور**' آسکر وائلڈ کی اُن کہانیوں میں سے ایک کا ترجمہ ہے۔ جن کی نسبت اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ " یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ یہ کہانیاں بچوّں کے لئے ہیں۔ انگلستان کے بچّے تو کیا' بڑے بُوڑھے بھی ان کو نہیں سمجھ سکتے۔"

یہ قول اگر اُس انانیّت پر مبنی تھا جو اُس کی فطرت کا جزو اعظم تھی۔ تو اس کے ساتھ ہی صداقت سے بھی لبریز تھا۔ زندگی اور زندگی کے مختلف اہم مسائل کی نسبت آسکر وائلڈ کے اقوال چاہے کتنے ہی تصنع سے پُر کیوں نہ ہوں، تاہم وہ اپنے متعلق جو کچھ کہتا تھا، وہ چونکہ ایک خود شناس شخص کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ اس لئے عین حقیقت ہوتا تھا۔ اور ہم اُسے دروغگوئی کا احتمال کئے بغیر تسلیم کر سکتے ہیں۔

اور کہانیاں تو بجائے خود رہیں' آپ اس کہانی ہی میں دیکھیں گے کہ بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا ننھے بچوں کا دِل بہلانے کے لئے ایک دلچسپ کہانی تراشی گئی ہے۔ جس کی سب سے زیادہ خوبی یہ ہے۔ کہ وہ جُھوٹی ہے۔ لیکن اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ اس کہانی کے قالب میں مُصنّف نے کس حقیقت کی رُوح ڈھال دی ہے۔ آسکر وائلڈ کی ہر بات میں یہ بات ہوتی تھی۔ کہ ظاہر میں دروغ لیکن فی الاصل ایک صاحب نظر اور صاحب ذوق کے مشاہدات اور آراء کا خلاصہ۔ اُس کی شخصیت بھی عین اسی طرح کی تھی۔ دُنیا نے اُس کے ظاہری افعال و اقوال سے دھوکا کھا کر اُسے ننگ زیست تصوّر کرنے سے دریغ نہ کیا۔ لیکن کسی نے اُس کی فطرت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کی۔ کوئی اتنی عمیق نظر سے کام لیتا تو دیکھتا کہ اس نظر فریب سراب کی تہ میں حقیقت و صداقت کے کیا کیا لعل و جواہر پنہاں ہیں۔

وہ جس کا دماغ ایک عظیم الشان دیوانگی، جس کی فطرت ایک عجیب و غریب معمّا، جس کی رُوح ایک شاندار گناہ تھی۔ یہاں دردِ دل اور انسانی ہمدردی کی غیر فانی حقیقتوں کا گیت گا رہا ہے! وہ جس نے زندگی کے مظاہر کو ایک فانوس خیالی کی گوناگوں شکلوں سے زیادہ نہ سمجھا۔ یہاں اپنی آنکھوں سے فریبِ خیال کی زرّیں نقاب اُٹھا کر انسانی فطرت کے اُس ازلی حُسن یعنی محبت سے دوچار ہوتا ہے۔ ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا!

ٹیگور کی ہمہ دانی کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی کہ اصنافِ ادب میں مشکل سے کوئی صنف ایسی ملے گی جس میں اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اور اُسے حدِّ کمال تک نہ پہنچا دیا ہو۔ لیکن اُس کی شاعری سب پر مقدم ہے۔ وہ اپنی کسی تحریر میں اُس رنگینی اور ترنّم کو جو شاعری کی جان ہیں۔ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ کثرتِ استعمال نے اِن الفاظ کا وقار کھو دیا ہے۔ ورنہ ٹیگور کے اندازِ تحریر کے لئے اس سے بہتر لفظ نہیں مل سکتے۔ اور نہ ٹیگور سے بہتر کسی اور ادیب کے اندازِ تحریر پر ان کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ "بہشت بازار" کو دیکھئے، یہ افسانہ صرف ایک شاعر کا نتیجۂ طبع ہو سکتا تھا۔ وہ عشرتِ خیال میں محو رہنے والا انسان جسے عالم الارواح کے اربابِ اختیار نے غلطی سے جنّت کے زندانخانے میں گرفتار کر دیا ہے۔ جہاں اُسے عمل کی اذیّتوں سے نجات نہیں ملتی۔ وہ انسان جب دیکھتا ہے کہ یہ جنّت میرے خوابِ زندگی کی تعبیر نہیں کیونکہ مَیں نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد   کسے را با کسے کارے نباشد

اور یہ اُس کے بالکل برعکس ہے"۔ تو وہ اُن کاموں کی انجام دہی سے جو اُسے تفویض کئے گئے ہیں۔ بے نیاز ہو کر ریاضِ خلد کی ایک روش پر ایک بیجان پتھر کی طرح پڑ رہتا ہے۔ اور جس طرح پتھّر پر کائی جم کر بیل بوٹے بنا دیتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی جنّتی محبوبہ کے پاؤں کو نقش و نگار سے آراستہ کرنا اپنا مرغوب مشغلہ بنا لیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جنّت سی کاروباری دُنیا میں ایسے "بے عمل حسن پرست" کی ضرورت نہیں۔ رضواں کو چاروناچار اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اور اس نقش و نگار کے دلدادہ کو جنّت کے حریمِ قدس سے نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ نکلتا ہے تو اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر

ٹیگور کے ساتھ آسکر وائلڈ کا نام لینا شاید بعض لوگوں کے نزدیک عرش و فرش کا مقابلہ ہو۔ لیکن کہنا پڑتا ہے کہ ٹیگور کے سوا اگر کسی کے ذہن میں یہ لطیف تصوّر آ سکتا تھا۔ تو وہ آسکر وائلڈ تھا۔

ایڈیٹر

شہزادہ مسرور

شہر سے بلند، ایک سربفلک مینار پر شہزادہ مسرور کی مورت کھڑی تھی۔ اُس نے سونے کی نازک نازک پتّیوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی جگہ دو چمکیلے نیلم تھے۔ اور اُس کی تلوار کے دستے پر ایک سُرخ لعل دمکتا تھا۔

لوگ اُس کی بیحد تعریفیں کیا کرتے۔ شہر کے بلدیہ کے ایک ممتاز رکن نے جسے مذاقِ سلیم کی شہرت حاصل کرنیکا بہت شوق تھا۔ اس پر رائے زنی کرتے ہُوئے کہا۔

"یہ مورت ایک بادنما کی طرح خوبصورت ہے۔" پھر اُس نے یہ سوچ کر کہ کہیں لوگ اُسے ایک بے عمل حُسن پرست نہ خیال کرلیں۔ اپنی رائے میں اتنی ترمیم کر دی۔ کہ "ہاں ویسی مفید نہیں۔"

ایک عقلمند ماں نے اپنے ضدّی بچے کو چُپ کرانے کے لئے جو چاند کے لئے رو رہا تھا۔ اُس سے کہا "تم شہزادہ مسرور جیسے کیوں نہیں بن جاتے؟ وہ تو کبھی کسی چیز کے لئے نہیں روتا۔"

ایک شکستہ دل نے جب اس حیرت خیز مورت کو دیکھا تو اس نے یہ کہکر اپنے مایوس دل کو تسلّی دے لی۔

"آہ میں خوش ہوں کہ دُنیا میں کم ازکم ایک انسان کو تو پوری خوشی حاصل ہے۔"

یتیم بچّے جب اپنی ڈھیلی ڈھالی وردیاں پہنے یتیم خانے سے نکلتے، تو مورت کو دیکھ دیکھ کر کہتے۔ "مورت کیا ہے۔ آسمان سے فرشتہ اُتر آیا ہے۔"

ریاضی کا اُستاد اُن سے پوچھتا۔ "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ تم نے کبھی کوئی فرشتہ دیکھا بھی ہے؟"

بچّے جواب دیتے۔ "ہاں خواب میں دیکھا ہے۔" اور ریاضی کا اُستاد ماتھے پر بل ڈال لیتا، اور تیوری چڑھا لیتا کیونکہ اُسے بچّوں کا خواب دیکھنا پسند نہ تھا۔

ایک رات ایک ابابیل اُس شہر میں اُڑتی ہوئی آئی اُس کی ہمجولیوں کو مصر گئے ہُوئے چھ ہفتے ہو چکے تھے۔ مگر وہ اُن کے ساتھ نہ گئی تھی۔ کیونکہ اُسکی سہلی نَے مصر جانے پر رضامند نہ تھی۔ بہار کے شروع میں ایک دن دریا کی سطح پر ایک پتنگے کے تعاقب میں اُڑتے ہُوئے اُسنے نَے کو دیکھا تھا۔ اور اُس کی لچکدار کمر اُس کے دل کو ایسی بھائی کہ وہ اُس سے باتیں کرنے کو ٹھہر گئی۔

اُس نے کوئی تمہید اُٹھائے بغیر پُوچھا۔ "میں تمہاری

سہیلی بن جاؤں۔" اور نے نے ایک دلنواز انداز سے سر خم کر کے رضامندی ظاہر کی۔ پھر وہ اپنے پروں کے سروں سے پانی کو چھوتی ہوئی اور اُس کی سطح پر ہلکی ہلکی لکیریں کھینچتی ہوئی اُس کا طواف کیا کرتی۔ یہ تھی اُس کی اُلفت، اور ساری گرمیوں اُس کا یہی کام رہا۔

اُس کے بھائی بند ہنستے تھے اور کہتے تھے: "یہ نرالا سہیلپن ہے!" اور پھر جب خزاں آئی تو اس کے بھائی بند اُسے اکیلا چھوڑ کر چل دئے۔

جب وہ چلے گئے، تو اس کا جی اُداس ہو گیا اور اپنی پیاری سہیلی کی طرف سے اُس کی طبیعت بھر گئی۔ وہ سوچتی "اُسے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ اور خدا نہ بھلائے وہ بڑی حسن فروش ہے۔ جبھی تو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ یہ چاؤ چوچلے کیا کرتی ہے۔" اور حقیقت میں جب ہوا کے جھونکے چلتے تو نے بڑے دلفریب نازو انداز سے اُن کے ساتھ چلیں کیا کرتی۔

پھر وہ یہ بھی سوچتی: "میں نے مانا وہ خانہ نشین عورت ہے۔ مگر مجھے سیر و سفر کا شوق ہے۔ اس لئے میری سہیلی کو بھی سیر و سفر کا شوق ہونا چاہئے۔"

اُس نے اتمامِ حجت کے لئے آخری مرتبہ اس سے پوچھا: "کہو، تم میرے ساتھ چلو گی؟" لیکن نے نے اپنا سر ہلایا اور کچھ نہ کہا۔ اُسے اپنا گھر بہت پیارا تھا۔

ابابیل غصّے میں آکر چلّا اٹھی: "ہمارا آج تک ساتھ ہونا تھا ہو چکا۔ لو اللہ بیلی۔ اب میرا بسیرا اہرامِ مصر پر ہوگا" اور یہ کہکر وہ اڑ گئی۔

دِن بھر وہ اُڑا کی۔ اور جب رات ہوئی۔ تو وہ اس شہر میں پہنچی۔ اور سوچنے لگی۔ "اب میں رات کہاں گزاروں؟ شہر والوں نے تو معلوم ہوتا ہے میرے خلاف تیاریاں کر رکھی ہیں۔ مجھے رات کاٹنے کے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔"

یکایک اُسے ایک اُونچے مینار پر ایک مورت نظر آئی۔

اُس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔

وہ پکار اُٹھی۔ "یہ مورت میرا رین بسیرا ہوگی۔ کیا پُر فضا مقام ہے۔ اور کیسی کھلی ہوا ہے۔"

اور وہ شہزادۂ مسرور کے پاؤں کے درمیان اُتر آئی۔

اُس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اور خوش ہو کر کہا: "اہا! میں ایک سونے کی مسہری پر سوؤنگی۔" لیکن ابھی اُس نے اپنا سر پروں کے نیچے چھپایا ہی تھا کہ پانی کی ایک بڑی سی بوند اُس پر پڑی۔ وہ حیران ہو گئی۔ "عجیب بات ہے! آسمان پر کہیں بادل کی صورت نظر نہیں آتی۔ تارے چمک رہے ہیں۔ پھر یہ مینہ کہاں سے آ گیا؟ شمال کی آب و ہوا سچ مچ بڑی خطرناک ہے۔ نے کو مینہ پسند تھا۔ مگر وہ تو اُس

کی خود غرضی تھی۔"

پھر ایک اور بوند ٹپکی۔

اُس نے اپنے جی میں کہا۔ "آخر اس مورت کا فائدہ کیا ہُوا۔ جب وہ مجھے مینہ سے نہیں بچا سکتی ؛ چلکر کوئی اور جگہ ڈھونڈھ نکالنی چاہیئے۔"

لیکن ابھی اُس نے پر نہ کھولے تھے کہ ایک تیسری بوند ٹپکی۔ اور اُس نے اُوپر کو آنکھ اُٹھا کر دیکھا ــــ تو کیا دیکھتی ہے، کہ شہزادہ مسرور کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو برس رہے ہیں۔ اور اُس کے سُنہرے رخساروں پر آنسوؤں کی ایک ندّی جاری ہے۔ چاندنی میں اُس کا چہرہ ایسا خوبصورت نظر آرہا تھا کہ ابابیل کو اُس پر رحم آگیا۔

اُس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"مَیں شہزادہ مسرور ہوں۔"

"تو پھر تم روتے کیوں ہو؟ تم نے تو مجھے تمام بھگو دیا ہے۔"

شہزادہ مسرور نے جواب دیا۔ "جب مَیں زندہ تھا اور میرے سینے میں ایک اِنسانی دِل حرکت کرتا تھا تو مَیں نے کبھی خواب میں نہ دیکھا تھا کہ آنسو کس چیز کا نام ہے۔ کیونکہ مَیں عشرت محل میں رہتا تھا۔ جہاں غم کو آنے کی اجازت نہیں۔ دن بھر مَیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باغ میں کھیلا کرتا اور جب شام ہوتی تو مَیں عشرت محل میں جا کر ناچ رنگ میں مشغول ہو جاتا۔ باغ کے چاروں طرف ایک اونچی دیوار کھڑی تھی۔ لیکن مَیں نے کبھی یہ پُوچھنے کی پروانہ کی کہ اُس کے باہر کیا ہے۔ وہ خوبصورت باغ ہی میرے لئے سب کچھ تھا۔ میرے درباری مجھے شہزادہ مسرور کہتے تھے۔ اور مَیں حقیقت میں مسرور تھا۔ اگر عشرت کو مسرت کہا جا سکتا ہے اس طرح صبح ہوتی تھی اور شام ہوتی تھی۔ اور اسی طرح ایک دن میری زندگی تمام ہوگئی۔ اور اب مَیں مر گیا ہوں۔ تو لوگوں نے مجھے اتنی بلندی پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ کہ اپنے شہر کی شکستہ حالی کا سماں ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ اور اگرچہ میرا دل سونے کا ایک ٹکڑا ہے، مگر اُس میں احساس ہے، اور یہی احساس میرے رونے کا باعث ہے۔"

ابابیل نے اپنے جی میں کہا۔ "ہیں، یہ سونے کی بنی ہُوئی ٹھوس مورت نہیں!" انتہائی تعجّب کی بدحواسی میں یہ الفاظ اُس کے مُنہ سے بلند آواز میں نکل گئے۔

مورت نے ایک دھیمی اور سریلی آواز میں کہا۔ "دور، بہت دور، ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک ٹوٹا پھُوٹا مکان ہے۔ اسکی ایک کھڑکی میں سے مجھے ایک عورت ایک میز کے اُوپر جھکی ہُوئی نظر آتی ہے اُس کا چہرہ زرد پیلا ہے۔ اور اُس کے سُرخ ہاتھ سوئی کے چُبھنے سے چھلنی ہو رہے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک غریب درزن ہے۔ اور سی پرو کر اپنا پیٹ پالتی ہے۔ وہ اس وقت ملکہ کی سب سے پیاری کنیز کے سایہ پر بیل بوٹے کاڑھ رہی

ہے۔ کیونکہ کل اُس کنیز کو دربار میں ناچنا ہے کمرے کے ایک کونے میں ایک ٹوٹی ہُوئی کھاٹ پر ایک پھٹا پُرانا بستر بچھا ہے۔ جس پر اُس کا بچّہ بیمار پڑا ہے۔ وہ تپ کے مارے نڈھال ہے۔ اور نارنگیوں کی رٹ لگا رہا ہے۔ اُس کی ماں کے پاس دریا کے پانی کے سوا کچھ نہیں، اور اس لئے وہ ضد میں آکر چیختا اور چلّاتا ہے۔ ابابیل، ابابیل، اچھی ابابیل، تم میری تلوار کے دستے میں سے یہ لعل نکال کر اس کے پاس نہ لیجاؤ گی؟ میرے پاؤں حرکت نہیں کرتے۔ ورنہ مَیں خود جاتا"

ابابیل نے جواب دیا "میرے بھائی بند مصر میں میرا انتظار کر رہے ہونگے۔ وہ دریائے نیل کی سیر کا لطف اُٹھا رہے ہونگے۔ اور کنول کے پھولوں سے اِدھر اُدھر کے تذکرے چھیڑ رہے ہونگے۔ جلد ہی وہ بادشاہ کے مقبرے میں جاکر سو جائینگے۔ بادشاہ پیلے رنگ کا کتان پہنے، اور خوشبودار مسالے لگاتے ہوئے کھڑا ہے۔ اُس کے گلے میں مروارید کی ایک مالا ہے۔ اور اُس کے ہاتھ مرجھاتے ہُوتے پتّوں کے سے ہیں۔"

"ابابیل، ابابیل، اچھی ابابیل۔ کیا سچ مچ تم آج کی رات یہاں نہ رہوگی۔ اور میری پیامبر نہ بنو گی؟ ایک ننھی سی جان پیاس کے مارے سوکھی جاتی ہے۔ اور اُس کی ماں غم سے بیحال ہو رہی ہے۔"

ابابیل نے جواب دیا۔ "مجھے لڑکوں سے پیار نہیں پچھلی گرمیوں جب مَیں دریا کے کنارے رہتی تھی۔ تو دو شریر لڑکے مجھ پر ہمیشہ پتّھر پھینکتے رہتے تھے۔ اگرچہ مَیں نے ہر وقت چوکنّا رہنے کے باعث اُن کا کوئی پتّھر اپنے کو لگنے نہیں دیا۔ لیکن اُن کی نیّت تو نیک نہ تھی"۔

یہ سُنکر شہزادہ مسرور کی صورت کچھ ایسی غمگین ہوگئی کہ ابابیل کو اپنے انکار پر پشیمانی ہُوئی۔ اُس نے کہا۔ "یہاں بڑی سردی ہے۔ مگر خیر، مَیں تمہاری خاطر آج کی رات یہاں رہونگی۔ اور تمہاری پیامبر بنونگی"۔

شہزادے نے کہا۔ "پیاری ابابیل مَیں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں"

پس ابابیل نے شہزادے کی تلوار سے لعل نکالا۔ اور اُسے چونچ میں دبا کر شہر کی سنسان چھتوں کے اُوپر اُڑنے لگی۔

وہ گرجا گھر کے مینار کے پاس سے گزری، جس پر فرشتوں کی مرمری مُورتیں نصب تھیں۔ وہ محل کے پاس سے گزری جہاں سے ناچ گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بالاخانے پر ایک حسین لڑکی اپنے عاشق کے آغوش میں کھڑی تھی۔ عاشق آسمان کی طرف نظریں اُٹھائے ہُوئے کہہ رہا تھا۔ "اہا، ستارے کیسے حیرت انگیز ہیں۔ مگر محبّت کی قوّت اُن سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔"

لڑکی بولی۔ "مجھے امید ہے میرا سایہ کل تک تیار ہو جائیگا۔ مَیں نے اُسے گلکاری کے لئے دے رکھا ہے۔

مگر یہاں کی مزنیں بڑی سُست ہیں "

پھر وہ دریا پر سے گزری۔ اور اُس نے جہازوں کے مستولوں پر لالٹینیں لٹکی ہوئی دیکھیں۔

اس کے بعد وہ ایک بازار کے اُوپر سے گزری۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ یہودی آپس میں خرید و فروخت کر رہے ہیں۔ اور ترازوؤں میں نقدی تول رہے ہیں۔

آخرکار وہ اُس ٹوٹے پھوٹے مکان میں پہنچی۔ جہاں اُسے جانا تھا۔ اور اُس نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ لڑکے کو بخار کی شدّت سے کسی پہلو چین نہ پڑتا تھا۔ اور ماں محنت اور کلفت کی تکان سے مغلوب ہو کر بیٹھے ہی بیٹھے سو گئی تھی۔

وہ پھدک کر اندر ہولی۔ اور اُس نے عورت کے انگشتانے کے قریب وہ لعل رکھ دیا۔ پھر وہ بیمار لڑکے کو اپنے پروں سے پنکھا جھلتی ہوئی بستر کے اردگرد ہولے ہولے اُڑنے لگی۔ لڑکے نے کہا۔ "اہا کیسی اچھی ٹھنڈی ہوا ہے! اب مَیں اچھا ہو جاؤنگا۔" اور وہ آرام کی نیند سو گیا۔

پھر ابابیل شہزادہ مسرور کے پاس لوٹ آئی۔ اور اُس کو سارا حال کہہ سُنایا۔ وہ حیران ہو ہو کر کہتی تھی۔ "ابھی مجھے اتنی سردی لگ رہی تھی۔ اور اب سردی کا نام بھی نہیں!"

شہزادے نے جواب دیا۔ "یہ اس لئے کہ تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔" اور ابابیل اس بات پر غور کرنے لگی۔ اور غور کرتے کرتے میٹھی نیند سو گئی۔ غور کرنے سے اُسے ہمیشہ نیند آجاتی تھی۔

دن چڑھے وہ اُٹھی اور ندی نہانے گئی۔ تندلات طیور کے ایک عالم نے جو ندی کے پل پر سے گزر رہا تھا تعجب سے کہا۔ "سردیوں کے موسم میں ایک ابابیل! کیسی عجیب بات ہے!"

اور اُس نے اس عجیب و غریب واقعے کے متعلق ایک طول طویل خط لکھ کر ایک مقامی اخبار میں شائع کرایا۔ وہ خط دیکھتے دیکھتے ہر خاص و عام کے زبان زد ہو گیا۔ مگر اصلی مطلب کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ اُس میں مشکل اصطلاحوں کی بھرمار تھی۔

ابابیل نے اپنے جی میں سوچا۔ "آج مَیں مصر جاؤنگی" اور وہ اس خیال سے بیحد خوش تھی۔ اُس نے تمام قابلِ دید مقامات کی سیر کی۔ اور گرجا گھر کے مینار پر دیر تک بیٹھی رہی جہاں کہیں جاتی چڑیاں چوں چوں کر کے ایک دوسری سے کہتی تھیں۔ "کیا شاندار پرندہ ہے!" اور وہ یہ سُن کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔

جب چاند نکلا تو وہ شہزادہ مسرور کے پاس پہنچی۔ "مصر میں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو کہئے۔ مَیں اب جاتی ہوں۔"

شہزادے نے کہا۔ ابابیل، ابابیل، اچھی ابابیل، تم آج کی رات اور یہاں نہ رہوگی؟"

ابابیل نے جواب دیا۔ "مصر میں میرے ساتھی میرا

انتظار کر رہے ہونگے۔ کل وہ دوسرے آبشار کے پاس پہنچ جائینگے۔ دریائی گھوڑے وہاں ناگر موتھوں کے درمیان لیٹے رہتے ہیں۔ اور سنگ مرمر کے ایک بڑے تخت پر ممنان دیوتا بیٹھا رہتا ہے۔ رات بھر وہ تارے گنا کرتا ہے۔ اور جب صبح کا ستارہ نکلتا ہے۔ تو وہ خوشی کی ایک چیخ مارتا ہے۔ اور پھر چپ ہو جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت ببر شیر گھاٹ پر پانی پینے آتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں سبز زبرجد کی سی ہیں۔ اور اُن کی گرج آبشار کے شور سے بھی زیادہ بلند ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "ابابیل، ابابیل، اچھی ابابیل، شہر کے اُس کنارے پر میں ایک نوجوان کو ایک خستہ حال کمرے میں دیکھتا ہوں۔ وہ ایک میز پر جھکا ہوا ہے۔ جس پر کاغذ بکھرے پڑے ہیں۔ اور اُس کے پاس ہی ایک پُرانے گلدان میں گلِ بنفشہ کا ایک کمھلایا ہوا گلدستہ ہے۔ اُس کے سر کے بال بھورے اور چرچرے ہیں۔ اور اُس کے ہونٹ ایک مرجھاتے ہوئے انار کی طرح سرخ ہیں۔ اور اُس کی بڑی بڑی آنکھیں مست اور خمار آلودہ ہیں۔ وہ ایک تھیٹر کے منیجر کی فرمائش پر ایک ڈرامہ لکھ رہا ہے۔ لیکن سردی کے مارے اُس کے ہاتھ ٹھٹھر گئے ہیں۔ اور اس سے لکھا نہیں جاتا۔ انگیٹھی میں نام کو ایک کوئلہ نہیں، اور فاقہ کشی نے اُس میں سکت نہیں رہنے دی۔"

نیکدل ابابیل نے جواب دیا۔ "میں آج کی رات اور تمہارے پاس رہونگی۔ آج بھی مجھے کوئی لعل لے جانا ہوگا؟"

شہزادے نے کہا۔ "افسوس، اب میرے پاس کوئی لعل نہیں بچا۔ لے دے کر صرف میری یہ بناوٹی آنکھیں رہ گئی ہیں۔ وہ نایاب پتھروں کی ہیں، جو مُدّتوں پہلے ہندوستان سے آئے تھے۔ ان میں کا ایک نیلم نکال لو۔ اور اُسے اُس کے پاس لے جاؤ۔ وہ اُسے جوہری کے ہاتھ بیچ دیگا۔ اور آگ اور خوراک خرید کر اپنا ڈرامہ ختم کر لے گا۔"

ابابیل نے کہا۔ "پیارے شاہزادے۔ مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔" اور وہ یہ کہکر رونے لگی۔ شہزادے نے کہا۔ "ابابیل، ابابیل، اچھی ابابیل، میں جس طرح کہتا ہوں اُسی طرح کرو۔"

پس ابابیل نے شہزادے کی آنکھ نکال لی۔ اور غریب مُصنّف کی طرف چل دی۔ اُس کے کمرے میں داخل ہونا نہایت آسان تھا۔ کیونکہ اُس کی چھت میں ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ وہ اُس سے گزر کر کمرے میں داخل ہوئی۔ نوجوان اپنی کہنی کے سہارے سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس لئے اس نے ابابیل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ نہ سُنی۔ اور جب اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو اُس کو بنفشہ کے مُرجھائے ہوئے پھولوں میں ایک خوشنما نیلم چمکتا ہوا نظر آیا۔

وہ پکار اُٹھا۔" اہا، لوگ میری قدر کرنے لگے ہیں یہ ضرور کسی قدردان کا عطیہ ہے۔ اب مَیں اپنا ڈرامہ اطمینان سے ختم کر لونگا" اور وہ بیحد خوش تھا۔

اُس کے دوسرے دن ابابیل بندرگاہ کی سیر کو گئی۔ وہ ایک بڑے جہاز کے مستول پر ہو بیٹھی۔ اور ملّاحوں کو سامان اُتارتے چڑھاتے دیکھتی رہی۔ ملّاح جب کوئی بوجھ اُٹھاتے تو" شاباش، شاباش" کا غل مچا دیتے۔

ابابیل نے پکار پکار کر کہا۔" مَیں مصر جانا چاہتی ہوں"، مگر کسی نے اُس کی بات نہ سُنی، اور جب چاند نکلا تو وہ شہزادے کے پاس پہنچی۔

اُس نے آتے ہی کہا۔" مَیں تمہیں خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔"

شہزادے نے کہا۔" ابابیل، ابابیل، اچھی ابابیل، تم آج کی رات اور یہاں نہ رہوگی؟"

ابابیل نے جواب دیا۔" اب جاڑوں کے دن ہیں اور آجکل یہاں برف پڑنا شروع ہو جائیگی مصر میں کھجوروں کے جھنڈ پر سورج اپنی پوری حرارت کے ساتھ چمکتا ہے اور مگرمچھ کنارے کی دلدل میں پڑے رہتے ہیں۔ اور مزے سے دھوپ سینکا کرتے ہیں۔ میرے ساتھی بعلبک کے آتشکدے میں گھونسلے بنا رہے ہیں۔ اور سُرخ و سفید قمریاں اُنہیں دیکھتی ہیں۔ اور اپنی بولی میں گٹک گٹک کر باتیں کر رہی ہیں۔ پیارے شہزادے اب مجھے جانا چاہیئے مگر مَیں تمہیں کبھی نہ بھولونگی۔ اور آنے والی بہار کو جب مَیں لوٹونگی تو تمہارے ان ہیروں کے بدلے میں جو تم نے غریبوں کو دیدئے ہیں۔ مَیں تمہارے لئے خوبصورت جواہرات لیتی آؤنگی۔ میرے لعل گُلِ لالہ کی سُرخی سے بھی سُرخ ہونگے۔ اور میرے نیلم سمندر کی نیلاہٹ سے بھی نیلے ہونگے۔"

شہزادے نے کہا۔" نیچے کے چوک میں ایک غریب لڑکی کھڑی ہے جو گھر سے دیا سلائیاں بیچنے نکلی تھی۔ اُس کی دیا سلائیاں نالی میں گر کر بھیگ گئی ہیں، اور اب کوئی اُنہیں نہ خریدیگا۔ اگر وہ اپنے گھر پیسے لیکر نہ گئی۔ تو اُس کا باپ اُسے پیٹیگا۔ اور وہ اس لئے رو رہی ہے اُس کے پاؤں میں جوتا ہے نہ موزے ہیں۔ اور وہ سر سے ننگی ہے۔ میری آنکھ میں سے یہ آخری نیلم نکال لے اور اُسے دے دے۔ پھر اُس کا باپ اُسے نہ پیٹیگا۔"

ابابیل نے جواب دیا۔" مَیں آج کی رات اور یہاں رہوں گی۔ مگر مَیں تمہاری آنکھ نہیں نکال سکتی۔ آہ پھر تو تم بالکل اندھے ہو جاؤ گے۔"

شہزادے نے کہا۔ ابابیل، ابابیل، اچھی ابابیل، مَیں جس طرح کہتا ہوں تُم اسی طرح کرو۔"

پس ابابیل نے شہزادے کی دوسری آنکھ بھی

نکال لی۔ اور اُسے چونچ میں دبا کر لے اُڑی۔ وُہ غریب لڑکی کے پاس سے تیر کی طرح گذر گئی۔ اور اُس کے ہاتھ میں نیلم پھینکتی گئی۔ لڑکی نے کہا۔ "اہا کیسا اچھا شیشہ ہے۔" اور وہ اُسے لیکر ہنستی ہُوئی گھر چلی گئی۔

پھر ابابیل شہزادے کے پاس پہنچی۔ اور بولی۔ "اب تم بالکل اندھے ہو۔ اس لئے مَیں ہمیشہ تمہارے پاس رہونگی"

شہزادے نے کہا۔ "نہیں، اچھی ابابیل، تمہیں مصر جانا چاہتے۔"

ابابیل نے جوابدیا۔ "مَیں ہمیشہ تمہارے پاس رہونگی اور وہ شہزادے کے قدموں میں لیٹی اور سوگئی۔ دوسرے دن وہ صبح سے شام تک شہزادے کے کاندھے پر بیٹھی رہی اور اُسے دُور دراز کے مُلکوں کے حالات سُناتی رہی۔ مصر کے وہ راج ہنس جو دریائے نیل کے کنارے قطاریں باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اور سُنہری مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ یونان کی وہ عجیب و غریب ساحرہ جس کی عمر دُنیا کی عمر سے کم نہیں۔ اور جو صحرا میں رہتی ہے۔ اور دُنیا کی ہر چیز جانتی ہے۔ وہ سوداگر جو اپنے اونٹوں کے ساتھ ہولے ہولے چلتے ہیں۔ اور کہربا کی تسبیحیں ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں۔ چاند کے پہاڑوں کا سردار جو آبنوس کی طرح سیاہ ہے۔ اور بلورین سانپوں کی پُوجا کرتا ہے۔ وہ کوہ پیکر اژدہا، جس نے کھجور کے ایک پیڑ میں اپنی بانبی بنا رکھی ہے۔ اور بیس پجاریوں کے ہاتھ سے شہد کی روٹیاں کھاتا ہے۔ اور وہ ٹھنگنے لوگ جو ایک جھیل میں چوڑے چوڑے پتّوں کی ناویں کھیتے ہیں۔ اور ہمیشہ تیتریوں سے لڑتے بھڑتے رہتے ہیں ان سب کو اُس نے دیکھا تھا۔ اور ان سب کے حالات وہ شہزادے کو سُنایا کرتی۔

شہزادہ کہتا تم مجھے عجیب و غریب چیزوں کے حالات سُناتی ہو۔ لیکن ان سب سے زیادہ عجیب و غریب انسانوں کی دُکھ بھری کہانی ہے۔ دُنیا کا کوئی راز مصیبت کے راز سے بڑھ چڑھ کر نہیں۔ اچھی ابابیل جاؤ میرے شہر پر اُڑ کر دیکھو، اور مجھے بتاؤ، تمہیں کیا کیا نظر آتا ہے۔"

پس ابابیل شہر کے اُوپر اُڑنے لگی۔ اور اُس نے دیکھا کہ دولت والے لوگ اپنے عالیشان مکانوں میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اور غریب لوگ دروازوں پر پڑے ہیں۔ وہ تنگ و تاریک گلیوں میں گئی۔ اور وہاں اس نے غریب بچّوں کے پیلے پیلے چہرے دیکھے جن پر فاقوں کی مُردنی چھائی ہُوئی تھی۔ اور جنکی نگاہیں اپنے سامنے کے تاریک خلا پر جمی ہُوئی تھیں۔ ایک پُل کی محراب کے نیچے دو چھوٹے چھوٹے بچّے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ہُوئے تھے۔ اور لپٹ لپٹ کر اپنے کو گرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا مُنہ دیکھ کر کہتے "بڑی

بھوک لگ رہی ہے۔" چوکیدار نے انہیں دیکھا۔ اور گرج کر بولا۔ "اٹھو یہاں نہ لیٹو۔" اور وہ اُٹھے۔ اور مینہ کی سیت میں کانپتے ہُوتے پھرنے لگے۔

پھر ابابیل اُڑ کر شہزادے کے پاس پہنچی اور جو کچھ اُس نے دیکھا تھا اُسے کہہ سُنایا۔

شہزادے نے کہا۔ "میرے جسم پر سونے کی نازک نازک پتّیاں ہیں۔ تم انہیں ایک ایک کر کے توڑ لو۔ اور میری غریب رعایا میں تقسیم کر دو۔ کیونکہ دُنیا والے سونے ہی کو راحت سمجھتے ہیں۔"

سونے کی نازک نازک پتّیاں ابابیل نے ایک ایک کر کے توڑ لیں۔ یہانتک کہ شہزادہ کے جسم پر لباسِ عریانی کے سوا کچھ نہ رہا۔ وہ اُنہیں لیجا کر غریبوں میں تقسیم کر دیتی اور اُنہیں لے کر بچّوں کے بے رونق چہرے گلاب کی طرح کِھل جاتے۔ اور وہ ہنستے اور گلی کوچوں میں کھیلنے کُودنے لگتے۔ اور خوش ہو ہو کر کہتے۔ "اب ہمیں کھانا مل جائیگا۔"

پھر برف پڑنے لگی۔ اور اپنے ساتھ کُہر کو بھی لے آئی۔ شہر کے در و دیوار یوں معلوم ہوتے تھے کہ چاند کے بنے ہُوتے ہیں۔ گھروں کی پر چھتیوں پر برف کی قلمیں بلّوریں خنجروں کی طرح لٹکنے لگیں۔ ہر کوئی سمور پہنے تھا' اور ننّھے بچّے سُرخ کنٹوپ اوڑھ کر برف پر پھسلا کرتے۔

غریب ابابیل پالے سے ٹھٹھری جاتی تھی۔ لیکن وہ شہزادے کا پہلو نہ چھوڑتی تھی۔ اُسے اس سے محبّت تھی۔ وہ نانبائیوں کی دکانوں سے روٹی کے گرے پڑے ٹکڑے چُن لیتی۔ اور اُنہیں کھا کر پیٹ بھرتی۔ اور اپنے پر پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر اپنے کو گرم رکھنے کی کوشش کرتی۔

لیکن آخر کار اُسے محسوس ہونے لگا۔ کہ اُس کا انجام قریب آپہنچا ہے۔ اب اُس میں صرف اتنی طاقت باقی تھی۔ کہ پھُدک کر شہزادے کے کاندھے پر جابیٹھے۔ اور وہ شہزادے کے کاندھے پر جا بیٹھی۔ اور آہستہ سے بولی "پیارے شہزادے' خدا حافظ' مجھے جانے سے پہلے اپنا ہاتھ چوم لینے دو۔"

شہزادے نے کہا۔ "اچھی بات ہے کہ تم مصر جارہی ہو تم یہاں بہت دیر تک رُکی رہی ہو۔ لو آؤ میرے ہونٹوں پر بوسہ دے لو۔ کیونکہ مجھے تم سے محبّت ہے۔"

ابابیل نے جواب دیا۔ "میں مصر نہیں جاؤنگی۔ موت کی سرزمین میں جاؤنگی۔ موت نیند کی بہن ہے' ہے نا؟"

اور اُس نے شہزادۂ مسرور کے ہونٹوں پر بوسہ دیا۔ اور اُس کے پاؤں میں گر کر دم توڑ دیا۔

اُس وقت مورت کے اندر سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی صدا آئی۔ شہزادے کا دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور یہ صدا اُسی کی صدا تھی۔ حقیقت میں کُہر بہت خطرناک تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے حاکم شہر اپنے مشیروں

کو ساتھ لئے اُس راہ سے گزرا۔ مورت پر اُس کی نظر پڑی تو وہ متعجب ہو کر بول اُٹھا۔ "میں شہزادے کو یہ کیا ہُوا۔ دیکھو وہ کیسا بھدّا معلوم ہو رہا ہے۔"

مشیروں نے جو ہر وقت حاکم کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی تھے، کہا۔ "ہاں، دیکھو کیسا بھدّا معلوم ہو رہا ہے!" اور وہ اسے بغور دیکھنے کے لئے مینار پر چڑھ گئے۔

حاکم نے کہا۔ "اس کی تلوار کے دستے کا لعل غائب ہے۔ اُس کی آنکھیں ندارد ہیں۔ اور اُس کا سارا سونا نہ جانے کہاں گیا۔ اب تو وہ ایک بھِک منگا معلوم ہوتا ہے۔"

مشیروں نے تائید کی۔ "ہاں اب تو وہ ایک بھِک منگا معلوم ہوتا ہے۔"

حاکم نے کہا اس کے پاؤں میں یہ پرندہ مرا پڑا ہے۔ ہمیں ایک اعلان شائع کرنا چاہئے۔ کہ آیندہ پرندوں کو یہاں نہ مرنے دیا جائے۔" اور منشی نے اس تجویز کو قلمبند کر لیا۔

پھر اُنہوں نے شہزادہ مسرور کی مورت گرا دی۔ جمالیات کے ایک ماہر نے اس کے متعلق یوں رائے زنی کی۔ "اب چونکہ وہ خوبصورت نہیں رہا، اس لئے وہ فایدہ مند بھی نہیں رہا۔"

پھر اُنہوں نے ایک بھٹی میں مورت کو گلا دیا اور حاکم شہر نے ارکانِ بلدیہ کی ایک مجلس منعقد کی۔ کہ اس دھات کو کس کام میں لایا جائے۔ اس نے تجویز کیا۔ "ہمیں ایک اور مورت بنوانی چاہئے۔ اور وہ مورت صرف میری مورت ہو سکتی ہے۔" ہر شخص نے حاکم شہر کے لفظ دُہراتے ہُوئے کہا۔ "وہ مورت صرف میری مُورت ہو سکتی ہے۔" اور وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ سُنا جاتا ہے کہ وہ ابتک لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

کارخانہ کے مہتمم نے بڑے تعجب سے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے کہ یہ ٹوٹا ہُوا دِل گلنے ہی میں نہیں آتا۔ اسے پھینکنا ہی پڑے گا۔" پس اُنہوں نے اُسے کوڑے کرکٹ کے ایک ڈھیر پر جہاں ابابیل کی لاش پڑی تھی پھینک دیا۔

خُدا نے اپنے ایک مقرّب فرشتے سے کہا۔ "جاؤ اس شہر کی دو سب سے زیادہ قیمتی چیزیں اُٹھا لاؤ۔" اور فرشتہ اُس مرے ہوئے پرندے اور ٹوٹے ہُوئے دِل کو لے کر حاضر ہُوا۔

خُدا نے کہا۔ "تم نے ٹھیک انتخاب کیا ہے میرے باغِ فردوس میں یہ پرندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گائے گا۔ اور قصرِ زرّیں میں شہزادہ مسرور میری حمد و ثنا کیا کریگا۔

نُور الھُدےٰ

غزل

آج دل سے ضبطِ غم کا حوصلہ جاتا رہا
آج دل ہم سے گیا گُزرا ہُوا۔ جاتا رہا

الفراق، اے فرصتِ عشق و محبت الفراق
وہ اُمنگیں مٹ گئیں، وہ حوصلہ جاتا رہا

الوداع اے آرزوئے چشمِ الفت الوداع
وہ طبیعت مرگئی۔ وہ ولولہ جاتا رہا

آج تا حدِ نظر خوش رنگ منظر ہیں تو ہوں
جن سے دلچسپی تھی وہ رنگ فضا جاتا رہا

آج سو سامانِ عشرت جلوہ گستر ہیں تو ہوں
اِک خوشی تھی چل بسی۔ اِک لطف تھا جاتا رہا

عالمِ حسرت ہے۔ کیا مسرور ہوں۔ کیا شاد ہوں
جو بنائے شوق تھا وہ سلسلہ جاتا رہا

وحشتِ دل سے نہ گھبراؤں تو آخر کیا کروں
جس سے لطفِ زیست تھا وہ مشغلہ جاتا رہا

ایک خوشوقتی کی صورت کیا مٹی۔ دل مرگیا
ایک دل کیا مرگیا۔ ہر حوصلہ جاتا رہا

کام کیا بگڑا کہ دل صرفِ ہجومِ یاس ہے
آس کیا ٹوٹی کہ جینے کا مزا جاتا رہا

اب وہ ربطِ چشمِ اُلفت ہے نہ ضبطِ حسن و عشق
سب ضرورت سے زیادہ اعتنا جاتا رہا

اب وہ حالت ہی نہیں اب پرسشِ حالت عبث
اب وہ شوقِ التماسِ مدعا جاتا رہا

رحم کر اور درگزر فرما کہ لاگ اچھی نہیں
وہ تعلق مٹ چکا۔ وہ واسطا جاتا رہا

حسرتِ دُنیا و مافیہا نہ فکرِ عاقبت
دل سے ہر غم اِک ترے غم کے سوا جاتا رہا

یا نشاطِ وصل تھی، سو عیش تھے، سو لطف تھے
یا باستثنائے حسرت ہر مزا جاتا رہا

جب خُدا بخشے دلِ مرحوم کا دھیان آگیا
ہاتھ سے سر رشتۂ صبر و رضا جاتا رہا

کیا کہوں۔ کیا چیز تھی صہبا تھی یا اکسیر تھی
چار قطروں میں غمِ ہر دوسرا جاتا رہا

آہ! بالکل امتیازِ رطب و یابس اُٹھ گیا
آہ! سارا غرّہ "خذ ما صفا" جاتا رہا

مرحبا۔ اے دوستانِ باوفا۔ صد مرحبا
وہ وفائیں کیں کہ سودائے وفا جاتا رہا

اب ترا آزاد ہے اور قیدِ افکارِ جہاں
اب وہ آزادی کا سچا اِدّعا جاتا رہا

آزاد انصاری

نقّاشی و موسیقی

دیکھنا اور سُننا ایک دماغی و روحانی فعل ہے۔ کیونکہ کسی عمدہ یا خراب چیز کے دیکھنے اور مختلف رُوح نواز و دلکش نغموں یا دلخراش و جگر سوز نالوں کے سُننے سے نہ صرف آنکھ اور کان ہی متاثر ہوتے ہیں بلکہ ہماری رُوح بھی متاثر و متحس ہو جاتی ہے۔ یہی تاثّر انسانی طبیعت میں سعی و کوشش کا ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ جو اُسے زندہ دِل اور بیدار انسان بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

علوم و فنون میں وہ چیزیں جو سب سے زیادہ جاذب رُوح ہیں، صرف دو تسلیم کی گئی ہیں۔ نقّاشی و موسیقی۔

جسقدر ہماری طبیعت ان فنون سے آشنا اور وجدانی کیفیّت کی رمز شناس ہوتی جائیگی۔ اسی قدر ہماری رُوح بھی لطیف، حساس اور بیدار ہوتی جائیگی۔

یورپین ممالک نے اسی نکتے اور اسی راز کو سمجھ کر اپنے یہاں تمام مدارس میں نقّاشی و موسیقی لازمی قرار دیدی ہے۔ اس لازمی تعلیم کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے۔ کہ ہر بچہ ایک نقّاش و موسیقی شناس بنے۔ بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ اس کی رُوح کی پرورش ہو۔ اور اس کی دماغی طاقت اور حواس خمسہ کی باقاعدہ نشو و نما ہو سکے۔

کیونکہ حواس خمسہ کی تہذیب و اصلاح کا تعلق زیادہ تر قوتِ باصرہ و سامعہ سے ہے۔ اور قوتِ باصرہ و سامعہ مخصوص ہیں نقّاشی و موسیقی کے لئے۔ اس لئے نقّاشی و موسیقی دماغ کی مجموعی تہذیب و اصلاح کا بہترین ذریعہ ہیں

بچّہ جس دن دُنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اُسی دن سے اس کی قوّت باصرہ و سامعہ کام میں لگ جاتی ہیں۔ اور مدارج ترقی طے کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ جن کے ساتھ ساتھ ان کی تابع قوتیں بھی اُن سے استفادہ کرتی رہتی ہیں۔ کیونکہ قوت باصرہ و سامعہ بخلاف قوت ذائقہ و لامسہ و شامہ کے ہر وقت مشغول رہتی ہیں اور موخرالذکر قوتوں کا فعل صرف "چکھنے" اور "سُونگھنے" ہی تک محدود ہوتا ہے۔

جس طرح بچّے کی تکمیل و ترقی کے لئے آنکھ، اور کان کا فعل ضروری ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے قوائے ذہنی کی پرورش کے لئے نقّاشی و موسیقی ضروری ہے۔

یہاں اس نکتے کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ بچّہ جسقدر

زیادہ باتیں سُنیگا اُسیقدر جلد باتیں کرنا سیکھے گا۔ اور جس چیز کو زیادہ دیکھے گا اُسی قدر اُسے زیادہ پہچانے گا۔ مثلاً "ماں" اور "باپ" کہ بچّہ اُنہیں ہر وقت اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے اس لئے انہیں سب سے زیادہ پہچانتا ہے۔ اسی طرح بہ نسبت روٹی کے پانی کو زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "دیکھنے" اور "سُننے" کی قوت، طاقت امتیاز کی پوری رہبری کرتی ہے۔

آنکھ اور کان کا فعل اس قدر وسیع ہے کہ بعض وقت ایک بچّے اور ایک مرد میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وہ بھی اپنی خواہشات و احتیاجات کو کبھی زبان اور کبھی آنکھ یعنی کبھی رو کر اور کبھی مختلف آوازوں سے دوسروں پر ظاہر کر دیتا ہے۔

بچّہ فطرتاً اُن چیزوں کی تقلید کرتا ہے جنہیں وہ عموماً اپنے گرد و پیش دیکھتا یا سُنتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس کی استعداد کو اس کی معنوی و روحانی تربیت و ترقی کا ذریعہ قرار دیں۔ تو اس کے لئے نقّاشی سے بہتر کوئی چیز نہیں کیونکہ بچّے کو' فطرت ایسے نقوش کھینچنے پر مائل کرتی ہے جنہیں وہ دیکھتا اور عزیز رکھتا ہے۔

مثلاً حیوانات، حشرات الارض اور مچھلی وغیرہ' چونکہ بچّے کو یہ چیزیں بہت عزیز و مرغوب ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ خارجی طور پر انہیں چیزوں کی اشکال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس طریقے سے رنگ اور مختلف تشکیلات کا امتیاز کرنے لگتا ہے۔

کاش ہندوستان بھی تعلیمی ترقی کے اس راز کو سمجھے۔ اور اپنے مدارس میں نقاشی و موسیقی کو دوسرے ممالک کی طرح لازمی قرار دیدے۔

سیّد ابو محمّد ثاقب

تاثرات

اے دِل اتنا خیالِ یار نہ کر — اور بھی مجھ کو بے قرار نہ کر
صاحبانِ خرد کی بات نہ سُن — اور سُن لے تو اعتبار نہ کر
شبِ ہجراں میں جاگنے والے! — وہ نہ آئینگے انتظار نہ کر
یا نگاہوں کو پاکباز بنا — یا غمِ عشق اختیار نہ کر

عابدؔ

شبابِ تازہ

(۱)

ظفر نے تصویر کی طرف ایک آخری حسرت آلود نگاہ سے دیکھا۔ اور پھر اُسے میز پر رکھ دیا۔ اس انداز سے رکھ دیا۔ گویا وہ اس جذبے کے تاثرات کو جو اس تصویر کے نقوش میں مضمر تھا محو کر دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ ایک خود فراموش عجلت سے اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا سامنے کی دیوار پر ایک قدِ آدم آئینہ آویزاں تھا۔ یکبارگی وہ اپنے عکس کو دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔ اور آئینہ کے قریب جا کر اس نے اپنے آپ کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پژمردہ چہرہ، بے رونق اندوہگیں آنکھیں، گھنی مونچھوں میں کہیں کہیں سفید بال۔ وہ اس طرح اپنے آپ کو غمگین ہیئت میں دیکھ کر آج خلافِ معمول اور خلافِ توقع پریشان ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ دن میں کئی دفعہ آئینہ دیکھتا تھا لیکن تکدّرِ خاطر کا یہ احساس پریشانیِ طبع کی یہ خلش آشفتگیِ مزاج کا یہ رنگ جو آج اُسے رُوح پر گرمی کے تاریک بادلوں کی طرح سایہ افگن معلوم ہوتا تھا۔ آئینہ دیکھ کر کبھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اُسنے کانپتے ہوتے ہاتھوں سے اور ہاتھوں سے زیادہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو چھوا۔ گویا اپنی قوتِ ارادی کے زور سے اُن بدنما جھریوں کو جو ایک پیش از وقت بڑھاپے کی نشانی دُور کر دیگا۔ پھر اُس نے انتہائی بیتابی سے اپنے چہرے کو آئینہ کے قریب تر کیا۔ اور تخیّل اُس کے حلقے کو گزرے ہوئے سالوں کی رنگین یاد میں لے گیا۔ آئینہ کی سطح مدھم سے ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور نیم وا آنکھوں سے اُسنے اپنی جوانی کا شگفتہ چہرہ منعکس دیکھا۔ خوشرنگ۔ تازہ رو سیاہ چمکتے ہوئے بال جذبات کی آتشی رو کی مستغرق آنکھیں پھر آہستہ آہستہ آئینہ کی سطح صاف ہوگئی۔ اور اُسے اپنا بدنما چہرہ صاف صاف نظر آیا۔ تضاد اور تقابل کے اس کریہہ اور دلخراش منظر کو دیکھ کر وہ بہت گھبرا گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر میز پر سے وہی تصویر جسے دیکھ کر وہ بیتاب ہو گیا تھا اُٹھا لی۔ یہ تصویر عمر خیام کی ایک رباعی کی شاعرانہ توضیح تھی۔ جسے مصوّر نے پیکرِ مادی میں منتقل کر کے شعر کی رنگینیوں کو چشمِ ظاہر پر نمایاں کر دیا تھا۔ ایک نوجوان خوشرو جوان اپنی نازک اندام محبوبہ کی معیت میں سیرِ باغ کر رہا تھا۔ گویا فراغت وکتابے وگوشۂ چمنے کی زبانِ حال سے تشریح کر رہا ہے۔ آہ۔ ایسا موقع اس کی زندگی میں کبھی پیش نہ آیا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کے گزشتہ۔۔

ایک نظرِ ثانی کرنا شروع کی۔ رس بھری جوانی کے اوائل میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ کس قدر مسرور دن تھے شبِ زفاف میں وہ جس وقت کانپ کانپ کے اپنے جذبات کو پرجوش الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکی حسیات بہت شاداب اور کامران تھیں۔ یہ رات اُسے ہزاروں رُوح فرسا دن کاٹنے کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ اور وہ جو ذہنی لحاظ سے ایک مکمل شاعر تھا۔ خیال کرتا تھا کہ شاید اس کی شعریت اس مونسِ حیات اس رفیقِ زندگی اس شریکِ غم یعنی بیوی کی معیت میں بہت رنگین ہو جائیگی۔ لیکن افسوس یہ تمام توقعات مجروح ہو گئیں۔ جس طرح کوئی نازک بدن کبوتر چھروں سے مجروح ہو جاتا ہے۔ اس کو بیوی ملی لیکن آہ کیسی بیوی ملی۔ اسے یہ امید نہ تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دُنیا میں کسی شخص کا زاویۂ نگاہ اس قدر تنگ اور قوتِ ذہن اتنی محدود ہو سکتی ہے۔ جتنی اس کی بیوی کی تھی۔ شادی کے دو تین ہی ماہ بعد اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ اس کی بیوی نے ایسی فضا میں تربیت پائی ہے۔ جہاں اوامر و نواہی فضائل و رذائل اخلاق و علم حقوق و فرائض اور محبت و شفقت کے متعلق ایسے خیال ہیں۔ جن کا اسے وہم و گمان بھی نہیں۔

اس نے پہلے اخلاص سے پیار سے اور بعد ازاں سختی سے اپنی بیوی کو اپنا ہم مزاج بنانا چاہا اور ناکامیاب رہا۔ اس کی روشن خیالی فطری جہالت کی گرانبار زنجیروں کو توڑ نہ سکی۔ اور آخرکار ان دونوں کے دِلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے اس کی بیوی خدیجہ اپنی جہالت میں یہ سمجھ کر کہ ظفر کا فرض ہے کہ وہ اسے منائے۔ کیونکہ اس کے خیال میں غلطی سراسر ظفر کی تھی۔ خاموش رہی۔ اور وہ یہ سمجھ کر کہ اس کی بیوی کبھی اس کی ہم خیال نہ بن سکتی تھی۔ چپ ہو رہا۔

وہ چاہتا تھا کہ جس وقت وہ دفتر سے تھکا ماندہ سُست قدموں سے گھر واپس آئے تو اس کی بیوی مُسکراتی ہوئی آنکھوں اور پُر تپاک الفاظ سے اس کا خیر مقدم کرے وہ چاہتا تھا کہ اپنی پریشانی کو محبت کے ہجوم میں گم کر دے لیکن خدیجہ ظفر کی اس آرزو سے بے خبر تھی۔ بلکہ حقیقت یوں ہے کہ بے نیاز تھی۔ دن بھر وہ خانہ داری کے کاموں میں مصروف رہتی۔ اور حقیقی شرافت کا وہ معیار حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ جو اس کے والدین نے طفولیت سے اس کے ذہن نشین کر دیا تھا۔ خانہ داری کے کام سے فراغت ہوتی تو سینا پرونا لے بیٹھتی۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ ظفر کی خدمتگزاری میں وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے زاویۂ نگاہ کے موافق کوئی کوتاہی نہ کرتی تھی۔ وہ یہ نہ سمجھتی تھی کہ خاوند کے لئے کھانا پکا دینا اور اس کی آرام و آسائش کا خیال رکھنا ہی ایک ایسا عنصر نہیں، جو مرد کی محبت کو مطمئن کر سکے۔

وہ اس مرمریں بُت سے جو مشین کی طرح اپنا تمام کام کاج کرتا تھا۔ اور جسکے مُنہ سے کبھی شوق کے کوئی پرجوش الفاظ اور جس کے انداز سے زندہ دلی کا کوئی متحرک ثبوت ظاہر نہ ہوتا تھا۔ انتہائے جوش سے نفرت کرنے لگ گیا۔ ایک سال کے بعد ان کو وہ نعمت بخشی گئی۔ جس کا وجود گہرے سے گہرے زخم پر مرہم کا کام دیتا ہے۔ لڑکے کے پیدا ہونے سے تھوڑے عرصے کے لئے بظاہر اُدہ خلیج جوان کے دلوں کے درمیان حائل تھی۔ کچھ عرصے کے لئے کم ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ اور وہ خوش تھا۔ کہ شاید اسی معصوم رُوح کے وسیلے سے اُن میں حقیقی صلح ہوجائے۔ لیکن یہ آرزو بھی باقی آرزوؤں کی طرح ناکام رہی۔ ان کا لڑکا امتیاز ایک سال کا ہوگیا تھا اور اب خانہ داری چھوڑ کر خدیجہ دن بھر امتیاز کی غور و پرداخت میں مصروف رہتی۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا جب اس کی صحت کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر انتظامی تدابیر عمل میں نہ لائی جارہی ہوں۔ حالات زیادہ ناگوار ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ اب خدیجہ امتیاز کی موجودگی میں اپنے خاوند کی ہستی کو گویا بالکل فراموش ہی کر چکی تھی۔

اس کا سلسلہ خیالات یہاں تک پہنچکر ایک لمحے کے لئے منقطع ہوگیا۔ وہ اب یہ سوچنے لگ پڑا۔ کہ فطرت کی ستم ظریفیاں بعض اوقات کس قدر مہیب اور دردناک ہوتی ہیں۔ اسے امید تھی کہ ان کا لڑکا ان دونوں میں حقیقی صلح کرانے کا موجب ہوگا۔ لیکن اس کے برخلاف اسے خود اپنے بیٹے سے نفرت ہوتی چلی جارہی تھی۔ وہ اس کے وجود کو اپنی محبت میں ایک سنگ راہ سمجھتا تھا۔ جس کی وجہ سے خدیجہ اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ایک دن جب خلافِ معمول اس کا دِل رنگین جذبات سے معمور تھا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس گیا۔ اور گزشتہ واقعات کو بھلا دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اور بعد ازاں باہر سیر کو جانے کے لئے کہا۔ اس کو امید تھی۔ کہ شاید آج خدیجہ اس کو خوش کرنے کے لئے ہاں کہہ دیگی۔ لیکن اُس نے جواب دیا تھا۔ "سردی کے دنوں میں باہر جانا امتیاز کے لئے مضر ہوگا۔ کہیں ہوا نہ لگ جائے۔" یہ سُنکر وہ اپنی بیوی سے خوب لڑا تھا۔ اور اُس دن اس نے اپنے دل کا بخار نکالا تھا۔ اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے جوش سے بیتاب ہوکر کہا تھا "کیا تمہارے فرائض میں یہ فرض داخل نہیں۔ کہ تم اپنے خاوند کی دلجوئی کرو۔ کہ تم اُسے خوش رکھو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ بیاہی ہوئی زندگی محض کھانے پینے اور بچّوں کی پرداخت کے لئے وقف ہے۔ خدیجہ کیا تم نہیں سمجھتیں کہ تم اپنے اس طرزِ عمل سے مجھے پیش از وقت بڑھاپے کی طرف کشاں کشاں کھینچے لئے جارہی ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا تھا۔ اس کو توقع تھی کہ خدیجہ اس کا جواب ترکی بہ ترکی دیگی۔ اس سے لڑیگی۔ لیکن اس نے

نہایت آہستہ سے کہا تھا۔ "آپ جو چاہیں کہیں۔ میرا فرض ہے
کہ میں آپ کے اس بیجا غصّے کو برداشت کروں۔"

فرض۔ فرض۔ فرض۔ ظفر آج بھی اس واقعے کے آٹھ
سال بعد اس واقعہ کی یاد کو تازہ کر کے بے بس اور اندھا دھند
غصّے سے کانپ اُٹھا۔ اگر اس کا بس چلتا۔ تو وہ فرض کے لفظ
کو لغت میں سے نکال دیتا۔ آہ شاید وہ یہ بھی کر لیتا لیکن یہ
ممکن نہ تھا۔ کہ فرض کے جو معنی اس کی بیوی نے اپنے ذہن
میں جاگزیں کر رکھے تھے وہ انہیں کسی طرح نکالکر پھینک
دیتا۔ اس کی جوانی کا بہترین حصّہ اسی روح فرسا کشمکش میں
گزر گیا۔ اور کبھی اُس کے دل میں اس زندگی کے خلاف
کھلم کھلا بغاوت کا خیال نہ آیا۔ لیکن آج خدا جانے کیا وجہ
تھی کہ آج کے دن اس گھر میں جہاں اس کی
بیوی نام نہاد فرض کی پابند بیوی بھی رہتی تھی۔ اسے اپنا
دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ اگر وہ زیادہ
عرصہ اس زہریلی فضا میں سانس لیتا رہا۔ تو بھڑک کر مر
جائیگا۔ اس نے پھر ایک دفعہ تصویر کو اُٹھا کر دیکھا۔ اور
دل میں کہنے لگا۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں۔ کہ میں اپنی کھوئی
ہوئی جوانی کو پھر حاصل کر لوں۔ ان سالوں کو جو میں نے اپنے
اخلاق کے ظالمانہ قانون کی نذر چڑھا دیتے ہیں۔ شادابی
اور کامرانی سے بسر کر سکوں۔ وہ بہت عرصہ تصویر کی طرف
گھورتا رہا۔ حتیٰ کہ اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا تصویریں
جسم میں بڑھ گئی ہیں۔ اور تمام کمرے پر چھا گئی ہیں۔ اس نے
اپنی آنکھیں ملیں۔ اور پھر بے اختیار ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ
گیا۔ ان چند لمحوں میں جب وہ آخری دفعہ تصویر کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک عظیم کشمکش برپا ہوئی۔
اور وہ اس ذہنی مجادلے کی تکلیف سے بیتاب ہو کر ہی
کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن ذہنی تکلیف کے رفع ہو جانے
کے بعد اب وہ مسرت کے ایک عجیب احساس سے مخمور
تھا۔ کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اس گھر کو چھوڑ کر
چلا جائیگا۔ اور اپنی برباد شدہ جوانی کی تلافی کے لئے اپنے
آپ کو محبت اور عشرت اور ہوس کے سمندر میں غرق کر دیگا۔

(۲)

اس نے ایک والہانہ انداز سے اپنی ٹوپی سر پر رکھی
چھڑی ہاتھ میں لی۔ اور نکل کھڑا ہوا۔ اب رات کافی آچکی تھی
بازاروں میں چراغ روشن ہو گئے۔ لیکن وہ ایک ایسے عالم
میں تھا کہ اس کی آنکھیں ظلمت و نور میں کوئی خاص امتیاز نہ
کر سکتی تھیں۔ محض کسی غیر معلوم قوتِ ادراک کی مدد سے وہ
حادثات کی زد سے محفوظ چلا جا رہا تھا۔ ورنہ اس کے حواس
اختلالِ باطنی کی اس کیفیت میں مبتلا تھے۔ کہ وہ کئی بار کسی
تیز رفتار موٹر یا کسی بے پروا کوچوان کے ٹانگے کے پہیوں
کے نیچے کچلا گیا ہوتا۔ یوں تو وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا
تھا۔ لیکن ابھی اس معرکہ آرا مسئلے کا حل باقی تھا۔ کہ آخر

شباب تازہ حاصل کرنے کے وسائل کیا ہونے چاہئیں آخر کھوئی ہوئی جوانی کی تلافی کس طرح کرنی چاہیئے۔ اسی ادھیڑبن میں مصروف وہ بازاروں۔ گلیوں۔ کوچوں میں سے گزرتا ہوا شہر کے مضافات کے قریب جا پہنچا۔ تنگ اور مسموم راستوں میں سے گزرنے کے بعد ان فراخ مقامات کی ہوا اسے بہت فرحت بخش محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ جہاں پسینے کے نمایاں قطرے نمودار تھے اور اس کے حواس کچھ بجا ہوتے۔ ساتھ ہی اس کی نگاہ سامنے ایک عظیم الشان عمارت پر پڑی۔ جو برقی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ وہ پہلے کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ یہ کیا مقام ہوسکتا ہے۔ پھر اس کی تمام ذہنی قوتیں یکلخت عود کر آئیں۔ اور اس کو خیال ہوا کہ یہ مقام ایک شرابخانہ تھا۔ وہ بہت عرصہ کھڑا ہوا۔ آدمیوں کے ایک جم غفیر کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید وہ آتش سیال جس سے یہ تمام لوگ اپنے قلب وجگر کو گداختہ کرنے کے لئے اس قدر مستعد بیتابی سے ہجوم کر رہے تھے۔ اسے بھی کچھ مدد دے سکے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو گئی اور اس نے اپنی رگوں میں گرم خون کو تیزی سے دوڑتا ہوا محسوس کیا۔ لیکن وہ شرافت نفس جو اتنا عرصہ اخلاق اعلیٰ کے سایہ میں پرورش پا کر اس کے دماغ میں مستقل طور پر جاگزیں ہو چکی تھی۔ اس کی اضطراری خام خیالی پر غالب آگئی

وہ اس شرابخانے اس روشن آزمائش کی طرف منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے دل میں بے بسی کا ایک بے پناہ احساس پیدا ہوا۔ آہ۔ آخر اسے وہیں جانا پڑیگا۔ جہاں جانے سے اس کی روح گریز کرتی تھی۔ لیکن جہاں جانے پر وہ مجبور تھا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ پھر چل دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ منزل مقصود پر آ پہنچا۔ وہاں جہاں حسن خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ جہاں سونے کی چمکتی ہوئی ٹکلیوں کی خواہش میں ظاہری پیار کے طلائی پھندے ناتجربہ کار دلوں کے لئے پھیلائے جاتے ہیں۔ جہاں ہوس کی بدترین حالت رنگین پیراہنوں میں ملبوس ہو کر۔ خرمن صبروشکیب کو پرتو جمال سے خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ وہ اس بازار حسن میں پہنچکر بہوت و ششدر رہ گیا۔ وہ دیکھتا تھا اور کچھ نہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ سنتا تھا۔ اور اسے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ ہر طرف بالاخانوں پر کھڑکیوں میں چبوتروں پر حسن کے ہجوم کو انوار کو تابش کو دیکھ دیکھکر وہ کچھ بیخود سا ہو رہا تھا۔ ان نہ پگھلنے والی شمعوں کے گرد نہ جلنے والے پروانوں کے ہجوم میں سے وہ بھی گزرتا ہوا چلا گیا۔ یہاں کے کاروبار کی جدت جہاں ہر شخص خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ اسے تمام دنیا سے انوکھی اور نرالی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دفعہ وہ تمام بازار کا چکر لگا چکا۔ اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ دوسری دفعہ اب وہ ذرا پہلے سے زیادہ آہستہ پہلے سے زیادہ مطمئن انداز میں ہر ایک حسن فروش کی طرف دیکھنے

لگا۔ وہ صورتیں جو پہلے اُسے اپنی حسیات کے وفور میں کچھ مبہم سی نظر آتی تھیں۔ اب ذرا زیادہ صاف نظر آنے لگیں لیکن ابھی تک وہ نسبتاً اُن کے حسن کے مدارج میں کوئی تفاوت اُن کے انداز میں کوئی امتیاز ان کے طریقِ نشست و برخاست میں کوئی فرق نہ کر سکتا تھا۔ اب وہ سوچنے لگا۔ کہ اسے کونسی خاص جگہ جانا چاہیے۔ لیکن اس استغراق ذہنی کی معیت میں اپنی ذلتِ خیال کا وہ احساس بھی تھا۔ جو اس سے پیشتر شرابخانے کے سامنے اسے ستا چکا تھا۔ وہ ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی فطری نفاستِ طبع کھلم کھلا اس کر یہہ صورتِ عمل کے خلاف بغاوت کرنے لگی لیکن جب اسے خیال آیا کہ یہاں سے واپس جا کر اُسے وہی مسموم فضا نصیب ہوگی۔ جہاں سے وہ اسقدر نفرت کے جذبات اپنے دل میں لیکر نکلا تھا۔ تو اس نے اپنے عمل سے اپنی نفاستِ طبع کے برخلاف خود بھی مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اعلانِ جنگ کے لئے اُس نے پھر دوبارہ ایک معائنہ ثانی کے لئے بازار کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ ابھی تین چار ہی قدم چلا ہوگا۔ کہ اس کے کان میں چند ایک تعریضی فقرے پڑے۔

دو تین سیاہ مست ہوس کار جو اپنی اندھی جوانی اس کوچے کی خراب زار گلیوں میں کھو چکے تھے۔ اور اب بطور مشغلۂ بیکاری اپنی پُر آرزو نگاہوں سے محض اس حسن کو دیکھ دیکھ کر ہوسِ گناہ کو نامکمل طور سے سیراب کر رہے تھے۔ جس کو حاصل کرنا اب روپیہ کی کمی اور جسمانی قوت کے افلاس کی وجہ سے ان کے امکان سے باہر تھا۔ تھوڑے عرصے سے اس کے رویئے کو متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ قیافے کی وہ مشق جو کئی سال اُنھوں نے انہی گلیوں میں ٹھوکریں کھا کھا کر حاصل کی تھی۔ انہیں بتا رہی تھی کہ ظفر آج پہلی دفعہ اس جگہ وارد ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جو اپنے دورِ تعیش میں شراب کا عادی رہ چکا تھا۔ اور اب اس قیمتی سرور کی جگہ گا نجے اور افیون کے مدہوش کن نشے کی تباہیوں کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ ظفر کو ٹھٹکتا دیکھ کر اور پھر کچھ بے اختیاری کے سے انداز میں بڑھتا دیکھ کر نہ رہ سکا۔

اُس نے اپنی آواز کو ارادتاً ضرورت سے زیادہ بلند کر کے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میاں کہیں جاؤ گے یا یونہی پھرتے رہو گے۔"

دوسرا بولا "آجکل کے تماشبین اسی طرح کے ہوتے ہیں۔"

ظفر کو یوں محسوس ہوا گویا کسی نے اُسے زمین پر سے اُٹھا کر غلاظت اور کیچڑ میں دے مارا ہو۔ اُسے معلوم تھا کہ اس طرح کے تعریضی کلمات بازاری گالی کی طرح مڑ کر دیکھنے والے کو لگتے ہیں۔ اس لئے اُس نے اس قدر ضبط تو کیا۔ کہ مڑ کر نہ دیکھا لیکن اب اس کے لئے آگے جانا محال ہو گیا۔ اسے اپنے پاؤں سو سو من کے معلوم ہوتے تھے۔ بڑی مشکل سے

اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر ایک مکان کی طرف مڑ جانے پر آمادہ کیا۔ اور پھر کسی بات کا امتیاز کئے بغیر وہ سیڑھیوں کو ایک خود فراموش اور جنون خیز بیتابی سے طے کر گیا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر اس کے ذہن میں ضائع ہو جانے والی شرافت نے آخری دفعہ اپنا فرض ادا کیا۔ اور اس کی عقل نے اس کے دماغ نے اس زہر کے پیالے کو جسے وہ شربت سمجھ کر پی جانا چاہتا تھا۔ اس قدر قریب دیکھ کر اسے اندر جانے سے روکا۔ لیکن اب وہ اس گناہ آلود فضا سے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے سامنے ایک انتہا درجے کی حسین عورت آسمانی رنگ کی ساڑھی باندھے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کر رہی تھی۔ اور اپنی تبسم آمیز نگاہوں سے اس دلربا پیغام کو ادا کر رہی تھی۔ جس کے لئے ظفر یہاں تک کھنچ کر آیا تھا۔ ظفر کو یوں محسوس ہوا۔ گویا کسی نے اُسے جیتے جی ایک جنت ارضی میں پہنچا دیا ہو۔ اور وہاں کی کوئی حور اس کے سامنے اپنی تمام رنگین جلوہ آرائیوں کے ساتھ باصرہ افروز ہو۔ وہ اس خوبصورت ناگن کی مقناطیسی جاذبیت سے لبریز آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور گویا ان کی خطرناک کشش کے تاثرات سے مرعوب ہو کر آگے بڑھا۔ ہاں اسی طرح بڑھا۔ جس طرح کوئی جانور سانپ کی مسحور کن نگاہوں کے سامنے بیکس و بے بس ہو کر خود اپنے دشمن کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ بڑھا جاتا ہے۔

اس زہرہ پیکر لیکن تجربہ کار حور وش نے صورتِ حالات کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیا۔ اور یہ سمجھ کر کہ اس جگہ وہ اجتناب جو دوسروں کی آتش شوق کو اور تیز کرتا ہے۔ اور بھڑکاتا ہے اس جگہ کام نہ آئیگا۔ خود ظفر کا ہاتھ پکڑ کر چاندنی پر بٹھا دیا۔ سازندے آ گئے۔ ساز درست ہونے لگے۔ فیروزہ (یہ وہ پیارا لفظ تھا۔ جس سے وہ خورشید جمال مخاطب کی جاتی تھی) نے ظفر کی طرف متجسسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا پوچھ رہی تھی کہ آیا گانا شروع کیا جائے۔ ظفر اس اشارے کا مطلب سمجھ گیا۔ اور وہ جواب دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی زبان تالو سے چمٹی جاتی تھی۔ اتنے میں گلوریاں تیار ہو گئیں۔ چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی مشک بو گلوریاں۔

فیروزہ نے اپنی گردن کو ایک عجیب دلربایانہ خم دیکر گلوریاں پیش کیں۔ اور نہایت شیریں آواز میں کہا۔ "شوق فرمائیے۔"

ظفر نے ایک گلوری اُٹھا لی۔ اور اسے محسوس ہوا۔ کہ اب کچھ نہ کچھ کہنا اس کا فرض ہو گیا۔ اس نے انتہائی کوشش کے بعد شرماتے ہوئے کہا۔ "مہربانی"

پھر اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا میں آپ کی خوش الحانی سے بہرہ اندوز ہونے کی درخواست کر سکتا ہوں۔"

فیروزہ نے مڑ کر سازندوں کی طرف دیکھا اور طبلے پر

نقاب پڑی۔ اسی اثنا میں ظفر کو فیروزہ کی طرف اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ نہایت نازک اندام، سنہری بال، موٹی موٹی بادامی آنکھیں۔

ظفر ابھی اپنی نگاہِ شوق سے اس کے چہرے ہی کا جائزہ لے رہا تھا کہ فیروزہ نے اپنے نازک ہاتھوں کی شمعی انگلیوں کو انگلیوں میں ڈالکر ایک وارفتہ انگڑائی لی۔ اور ریشمی دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور رقص شروع کردیا۔ جب فیروزہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار تال کیساتھ مل کر ختم ہوتی۔ اور مابعد ایک مدھم سا نقش چھوڑتی چلی جاتی۔ تو ظفر کے دل کے تمام تار رقص کرنے لگ جاتے۔ خدا جانے وہ کتنا عرصہ اس متحرک فتنے اس بولتے ہوئے جادو کے تاثرات میں گم رہا۔ ہاں کچھ ہوش اس وقت آیا جب اُسنے آخری سم لیکر تان الاپی۔ اور غزل شروع کی۔ ؎

سب نہیں آفتاب کہتے ہیں
اور کس کو شباب کہتے ہیں

جب اس مصرع پر پہنچی۔ "اور کس کو شباب کہتے ہیں" تو سینہ ابھار کے آنکھوں میں کیف کا ایک خاص انداز پیدا کر کے ایسے استفہامیہ لہجے میں "اور کس کو" کہا۔ اور شباب کے مظاہر کو اس ہوس انگیز طریقے سے ادا کیا کہ ظفر بیتاب ہوگیا۔ وہ ابھی اسی شعر کے کیف میں غرق تھا کہ فیروزہ نے دوسرا شعر گایا۔ ؎

مست آنکھیں وہ تو نے پائی ہیں
سب جنہیں نیم خواب کہتے ہیں

اور پھر کہ ؎

ہم محبت کے بادہ پیما ہیں
آرزو کو شراب کہتے ہیں

جب اس شعر پر پہنچی۔ کہ ؎

اہلِ دل میرے داغ حسرت کو
نقطۂ انتخاب کہتے ہیں

تو سراپا آرزو بن گئی اور چہرے پر حرمانِ محبت کے مکمل آثار پیدا کر لئے۔ پھر اپنے دل کے قریب ہاتھ رکھ کر یہ مصرع پڑھا۔ ع

"نقطۂ انتخاب کہتے ہیں"

ایک تو اشعار کی دلگدازی، پھر فیروزہ کی خوش الحانی موسیقی کا اثر۔ وقت کی چیز، شام کا سناٹا، یہ تمام عناصر مل ملا کر ظفر کو تباہ کر گئے۔ برباد کر گئے۔

(۳)

دو سال گزر گئے۔ سردیوں کی طویل راتیں آئیں۔ اور گزشتہ عشرت کے خاکستر میں دفن ہوگئیں۔ گرمی کے بارانی دن آئے۔ اور آخر ماضی کے سیاہ پردے میں چھپ گئے۔ لیکن ظفر شام و سحر کی فتنہ کاری سے بے نیاز رہا۔ اور ایک دن بھی بھول کر اپنے گھر واپس نہ گیا۔ وہ دولت جو اُس کے پسینے کی

گاڑھی کمائی تھی۔ اس قلیل عرصے میں اس اندھا دھند سرعت سے تباہ ہوئی۔ کہ ظفر کو ہوش اس وقت آیا۔ جب اس کی تہی دامانی روز روشن کی طرح آشکارا ہوگئی۔ جھوٹی امیدوں نے اسے کامرانی کے لہلہاتے ہوئے سبز باغ دکھاتے اور اس نے قصداً اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرکے اپنی آنکھیں فیروزہ کے بچھے تلے سرد مہر تغافل سے بند کرلیں۔

ایک شام فیروزہ جو اب پچھلے دنوں سے شام کو اکثر باہر نکل جایا کرتی۔ حسب معمول کہیں گئی ہوئی تھی۔ اور وہ بیٹھا انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ یکلخت سیڑھیوں میں بھاری بھاری قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ بیتابی سے اُٹھا۔

فیروزہ ایک قوی ہیکل تنومند نوجوان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ رنگین آرزوؤں کا وہ بلوریں قصر جسے ظفر کے تخیل نے سر بفلک بلندی تک پہنچایا تھا۔ یکبارگی نیچے آرہا۔

نووارد ظفر کو دیکھ کر جھجکا۔ پھر فیروزہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔" اچھا میں کل اسی وقت پھر آجاؤنگا۔"

فیروزہ نے اس کے بازو تھام لئے۔ اور کہا:۔

"نہیں ٹھہرتے۔"

ظفر اپنی جگہ پر کھڑا مبہوت ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے توقع نہ تھی۔ کہ فیروزہ اس بیباک جسارت سے اس کے سامنے اس طرح کی باتیں کرسکیگی۔ کچھ عرصہ اسنے خیال کیا۔ کہ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن فیروزہ نے اسے اس خوشگوار فریب کے طلسم کو توڑ دینے پر مجبور کیا۔ اس نے ظفر کے قریب آکر نہایت آہستہ سے کہا:" ظفر اب تم جاؤ۔"

" جاؤں۔"

ظفر نے یہ لفظ اس طرح ادا کئے۔ گویا وہ کچھ نہیں سمجھا کہ فیروزہ کیا کہہ رہی ہے۔

وہ پھر بولی:" ظفر کیا تم سمجھتے نہیں۔ جبتک تم میرے اخراجات برداشت کرسکتے تھے۔ میں تمہاری تھی۔"

اب ظفر کو غصہ آگیا۔ فیروزہ کو اس طرح پرسکون لہجے میں گفتگو کرتے دیکھ کر اس کی سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھیں دفور جوش میں اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور نووارد جوان کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ جو طنزیہ سے انداز میں مسکرایا۔ اب ظفر کو تاب نہ رہی۔ اس نے دانت بھینچکر کہا:" ہاں میں جاؤں گا۔ لیکن اس کو بھی ساتھ لیجاؤں گا۔"

یہ کہکر وہ نووارد کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ فیروزہ نے اسے اپنے پورے زور سے تھام لیا۔ اور منت سے بولی:" ظفر۔ ظفر تم بھی عام آدمیوں کی طرح لڑائی پر آمادہ ہوگئے۔ تم تو کہتے تھے۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ دیکھو۔ ہوش کرو۔ تمہاری لڑائی سے مجھے نقصان پہنچے گا۔

اسے نقصان پہنچیگا۔ جس سے تم محبت کرنے کا دعوے کرتے ہو۔ جاؤ۔ چپ چاپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ظفر نے پوری قوت سے اپنے آپ کو فیروزہ کی کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور پھر نووارد کی طرف جھپٹا۔ وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ اور ظفر کے کان میں برابر فیروزہ کی آواز آتی رہی۔ جو منت آلود لہجے میں کہہ رہی تھی:" ظفر۔ ظفر خدا کے لئے۔ محسن تم ہی چھوڑ دو۔ دیکھو جانے دو۔ یا اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نووارد نے جو ظفر سے بدرجہا مضبوط اور طاقتور تھا آخر موقع پاکر اسے دھکا دیدیا۔ اس کا پاؤں پھسلا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے خلا کو پکڑ کر سنبھلنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر یکلخت اس کا سر سیڑھیوں سے ٹکرایا۔ اور اُسے یوں محسوس ہُوا۔ گویا اس کی گردن میں کوئی چیز ریزے ریزے ہوگئی ہو۔ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہُوا وہ نیچے آپڑا۔ خلاف توقع اس کے حواس بجا رہے۔ نووارد بھی اس کے پیچھے پیچھے اتر آیا تھا۔ اس نے ظفر کے سر کو اُٹھا کر اُس کی گردن کو ٹٹولا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر حقیقی رنج سے لبریز آواز میں بولا "مجھے افسوس ہے۔"

ظفر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اور پھر کراہ کر کہا۔" غلطی میری تھی۔ مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اُٹھا کر سڑک کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف رکھ آیئے۔"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی گردن کو کسی نے تپتے ہوئے لوہے سے داغ دیا ہو۔

اس نے پھر کوشش کرکے کہا۔" ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن اب اس کے حواس جو ابتک قائم رہے تھے۔ اسے جواب دے گئے۔ ایک عارضی بیہوشی نے اسے تکلیف اور درد کے احساس سے بچالیا۔ نووارد نے اسے آہستہ سے اپنے ہاتھوں پر اُٹھالیا۔ اور سڑک کے دوسری طرف ڈال آیا۔

.. ..

خدا جانے وہ کتنا عرصہ بیہوش رہا۔ جب اسے ہوش آیا۔ تو اس نے ایک خوبصورت اور غمگین چہرہ اپنے چہرے کے قریب جھکا ہُوا دیکھا اور اسے خیال ہُوا کہ شاید وہ مر کر جنت میں پہنچ گیا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھیں پھر بند کرلیں۔ اور ہاتھوں کو اپنی گردن کے قریب جہاں اسے ابتک درد محسوس ہو رہا تھا۔ لے جانا چاہا۔ لیکن دو نازک ہاتھوں نے نہایت آہستہ سے اس کے بازوؤں کو تھام لیا۔ اس نے حیران ہو کر اپنی آنکھیں پھر کھول دیں۔ اور اس غمگین اور خوبصورت چہرے کو

اپنے اُوپر جھکا ہُوا دیکھا۔ اس نے گھبرا کر اُٹھنا چاہا۔ لیکن اس کے جسم کو پھر روک دیا گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر پریشانی سے دیکھا۔ اور اس جگہ کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ کہاں تھا۔ شاید وہ اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ مگر نہیں۔ گھر سے تو وہ مُدت ہوئی نکل کر آگیا تھا پھر یہ کونسی جگہ تھی۔ کیا وہ فیروزہ کے مکان پر تھا فیروزہ کا خیال آتے ہی اس کے تخیّل کے تمام تار مرتعش ہو گئے۔ اور اس کے حافظے نے دردناک صحت سے ان تمام واقعات کی یاد تازہ کی جو اس آخری دن جب وہ فیروزہ کے مکان پر موجود تھا پیش آئے تھے۔ اُس نے اپنا مُنہ ایک طرف کو موڑ لیا۔ اور قریب کی ایک چھوٹی سی میز پر اسے دوائی کی چند شیشیاں اور چند ایک اوزار نظر آئے۔ ابھی وہ ان کی موجودگی پر غور کر رہا تھا کہ اس کے کان میں باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ اُس نے اپنا مُنہ موڑا۔ اور اس ہستی کو جسے وہ پہلے حور سمجھا تھا ایک اور شخص سے باتیں کرنے میں مصروف پایا۔ وہ شخص ظفر کو اپنی طرف دیکھتا پاکر قریب آگیا۔ اور ظفر کی نبض دیکھنے لگا۔ اب ظفر کو معلوم ہُوا کہ وہ ایک ہسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھنے کے بعد نرس کی طرف دیکھ کر ایک عجیب انداز میں سر ہلایا۔ پھر وہ دونوں مِلکر کچھ عجیب سی نگاہوں سے ظفر کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن اب ظفر کے حواس کافی طور پر مجتمع ہو چکے تھے۔ اور اسے تمام واقعات انگاروں کی طرح روشن اور نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔

اس نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب"

ڈاکٹر اس کے قریب آگیا۔ اور لبوں پر انگلی رکھ کر بولا "چپ چپ تمہارے لئے باتیں کرنا خطرناک ہے۔"

ظفر اس ہدایت کے علی الرغم بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس کو اپنی آواز سینے میں رکتی ہُوئی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس نے کوشش کر کے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ مَیں جلدی مر جاؤنگا۔ آپ مجھے یہ بتا دیجئے۔ کہ مجھے اور کتنا عرصہ زندہ رہنا ہے۔ مجھے آج ......"

اس کی چھاتی میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ اور یکلخت اُسے خُون کی ایک قے آئی۔

ڈاکٹر اب بالکل اس کے قریب آگیا۔ "آپ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ شاید دو دن اور زندہ رہیں۔"

ظفر نے اس خبر کو ایسے سکون سے سُنا گویا وہ موسم کے متعلق کوئی رسمی بات سُن رہا ہے۔ اور اپنی موت کو اسقدر قریب پاکر اپنے دل کی گہرائیوں کا رنج کا ذرا سا شائبہ خوف کا کوئی معمولی عنصر بھی محسوس نہ کیا۔ اس نے نرس کی طرف بے معنی نگاہوں سے دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں اسے رحم کی چمک محسوس ہُوئی۔ اس نے ماتھے پہ بل ڈال کے مُنہ موڑ لیا۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نرس اس کے قریب آکر اس کے سر کے نیچے تکیے درست کرنے لگی۔ درست کرتے

کرتے بولی۔

"پولیس آپ کے متعلق اشتہار بھی دے چکی ہے۔ اور آپ کے گھر غالباً اب تک ہر قسم کی اطلاع پہنچ چکی ہوگی۔"

ظفر خاموش رہا۔ خون کی قے کر کے وہ بہت نڈھال ہوگیا تھا۔ اس سے بولا نہ جاتا تھا۔ لیکن فیروزہ کو آخری دفعہ دیکھنے کا خیال ستا رہا تھا۔ اس نے اشارے سے نرس کو اپنے قریب بُلایا۔ اور رُک رُک کر بولا۔

"فیروزہ ...... فیروزہ"

مکان کا پتہ وہ اچھی طرح ادا نہ کرسکا۔ لیکن مشاق نرس جو اس سے پیشتر کئی بار اس قسم کے واقعات دیکھ دیکھ کر ناتمام فقروں کا مطلب سمجھنے کی عادی ہوچکی تھی۔ سمجھ گئی۔ اور بولی "ابھی"

"نہیں ...... کل"

(۴)

خدیجہ ظفر کی غیر موجودگی سے اسی قدر متاثر ہوئی، جسقدر ایک نیک اور وفاشعار بیوی کا فرض تھا لیکن صرف چند دنوں کے لئے۔ اس کے بعد اس کی زندگی کے تمام جذبات اپنے ماں باپ کی خدمتگزاری۔ جو اس کے پاس آرہے تھے۔ اور امتیاز کی غور و پرداخت میں مدغم ہوگئے۔ ظفر اپنی بیوی کے نام اپنی جائداد کا کچھ حصہ منتقل کر چکا تھا۔ اور اس کی مستقل آمدنی نے خدیجہ کو ہر طرح کے تفکرات سے بے نیاز کر دیا۔ جس شام ظفر فیروزہ کے مکان سے آخری دفعہ نکالا گیا۔ اس سے دو دن بعد شام کے وقت خدیجہ کے والد سیّد اصغر علی شاہ صاحب شمسی دفتر سے آکر حقہ نوشی کے پرسکون شغل میں مصروف تھے۔ وہ ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ اور شروع ہی سے ایسے پُرانے خیالات لیکر پیدا ہوتے تھے۔ کہ دورِ حاضرہ کے جلد بدلنے والے ہنگاموں نے بھی ان کی طبیعت پر کوئی اثر نہیں کیا۔ ریل کے دفتر میں ملازم تھے۔ اور سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے۔ صحتِ نسب شرافتِ خاندانی اور اپنے نجیب الطرفین ہونے پر جا و بیجا تفاخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔ جب لڑکیوں کی تعلیم کا اہم اور عظیم مسئلہ تمام ملک کے اہل الرائے کو دعوتِ حل دے رہا تھا۔ تو انہوں نے اپنی فطری خودسری اور اہل سادات کے فرائض کے متعلق غلط خیالات کے ماتحت سادات کے ایک خاص جلسے میں جو اسی غرض سے منعقد ہوا تھا۔ کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کے متعلق کیا رویّہ اختیار کرنا چاہتے۔ بہت بیباکی اور جسارت سے پکار کر کہدیا تھا۔ "کہ کیا سیّد اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوائینگے۔ کیا وہ انہیں سکول بھیجیں گے کم از کم میں اور یاد رہے میں شمسی خاندان کے تمام افراد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ یہ گوارا نہیں کرسکتا۔ کہ میری لڑکی انگریزی سکولوں میں جاکر کرسٹان بن جائے۔

جس شخص کے تعلیم کے متعلق یہ خیالات ہوں۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی لڑکی کو کسی قسم کی تعلیم دیگا۔ یا اس کے ذہنی نشوونما میں کسی طرح ممد و معاون ثابت ہوگا۔ فضول تھا۔ اسی لئے ان کے خاندان کے باقی افراد کو اس بات پر بہت تعجب ہوا۔ کہ وہ خود اپنی لڑکی کو ظفر سے جو ہر چند کہ ایک متمول و معزز آدمی تھا۔ اور سب ججی کے عہدے پر فائز تھا۔ لیکن پھر بھی غیر گھرانے کا لڑکا تھا، کسی طرح بیاہ دینے پر رضامند ہوگئے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کو خود بھی بار بار اس رشتے پر افسوس آتا تھا۔ اور خاصکر جب ظفر گھر سے نکل کر چلا گیا۔ تو ان کے بجا افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اکثر بیٹھے سوچا کرتے۔ کہ اپنے گھرانے سے باہر رشتے کرنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔ مجھے یقیناً اپنی لڑکی شمسیوں ہی کو دینی چاہیئے تھی۔ آج بھی وہ اسی قسم کے خیالات میں مستغرق تھے۔ اور حقّے کی نے کو اپنے لبوں سے لگاتے دھوئیں کی طرف غور آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک طرف ان کی بیوی انوری بیگم بیٹھی اپنے نواسے امتیاز کی قمیص سی رہی تھی۔ خدیجہ بھی ایک طرف کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔

شمسی صاحب نے دیکھا کہ تمباکو جل گیا بیوی سے بولے "خدیجہ کی ماں ذرا چلم تو بھروا دینا۔"

انوری بیگم تیوری پر بل ڈال کر اٹھیں۔ وہ شمسی صاحب سے بھی زیادہ بدمزاج اور پرانے خیالات کی تھیں۔ اور شمسی صاحب کی حقہ نوشی کو ایک امر مجبوری سمجھ کر خاموش ہو رہتیں ورنہ انہیں اس مشغلے میں بہت سی برائیاں نظر آتی تھیں۔ چلم اٹھانے کو تو اٹھالی۔ لیکن ذرا تلخ سے لہجے میں کہنے لگیں۔ "کیا ہر وقت حقہ۔ لئے بیٹھے رہتے ہو۔"

شمسی صاحب خاموش ہو گئے۔ اس وقت انہیں لڑائی کرنا پسند نہ تھا۔ جہاں حقہ پینے والے قطب جنبد نہ جنبد گل محمد کے مصداق بن جاتے ہیں۔ وہاں ان کے دل سے جوش اور غصّے کے مادے کا اکثر و بیشتر حصّہ مفقود ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ اپنی بیوی کی طرف شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر فلسفیانہ متانت سے قریب کی میز سے سیاست کا پرچہ اٹھا لیا۔ اور چشمہ کو اپنی ناک پر درست کرتے ہوتے ورق گردانی کرنے لگے۔ یکبارگی ان کی نگاہ ایک عنوان پر جم کر رہ گئی انہوں نے دھڑکتے ہوتے دل سے عنوان کے نیچے کی سطور کو پڑھنا شروع کیا۔

" لاہور مورخہ ۳۔ دسمبر۔ سرکاری ہسپتال میں ایک مریض پہنچایا گیا ہے۔ جس کا نام اس کے کاغذات سے میرزا ظفر علی معلوم ہوتا ہے۔ بتیس تینتیس برس کی عمر ہے۔ گردن کی ہڈی کو ضرب شدید پہنچی ہے۔ حالت مخدوش

ہے رشتہ دار ان کو سرکاری ہسپتال سے مفصل اطلاعات مل سکتی ہیں۔"

اشتہار پولیس کی طرف سے تھا۔ شمسی صاحب کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُنہوں نے دوبارہ سطور کو پڑھا کہ کہیں ان کی آنکھوں نے انہیں کسی قسم کا دھوکا تو نہیں دیا۔ لیکن مطلب بالکل صاف اور واضح تھا۔ اتنے میں خدیجہ کی والدہ بھی آگئی ماتھے پر ہاتھ مار کر بولے۔" لو لڑکی کی تقدیر پھوٹ گئی۔"

خدیجہ کی والدہ ہر چند کہ شقی القلب تھیں۔ لیکن آخر عورت تھیں۔ گھبرا گئیں۔ چلم ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ ہکلا کے کہنے لگیں۔" کیا ..... کیا ہے۔"

خدیجہ نے اپنا سر زخمی ہرن کی طرح اُٹھایا۔ اور ملتجی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ شمسی صاحب نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر بولے۔" بیٹی۔ تیرا خاوند ہسپتال میں زخمی پڑا ہے۔ لکھا ہے کہ حالت خطرناک ہے۔"

خدیجہ نے ایک چیخ ماری۔ اور اُٹھ کر فوراً والد کے قریب آگئی۔

اس کی والدہ نے خدیجہ کو سنبھال لیا۔ اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر خاوند کی طرف قہر پاش نگاہوں سے دیکھ کر بولیں۔" تم نے تو بچی کی جان نکال لی تھی۔ اچھی طرح مضمون تو پڑھا ہوتا۔ کیا لکھا ہے کیا حالت بہت خطرناک ہے۔"

شمسی صاحب اس بیجا اظہار ناراضگی پر بھی خاموش رہے۔ آہستہ سے بولے۔" لکھا تو یہی ہے۔ کہ گردن کی ہڈی کو ضرب پہنچی ہے۔"

خدیجہ کی جو اب تک بُت بنی کھڑی تھی، جان میں جان آئی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔" ابّا۔ جائیے اور اُنہیں یہاں اُٹھا کر لے آئیے۔"

پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولی۔" میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔"

شمسی صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے۔ لیکن اب کہ واقعہ کا فوری صدمہ اپنی شدت میں بہت کچھ کم ہو چکا تھا۔ خدیجہ کی والدہ کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ اُنہوں نے سر بلند کر کے خاوند کی طرف دیکھ کر کہا۔" خُدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ آخر میری بچّی کا صبر پڑا۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ کل چلے جانا ذرا اسے بھی تو تکلیف برداشت کر لینے دو۔ پتہ لگے گھر سے باہر رہ کر کیا کیا اذیتیں ہوتی ہیں۔ حالت اتنی خطرناک تو ہے نہیں۔"

آخری فقرہ گویا انوری بیگم نے عذر کے طور پر پیش کیا شمسی صاحب اتنے شقی القلب نہ تھے۔ لیکن بیوی کے جا و بیجا احکام ماننے کے اسقدر خوگر ہو چکے تھے۔ کہ اختلاف رائے کی جُرات نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے بیٹی کی طرف استفہامیہ انداز سے دیکھا۔ خدیجہ چپ رہی۔

انوری بیگم خدیجہ کے قریب آکر پیار سے کہنے لگیں

"بیٹی کل چلی جانا۔ آج ذرا اُسے ہسپتال میں رہنے دو۔"

خدیجہ پھر خاموش رہی۔ اور اپنے نام نہاد فرض کا وہ احساس جو اُس نے والدین سے ورثے میں پایا تھا۔ اور جواب اس کی فطرت میں ایک نسوانی خصوصیّت کی طرح جاگزیں ہوگیا تھا۔ اسے مجبور کرنے لگا۔ کہ وہ اپنی ماں کی فرمانبرداری کرے ....

(۵)

ظفر کو مکمل ایک دن اور ایک رات کے بعد ہوش آیا۔ اس کو اپنے اردگرد مہیب اور سنسان تاریکی مسلط ہوتی ہوئی معلوم ہوئی اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوتا گویا کبھی کبھی فضا کی تاریکیوں میں مختلف النوع روشنیاں چمک جاتی ہیں۔ کبھی اسے تمام کمرہ گہرے سرخ رنگ میں ملبوس دکھائی دیتا۔ کبھی شہابی رنگ میں، کبھی سبز رنگ میں اور پھر کبھی یہ تمام روشنیاں ایک دوسرے میں مل کر ایک عجیب رنگ پیدا کرلیتیں۔ ظفر اس بات کو محسوس کرکے حیران ہوا کہ اس کو اپنی گردن میں کوئی درد محسوس نہ ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے وہ اپنا جسم پہلے سے زیادہ سبک پاتا تھا۔ کمرے کی تمام اشیا۔ اسے دھندلی سی نظر آتی تھیں۔ ہر چند کہ وہ محسوس کررہا تھا۔ کہ کمرے میں بجلی کا لیمپ روشن ہے۔ لیکن ایک محدود دائرہ نور کے علاوہ اسے کوئی چیز نور سے منعکس نظر نہ آتی تھی۔ اس نے دائیں طرف کروٹ بدلی اور اس وقت اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہے۔

اس نے اپنے آپ کو بستر پر سے ذرا اُٹھا کے آنکھیں پھاڑ کے اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کی۔ عین اس وقت اس شخص نے اپنا سر اُٹھایا۔ اور ظفر نے فیروزہ کو خوب اچھی طرح پہچانا۔ اسے فیروزہ کا چہرہ اس وقت دوسری چیزوں کے تقابل میں بہت زیادہ روشن، بہت زیادہ نورانی بہت زیادہ حسین معلوم ہوتا تھا۔

وہ انبساط و مسرت کی رنگین پہنایوں میں غرق ہوگیا۔ اور بولا۔ "فیروزہ - فیروزہ"

اسے اپنی آواز خلافِ معمول بہت صاف معلوم ہوتی وہ تکلیف جو اُسے بولنے میں محسوس ہوتی تھی۔ آج بالکل ناپید تھی۔

فیروزہ نے جواب دینے کے بغیر اپنے گال ظفر کے ہاتھوں پر رکھ دئے۔ اور اپنے گرم گرم آنسوؤں سے انہیں دھونے لگی۔

ظفر نے کہا۔ "فیروزہ مجھے گانا سُناؤ۔"

وہ گانے لگی۔ اور شاید اس نے اپنی رُوح کے تمام سوز کو راگ کے الفاظ میں قید کردیا۔ کیونکہ ظفر کو یوں محسوس ہوا گویا وہ اپنے جسم کو چھوڑ کر راگ کے زیر و بم کے

ساتھ پرواز کر رہا ہے۔ اسے الفاظ بالکل نہ سنائی دیتے تھے۔ لیکن وہ لے کے گداز کو نمایاں طور پر محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد اسے خیال ہوا کہ شاید وہ اس دنیا کو چھوڑ کر کسی اور پر سکون دنیا میں جا بسا ہے۔ جہاں ہر طرف نغموں کی نشاط آفرینی سے ایک ہنگامہ سا برپا ہے۔ جہاں غنچے مسکرا رہے ہیں۔ جہاں پھول کھل رہے ہیں۔ جہاں عطر بیز ہوا خوشبو کے مستی افزا خزانے اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے رواں ہے۔ پھر اسے یکبارگی ایک جھٹکا سا محسوس ہوا . . . . . .

فیروزہ نے ظفر کی پیشانی پر ایک پاکباز بوسہ دیا۔ اور پائینتی پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ آج وہ پہلی دفعہ خلوصِ دل سے روئی۔

نرس نے ظفر کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا۔ اور واپس مڑی دروازے میں اسے ایک برقعہ پوش عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ اسے ہدایات مل چکی تھیں کہ صرف مریض کے رشتہ داروں کو آنے کی اجازت دی جائے۔ اس نے مرد کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"مریض میرا داماد ہے۔ یہ اس کی بیوی ہے۔"

نرس نے مڑ کر جھکی ہوئی فیروزہ روتی ہوئی فیروزہ کی طرف دیکھا اور پھر اس بیوی کی طرف دیکھا۔ جو خاوند کے مرنے کے بعد آئی تھی۔ اور اس نے تحقیر کے ایسے لہجے میں نفرت کے ایسے انداز میں طنز کے ایسے طریق میں جو صرف ایک عورت سے مخصوص ہے کہا۔ افسوس آپ صرف چند لمحے دیر کر کے آئے ہیں"۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

عابد

کیفِ غم

کیا کسی سے کہیں فسانۂ غم — تم سنو تو ہزار بار کہیں

ہائے وہ روزگارِ وصل جسے — حاصلِ دورِ روزگار کہیں

آہ! اُن صاحبانِ ہوش کے رنگ — جو گلِ آرزو کو خار کہیں

"۹"

وجدانیات

کسی طرح سے بھی اظہارِ حال ہو نہ سکا
دلِ نیاز حریفِ جمال ہو نہ سکا

تمہارے بعد کسی پر نگاہ جم نہ سکی
تمہارے بعد کسی کا خیال ہو نہ سکا

وہ انتہائے مسرت وہ روزگار وصال
کہ فرقِ روز و شب و ماہ و سال ہو نہ سکا

یہی رہا ہے مئے عاشقی بھی پی دیکھیں
شراب ناب سے رفع ملال ہو نہ سکا

ہوا ہے فتنۂ ایمان و ہوش حسن مجاز
رہی یہ پھر بھی کمی بے مثال ہو نہ سکا

بہار آئی تو وہ آکے ہم کو چھیڑ گئے
کبھی کمال جنوں کو زوال ہو نہ سکا

ہزار بار ہوس نے اسے فریب دئے
نیاز شوق حریص وصال ہو نہ سکا

عجیب چیز ہے دنیا میں استواری شوق
کہ خاکسار ترا پا تمال ہو نہ سکا

غلط ہے یہ کہ ہمیں وہ جواب دے نہ سکے
حضورِ یار ہمیں سے سوال ہو نہ سکا

مآل عشق سے ہم آشنا تو تھے لیکن
رہِ وفا میں خیالِ مآل ہو نہ سکا

شراب عشق وہ شے تھی کہ ہم نے اے عابد
ہزار ضبط کیا اعتدال ہو نہ سکا

عابد

ایک کہانی کی رام کہانی

"ارشاد ہوا کہانی سنینگے" چند ڈرامانگاروں کے حالات عرض کئے۔ ذرا بگڑ کر بولے۔ "نہیں صاحب ہم تو کہانی سُنیں گے۔" دو ایک ایکٹروں کے سوانح حیات گزارش کردئے۔ اب تو مچل ہی گئے۔ کہ کہانی سُن کر چھوڑیں گے۔ ایک تھیٹر کی تاریخ شروع کردی۔ چلئے ہنسی ہنسی میں رودئے۔ "ہمیں باتوں میں اُڑاتے ہیں آپ' کہانی کہہ ڈالتے تو کیا جاتا آپ کا ؟ بڑے" داستان گو" بنے پھرتے تھے۔ آج سارا بھرم کُھل گیا۔ ایک کہانی کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ وہ بھی نہ ہوسکی۔ یہ کہتے۔ بے زبان ہیں۔ اگر کوئی اہل زبان ہوتا تو ابھی بات کا بتنگڑ بنا کر دکھا دیتا۔ پنجابی آخر پنجابی ہوتے ہیں۔" اب آپ جو چاہیں کہیں مگر چشم پرآب کا مقابلہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ کسی کی آنکھوں میں آنسو آئے اور ظرافت۔ مذاق۔ چھیڑ خانی، بلکہ شاعروں کی زبان میں صبرو قرار رخصت۔

آپ بجا فرماتے ہیں۔ مذاق بھونڈا تھا۔ بے محل تھا مگر اس کا کیا علاج کہ اس وقت کوئی کہانی ذہن میں نہ تھی۔ خیر میں ہارا اور وہ جیتے۔ کہانی کہنا شروع کیا۔ یہ گویا میری "پلاٹ آفرینی" کا امتحان تھا۔ بغیر سوچے سمجھے یوں چل پڑا۔

آدھی رات ادھر آدھی رات اُدھر۔ سونا سنسار جاگتا پاک پروردگار۔ آنکھوں دیکھی نہیں کانوں سُنی کہتا ہوں۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارے آپ اور آپ کا خدا بادشاہ!

"نہیں باز آتے آپ۔ یہ کہانی ہے یا نثر میں قصیدہ کہہ رہے ہیں۔ واہ!"

ہاں! بادشاہ تھا۔ اُس کے دِل میں یہ بات آئی کہ جیسے ہو دُنیا کا سب سے بڑا انسان بن جاؤں۔ بادشاہوں کے دل میں بات تو ہر قسم کی آجاتی ہے۔ مگر اُس پر عمل کرنے کی ترکیب انہیں کبھی نہیں سُوجھتی۔ اسی لئے بادشاہوں کو" بھولا" کہتے ہیں۔ یہ لقب مدح میں داخل ہے۔ گو اس کے معنے" بے وقوف کُندہ ناتراش۔ جاہل" سے کم وبیش نہیں۔

" اچھا تو مجھے بادشاہ کہنے سے آپ کا یہ مطلب تھا۔ کہ مَیں کودن ہوں۔ بس رہی۔ میرا سر پھر گیا ہے معاف رکھئے۔ اس کہانی سے۔ آپ تو پردہ ہی پردہ میں ملاحیاں سُنا رہے ہیں۔"

اُن کی عقل کی باگ وزیر کے ہاتھ میں ہوتی۔

جب اس کی سمجھ کام نہیں کرتی تو وہ جورو کے پاس دوڑا جاتا ہے۔ اور وہ عقدہ حل کر دیتی ہے۔

"تو یہ کہانی ہے یا افسانہ نگاری پر تنقید ہو رہی ہے۔"

بادشاہ نے چوبدار کو حکم دیا۔ کہ جاؤ اور وزیر کو جس حال میں ہو لو لاؤ! چوبدار پہنچا تو وزیر اعظم صاحب اپنی دو دست و یک بالشت داڑھی

(۱) کو خضاب لگا رہے تھے یا
(۲) کو خضاب کر رہے تھے یا
(۳) پر خضاب مل رہے تھے یا
(۴) کو پر زاغ بنا رہے تھے یا } جو اہلِ زبان پسند فرمائیں
(۵) کو سیاہ کر کے عورت کے پہلو کا تیر نکال رہے تھے
(۶) . . . .

"بس رہنے دیجئے۔ معلوم ہوا آپ من گھڑت باتوں سے وقت گزاری کر رہے ہیں۔ بھلا بچارے اہلِ زبان پر کیوں پل پڑے آپ؟"

ایکے تو میں نے بھی جواب دینا مناسب خیال کیا۔

"کہانیاں من گھڑت ہی ہوا کرتی ہیں۔ وحی یا القا کے ذریعہ نازل نہیں ہوتیں۔ اور اہل زبان کے ذکرِ خیر کے بغیر ان کا لطف ادھورا رہ جاتا ہے۔"

"کیوں؟"

"ان کی ہستی بذاتہ ایک مضحکہ خیز افسانہ ہے۔"

"اب یہ پہیلیاں کون بوجھے۔ صاف کہہ دیجئے نا صرف نام ہی نام ہے۔ ورنہ اہلِ زبان ہونے کا ادعا بے ہنگام ہے۔"

"ارے ارے غضب کر دیا آپ نے۔ زمزم۔ اور کوثر منگوا کر زبان دھو ڈالیے۔ آپ کی زبان سے قافیہ پیمائی ہو گئی۔ کوئی اہلِ زبان سن پائیگا تو زبان جڑ سے کٹوانا پڑیگی۔" "بات چبا جانے کی سند نہیں۔ اس کا ثبوت دیجئے۔ کہ اہلِ زبان کا دعویٰ کیوں باطل ہے۔"

"کہانی بے مزہ ہو جائیگی۔ اس کی وہی گت بنے گی جو متعدد اشاعتوں میں شائع ہونے والے مضامین کی بنا کرتی ہے۔ خیر سنئے۔ جب یونان کا ستارہ اوج پر تھا تو یونانی تمام دنیا کو ماوراء تومان بار سرین کہتے تھے اب جس لفظ کے معنی وحشی ہو گئے ہیں۔ عرب کو عروج ہوا تو عربوں کے سوا تمام خدا کی خدائی خصوصاً اہل فارس عجمی قرار پاتے۔ اور ایران کی باری آئی تو اس نے اہل ہند کو "پوچ گو" کا خطاب دیا۔ اسی طرح دہلی میں اردو کا چرچا ہوا تو لکھنؤ کی زبان کو "پوربی بولی" کا خطاب ملا۔ لیکن جب لکھنؤ نے دہلی کا تتبع چھوڑ کر خود اہلِ زبان ہونے کا دعوے کیا تو دہلی والوں نے اپنی زبان کو "اردوے معلےٰ" کہنا

شروع کیا۔اس کے جواب میں لکھنؤ کی زبان اُردوے معلےٰ کے لقب سے ملقب ہوتی۔کچھ مدّت تک دہلی اور لکھنؤ ایک دوسرے کے دست بگریبان رہے۔لیکن زمانہ کی ایک گردش نے دہلی اور لکھنؤ کا تختہ الٹ دیا۔ لال قلعہ پلٹن کے سپاہیوں کا لکد کوب بنا۔اور قیصر باغ میں کیننگ کالج کُھل گیا۔اس طرح دہلی اور لکھنؤ دونوں زبان کی سرپرستی سے عاری ہو گئے۔ اب اس گلشن کی آبیاری پنجاب، رامپور، اور دکن نے اپنے ذمہ لی۔ اور خدمت کا حق ادا کر دیا۔خصوصاً پنجاب نے نشر و اشاعت کا وہ بازار گرم کیا کہ باقی تمام ہندوستان اس سے لگّا نہیں کھا سکتا پنجاب مدّتوں رہنمائی کے لئے دہلی اور لکھنؤ کا منہ دیکھتا رہا لیکن جب معلوم ہوا۔کہ دہلی اور لکھنؤ سوائے تعریض کے اور کسی مصرف کے نہیں، تو زندہ دلانِ پنجاب نے اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے کا تہیّہ کیا۔اور تحصیل و خدمت زبان کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ اگر چوطھے چکّی اور کنگھی چوٹی کے چند بیکار محاورات ہی سرمایۂ زبان دانی ہیں تو اہلِ دہلی و لکھنؤ اس پر بڑے اِتراتیں۔ ورنہ دُنیا جانتی ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کے خاوند بننا چاہتے ہیں۔جس کا نکاح ادا کرنا اُن کی بساط سے باہر ہے۔نئی باتیں پیدا کرنا۔ جدید علوم کی کتابیں لکھنا مغربی لٹریچر کے جواہر اُردو کے خزانہ میں جمع کرنا انہیں مدِّنظر نہیں، اس لئے ان کی موجودہ لغات اُن کی ضروریات کے لئے کافی ہے۔محاوروں کے چٹخارے پر ذہنیات کی ترقی کو قربان کر دینا اُنکی وضعداری میں داخل ہے۔ لیکن کام کرنے والے لوگ اگر محاوروں کے چکّر میں پڑ جائیں تو ان پر بھی وہی جمود طاری ہو جائے جس کے پنجہ میں دہلی اور لکھنؤ دم توڑ رہے ہیں۔ زبان کی وسعت تخیّل کی بلند پروازی۔اور تالیف و اشاعت نئے الفاظ اور نئی تراکیب چاہتے ہیں۔ اس لئے زبان میں وہ الفاظ وہ ترکیبیں آنی اٹل ہیں۔جن سے اہلِ دہلی اور لکھنؤ کے کان ہنوز نا آشنا ہیں۔اور جو ایک دن اُن کی زبان پر بھی جاری ہو کر رہینگی۔کوئی دن کی بات ہے جب پنجاب اور دکن کی زبان ٹکسالی ہو گی۔ اور دہلی اور لکھنؤ والے "جمنا" اور "گومتی" کا پانی پی پی کر کوستے پھرینگے۔"آپ نے کلاسیکل اور رومانٹک تحریکوں کا ذکر ادبیات یورپ کی تاریخ میں......

"نہیں میں نے نہیں دیکھا نہ سُننے کی تمنّا ہے۔ اب لکچر سمیٹئے اور کہانی......"

ہاں جب چوبدار پہنچا تو وزیر آدھی داڑھی سیاہ کر چکا تھا۔مگر باقی نصف میں چاندی کے تار ہنوز چمک رہے تھے وزیر نے ٹالنا چاہا مگر چوبدار نے ایک نہ مانی۔ اور اُسے اسی ہیئت کذائی میں لیکر چل کھڑا ہوا۔ خیر بازار میں جو لوگ چھپا چھپا کر ہنستے تھے اس کا ذکر جانے دیجئے۔ نہ وزیر نے دیکھا نہ محسوس کیا۔مگر دربار میں پہنچا تو بادشاہ

کے لبوں کو تبسم آشنا پا کر اہل دربار نے وہ فرمائشی قہقہہ
لگایا کہ ایوان گونج اُٹھا۔ اور وزیر پانی پانی ہو گیا۔ آخر بادشاہ
نے اس سے اپنے دل کی بات کہی۔ اور اس کی تدبیر دریافت
کی۔ وزیر نے دست بستہ ہو کر عرض کی کہ جہاں پناہ جان
کی اماں! سوال مشکل ہے سوچ بچار کر عرض کرنے کی
اجازت بخشی جائے۔ بادشاہ کے ابرو پر بل پڑ گئے۔
پیشانی شکن در شکن ہو گئی۔ چہرہ فرطِ طیش سے تمتما اُٹھا۔
اور گرج کر بولا۔ کہ اگر جان کی امان نہ مانگی ہوتی۔ تو سر
اس وقت پاؤں کی ٹھوکریں کھاتا۔ اچھا جاؤ کل غروبِ آفتاب
سے قبل جواب دو۔ ورنہ تمہارے زن و بچہ کولھو میں پیس
ڈالے جائینگے۔ وزیر ہانپتا کانپتا گھر پہنچا۔ موت اور کل
خاندان کا خاتمہ اُس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ ڈھاڑیں
مار کر رونے لگا۔ باندیوں۔ اصیلوں نے جب وزیر کو
بایں ریش و فش عورتوں کی طرح بین کرتے دیکھا تو وُہ
فوراً بھانپ گئیں کہ کسی میٹھے پیارے کی سُناؤنی آئی ہے
بس پھر کیا تھا کہرام مچ گیا۔ دوہتڑ چلنے لگا۔ خدا کی کرنی
اس وقت بوڑھے وزیر کی نوجوان بیگم مہندی لگاتے بیٹھی
تھی۔ اُس نے بھی سُنا مگر کیا کرتی اٹھتی تو مہندی چھٹ جاتی
مہندی کا بہانہ ایک پامال عذر ہے۔ بات یہ تھی کہ اسکے
میکے میں کوئی نہ تھا۔ جس کے مرنے کا اُسے دھڑکا ہوتا۔
سب عزازیل کی پہنچ سے باہر ہو کر لازوال نیند کے مزے
لے رہے تھے۔ رہا سسرال تو وہاں اسے عزیز و اقارب
کا کال نہ تھا۔ لیکن ان تعلقات میں اس کے خون کی آمیزش
کم تھی۔ سو اُن کی صرصرِ حیات بیگم کے سنبلستان کو پریشان
نہ کر سکتی تھی۔ وزیر کے گھرانے میں کوئی مر جائے تو اپنی خیر خواہی
جتانے کا اس سے بڑھ کر کونسا موقع ہو سکتا ہے۔ اس لئے
مردوں عورتوں کا اُسے توبہ! عورتوں اور مردوں کا تانتا
بندھ گیا۔ ڈولی پر ڈولی اور ہوادار پر ہوادار آنے لگے۔
اور تھوڑی دیر میں محل اچھا خاصہ ماتم سرا بن گیا۔ اندر باہر
صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور مراسم تعزیت ادا ہونے لگے، خدام ادب
نے دیوانخانہ میں ریش ایل حضرات کے آگے پیچوان رکھ دیئے
اور وہ نہایت سکونِ قلب سے کش لگانے لگے۔ حرم سرا
میں بچوں اور عورتوں نے وہ چیخم دہاڑ مچا رکھی تھی کہ کان پڑی
آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ وزیر نے سمجھا کہ ضرور کوئی سانحہ ہوا۔
اور وہ غمزدہ شکل بنا کر باہر آیا۔ لیکن جب وزیر آ کر مجلس
میں بیٹھا تو داروغہ جی نے دیگیں نکالیں، اور ختم شریف
کے لئے قسم قسم کے کھانے پکنے لگے۔ اتنے میں مساجد
کے ملاؤں کے کان میں بھنک پڑی اور وہ سیپارے
بغل میں دباتے آ پہنچے۔ اور سب نے مل ملا کر ایک گھنٹہ
میں ۱۲۱ دفعہ قرآن شریف ختم کر ڈالا۔ اب یہ ان کا دین ایمان
جانے کہ کتنی دفعہ پڑھا اور کتنی دفعہ ورق گردانی میں سہو
ہو گیا۔ لیکن ایک یک چشم سے روایت ہے کہ ان میں سے

چند ایک ایسے بھی تھے جو حرف نہیں اٹھا سکتے تھے۔ صرف سطروں پر انگلی پھیرتے جاتے تھے۔ مگر ہمیں اس روایت کے باور کرنے میں تامل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ راوی ثقہ نہیں، کیونکہ وہ ایک دن تھئیٹر کی طرف جاتا ہوا دیکھا گیا تھا۔

"آج ہو کیا گیا آپ کو؟ آپ کی باتوں کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ اب مولویوں کے پیچھے پڑ گئے۔ "بازی بازی باریش بابا ہم بازی" چھوڑئے ان باتوں کو۔ اور کہیے جب وزیر مردانے میں آکر بیٹھا تو"

"جب وزیر باہر آکر بیٹھا تو چند لمحوں کے لئے مجلس میں سناٹا سا چھا گیا۔ آخر داد تعزیت ملنے لگی۔ اور حاضرین بھیت بھیت کی بولیاں بولنے لگے

مشیت ایزدی کے آگے کیا چارہ ہے۔

بیشک دم مارنے کی مجال نہیں۔

سچ ہے اوّل فنا آخر فنا۔

مرضیِ مولا از ہمہ اولےٰ۔

اچھا خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

اور . . . . (کہنے کو تھے کہ "نعم البدل بخشے"

مگر دور اندیشی نے زبان کھینچ لی)

کل نفسٍ ذائقۃ الموت

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

کل من علیہا فان

یہ اُن حضرات کی طرف سے جو عربی دانی کے اظہار کا کوئی موقع شاید ہی ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔

وزیر ان رسمیات کو کان رکھ کر سنتا رہا۔ مگر اس کی آرزو بر نہ آئی۔ اور متوفی کا نام معلوم کرنا تو کجا یہ بھی نہ کھلا کہ مسافرِ عدم مرد تھا یا عورت سلسلہ کلام یوں جاری ہوا۔

اب صبر کیجیے۔

ہاں بھائی صبر کے سوا کیا ہو سکتا ہے آج نہ کرینگے کل کرینگے۔

"آج نہ کرینگے کل کرینگے" میں پانی مرتا تھا کہ اس سے دوسری شادی کا ایما ہوتا تھا۔ وزیر چونک پڑا۔ بڈھا خاوند جوان بیوی کی درازیِ عمر کا خواہاں رہتا ہے۔ تاکہ اگر وہ ڈھلک جائے تو اس کی حماقت، چندے "بہار آفرینی" کا دم بھرتی رہے۔

جی ہاں یہ کلیجہ پر پتھر نہ رکھینگے تو سب وقف ماتم ہو کر خود قابلِ دو ہتڑ" ہو جائینگے۔

قابلِ دوہتڑ کی ترکیب سنتے تو "پائے محمّر" "ارباب کیٹی" "دو پہر خزاں" "وقت مرگ" کو بھی مات کر دیا

میاں سُنا نواب چھمن کے بٹیر نے کیا قیامت کی۔

ہاں ہاں کہنا تو کیا ہُوا۔

ہونا کیا تھا پالی میں اُترتے ہی وہ ذوک دم بھاگا

کہ نواب صاحب کی چانڈو کی تھیلی میں جاکر دم لیا۔

توبہ۔ اِتنے عزّت دار کی جڑ ہی کٹ گئی۔ خدا سب

کی لاج رکھے۔

اِتنا بڑا رئیس کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔

اِس لئے تو آج یہاں بھی نظر نہیں آتا۔

تو چند دی کی کہتے کیا اکیلے چلتے گا۔

نہ جانے کی ایک ہی کہی۔ بس ہنڈی کا انتظام ہُوا

اور اینجانب روانہ باشد۔

کیوں صاحب یہ پالی کس زبان کا لفظ ہے

(عینک سے چونک کر) یہ لفظ جناب ٹکسالی ہے

اور نیپالی سے مشتق ہے۔ کثرت استعمال سے "نی" گر گئی۔

اور پالی رہ گئی۔ نیپال کی لڑائی شیروں کا کھیل رہے۔ اِس

نسبت سے بٹیروں کے دنگل کو پالی کہتے ہیں۔ کیونکہ بٹیروں

کا لڑنا شیروں کے معرکہ سے کم خیال نہیں کیا جاتا۔

اس قسم کی باتوں سے حقِ ماتم پرسی ادا کر کے اور

طرح طرح کے لذیذ کھانے چھک کر لوگ اپنے گھروں کو

چلے گئے۔ محل سرا میں بھی ذرا سکون ہُوا۔ اور وزیر کو اپنی بیگم

کی خدمت میں بار ملا۔ میاں بیوی اکٹھے ہُوئے۔ تو یوں گفتگو

ہوئی :-

بیگم۔ آخر یہ ہُوا کیا؟

وزیر۔ مَیں کیا جانوں۔

بیگم۔ یہ کس کی سُناؤنی آئی تھی۔

وزیر۔ مجھے کیا معلوم

بیگم۔ تو تم گھر آتے ہی رونے پیٹنے کیوں لگے

وزیر۔ اس کے سبب کو ماتم کی علت سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

بیگم۔ تو اس کے یہ معنی ہُوئے کہ مرا ورا کوئی نہیں، ماتم

مفت میں ہوتا رہا۔

وزیر۔ صورت تو ایسی ہی نظر آتی ہے۔

بیگم۔ تو پھر تمہاری سینہ کوبی کا کارن

وزیر نے بادشاہ کے حکم اور عدم تعمیل میں تعزیر عینہ

کی ساری کیفیت کہی تو بیگم مُسکرا دی۔

وزیر کو تسلّی دی۔ کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں مشکل

حل ہو جائیگی۔ بادشاہ سے کہدینا کہ منگل کی رات کو جیل خانہ

کے عقب میں جو پہاڑی ہے اس پر جریدہ آئے۔ وہاں ایک

فقیر ملیگا۔ اور من کی کامنا پُوری ہو جائیگی۔

وزیر۔ کوئی نذر و نیاز

بیگم۔ تم مور کھ ہی رہے۔ بھلا فقیروں کے حضور کوئی خالی ہاتھ

بھی جاتا ہے۔

وزیر۔ تو بتاؤ کیا حاضر کیا جائے؟

بیگم۔ یہی جو شرع شریعت میں لکھا ہے۔
وزیر۔ یعنے
بیگم۔ سُنو۔ یہ ہے ٹکسالی نذرونیاز
(۱) پیر دیندار کا کونڈا۔
(۲) سید احمد کبیر کا چھاندا۔
(۳) مشکلکشا کا دونا۔
(۴) پٹیلے کا مُرغا۔
(۵) شیخ سدو کا بکرا۔
(۶) شہید کا ملیدا۔
(۷) بابا فرید کا چلا (حلوا)
(۸) بی بی کی پوڑیا۔
(۹) پریوں کا طبق
(۱۰) خواجہ خضر کا دلیا۔
(۱۱) حضرت عباس کی حاضری۔

یہ چیزیں وزن میں پورے سات من ہوں۔
وزیر۔ مگر بادشاہ تنہا جائیگا تو اسے اُٹھائیگا کون ؟
بیگم۔ اس کا کام ہے۔ خواہ خود اُٹھائے یا ہاتھی پر بار کرالائے۔ ہاں بار برداری بھی نذر میں شمار ہوگی۔ واپس نہ دیجائیگی۔
وزیر۔ تو اُونٹ کے گلے بلّی ہوئی نہ۔ خیر یہ سب کچھ ہو رہے گا۔

دِن چڑھے کی دیر تھی کہ وزیر نے آستانِ شاہی کو جا بوسہ دیا۔ اور تمام بات عرض کی۔ حاصل کلام بادشاہ نذرونیاز ہاتھی پر بار کر کے ایسے حال میں کہ رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ مقام مقررہ پر جا پُہنچا۔ دیکھتا کیا ہے کہ الاؤ دھڑ دھڑ چل رہا ہے۔ جسکی روشنی ایک نوعمر سبز پوش فقیر کے پُرانوار چہرہ پر پڑ رہی ہے۔ جو حق سے لو لگائے عالم استغراق کی سیر میں محو ہے۔ باادب اس کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فقیر نے سر اُٹھایا۔ اور یوں گویا ہُوا۔
فقیر۔ حق حق اُسی کی ذات مہتر جسے زوال نہیں۔ باقی سب فانی اس لئے کہتر۔ بزرگی اسی میں کہ لازوال زندگی نصیب ہو۔ فنا میں بقا کی جھلک نظر آئے۔ فانی انسان جاودانی ذات میں سمو جائے۔ اے جویائے مہتری تیرے دل کا حال ہم پر روشن ہے۔ غم نہ کھا۔ فقیر کے اشارے پر چل اور دل کی مراد حاصل کر۔
بادشاہ۔ اے واقف اسرار خفی و جلی! خوب سمجھا جو فرمایا واقعی زندگی پیہم کا حصول بزرگی کے مترادف ہے لیکن یہ کیسے حاصل ہو۔ اس کے معلوم کرنے کا مشتاق ہوں۔
فقیر۔ بھولے بادشاہ! اس کا حاصل کرنا تلوار کی دھار پر نہیں۔ بلکہ قلم کی نوک پر منحصر ہے۔ اس کے لئے قوی ہیکل پہلوانوں کی امداد درکار نہیں۔ بلکہ منخنی انشا۔ پردازوں کی احتیاج ہے۔ اہل قلم کے جھرمٹ میں بیٹھ جا۔ ان کو اپنا

ہمنوا بنا۔ اقلیم سخن کو ان کے بل پر فتح کر اور جہاں اُستاد ہونے کے علم کے سایہ تلے اپنی فنا کا مرقد بنا۔ اور حیات جاودانی حاصل کر۔ مگر یہ بات یاد رہے کہ اس مجلس میں کسی ایسے انشاپرداز یا شاعر کو بار نہ ملے۔ جس کے کلام پر کوئی انگلی رکھ سکے۔

یہ کہکر فقیر جوف کوہ میں چلا گیا۔ اور بادشاہ خوشی خوشی محل کو لوٹا۔ پھر اس کے جانے کے بعد فقیر نے یہ بانا اُتارا۔ اور اس بادل سے ایک سُورج کی کرن نکلی۔ اور چاند نے دیکھا کہ وزیر کی بیگم اپنے گھر جا رہی ہے۔ جب دن چڑھا تو بادشاہ نے ادبا کو صلائے عام دی۔ اور وہ جوق در جوق دربار میں جمع ہُوئے۔ لیکن ایک نے دوسرے کے کلام میں میخ نکالی۔ اور اس طرح سب کی کاوشیں ایراد کی نذر ہو گئیں۔

آخر مناظرہ نے مجادلہ کی شکل اختیار کی۔ طرفداروں نے تلواریں کھینچ لیں۔ اور بادشاہ کے خرمن حیات کو برق سخن نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ اس جنگ کے شعلے محل سے نکل کر شہر میں اور شہر سے تمام مُلک میں پھیل گئے۔ اور تمام سلطنت نکتہ وری کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس شورش سے . . . . " وہ خواب ناز کے مزے لینے لگے۔ اور میری آنکھ کھُل گئی۔ تو دیکھا کہ شمع جل رہی ہے اور میرے سامنے میز پر ایک خط پڑا ہے۔ جس میں ایک کہانی لکھنے کی فرمایش ہے۔

"ڈرامی" جموں

فسانۂ دوش

میرے حق میں بلائے جاں ہے یہ ہوش ۔۔۔ کاش مل جاتے کوئی بادہ فروش

اب کہاں دور ہائے وصل و فراق ۔۔۔ اب کہاں وہ امید حسرت کوشش

حُسن سے اُن کے کیا کروں شکوہ ۔۔۔ میری فطرت ہے خود مصیبت کوش

اِک مرقع ہے یاس و حسرت کا ۔۔۔ کیا سُناؤں تمہیں فسانۂ دوش

مَیں جو آیا جہاں میں' آئی صدا ۔۔۔ آگیا اور اِک نیا مے نوش

کیا تماشا ہے بزم محشر میں ۔۔۔ وُہ اُدھر چپ' اِدھر ہوں مَیں خاموش

ہائے تقدیر ! وائے ناکامی !! ۔۔۔ اُن کے آتے ہی ہو گیا بیہوش

کسقدر آہ کیف پرور تھا ۔۔۔ وہ جوانی کا راز جوش و خروش

راز

جذبات

پیکاں کی تواضع ہو خونِ دلِ مضطر سے
صہبائے وفا چھلکے یارب مرے ساغر سے

صدقے تری آنکھوں کے تڑپا دے مجھے ساقی
بیگانۂ ہستی ہوں بے مہریِ ساغر سے

پھر سوزِ نہانی کا احساس ہُوا مجھ کو
پھر غم نے مجھے چھیڑا نوکِ مژۂ تر سے

کیوں خونِ دلِ محزوں آنکھوں میں کھنچ آیا ہے
کچھ اور نہ وہ سمجھیں رنگینیِ منظر سے

یوں دستِ تمنا میں آتے ہی چھلک جائے
شکوہ ہے مجھے ساقی کم ظرفیِ ساغر سے

بیٹھا ہوں لئے دل میں بیتابیِ حرماں کو
دُنیا ہے الگ میری ہنگامۂ محشر سے

پھر دشت نوردی کا فرقت میں خیال آیا
پھر دل کو ہوئی قوّت آشفتگیِ سر سے

دِل اور اُسے عادت بیتابیِ فرقت کی
مَیں اور پریشاں ہوں ہنگامۂ محشر سے

صدقے ترے ہاتھوں کے وہ جام عنایت ہو
دُھل جائے غمِ ہستی ساقی دِلِ مضطر سے

میری کششِ حسرت بیکار رہی جاتی
مے دیکھ چھلکتی ہے ساقی ترے ساغر سے

ہو جذبِ جنوں یارب احساسِ غمِ ہستی
ٹل جائے بلا دِل کی اس طرح مرے سر سے

تدبیرِ رفو کیا ہو اے ذِلّتِ صد چاکی
دامن تو مرا چھوٹے اس دستِ ستمگر سے

بنجاتے ہیں تصویریں غمہائے نہانی کی
قطرے جو ٹپکتے ہیں میری مژۂ تر سے

پھر شکل ہُوئی پیدا آبادیِ صحرا کی
پھر جوشِ جنوں میرا اُبھرا ہے نئے سر سے

میرے دِلِ محزوں کا ماتم تو نہیں ہوتا
آتی ہے صدا غم کی ہنگامۂ محشر سے

اے آتشِ پنہانی پھر کار نمایاں کر
پھر دودِ دلِ محزوں اُونچا ہو مرے سر سے

موہوم امیدوں پر صبر آئے تو کیا آئے
مجبور ہوں یوں ہادیؔ مَیں بھی دِلِ مضطر سے

ہادی مچھلی شہری

وفاکی دیوی

(۱)

"ولز کی مشہور دکان کا دیوالہ نکل گیا" اس خبر کو سنتے ہی جان ہکسفورڈ کے خرمنِ امید پر گویا بجلی سی گری۔ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ بیچارے کے ارادے خاک میں مل گئے۔ عنقریب "فلورا" سے شادی ہونے والی تھی۔

فلورا مسز فاہن کی بیٹی، جس پر وہ دل و جان سے فدا تھا۔ جس کے دیکھے بغیر اُسے کل نہ پڑتی تھی۔ جو حسن میں چندے آفتاب و چندے ماہتاب تھی۔ اور جسکی خوبصورتی سارے گاؤں میں مشہور تھی۔ آہ! غریب "جان" دل تھام کر رہ گیا۔

پاس کوڑی نہیں۔ فرم میں ستر روپے ماہوار کی ملازمت تھی وہ بھی جاتی رہی۔ انگلستان جیسے ملک میں ملازمت کا ہاتھ سے جاتے رہنا کوئی معمولی صدمہ نہیں۔ ہزاروں کیا لاکھوں فاقوں مرتے ہیں۔ نوکری نہیں ملتی۔ جسے دیکھو بے روزگاری کے ہاتھوں نالاں ہے۔ "جان" کی ترقی ہونے والی تھی۔ ارادہ تھا کہ فرم سے کچھ روپیہ ادھار لیکر شادی کرلونگا۔ اور اپنی تنخواہ سے اپنا، فلورا اور اُس کی بیوہ ماں کا پیٹ پالونگا۔ لیکن ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال وہ باتیں ہی نہ رہیں۔ وہ فرم ہی جاتی رہی۔ روپیہ لینا تو درکنار، ملازمت ہی سے جواب ملا۔ جان اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ فرم کا مینجر آیا۔ اور جان کو مخاطب کرکے بولا۔

"جان! فکرمند کیوں ہو۔ اُٹھو اور سُنو میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔ میرے ایک دوست نے "نیویارک" میں کارک بنانے کا کارخانہ جاری کیا ہے۔ اُسے ایک ایماندار اور محنتی کلرک کی ضرورت ہے۔ میں تمہاری سفارش کئے دیتا ہوں۔ تم تیار رہو۔ اگلے ہفتے نیویارک کو روانہ ہو جاؤ۔"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑگیا۔ جان کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ تشکر آمیز نظروں سے مینجر کی طرف دیکھا۔ مینجر نے اُسے ایک سفارشی خط دیا۔ اور چلا گیا۔ جان، خوش خوش اپنی پیاری فلورا کے ہاں گیا۔ اور جاتے ہی فرم کے ٹوٹ جانے اور اپنے نیویارک جانے کا حال بیان کیا۔

فلورا اور مسز فاہن کو خوشی بھی ہوئی۔ اور رنج بھی۔ خوشی اس لئے کہ جان کو نوکری مل گئی۔ رنج اس لئے کہ

اب وہ نیویارک چلا جائیگا۔ اور فلورا جدائی کی مصیبتیں اُٹھانے
کو برسپورٹ ہیں رہ جائیگی۔

فلورا کو بھی جاؔن سے اُتنی ہی محبت تھی جتنی جاؔن کو
فلوراؔ سے۔ بڑی دیر تک صلاح مشورے ہوتے رہے
آخر یہ صلاح ٹھہری۔ کہ جاؔن اگلے ہفتے نیویارک چلا جائے۔
اور وہاں اپنا کام سنبھال کے مکان وغیرہ کا بندوبست
کرے۔ اور ان کو ایک خط لکھ دے۔ پھر وہ بھی نیویارک
چلے جائینگے۔ اور وہیں شادی ہو جائیگی۔ وہ دن آگیا۔ جب
جاؔن کو رخصت ہونا تھا۔ مسز فاہن نے دُعائیں دیں۔
فلوراؔ سے گلے مِلا۔ اور رخصت ہُوا۔ فلورا نے روتے ہُوتے
کہا:۔ "مینہ برسے۔ طوفان آئیں۔ آندھیاں چلیں۔
لیکن جبتک "پیارے جان!" تم مجھے نہ بلا دوگے میں
اسی مکان میں تمہارا انتظار کرونگی۔"

(۲)

نیویارک سے ایک خط جان کے بخیریت پہنچنے کا
موصول ہُوا۔ اور پھر خاموشی، ایک طویل خاموشی۔ ہفتہ، دو ہفتے،
مہینہ دو مہینے، سال دو سال گزر گئے۔ مگر جان کا کوئی
خط نہ آیا۔ فلورا کی عجیب حالت ہوگئی۔ بیچاری کی نیند
جاتی رہی۔ کھانا پینا چھوٹا۔ ہر دم متفکر نظر آنے لگی۔ چہرے
پر بے رونقی چھا گئی۔ مسز فاہن اپنی پیاری بیٹی کی حالت
دیکھتی اور کُڑھتی۔ حیران تھی کہ جاؔن کا خط کیوں نہیں آیا، اور
اُس نے ان لوگوں کو بُلایا کیوں نہیں۔ "کیا جاؔن نے فلورا
کو دھوکا دیا۔ نہیں وہ بڑا راستباز آدمی تھا۔ اُس سے یہ
امید نہ تھی۔" آخر بارہ سال گزر گئے۔ اور بوڑھی مسز فاہن
اپنی بیٹی کو اکیلی چھوڑ راہیِ ملک بقا ہوئی۔

ایک تو جاؔن کی جُدائی کا قلق دوسرے پیاری ماں
کی موت کا رنج۔ وہ ماں جو ہر وقت اُسے تسلیاں دیتی اور
اُس کی ڈھارس بندھاتی تھی۔ فلوراؔ کی عجب حالت ہوگئی۔
مینہ برسے۔ آندھیاں آئیں۔ طوفان آئے۔ مگر زبان کی
سچی فلورا اُسی مکان میں جاؔن کا جس کو وہ راستباز اور وفادار
سمجھتی تھی انتظار کرتی رہی۔

(۳)

جاؔن نیویارک پہنچا۔ اور ایک معمولی سے ہوٹل میں
قیام پذیر ہُوا۔ یہ ہوٹل ایک کم آباد سے علاقے میں واقع
تھا۔ اور اُس کی مالک ایک بُوڑھی عورت تھی۔ یہ عورت
کیا تھی شیطان کی خالہ تھی۔ اس کا نام رہزنی تھا۔ اسکے
دو بیٹے تھے۔ جو اس کے شریک کار تھے۔ یہ عورت مسافروں
کو اپنے ہوٹل میں ٹھہراتی۔ ایک دو دن کے بعد ان کے کھانے
میں کوئی نشی چیز ملا کر اُن کا سامان لُوٹ لیا کرتی تھی: بیچارے
مسافر قانون کی قباحتوں اور پولیس کی تکلیفوں سے بچنے
کے لئے چپ ہو رہتے۔ اور ہوٹل چھوڑ کر بھاگ جاتے۔
جاؔن، نووارد شخص تھا۔ اس بڑھیا کے مکروفریب سے

ناواقف تھا۔ کسی شخص سے شناسائی نہ تھی۔ پھنسا اور بُری طرح پھنسا۔

ابھی تک اس نے اپنے کام کا انتظام نہ کیا تھا۔ اور فی الحال وہ شہر کی سیر میں مشغول تھا۔ صبح کھانا کھا کر جاتا' اور شام کو واپس ہوتا۔ ایک دن اُسے معمول سے زیادہ دیر ہوگئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ جب واپس آیا تو بڑھیا نے کھانا کھلانے کے بعد شراب کا ایک گلاس دیا۔ جاؔن پی گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُسے نیند محسوس ہونے لگی۔ اُٹھا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے کا خیال نہ رہا۔ اور جاتے ہی پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند آگئی اور بے خبر سو گیا۔ خوش قسمتی سمجھو یا بدقسمتی' ایک گھنٹے کے بعد اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ بڑھیا مع اپنے لڑکوں کے اُس کے سامان کی تلاشی لے رہی ہے۔ بیگ کھُلا پڑا ہے۔ اور اُس کا سامان باہر نکالا جا رہا ہے۔ جاؔن غصّے میں بھرا ہُوا اُٹھا۔ اور چھوٹتے ہی قریب بیٹھے ہُوئے شخص کے زور سے لات ماری۔ بُڑھیا کے دوسرے بیٹے نے اُٹھ کر بڑے زور سے ایک مُکا جان کی کنپٹی میں مارا۔ جس کے لگتے ہی جان کو چکّر آگیا۔ اور وہ زمین پر گر پڑا۔ جس نے لات کھائی تھی۔ اُس نے قریب ہی سے ایک لوہے کی بڑی سلاخ اُٹھائی۔ اور جان کے سر پر دے ماری۔ اس طرح آواز آئی۔ جس طرح بلور کی کوئی چیز ٹوٹتی ہے۔ اور جان بیہوش ہوگیا۔ بڑھیا نے سمجھا کہ جان مرگیا۔ بڑی گھبرائی دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ ابھی کچھ جان باقی ہے۔ بڑھیا نے کہا۔ کہ اب یہ جیتا دکھائی نہیں دیتا۔ اپنے آپ کو مصیبت سے بچانا چاہتے ہو تو اس کو اُٹھا کر دُور سڑک پر رکھ آؤ۔ سردی سے خود بخود مر جائیگا۔ اور ہم پر کوئی الزام نہ آئیگا۔ بُڑھیا کے لڑکوں نے اُس کی جیب سے تمام اشیا۔ اور سفارشی خط جو وہ برسپورٹ سے لایا تھا نکال لئے۔ اور اُس کو اپنے ہوٹل سے کافی فاصلے پر سڑک پر رکھ کر چلے آئے۔

(۴)

صبح کے وقت پہرے کے سپاہی نے جان کو دیکھا اور اُٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ ملاحظہ کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ مریض بارہ گھنٹے سے زیادہ نہیں جئے گا۔ بارہ گھنٹے گزر گئے' چوبیس گھنٹے گزر گئے' بارہ گھنٹے اور گزر گئے۔ مگر مریض کی نبض اُسی طرح دھیمی دھیمی چلتی رہی۔ ڈاکٹر حیران ہوگیا۔ اور علاج شروع کیا۔ تین دن کے بعد مریض نے آنکھیں کھول دیں۔ اور حیرت سے اپنے اردگرد دیکھنا شروع کیا ڈاکٹر کو ایک گونہ اطمینان ہُوا اور انگریزی میں پوچھا کہ تو کون ہے؟ مریض خاموش ڈاکٹر کا مُنہ دیکھا کیا۔ ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔ پھر وہی خاموشی۔ ڈاکٹر نے پھر فرانسیسی زبان میں پُوچھا۔ اور جواب نہ پاکر جرمن زبان میں' مگر مریض کچھ نہ بولا۔ بلکہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر نے اس کے دماغ

کا اچھی طرح ملاحظہ کیا۔ معلوم ہوا کہ دماغ کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی ہے جس سے مریض کی قوت حافظہ جاتی رہی ہے۔ مریض کو اپنا نام اور اپنے متعلق تمام باتیں بھول گئیں۔ نہ اس کو یہ یاد تھا کہ میں جان ہکسفورڈ ہوں۔ "ولز" کی فرم میں کلرک تھا۔ اور اب نیویارک نوکری کے لئے آیا ہوں اور نہ فلورا اور مسز فاہن یاد رہیں۔ اپنے وطن برسپورٹ وغیرہ کو بھی بھول گیا۔ اُسکے حسب ونسب کا پتہ لگانے کے لئے پولیس نے سر توڑ کوششیں کیں لیکن سب بیکار ثابت ہوئیں۔ اُس کے کوٹ کی آستین پر لفظ "ج۔ ہ" لکھے تھے۔ اس لئے اسکا نام جان ہارڈی رکھا گیا۔ اور اب وہ "جان ہکسفورڈ" کی بجائے "جان ہارڈی" ہوگیا۔ ڈاکٹر نے بہت علاج کیا۔ مگر اُس کی زائل شدہ قوت حافظہ نے عود نہ کیا۔ ہاں اتنا ہُوا کہ اس کو صحت حاصل ہوگئی۔ اب از سرِ نو بچوں کی طرح اس کو تعلیم دی جانے لگی۔ اور وہ جلدی ہی انگریزی بولنا اور لکھنا سیکھ گیا۔ اور پوری طرح تربیت پا چکنے کے بعد ہسپتال کے ڈاکٹر کی سفارش سے نیویارک کے ایک مشہور سرمایہ دار نے اُسے ایک معمولی مشاہرہ پر جہاز سے مال اُتروانے پر ملازم رکھ لیا۔ 'جان ہارڈی' سابق 'جان ہکسفورڈ' بڑی محنت اور ایمانداری سے کام کرتا رہا۔ کارخانے کا مالک اُس کی محنت سے بہت خوش ہُوا۔ اور اُس کو ترقی دیکر اپنے کارخانے میں کلرک بنا دیا۔ یہاں اُس نے اس محنت اور ایمانداری سے کام کیا کہ مالک نے خوش ہوکر اُس کو اور ترقی دے دی اور آخرکار وہ ترقی کرتا کرتا کارخانے کا مینجر ہوگیا۔ اب جان ہارڈی کو بڑی معقول تنخواہ ملنے لگی۔ پورے پچاس سال تک وہ اس کارخانے میں ملازم رہا۔ اور کافی سے زیادہ روپیہ اس نے کمایا۔ آخر بہت بوڑھا ہوکر وہ نوکری سے مستعفی ہوگیا۔

اب صبح و شام وہ بغرض تفریح بندرگاہ پر جایا کرتا اور جہازوں کو بندرگاہ میں آتے جاتے دیکھتا۔ اور دُور دُور سے آئے ہوئے مسافروں سے ملتا اور اُن کے مُلک کی باتیں پُوچھا کرتا۔ کئی دفعہ تنہائی میں اپنے متعلق سوچا کرتا۔ کہ میں کون ہوں۔ کس کا بیٹا ہوں۔ اور کہاں کا رہنے والا ہوں مگر کچھ یاد نہ آتا۔

(۵)

جان کے برسپورٹ سے چلے آنے کے ایک عرصہ بعد جرمنی اور فرانس میں لڑائی چھڑ گئی۔ تجارت منقطع ہوئی۔ اس سے انگلینڈ کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ خصوصاً برسپورٹ کے لوگوں کی قسمت کا پانسہ پلٹا۔ اُن لوگوں نے تجارت سے ہاتھ رنگ لئے۔ برسپورٹ پہلے ایک معمولی گاؤں تھا۔ جو سمندر کے کنارے آباد تھا۔ بالکل معمولی سی بندرگاہ تھی۔ اور لوگ بالکل غریب تھے۔ جنگ کے چھڑنے سے یہاں بڑے بڑے کارخانے کھل گئے۔ عام لوگ تجارت پیشہ ہوگئے۔ اور امیر کبیر بن گئے۔ جہاں پہلے چھوٹے چھوٹے

جھونپڑے تھے۔ اب وہاں عالیشان مکانات بن گئے۔ اور دکانیں کھل گئیں۔ غیر آباد جگہیں آباد ہو گئیں۔ باغات لگ گئے۔ کچے راستوں کی جگہ پکی عظیم الشان سڑکیں بن گئیں یہاں کے سوداگر غیر ممالک میں اپنا مال بغرضِ فروخت بھیجنے لگے۔ پہلے گاؤں سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ اب عین گاؤں کے وسط میں ایک عالیشان ریلوے اسٹیشن بن گیا۔ غرضیکہ برسپورٹ کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اگر کوئی اجنبی جس نے چند سال پہلے برسپورٹ کو دیکھا ہو۔ اب دیکھتا تو بالکل نہ پہچانتا۔

(۶)

"جان ہارڈی" ایک دن بندرگاہ پر سیر کرنے گیا۔ ایک جہاز ابھی آیا تھا۔ یہ اُسے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔ جہاز کے لوگوں کو دیکھ کر اس کے دل میں انبساط کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ اس انبساط کا باعث یہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اُنکی طرزِ گفتگو اسے بہت پیاری معلوم ہوئی۔ ان کا لب و لہجہ اسے مانوس معلوم ہوا۔ اُن کا لباس چال ڈھال غرضیکہ ہر بات سے ایک دلفریبی ٹپکتی تھی۔ اور جان ہارڈی کا دل وہاں سے ہٹنے کو نہ چاہتا تھا۔ بڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ وہ اس کے بڑھے ہوتے جوش اس کے بڑھاپے اور اس کی لمبی سفید داڑھی کو دیکھ کر اسے چھیڑنے لگے۔ اور طنز یہ فقرے کہنے لگے۔ اُن کے طنز آمیز الفاظ بھی اسے بھلے محسوس ہوتے۔ وہ ٹکٹکی باندھے ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اور اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ یہ وطن کی محبت کا جوش تھا۔ جو جان میں موجزن تھا۔ اور جسے جان نہ سمجھ سکتا تھا یہ جہاز برسپورٹ کے ایک سوداگر کا بھیجا ہوا تھا۔

دوسرے دن علی الصبح جان بندرگاہ پہنچ گیا۔ ایک ملّاح بوڑھے جان کو دیکھ کر اُس کی طرف آیا۔ جان اُسے ایک طرف لے گیا۔ اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ ملّاح نے اپنے وطن کے حالات بیان کرنے شروع کئے وہ برسپورٹ کا رہنے والا تھا۔ جان اُس کی باتیں بڑے غور سے سُنتا رہا۔ باتوں باتوں میں ملّاح نے "جارج اسٹریٹ" کا نام لیا۔ جہاں اُس کے جہاز کے مالک کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔" جارج اسٹریٹ کا نام سُنتے ہی جان کانپ اُٹھا اور زور سے چلّایا ۔ ۔ ۔ فلورا! فلورا!! میری پیاری فلورا!!!

یہ کہتے ہی دھم سے گر پڑا۔ اور بیہوش ہو گیا۔

جارج اسٹریٹ وہ گلی تھی جس میں فلورا رہا کرتی تھی۔ اس نام کو سنتے ہی جان کی زائل شدہ قوت حافظہ پھر عود کر آئی بھولی ہوئی باتیں پھر یاد آگئیں۔ گویا جان خواب سے بیدار ہو گیا۔

جوش آتے ہی اُٹھا۔ اور گھر کو روانہ ہوا۔ ضروری سامان لیکر دوسرے ہی دن برسپورٹ کو چل پڑا۔

(۷)

پھر وہی جان ہکسفورڈ ہے۔ اور وہی شہر برسپورٹ

پچاس سال باہر رہ کر جان پھر اپنے وطن میں واپس آگیا۔ مگر برسپورٹ کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اُس کے زمین و آسمان ہی اور ہو گئے تھے۔ اگر دکانوں کے سائن بورڈوں پر برسپورٹ لکھا ہوا نہ ہوتا تو جان اس شہر کو ہرگز برسپورٹ نہ کہتا۔ پوچھتے پوچھتے جان "جارج اسٹریٹ" میں پہنچ گیا جارج اسٹریٹ۔ بدلا ہوا جارج اسٹریٹ، یہاں پہلے کچے مکان ہوتے تھے اور اب پکے اور عالیشان۔ پہلے غریب لوگ تھے۔ اب امیر کبیر۔ جان یہ بدلی ہوئی صورتِ حالات دیکھ کر مایوس ہو گیا۔ دل بیٹھ گیا۔ "پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ اب فلورا کہاں اب پیاری فلورا ہوگی تو کسی دوسرے کے ہاں ہوگی۔ مجھے بھول گئی ہوگی۔ جان ہکسفورڈ کا خیال بھی نہ ہوگا۔ پچاس سال! اُف پچاس سال کتنا طویل عرصہ ہے!!" یہ کہتا ہوا جان کچھ آگے بڑھا۔ . . . . . ایک عالیشان مکان کی بغل میں ایک ٹوٹا سا مکان نظر آیا۔ یاس میں امید کی صورت نظر آئی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سڑک کے ایک طرف ایک بوڑھے آدمی کو بیٹھے دیکھ کر جان اُس کی طرف لپکا۔ اور جاتے ہی پوچھا۔

بھائی میاں! ان عالیشان محلات میں وہ ٹوٹا پھوٹا مکان کیسا ہے؟

بوڑھا۔ یہ اس بڑھیا کا مکان ہے جس سے بڑھ کر خبطی کوئی عورت دُنیا میں نہ ہوگی۔ وہ بڑی ضدی ہے۔ لوگوں نے اسے مکان کی قیمت سے ہزار گُنا زیادہ دام دِئے۔ مگر بڑھیا بھی وہ ہٹ دھرم واقع ہوئی ہے کہ مانتی ہی نہیں۔

جان۔ آخر کوئی وجہ؟

بوڑھا۔ یہ بھی ایک لطیفہ سے کم نہیں۔ صدیاں گزر گئیں، یہ ابھی نوجوان تھی کسی شخص نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ کہیں نیویارک میں ملازمت کرنے چلا گیا۔ اور جب کا گیا اب آتا ہے۔ بیچاری اسی کا انتظار کر رہی ہے۔ لوگوں نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ مر کھپ گیا ہوگا۔ اب اُسے نہ پائیگی۔ مگر یہ ہے کہ اپنی ہٹ پر قائم ہے۔ کہتی ہے اگر میں نے یہ مکان چھوڑ دیا تو وہ مجھے کہاں ڈھونڈے گا. . . . . بیچاری روتے روتے آنکھیں بھی کھو بیٹھی۔

جان کے سینے میں تیر سا لگا۔ بیقرار ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ضبط کر کے بولا۔

"ایں۔ کیا وہ اندھی ہو گئی!

بوڑھا۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ چند گھڑیوں کی مہمان ہے دیکھتے نہیں۔ اُس کے مکان کے سامنے ایک گاڑی کھڑی ہے۔ وہ ڈاکٹر کی ہے جو اُسے دیکھنے کے لئے آیا ہے۔

جان روتا ہوا اُٹھا اور فلورا کے مکان کی طرف دوڑا۔

اتنے میں ڈاکٹر بھی باہر نکل آیا۔

جان۔ "ڈاکٹر مریضہ کا کیا حال ہے؟

ڈاکٹر۔ سخت نازک۔ اب بچ نہیں سکتی۔ مَیں پادری کو بُلانے جاتا ہوں کہ مریضہ کے لئے دُعا کرے۔

جاؔن ہکّا بکّا ہو کر رہ گیا۔ اتنا حوصلہ نہ ہُوا کہ اندر جاتے۔ "پادری" آیا۔ اندر چلا گیا۔ مریضہ کے آگے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا، اور دُعا دینے لگا۔ جاؔن دروازے کے پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ مریضہ نے کانپتے ہُوئے الفاظ میں کہا۔ "مقدس باپ! مَیں تو جاتی ہوں۔ اس دُنیا کو چھوڑتی ہوں۔ اگر میرا پیارا جان آکسفورڈ آتے تو کہدینا کہ بینہ برسے آندھیاں آئیں۔ طوفان آئے لیکن تیری فلورا کے دل سے تیرا خیال نہ گیا۔ وُہ آخر تک تیرا انتظار کرتی رہی۔ اور انتظار کرتے کرتے اگلے جہان میں تجھے ڈھونڈھنے چلی گئی۔" یہ سُنتے ہی جان نے چیخ ماری۔ "فلورا! میری وفادار فلورا!!" کہتا ہُوا اندر داخل ہُوا۔ آواز سُنتے ہی فلورا چارپائی سے اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ جان نے ہاتھ تھام لئے۔ اور سینے سے لگا لیا۔ اور دونوں جان بحق تسلیم ہُوئے۔

(سر آرتھر کانن ڈائل) نیاز

دو آتشہ

نہ لکھنا تھا غمِ ناکامیِ عشق
جوابِ نامۂ بے مدّعا کیا

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
داماں کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

شیفتہ

انکار ہم آغوشیِ اغیار بجا ہے
گل میرے ہی بستر پہ تو کمہلائے ہوئے ہیں

سالک

نہ ہم سمجھے نہ تم آتے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

انور

آں ظالمم کجاست کہ از پہلوئے رقیب
قتلِ مرا بہانۂ برخاستن کند

سیلی ہزار حیف کہ آں مے پرست را
ذوقِ شراب ساقیِ ہر انجمن کند

سیلی یزدی

قلی

"ہری! ہری! کہاں جاتے ہو؟" اس طرح ایک قلی نے دوسرے قلی کو آواز دی۔

ہری کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں، ناک ستواں اور رخسارے اندر کو دھنسے ہوئے۔ اس کے چہرہ کا رنگ گورا تھا جس پر کسی قدر سیاہی اور زردی بھی نمایاں تھی۔ سیاہی شاید اس واسطے کہ اُسے گرمیوں کی تیز دھوپ میں کام کرنا پڑتا تھا اور اس کا نحیف و نازک جسم آفتاب کی تاب نہ لا سکتا تھا، زردی غالباً اس بات کی دلیل تھی۔ کہ وہ ہر وقت کسی گہری فکر میں ڈوبا رہتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کی ظاہری وضع و قطع سے صاف ٹپکتا تھا کہ وہ گزشتہ زمانہ میں ضرور خوشحالی سے بسر کر چکا ہے۔

"بھائی موہن، بمبئی میل آنے والا ہے۔ مَیں کانٹا دینے جا رہا ہوں۔" اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا اور چلا گیا۔

کانٹا دیتے وقت یکایک کسی خیال نے اُس کا دماغ پریشان کر دیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلک کر اس کے پژمردہ رخساروں پر آ رہے۔ اور وہ صرف اتنا کہکر خاموش ہو گیا۔ "آہ، سوشیلا، نہیں . . . . . "

کانٹا دے کر وہ اپنے مقام پر واپس آ گیا۔ وہاں دیکھا کہ دس بارہ قلی بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ گفتگو موجودہ زمانہ کی مشکلات کے متعلق ہو رہی تھی۔ اُن میں سے ایک قلی کہنے لگا۔ "بھائی کیا کریں، مہینہ میں پندرہ بیس روپیہ ملتے ہیں۔ اُن سے ہمارا گزارہ ہو تو کیسے؟" دوسرا بولا "سچ کہتے ہو، ایک روپیہ کا ساڑھے چار سیر آٹا آنے لگا اب کہاں ٹھکانا ہے!" تیسرا بول اُٹھا۔ "ارے اگر یہی بھاؤ رہے جب بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ نجومی کہتے ہیں کہ اس سال بارش بالکل نہ ہوگی۔ اس لئے اناج اور بھی مہنگا ہوگا۔"

یہ سُنکر ہری کہنے لگا۔ "بھائی ایسے نجومیوں کی باتوں پر نہ جاؤ۔ سچ تو یہ ہے کہ اُنکو جوتش کا علم تو خاک نہیں ہوتا بس جو جی میں آیا کہہ ڈالا۔ مُفت میں جوتش کا نام بھی بدنام کرتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا میں نے ایک اخبار میں چند پیشینگوئیاں پڑھی تھیں۔ اور اُن پر اعتبار بھی کر لیا تھا۔ مگر تعجب کہ اُن میں سے ایک بھی سچ نہ نکلی۔ ایسی ہی باتوں نے آجکل لوگوں کے دلوں سے جوتش اور نجوم کا اعتبار اُٹھا دیا ہے۔" اُس کی یہ تقریر سُنکر سب حیرت میں رہ گئے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر سرگوشیوں میں کہنے لگے۔ کہ یہ کیسا قلی ہے جو اخباروں کی باتیں کرتا ہے!

ان لوگوں میں ابھی یہی سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ دو اور

قلی ہنستے ہوئے وہاں پہنچے۔ اُن کو کھلکھلا کھلکھلا کر ہنستے دیکھا
توسب ایکدم پوچھنے لگے۔ "کیوں بھئی خیر ہے، اسقدر کیوں
ہنس رہے ہو؟"

وہ بولے "ایک ایسی ہی ہنسی کی بات سُنکر آئے ہیں!"
سب نے ہمہ تن شوق ہوکر دریافت کیا "کیوں کیا بات سُنی
ہے۔ کچھ کہو تو سہی؟" "کیا بتائیں ابھی ابھی سُنکر چلے آتے ہیں
کہ دو شریف آدمیوں نے روزگار نہ ملنے کے باعث قلیوں
میں نام لکھالیا ہے۔" "کہاں؟" "کلکتہ میں"

اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گاڑی کی آواز کان میں
آئی۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مستعد ہوکر پلیٹ فارم پر
جا ڈٹے۔ ریل کے ٹھہرتے ہی چاروں طرف سے "کوئی قلی
چاہیے قلی!" کا غُل ہونے لگا۔ ہری بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا
کہ کہیں کوئی اسباب ملے تو ایک وقت کے گزارے کا
سامان ہو۔ اتنے میں اُس نے سُنا کہ کوئی شخص بُلا رہا ہے "قلی
او قلی!" مڑ کر دیکھا تو سکنڈ کلاس میں ایک بابوجی کھڑے
آواز دے رہے ہیں۔ بابو صاحب کا رنگ گندمی تھا۔ مونچھیں
بڑی بڑی جن میں سیاہ و سفید بال ملے ہوئے اس امر کا پتہ
دے رہے تھے۔ کہ اُن کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان
ہے۔ انکے پیچھے ایک خوبصورت پری جمال دوشیزہ کھڑی ہوئی
تھی۔ جس کا سن اٹھارہ برس سے کچھ کم، رنگ نکھرا ہوا آنکھوں
میں جادو کی سی کشش اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ اسکے سانچے میں
ڈھلے کندن سے دمکتے ہوئے جسم پر گلابی رنگ کی ساڑی حُسن
کو دوبالا کر رہی تھی۔ اُن دونوں مسافروں کی شکل و شباہت
سے صاف ظاہر تھا۔ کہ وہ باپ ہے اور یہ بیٹی۔

"آیا حضور" کہکر ہری فوراً وہاں پہنچا۔ بابو صاحب
نے اس کی طرف دیکھے بغیر اسباب اُٹھانے کا حکم دیا۔ وہ ٹرنک
اُٹھاکر پیچھے ہٹنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر دوشیزہ کے چہرے
پر پڑی۔ اُدھر اُس کی نگاہ بھی اس سے ملی۔ آنکھوں کا چار ہونا
تھا کہ ہری کے ہاتھ سے ٹرنک چھوٹ گیا۔ اور گھبرائی ہوئی
آواز میں آہستہ سے بولا۔ "سوشیلا!" اس لفظ کا سُننا تھا
کہ سوشیلا نے ایک چیخ ماری "ہری!" لیکن فوراً ہی وہ
سنبھل گئی۔ جب اُس کے باپ نے پوچھا کہ "کیوں کیا ہوا؟"
تو وہ کسی قدر خوفزدہ ہوکر بولی۔ "کچھ نہیں! قلی کے ہاتھ سے
ٹرنک گر پڑا تھا۔ میں ڈری کہ کہیں مجھ پر نہ آگرے۔ مگر خیر
ہوگئی۔ وہ اسی طرف رہا۔" اس عرصہ میں قلی بھی ٹرنک لے کر
باہر جانے لگا۔ سوشیلا نے آواز دی۔ "او قلی! او قلی، اپنا
نمبر دکھاتا جا!" ہری اسی وقت سمجھ گیا کہ اس کا نمبر کیوں
پوچھا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ کسی قدر غمگین آواز میں بولا۔ "لیجئے
صاحب نمبر بھی دیکھئے۔ کہیں ہم بھاگ تو جائینگے نہیں" "نہیں نہیں
میرا یہ مطلب . . . . . ." سوشیلا ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائی
تھی کہ قلی اُسے پُل پر چڑھتا ہوا نظر آیا۔ قلی نے باہر جا کر
اسباب ایک فٹن میں رکھ دیا۔ اور کوچبان سے کچھ باتیں کرکے

وہاں سے چلتا بنا۔

یہ دونوں نو وارد اسٹیشن سے باہر آکر قلی کو دیکھنے لگے اس کو غائب پاکر بابو صاحب نہایت پریشان ہوتے اور قریب تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس اس واقعہ کی اطلاع کریں کہ سامنے سے ایک گاڑیبان نے جھک کر سلام کیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "کیوں صاحب بابو رام سروپ آپ ہی کا نام ہے؟ اور آپ ہی لکھنؤ سے آئے ہیں؟" وہ حیران ہوکر اسکی طرف دیکھنے لگے۔ اور بولے "ہاں! کیوں؟" "آیئے آپکا اسباب میری فٹن میں موجود ہے" "وہاں کس نے رکھا ہے؟" "حضور! ایک قلی آپ کا نام اور آپ کی شکل وصورت بتا کر اسباب میری فٹن میں رکھ گیا ہے۔ اور یہ کہکر کہ جہاں وہ بتائیں انہیں لے جانا، خود کہیں چلا گیا ہے۔

یہ ماجرا سنکر بابو رام سروپ اور بھی متعجب ہوتے۔ اور سوچنے لگے کہ یہ قلی کون تھا جو میرے نام اور پتہ سے بخوبی واقف تھا۔ اور بغیر کچھ لئے ہوئے چلا گیا۔ وہ ابھی انہیں خیالات کی ادھیڑ بن میں تھے کہ گاڑیبان نے کسی قدر زور دے کر کہا۔ "بابو جی چلئے بیٹھئے ورنہ رات ہو جائیگی"۔ بابو صاحب کچھ چونک کر چپکے سے گاڑی میں مع اس دوشیزہ کے جا بیٹھے، اور گاڑیبان سے کہا کہ "بمبئی ہندو ہوٹل چلو" کوچبان نے فوراً باگ کو اسی طرف موڑا۔ اور ذرا دیر میں ہوٹل کے سامنے لا کھڑا کیا۔ گاڑی کے رکتے ہی ہوٹل کا منیجر باہر آیا۔ اور دونوں مسافروں کو اپنے ہمراہ لیجاکر ایک مختصر سے آراستہ کمرے میں ٹھہرا دیا۔ اس کے بعد منیجر نے دریافت کیا "بابو جی چائے بھجواؤں" جس کا جواب بابو صاحب نے کچھ عرصہ تک نہ دیا۔ کیونکہ وہ ابھی تک قلی کے فکر میں غوطہ زن تھے۔ پھر ذرا سر ابھار کر یوں گویا ہوتے "جی ہاں دو پیالیاں لے آئیے" چنانچہ منیجر نے فوراً جاکر چائے بھیجدی۔ چائے سے فارغ ہوکر بابو رام سروپ پھر کسی فکر میں چلے گئے، بابو صاحب کو اسقدر پریشان خاطر دیکھ کر دوشیزہ بھی قریب کی ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ اور اس طرح دریافت کرنے لگی۔ "ابّا جان کیا وجہ ہے کہ جب سے آپ فٹن میں بیٹھے ہیں، آپ کو متفکر اور اداس پاتی ہوں۔ اگر کوئی بات بتانے کی ہو تو مجھے بھی فرمائیں۔ شاید میں آپ کو کچھ مدد دے سکوں۔"

"بیٹی کچھ نہیں۔ میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ قلی جو ہمارا اسباب لایا کون تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ گاڑیبان کو اس نے میرا سب نام ونشان بتا دیا۔"

"ابّا جان وہ تو ہری تھا!" "ایں! کیا کہا! ہری! ہری۔ ۔ ۔ ۔ ایک قلی۔ ۔ ۔ ۔ نہیں یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔"

"(بھرائی ہوئی آواز میں) ابّا جان آپ اسٹیشن پر جاکر تحقیق کر سکتے ہیں۔ میں اس کا نمبر بھی لیتی آئی ہوں۔ اسکا نمبر ۸۳۵

ہے۔"

"(کسی قدر سخت لہجہ میں) تو تم نے مجھے وہیں کیوں نہ بتایا؟"

"(متوحش ہوکر) مَیں ..... مَیں .... وہاں کچھ گھبرا سی گئی تھی۔"

لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ اس وقت ہری نے اُسے اشارہ سے منع کر دیا تھا۔ اور یہ اُس کو ناراض بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ بابو صاحب یہ سنکر بولے کہ خیر اگر یہ بات ہے تو مَیں کل ہی صبح اسٹیشن پر جاؤنگا۔

آپ متعجب ہونگے کہ یہ کیا معاملہ تھا جس سے ہری اور سوشیلا ایک دوسرے کو دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ ان باتوں کی توضیح کے لئے ہم ہری کی گزشتہ زندگی پر کسی قدر روشنی ڈالنا مناسب سمجھتے ہیں۔

. . . . . .

ہری (نہیں۔ نہیں۔ ہری ناتھ بی۔ اے) لکھنؤ کا باشندہ اور بابو سیتا رام کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بابو سیتا رام لکھنؤ کے معزز لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ دولت کی اُن کے گھر کمی نہ تھی۔ گو اُنھوں نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہ پائی تھی۔ پھر بھی اُن کو ہندی۔ سنسکرت اور انگریزی کی خاصی لیاقت تھی۔ شاید یہی باعث تھا کہ وہ آجکل کے مغربی خیالات کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کچھ دنوں سے انکے مکان کے سامنے ایک نئے بنگالی آکر رہے تھے۔ وہ سوشیلا کے باپ یہی بابو رام سروپ تھے۔ جن سے ہمارے ناظرین کا پہلے باب میں تعارف ہو چکا ہے۔ یہ بھی کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ مگر بایں ہمہ وہ مغربی رنگ کے استقدر گرویدہ نہ تھے۔ ہاں اُن کا یہ عقیدہ ضرور تھا کہ لڑکے یا لڑکی کا عقد اُن دونوں کی مرضی کے موافق ہونا چاہئے۔ کیونکہ بے مرضی کی شادی میں ایک ذرا سی غلطی دونوں کی خوشی کو تمام عمر کیلئے برباد کر سکتی ہے۔ اس کی دلیل میں وہ شاستروں کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے ان دونوں ہمسایوں کی ملاقات ہو گئی۔ پھر تو یہ بزرگ گھنٹوں اسی مضمون پر بیٹھے بحث کیا کرتے تھے۔ ادھر ہری اور سوشیلا کے درمیان بھی اُلفت نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت ہری کی عمر دس برس کی ہوگی۔ اور سوشیلا کی آٹھ برس کی۔ وہ دونوں ساتھ ہی پڑھتے اور ساتھ ہی کھاتے پیتے تھے۔ جس زمانہ میں ہری ناتھ نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اُسی سال سوشیلا نے بھی انٹرنس میں کامیابی حاصل کی۔ سوشیلا کے باپ کو اپنی لڑکی کا بر ہری سے بہتر کوئی نظر نہ آتا تھا۔ اس معاملہ میں صرف ہری کے باپ سے صلاح لینی باقی تھی۔ بابو رام سروپ موقع کی تلاش میں تھے کہ کس طرح وہ اس مسئلہ کو بابو سیتا رام سے چھیڑیں۔ لیکن زمانہ نے اس قسم کی گفتگو کا موقع ہی نہ دیا۔

ایک روز ہری اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا۔ اس کے والد نے باہر سے آواز دی۔ وہ فوراً اُٹھ کر چلا گیا۔ باپ نے اُسے دیکھ کر سامنے کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہری نے دیکھا کہ اس کے والد کے پاس ایک ضعیف العمر شخص بیٹھا اس کی طرف نہایت غور سے دیکھ رہا ہے تھوڑی دیر بعد وہ شخص اُٹھا۔ اور بابو سیتارام سے دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ بابو صاحب نے بھی بڑی خندہ پیشانی سے اُسے رخصت کیا۔ اور اُس کے بعد ہری سے اس طرح مخاطب ہُوا۔ "تم جانتے ہو یہ کون شخص تھا؟" "جی نہیں۔ مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے۔"

"بیٹا! یہ رامپور کا بہت بڑا رئیس ہے۔ یہاں اپنی لڑکی کی بات چیت ٹھہرانے آیا تھا۔ اب کل وہ شگون کے لئے آئیگا۔"

یہ سُنکر ہری حیران و ششدر رہ گیا۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ تمام جسم میں ایک رعشہ سا پیدا ہو گیا۔ اور اس کے منہ سے خود بخود یہ الفاظ نکل پڑے۔ "کون رئیس؟ کیسی بات چیت؟ کس کے لئے؟" اس سے زیادہ اس کی زبان نے یاری نہ دی۔ باپ نے دیکھا کہ لڑکا کچھ گھبرا سا گیا ہے۔ وہ نہایت محبت بھرے الفاظ میں اس طرح کہنے لگے۔ "بیٹا وہ اپنی لڑکی کی منگنی تمہارے ساتھ کرنے آیا تھا۔"

"اچھا تو پھر آپ نے کیا جواب دیا ہے؟"

"مَیں نے اُسے کل شگون لانے کو کہا ہے"

"تو کیا مجھ سے پوچھے بغیر؟"

"اب پوچھ تو رہا ہوں"

"خیر اگر یہی بات ہے تو جو میرے دل میں ہے وہ کیوں نہ مَیں صاف صاف عرض کر دوں۔ آپ کو یہ بتا دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مَیں اپنی پسند کی شادی کرونگا۔ کیونکہ مَیں شادی کو بچّوں کا کھیل نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک بیاہ محبت کا ایک پاک رشتہ ہوتا ہے۔ اور بیوی مرد کی شریک زندگی۔"

بابو سیتارام کو یہ سُنکر غُصّہ آگیا۔ اور وہ جھنجھلا کر بولے۔ "اتنی باتیں بنانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" ہری نے ادب اور نرمی سے جواب دیا۔ "میرا مطلب صرف اسقدر ہے کہ مَیں اس کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔" "نہیں تجھے کرنا ہوگی۔ کیا تُو میری عدول حکمی کریگا؟" "افسوس ہے کہ مَیں اپنے ضمیر کے خلاف نہیں کر سکتا اور مَیں ہرگز نہ کرونگا۔"

اب بابو صاحب کے غُصّہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ دانت پیس کر بولے۔ "کیا کہا؟ نہیں کرونگا؟ یہی ضد ہے تو مَیں بھی تجھے آج سے عاق کرتا ہوں۔ بس میرے مکان سے نکل جا۔"

اُس وقت ہری کے جسم پر ایک دھوتی اور ایک قمیص تھی۔ اس لئے وہ اپنے خاص کمرے کی طرف جانا چاہتا تھا

یہ دیکھ کر اُس کے باپ نے زور سے للکارا " خبردار - اب تم اس گھر کی کسی شے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے " یہ سنتے ہی ہری وہاں سے اُلٹے قدموں پھرا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کا حکم اٹل ہے - اس لئے وہ اپنی ماں کو سلام کرنے کے لئے بالاخانے کو چلا - اس مرتبہ پھر باپ نے پُر غضب آواز میں پُوچھا " کدھر جارہے ہو ؟ "

" والدہ صاحبہ کی قدمبوسی کو "

" کوئی ضرورت نہیں - کوٹھے پر مت جاؤ - وہ تمہارا مُنہ دیکھنا بھی پسند نہ کرینگی - "

" وہ مجھے نہ دیکھنا چاہیں تو بھی مَیں اُن کے دیدار سے محروم رہنا نہیں چاہونگا - کون ایسا بدبخت ہو گا - جو ہمیشہ کے لئے اپنے گھر سے وداع ہوتا ہو اور چلتے وقت اپنی ماں کی صورت کو بھی ترستا رہ جائے - "

اُس کی آواز میں اسقدر کشش اور تاثیر تھی کہ پتھر کا کلیجہ بھی اُس کے سامنے پانی پانی ہو جاتا لیکن غُصّہ وہ جن ہے جس کے روبرو کشش و محبّت کچھ معنی نہیں رکھتیں - غُصّہ میں دیوانہ باپ کڑک کر بولا - " بس زیادہ باتیں نہ بناؤ اور سیدھے نیچے اُتر آؤ - "

ہری نے اس حکم کی مطلق پروا نہ کی - اور بھاگ کر اپنی والدہ کے قدموں میں جاگرا - لیکن بابو صاحب بھی اس کے پیچھے ہی لپکتے ہوئے پہنچے - اور اُس کا کان کھینچکر بولے " بس اب ایک لمحہ بھی یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں - "

اس وقت شام کے پانچ بجے تھے - ہری آنسو پونچھتا ہُوا گھر سے نکلا - تو سڑک پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا - کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے - اُس کے دل میں آیا کہ اس وقت کسی سے ملنا ملانا ٹھیک نہیں لیکن ساتھ ہی اس خیال نے اُسے بے چین کر دیا - کہ سوشیلا سے ملے بغیر چلا جانا خود محبت کے نام پر دھبہ لگانا ہے - مگر دل نے ایک دفعہ پھر کہا کہ نہیں اُس سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں - ممکن ہے یہ حال سُنکر وہ مجھ سے بدظن ہو جائے - غرض یہ عزم کر کے وہ اسٹیشن کی طرف چل کھڑا ہُوا - مگر تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنے آپ کو اسٹیشن کی بجائے سوشیلا کے صحن میں پایا - سوشیلا سامنے کھڑکی میں بیٹھی تھی - وہ اُسے دیکھتے ہی متحیّر ہو کر بولی " ہری کیا بات ہے - جو آج اس حال میں آئے ہو ؟ آؤ کوٹھے پر چلے آؤ - "

ہری اُس کے پاس چلا گیا - سوشیلا نے پھر پوچھا " کیوں ؟ کیا کوئی ضروری کام تھا ؟ " اس نے جواب میں کہا " نہیں کام تو کچھ نہیں لیکن مَیں اس وقت آخری ملاقات کرنے آیا ہوں - کیونکہ مَیں ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے تم سے جُدا ہو رہا ہوں " یہ سُنکر سوشیلا کا چہرہ زرد پڑ گیا - اور وہ عجیب اضطراب کے ساتھ پوچھنے لگی - " کہاں جارہے ہو ؟ اور کیوں ؟ "

ہری نے رامپور کے رئیس کی آمد سے اس وقت تک کا تمام حال کہہ سُنایا - اور بولا - اچھا اب مَیں جاتا ہوں -

سوشیلا۔ "میں تمہیں کبھی نہیں جانے دونگی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ میرے والد تمہیں اپنے یہاں رکھنے سے کبھی انکار نہیں کرینگے۔"

ہری۔ "نہیں سوشیلا تم اب مجھے نہ روکو۔ بس میرا اسلام لو میں جاتا ہوں۔" یہ کہکر وہ کھڑا ہوگیا۔ ابھی دروازے ہی پر تھا۔ جو سوشیلا نے کہا۔ "اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ شام ہو چکی ہے اب رات کے وقت کہاں جاؤ گے۔ صبح چلے جانا۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو اس وقت میرے پاس کچھ روپے جمع ہیں وہ لیتے جاؤ۔ ضرورت پر کام آئیں گے۔"

ہری نے ایک نہ مانی۔ وہ جاتے وقت یہ کہہ گیا۔ "میرا آخری عرض نیاز قبول کرو۔ مجھے اب رخصت دو۔ اگر خدا نے چاہا اور ہماری محبت صادق ہوئی تو آئندہ ضرور ملیں گے۔ اس دُنیا میں نہیں تو عالم بالا میں سہی۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ سُنکر سوشیلا کو ضبطِ گریہ کی تاب نہ رہی۔ وہ اُس کے چہرے کی طرف نظر جماتے ہوئے تھی۔ ہری نے بھی اس پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی، اور آہوں کو سینہ میں دباتے ہوتے مکان سے نکل آیا۔ بازار میں پہنچکر ہری نے اپنی انگوٹھی فروخت کردی۔ اور اس کی قیمت سے تیسرے درجہ کا ایک ٹکٹ لاہور کے لئے خریدا۔ لاہور پہنچا تو اکثر دُکانوں اور دفتروں میں ملازمت کی تلاش و جستجو کی۔ مگر ہر طرف سے نا امید ہوکر آخر کار اُس نے اپنا نام قلیوں میں لکھوالیا۔ اور وہیں اس سے پہلے آپ اُسے دیکھ چکے ہیں۔

دوسرے روز بابو رام سروپ اسٹیشن پر پہنچے، اور اسٹیشن ماسٹر سے ملکر پوچھنے لگے۔ "کیوں صاحب ۸۳۵ نمبر کے قلی کا کیا نام ہے؟"

"کیوں کیا کچھ لیکر بھاگ گیا؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں۔ یونہیں پوچھتا ہوں۔ اُس سے کچھ کام ہے۔"

یہ سُنکر اسٹیشن ماسٹر نے قلیوں کا رجسٹر نکالا۔ اور ۸۳۵ نمبر ڈھونڈھ کر بولا۔ "اس میں اس کا نام ہری ناتھ لکھا ہے۔"

"اگر آپ اُسے بلوا دیں تو عین عنایت ہوگی۔"

اسپر اسٹیشن ماسٹر پھر رجسٹر دیکھنے لگا۔ اور کچھ دیر کے بعد بولا۔ "وہ تو آج غیر حاضر ہے۔ اور دس دن کی چھٹی پر گیا ہوا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو براہ مہربانی آپ اسکے کسی ایسے ساتھی کو بلوا دیجئے۔ جو اُس کے گھر کا پتہ بتا دے۔"

اسٹیشن ماسٹر نے ایک قلی کو آواز دی اور اُس سے ہری کے مکان کا پتہ پوچھا۔ لیکن قلی نے صاف کہدیا۔ کہ صاحب ہم کو نہیں معلوم وہ کہاں رہتا ہے۔ بابو صاحب کو ازحد نا امیدی ہوئی۔ ہوٹل میں آکر انہوں نے جب سوشیلا کو یہ حال سُنایا تو وہ بھی نہایت پریشان ہوئی۔ لیکن اب وہ وہاں زیادہ ٹھہر کر ہری ناتھ کا پتہ نہیں معلوم کر سکتے تھے۔ کیونکہ انہیں کسی سرکاری کام پر فوراً شملہ جانا تھا۔ اس واسطے انہوں نے ایک خط بابو سیتا رام کو لکھا جس میں ہری کی ملاقات کا تمام واقعہ اور اُس کا پورا پتہ بھی لکھ دیا۔

حسبِ معمول آج بھی قلی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اور باتیں بھی اُسی دن کے معاملہ کی بابت ہو رہی تھیں۔ ایک قلی نے پوچھا۔

"کیوں عبداللہ تو اُس روز کہتا تھا کہ دو بی۔ اے پاس قلیوں میں بھرتی ہو گئے ہیں؟"

"بھائی مَیں نے تو جو سنا تھا وہی کہدیا۔"

یہ سُن کر ہری بول اُٹھا "ہاں۔ہاں۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ چھ مہینے ہوتے جب مَیں نے امرت بازار پترکا میں پڑھا تھا۔"

سب قلی اِک دم بول اُٹھے۔ "ایں! وہ کیا بلا ہے!"

"یہ کلکتہ کے ایک روزانہ انگریزی اخبار کا نام ہے۔"

"تو کیا تم انگریزی جانتے ہو؟"

"ہاں تھوڑی سی پڑھ لیتا ہوں۔"

سب حیران ہو کر بولے۔ "یہ کیسے؟"

ابھی یہی بحث ہو رہی تھی کہ ایک ڈاکیہ وہاں آ کر پُوچھنے لگا۔ "کوئی ہری ناتھ نام کا قلی ہے؟"

ہری۔ "ہاں۔ کہو کیا کام ہے؟"

"یہ تمہارے نام کا ایک رجسٹری لفافہ ہے اور کسی سیتا رام نے بھیجا ہے۔ اگر یہ تمہارا ہے تو یہاں انگوٹھا لگا دو اور اسے لے لو۔

"انگوٹھے کی کیا ضرورت ہے۔ لاؤ مَیں دستخط کئے دیتا ہوں۔"

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس خط کو لیا۔ اور تنہائی میں جا کر دھڑکتے ہوئے دل سے پڑھنا شروع کیا۔ خط کا مضمون حسبِ ذیل تھا۔

میرے پیارے بیٹے خوش رہو۔ مجھے بابو رام سروپ کے خط سے یہ معلوم کر کے مسرت بھی ہوئی اور تکلیف بھی کہ تم لاہور میں قلی کا کام کر رہے ہو۔ مسرت اس لئے کہ جسے مَیں عرصہ سے ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ عنقریب مجھے آ کر ملیگا۔ اور اپنی دُکھیا ماں کی جس کی آنکھیں بیٹے کے غم میں روتے روتے سفید ہو گئی ہیں۔ ڈھارس بندھائے گا۔ تکلیف کی وجہ یہ کہ تم، جو شہر کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ آج پردیس میں قلی گری کر رہے ہو۔

جب مَیں یہ سوچتا ہوں کہ تم پر ان تکالیف کا بار لادنے والا صرف مَیں تھا۔ تو میری رُوح کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اے میرے پیارے لڑکے خواہ مَیں نے تمہیں گھر سے نکالا یا تم نے میرا کہنا نہ مانا ان قصوروں کو قطعاً دل سے بُھلا دو۔ کیونکہ ہم دونوں کو اس کی اچھی طرح سزا مل چکی ہے۔ اب اس خط کو دیکھتے ہی سب سے پہلی گاڑی سے لکھنؤ چلے آؤ۔ مجھے کامل یقین ہے کہ میرا یہ خط مجذوب کی بڑ

نہیں تصوّر کیا جائیگا۔ اور تم اگر میرے لئے نہیں، تو اپنی غم نصیب والدہ کی خاطر ضرور آؤ گے۔ بس یہی میری آرزو ہے۔"

"تمہارا غم زدہ باپ"

یہ خط پڑھ کر ہری کا دِل بھر آیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اس طرح اُمنڈ آئے جیسے گرم پانی کے دو چشمے اُبل پڑے ہوں۔ یا یوں کہنا چاہیئے۔ کہ جس طرح گرمیوں کی تیز دھوپ سے پہاڑوں پر برف پگھل جاتی ہے ویسے ہی محبت کی گرمی سے ہری کے رنج و غصّہ کی برف دل سے بہہ کر آنکھوں کی راہ باہر آگئی۔

وہ اسی وقت اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچا۔ اور قلیوں کے رجسٹر سے اپنا نام خارج کرا دیا۔ پھر وہ اپنے ساتھی قلیوں کے پاس آکر اُن سے اس طرح کہنے لگا۔

"بھائیو۔ مَیں نے تمہارے ساتھ پورا ایک سال گزارا اور خوب مزے سے گزارا۔ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مَیں بی۔ اے پاس ہوں۔ اور قسمت کے لکھے کو پورا کرنے یہاں آیا تھا۔ اب والد صاحب کا خط آنے پر واپس گھر جا رہا ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی خطا یا غلطی ہوگئی ہو تو برائے خُدا معاف کرنا۔ لو اب خدا حافظ۔"

یہ کہکر وہ گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اور تیسرے روز لکھنؤ جا پہنچا۔ ریل سے اتر کر وہ سیدھا گھر آیا۔ اور مدّت کے بچھڑے ہوئے والدین سے مِلا۔ اس کے بعد وہ سوشیلا سے ملنے گیا۔ یہ سُنکر اُسے نہایت خوشی ہوئی کہ دونوں کے والدین نے ان کی باہم شادی کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

شادی کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک روز ہری ناتھ بیٹھا امرت بازار پتریکا دیکھ رہا تھا۔ کہ سوشیلا چائے لے کر آئی۔ گھر کا کام کاج کرنے سے سوشیلا کے کپڑے کچھ میلے سے ہو رہے تھے۔ اس پر ہری نے ہنسکر کہا۔

"دیکھو کیسی قلیوں کی سی صورت بنا رکھی ہے۔"

سوشیلا نے کسی قدر منہ بنا کر ہری کی طرف دیکھا۔ اور کاغذ کے ایک پرزہ پر ۸۳۵ لکھ کر ہری کے سامنے رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر ہری ہنس پڑا۔ اور سوشیلا بھی مُسکرانے لگی۔

(پربھا)

مرزا مظفر حسین

بہشت بازار

(۱)

اُسے کچھ کام کاج تو تھا نہیں۔ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا۔ شوقین وہ بیشک تھا۔ آٹھوں پہر اپنے ہی رنگ میں مست رہتا۔ اور کچھ نہ کچھ کھیل کیا ہی کرتا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے تختوں پر مٹی گوندھتا گویا کسی کی دعوت کی تیاری کر رہا ہو۔ کبھی پوریاں بناتا، کبھی کچوریاں اور کبھی لڈو۔ کبھی جی میں آتا تو سپاہیوں کی پلٹنیں تیار کرتا۔ خشک گھاس پھونس اور پتّیوں کے گھر بناتا۔ پہاڑ بنانے کے لئے اِدھر اُدھر سے ٹوٹے پھوٹے کھپریل اور سنگریزے بٹور لاتا۔ ان پر تنکے گاڑ کر گویا جنگل کی سبزی دکھلاتا۔ اور چرنے کے لئے دو تین مٹی کی گائیں بھی بنا کر رکھ دیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے کچھ کام ہی نہیں ہے۔

گھر والے سب اس کو دیکھ کر پریشان تھے۔ اِس کا کوئی علاج ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی اس کی طبیعت میں خود ہی یہ بات کھٹکتی۔ کئی مرتبہ اس نے اپنے پاگل پن چھوڑنے کی ٹھان بھی لی۔ مگر شاید پاگل پن اُسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اس کی ساری زندگی یونہی کٹ گئی۔

(۲)

بعض لڑکے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سال بھر میں ایک حرف بھی نہیں پڑھتے۔ لیکن خدا معلوم امتحان میں کیسے کامیاب ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کی بھی بعینہ یہی حالت تھی۔

قسمت کی بات اسی کو کہتے ہیں۔ جسدِ عنصری سے مفارقت کے بعد اُسے خبر ملی کہ بہشت میں جانا پڑیگا۔ پہلے تو اس نے کچھ حیلے حوالے کئے۔ جب ایک بھی پیش نہ گئی تو آخر کار کہا۔ "خیر اب تو جو قسمت میں ہوگا وہی ہوگا۔" فی الحقیقت اس کے لئے بہشت بھی ایک دکھڑا ہی تھا۔

خواہ کوئی جنّت ہی میں کیوں نہ رہے لیکن شدنی ہو کر ہی رہتی ہے۔ فرشتے بھول گئے۔ اُنھوں نے اُسے کاروباروالی جنّت میں پہنچا دیا۔

یہاں تو سب چیزیں موجود تھیں، مگر دم لینے کو بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ سب کو اپنی ہی پڑی رہتی۔ ایک ایک آدمی پر سات سات بھوت سوار تھے۔ لڑکے کہتے "ابھی تو کچھ کیا ہی نہیں"۔ لڑکیاں کہتیں "کیا کہیں ابھی تو سب کام پڑا ہے"۔ کوئی نہ کہتا کہ وقت فضول ہے۔ یہاں سب کے لئے وقت قیمتی تھا۔ "کام کرتے کرتے مر گئے"۔ یہی

وہاں کا نغمہ شیریں تھا!

یہ غریب وہاں جاکر تکوین گیا۔ اس کی کوئی بات ہی نہ پوچھتا تھا۔ راستہ میں جہاں کہیں ہوتا بے جان پتھر کی طرح پڑا رہتا۔ بھیڑ اتنی تھی کہ کوئی نہ کوئی کاروباری اکثر اس سے ٹھکرا کر گر پڑتا۔ کیا کرے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جہاں بیٹھتا وہیں سُنتا۔ کہ کھیتی ہوتی ہے۔ جہاں چادر بچھا کر لیٹتا، وہیں کوئی آکر کہتا۔ "اُٹھو، یہاں تو دھان بویا جائیگا" کیا کرتا قسمت ہی پھوٹی تھی اُٹھ کر چلا جاتا۔

کہیں چھپا پڑا رہتا۔ نیند تو آتی نہ تھی۔ نگاہ بچا کر لوگوں کو دیکھا کرتا۔ اسی میں اُسے راحت ملتی تھی۔

(۳)

روزا اُدھر سے ایک چھوٹی سی لڑکی پانی بھرنے جایا کرتی تھی۔ ٹھیک اپنے وقت پر آتی اور فوراً چلی جاتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے بیچارہ غریب تھک گیا۔ آنکھیں دُکھنے لگیں مگر وہ آتی اور ستار کی آواز بازگشت کی طرح نغمہ خیز ہوکر چلی جاتی۔

جنّت کی سڑکوں پر وہ ایسا پڑا تھا۔ جیسے بہتے ہُوئے چشمہ کے پانی میں پتھر کا ٹکڑا۔ جیسے کوئی شہزادی اپنے محل کے غرفہ سے کسی بے نوا فقیر کو دیکھے اور اُسے اس پر رحم آجائے۔ ویسے ہی ایک دن لڑکی کا بھی جی بھر آیا۔ بولی "بھائی! تم یہاں کیسے پڑے ہو۔ کیا کچھ کام نہیں ہے۔"

ٹھنڈی سانس بھر کر کاہل نے جواب دیا "کرنا تو بہت کچھ ہے لیکن وقت ہی نہیں ملتا۔"

لڑکی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس نے پُوچھا "چاہو تو مَیں تمہیں کچھ کام دے سکتی ہوں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ اچھا۔ اپنے گھڑوں میں سے مجھے ایک گھڑا دے دو۔"

"اُسے تم کیا کروگے؟"

"اس پر نقش و نگار بناؤنگا۔ تمہارا گھڑا خوبصورت ہو جائیگا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ اتنا وقت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

وہ ہر روز علی الصبح آتی اور کاہل اُس سے یہی کہتا۔ بیکاروں کے سامنے کام کاج کرنے والوں کی کہیں چلتی بھی ہے؟

بالآخر اُسے ماننا ہی پڑا۔ گھڑا کاہل کو مل گیا۔

لڑکی نے کہا "جبتک تم اس پر نقش و نگار بناؤ مَیں دوسرا بھر لاتی ہوں۔"

(۴)

نقش و نگار بن گئے۔ رنگ برنگ کی چڑیاں بن گئیں بیل بوٹے بن گئے۔ لڑکی نے پوچھا۔ "اس کا کیا مطلب؟" جواب ملا۔ "کچھ نہیں" لڑکی نے شاید اپنی عمر میں پہلی ہی

مرتبہ ایسی بے معنی بات دیکھی یا سُنی تھی۔

ایک دن وہ آ رہی تھی۔ یک بیک رُک گئی۔

"کیا ہُوا۔ تم سے چلا کیوں نہیں جاتا؟"

"معلوم نہیں کیا ہو گیا۔"

دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اُس کے پیر میں کانٹا چبھ گیا ہے

کاہل سوچنے لگا۔ جنّت میں کانٹا کہاں سے آیا۔

جتنی دیر میں اُس نے کانٹا نکالا، اتنی ہی دیر میں اُس نے لڑکی کے پیروں پر بیل بُوٹے بنا دِئے۔ کانٹا نکلتے ہی وہ اپنے کام کو چلی گئی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کے پیروں پر بھی نقش و نگار بن گئے ہیں۔

ایک دن پھر جب لڑکی آئی تو کاہل نے دیکھا کہ اُس کے قدم اتنی جلدی نہ اُٹھتے تھے۔ وہ رُک رُک کر چل رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ "آج کیا کام چاہتے ہو؟"

"کچھ اور کام چاہتا ہوں۔"

"بولو۔ کیا کرو گے؟"

"کہو تو چوٹی باندھنے کے لئے تمہیں ایک رنگین ڈورا بٹ دُوں۔ تمہارے بال بکھرے ہُوتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا۔ ذرا اچھا لگے گا۔"

پھر کیا تھا لڑکی نے اپنی رانی کے یہاں سے چُرا کر رنگین ریشم بھی دے دیا۔ ڈورا تیار ہو گیا۔

لیکن اسی وقت سے اس کا سارا دن آئینہ دیکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ کبھی گھڑوں کی تصویریں دیکھا کرتی کبھی پیروں کے نقش و نگار دیکھنے میں محو رہتی۔ یا آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھ دیکھ کر اپنی چوٹی باندھتی رہ جاتی۔ پھر بھی ٹھیک نہ بندھتی اُس کی نظروں میں جنچتی ہی نہ تھی۔

(۵)

بہشت کے کاموں میں رخنہ پڑنے لگا۔ دن تو نغمہ و سرود میں کٹتا اور رات کو ایک اس سے بھی اچھی جنّت کی تمنّا میں نیند نہ آتی۔

بہشت کے عمّال بڑی فکر میں مبتلا ہو گئے۔ وہاں کے کاروبار میں ایسا رخنہ کبھی نہ پڑا تھا۔ وہاں کے عمّال کا جلسہ ہُوا۔ سب نے ایک زبان ہو کر اس عالم کی تاریخ میں اب تک کبھی ایسا نہ ہُوا تھا۔ بات کیا ہے؟"

چپراسی بُلایا گیا۔ رضواں کے اظہار ہُوتے۔ اس نے اپنے قصور کا اعتراف کیا۔

اُس نے کہا: "حضور مجھ سے بڑی غلطی ہُوئی مَیں نے ایک دوسرے ہی آدمی کو یہاں لا کر ڈال دیا۔"

کاہل کی طلبی ہُوئی۔ اُس کی مختلف اللون پگڑی اور سُنہرا ازار بند دیکھتے ہی لوگ سمجھ گئے کہ رضوان نے بڑی غلطی کی ہے۔

بہشتی جلسہ میں قرارداد منظور ہو گئی۔ صدر جلسہ نے کہا:۔

"دیکھو تم کو دار فانی کو واپس جانا پڑیگا۔"

کابل نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔ اپنی زندگی میں اُسے کبھی ایسی خوشی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اُس نے پگڑی پھر سے باندھی۔ اور کمر بند کستے ہوئے کہا۔ "یہ لو میں یہ چلا۔ میں تو یہی چاہتا تھا۔"

اتنے میں لڑکی دوڑ کر آگے آگئی۔ گھڑا تو گھر میں رکھا تھا پیروں پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اور بال اسی ریشمیں ڈورے سے بندھے ہوئے تھے۔ اہل جنت نے اُسے کبھی اس ہیئت میں نہ دیکھا تھا۔"

کاہل کو جاتے دیکھ کر اس نے کہا۔ "میں بھی چلونگی۔"

صدر نے پوچھا۔ "کہاں؟"

"معلوم نہیں کہاں۔"

سب کے سب اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے۔ کسی سے کچھ کہتے نہ بنا

اہل جنت کے لئے یہ پہلا واقعہ تھا جو صدر کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔ (ٹیگور)

عبدالستار خاں

تغزّل

یہ کہہ دو اُس کے تصوّر سے روبرو آئے　　ہم اور تجھ سا بُلا لیں اگر نہ تو آئے

وہ کاوشِ غمِ پنہاں کو جانتے ہی نہیں　　کہ چشمِ تر میں نہ جبتک رمری لہو آئے

نہ میرے پاس کوئی آیا راحت و غم میں　　کبھی جو آئے بھی تو شیشہ و سبو آئے

ملا نہ جب کوئی ساغر تو خستہ دل ہو کر　　ہجومِ یاس میں ساقی کے در کو چھو آئے

یہ گریۂ پسِ دیوار کا اثر دیکھو　　کہ اُس کی بزم سے روتے ہوئے عدو آئے

غضب ہے شامِ مسرت کی صبح دنیا میں　　گیا شباب تو سر پر سفید مو آئے

بتاؤنگا کہ لُٹا کس طرح سے کعبۂ دل　　کبھی جو داورِ محشر سے گفتگو آئے

جنوں میں ننگ ہے شوقِ ورستیٔ ملبوس　　نہ میرے دل میں کبھی حسرتِ رفو آئے

ہے کفر میں بھی یہ شامی کو پاس ایماں کا
کہ آپ جانبِ بُت خانہ قبلہ رو آئے

شامی

بربادیٔ شادماں

(۱)

لیل و نہار کے اوراق پر ہر ساعت ہزاروں افسانہ ہائے بیکسی اور داستانہائے عیش و نشاط لکھی جاتی ہیں۔ ایک ہی صبح و شام میں ہزاروں موہوم امیدوں کے محلات تعمیر ہوتے ہیں۔ اور لاکھوں قصر ہائے رنگیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ تماشا گاہِ ہستی میں ہر لحظہ ہزاروں کھیل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تماشائیوں کی اکثریت اوّل تو انہیں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اور پھر اگر ان میں کچھ دیکھ بھی سکیں تو سمجھنے والوں کی تعداد نہایت ہی قلیل ہے۔ افسانہ نگار جب انہیں واقعات سے کوئی واقعہ اپنے مخصوص اندازِ نگارش میں پیش کرتا ہے۔ تو ہم اسی واقعہ کو ایک افسانہ، ڈرامہ یا رومان کہدیتے ہیں اور پھر جی چاہتا ہے کہ کاش یہ افسانہ ایک حقیقت ہوتا۔ لیکن جب ایسے لاتعداد واقعات میں سے کوئی واقعہ ہمارے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ جس کی حقیقت کو ہم بطور خود محسوس کرتے ہیں۔ تو ہماری یہی آرزو ہوتی ہے۔ کہ کاش یہ واقعہ افسانوں کی کسی کتاب میں زیب رقم ہوتا۔ آئندہ سطور میں ہم اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو حقیقت کی بجائے افسانہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کہ وہ تعلق رکھتا ہے۔ اجسام مادی کی بربادی سے جن کا برباد ہونا ہی روحانی شادمانی کا ضامن ہے۔

(۲)

بسنت کی رُت میں قدرت نے خدا معلوم کیسی کیفیتیں بھر دی ہیں۔ اس کی ہر بات میں ایک لطف ہے۔ اس کی دُھوپ رنگین، دلکش اور ولولہ انگیز ہے۔ اس کی چھاؤں میں خمار آگیں تسکین ہے۔ آبادیوں میں مسرت کی لہریں اور باہر کھیتوں میں سرسوں کی نظر افروزیاں ہیں۔ ہندوستان میں تو یہی ایک موسم ہے جس کو ہم ایران کی "بہار" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ورنہ بہار کا لفظ ہمارے لئے بالکل مہمل ہے۔ ہاں! تو چند سال ہوئے ہندوستان کی سرزمین پر ایک ایسا ہی موسم چھایا ہوا تھا بسنتی دوپٹوں کی پھڑپھڑاہٹ عشوہ فروشوں کی جلوہ طرازیاں، رنگینیوں اور خوشبوؤں کی فراوانیاں اور رنگارنگ کنکوؤں اور پتنگوں کی رنگ افشانیاں حسب معمول تھیں۔

سلیم قلاش اور نادار والدین کا بیٹا سلیم بھی اِس طوفانِ رنگ و بو میں نشۂ مسرت سے مدہوش تھا۔ وُہ

بھی پتنگ اُڑا رہا تھا۔ غالباً کہیں سے کوئی کٹا ہُوا پتنگ مل گیا ہوگا۔ وہ فرطِ مسرت سے جامے میں پُھولا نہ سماتا تھا سلیم کا سن تیرہ چودہ برس کا ہوگا۔ لیکن قدرت کا یہ بھی ایک اعجوبہ ہے۔ کہ بر گہائے گل پر اُس کے قطرے اور صدف میں گوہر ہوتے ہیں۔ اس کی جسمانی رعنائیوں اور اُس کے دلاویز انداز کا تو یہی تقاضا تھا کہ وہ کسی امیر گھرانے میں پیدا ہوتا۔ وہ بلا کا ذہین اور حساس تھا۔ اور اپنے کنگال گھر میں گویا گودڑ کا لال تھا۔ چونکہ والدین کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اسلئے ان کی تمام آرزوؤں کا مرکز اور تمام اُلفتوں کا کعبہ تھا۔ وہ پتنگ اُڑا رہا تھا۔ اور دُنیا کی تمام مسرتیں اس کے سینے کے اندر موجزن تھیں۔ وہ غریب تھا۔ لیکن خوشی کا معیار سُرخ و سپید ٹکلیوں پر نہیں، بلکہ قوتِ انتساب لذت پر مبنی ہے۔ اس لئے بعض غریب غالباً اکثر امرا سے زیادہ مطمئن اور مسرور ہوتے ہیں۔ اور سلیم بھی ایسے ہی غربا میں سے تھا۔ جن کے ہاتھ تو خالی ہوتے ہیں۔ لیکن دل طمانیت اور انبساط کی دولت سے مالا مال، اس لئے وہ اپنی قلاشی اور بے زری کے باوجود بھی پتنگ بازی سے لذّت اندوز ہو رہا تھا۔ وہ اپنی خوشیوں میں اسقدر محو تھا۔ کہ دُنیا و مافیہا کی لذتیں اس کو اپنے پتنگ میں مرکوز نظر آتی تھیں۔ جب وہ کسی اور کے پتنگ کو کاٹ دیتا تو وہ ایک فاتح کما نڈر کی طرح نعرہائے مسرت بلند کرتا۔ اس کے پاس ایک ہی پتنگ

تھا۔ اور آخر وہ بھی کٹ گیا۔ اس نے دیکھا کہ قریب کے مکان ہی پر جا پڑا ہے۔ اس لئے وہ اپنے کھوئے ہُوئے خزانے کے لئے ننگے پاؤں اور ننگے سر دوڑا۔ اس کی سانس پُھولی ہُوئی تھی اور وہ اس مکان کے قریب ہی بدحواسی کے عالم میں ادھر اُدھر جھانک رہا تھا۔ کہ اُس نے مکان کے دریچے سے ایک پتنگ کو لٹکتے ہُوتے دیکھا۔ یہ اسی کا پتنگ تھا۔ اس لئے اس نے نہایت بیتابی کے ساتھ دریچے کی طرف دیکھا۔ ایک معصوم لڑکی جس کا سن بمشکل بارہ تیرہ سال کا ہوگا۔ اس کو لٹکا کر اپنا دِل بہلا رہی تھی۔ سلیم دیکھتا رہا —— ہاں ایک بے حس بُت کی طرح کھڑا دیکھتا رہا۔ خدا معلوم وہ کیسی ساعت تھی کہ اس بھولی بھالی لڑکی کی ہر ادا سلیم کے سینہ میں پیوست ہوتی جاتی تھی۔ وہ کھویا ہُوا تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ کہاں ہے۔ آخر لڑکی نے بھولپن سے پوچھا "کیا یہ پتنگ آپ کا ہے؟" سلیم خاموش تھا۔ اور اس کی نگاہیں اسی لڑکی کے چہرے پر جمی ہُوئی تھیں۔ اس نے پھر پوچھا۔ "کیا یہ پتنگ آپ کا ہے؟" سلیم پھر بھی خاموش تھا۔ اور اس کی آنکھیں اسی لڑکی کے چہرے پر جمی ہُوئی تھیں۔ لڑکی پتنگ کو پھینک کر اندر چلی گئی۔ سلیم کچھ مدت تک دریچے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور آخر پتنگ کو پکڑ کر اسی سوال کو دُہرانے لگا۔ "کیا یہ پتنگ آپ کا

ہے ؟ ـــــ کیا یہ پتنگ آپ کا ہے ؟"

(۳)

بسنت کا دِن گزر گیا۔ اس کی تمام دلچسپیاں ماضی کے رنگین دور میں جذب ہوگئیں۔ سب لوگ پھر اپنے اپنے مشاغل میں اسی طرح منہمک ہو گئے۔ اور دُنیا پھر ویسی ہی تھی جیسی بسنت سے پہلے لیکن اس کے نقوش نہ مٹے تو سلیم کے لوحِ دِل سے وہ پھر بھی پتنگ کو ہاتھ میں لیکر یہی دہراتا رہا۔ "کیا یہ پتنگ آپ کا ہے ؟" ـــــ "کیا یہ پتنگ آپ کا ہے ؟"

محلّے کے لڑکے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اور جب اُنہوں نے ہر بات پر سلیم کے مُنہ سے یہی الفاظ سُنے تو اُنہوں نے دیوانہ سمجھ کر اس کا مضحکہ اُڑانا شروع کر دیا۔ کسی نے پتھر پھینکا کسی نے گالیاں دیں کسی نے پکڑ کر خوب جھنجھوڑا لیکن وہ پتنگ کو پکڑ کر یہی کہتا رہا "کیا یہ پتنگ آپ کا ہے ؟" تمام لڑکے تقریباً اسی کے ہم عمر تھے اور اگرچہ وہ سب ایک ساتھ کھیلنے والے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بچے تھے۔ اس لئے وہ اپنے شغل میں محو رہے۔ آہ! اس کی دیوانگی کا راز کس کو معلوم تھا! وہ اسی طرح چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے شہر سے باہر کھیتوں میں چلے گئے سلیم کے لبوں پر اب بھی وہی وظیفہ جاری تھا۔ آخر وہ تھک کر ایک کوئیں پر بیٹھ گئے۔ ایک شریر لڑکا یونہی کسی بات پر سلیم سے اُلجھ پڑا۔ لڑکا اکھڑ اور طاقتور تھا اس نے اس کو کوئیں میں دھکیل دیا۔ لڑکوں نے ہرچند شور مچایا لیکن سلیم اپنے پتنگ سمیت کوئیں میں گر چکا تھا۔ اِسکے گرنے سے کوئیں کی گہرائیوں میں ایک خفیف سا شور اُٹھا بعض کانوں کو اس شور میں یہی الفاظ سُنائی دِئے۔ "کیا یہ پتنگ آپ کا ہے ؟"

(۴)

پولیس نے تفتیش کے بعد دو ایک لڑکوں کا چالان کر دیا۔ مقدمہ پنڈت چندر پرکاش صاحب مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت میں پیش ہوا۔ کون ایسا متنفس ہے ہے جو محبّت کی ایسی سادگی، جذبات کی ایسی معصومیّت اور پھر اس مقدس داستان کے ایسے انجام سے متاثر نہ ہو۔ جب واقعات بیان کئے گئے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ در و دیوار فرطِ غم سے کانپ رہے ہیں۔ تمام آنکھیں نمناک تھیں۔ ہاں! خود مجسٹریٹ کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا تار جاری تھا کچہری سے گھر کو واپس آتے ہی پنڈت صاحب نے سب سے پہلے اِسی جانگداز داستان کو بیان کیا۔ آپ کی بیوی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بیٹی جمنا چولہے کے پاس کچھ چیز بنانے میں مشغول تھی۔ بیوی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری تھے۔ خود پنڈت جی کی آواز بھی بھرّائی ہوئی تھی۔ جمنا

ہمہ تن گوش تھی۔ وہ اس داستان میں اسقدر محو تھی۔ کہ اپنے حوالی د موالی سے یکسر بے خبر تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کڑاہی میں تھا اور دوسرا چولہے میں۔ اس کے ہاتھ جل رہے تھے لیکن وہ سکتے کے عالم میں تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو باہر نہیں کھینچ سکتی تھی۔ پنڈت جی نے جب داستان کا انجام بیان کیا تو چولہے کے قریب ایک چیخ اٹھی۔ تھوڑی دیر کے لئے جمنا کے بے حس وحرکت بدن میں تڑپ پیدا ہوگئی لیکن اس تڑپ نے کڑاہی کو اُلٹا دیا۔ جمنا کا بھولا سا جسم گرم تیل میں جھلس گیا۔ ماں اور باپ دونوں دوڑے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیل کی گرمی جمنا کے جسم کو سرد کر چکی تھی۔

(۵)

یہ رُوح فرسا واقعات دُنیا کے اوراق پر لکھے گئے اور چند لمحوں کے لئے ان پر ماتم بھی کیا گیا لیکن اس کے راز کو کوئی نہ سمجھا۔ کون جانتا ہے کہ یہ جمنا وہی معصوم جمنا تھی، جو پتنگ کو لٹکا کر پوچھ رہی تھی۔

"کیا یہ پتنگ آپ کا ہے؟"

"اثر صہبائی"

مکینِ دل

(۱)

اے جمالِ سحر کہاں ہے تُو! اے گلِ تازہ تر کہاں ہے تُو!
اے سکونِ جگر کہاں ہے تُو! اے فروغِ نظر کہاں ہے تُو!

چشم ہے تنگ ونار بن تیرے
رُوح ہے بے قرار بن تیرے

(۲)

ڈھونڈھتا ہے مجھے کہاں ہوں میں تیرے سینے ہی میں نہاں ہوں میں
ایک دریائے جاوداں ہوں میں مثلِ موجِ صبا رواں ہوں میں

چشمِ دل جب نہ وا کرے کوئی
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

"اثرِ صہبائی"

روحی فداک

عرضِ مترجم

روحی فداک ایک رنگین اور دلپذیر افسانہ ہے۔ جو فرانس کے ایک لائق انشاء پرداز کے جدّت نگار قلم کا نتیجہ ہے۔ اس عروسِ ادب کو مصر کے مشہور روزنامہ الاہرام کے فاضل محرّر (ایڈیٹر) خلیل آفندی نے اس کی معنوی دل پذیریوں کے باعث، عربی لباس سے آراستہ کیا۔ اور غالباً ۱۹۰۶ء میں یہ مصر سے شائع ہوکر سرزمینِ ہند میں پہنچا۔ اور کئی سال بعد راقم کی نظر سے گزرا۔ پڑھ کر بے اختیار جی چاہا کہ اس کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ مگر عرصہ تک یہ خیال عمل میں نہ آیا۔

محوی صدیقی اورنگ آباد دکن

تمہید

(۱)

محبّت اور محبّت بھی وہ جس کا انجام ناکامی ہو۔ دِلوں کے لئے برقِ اجل سے کم نہیں۔ فطرت ربّانی خاموشی سے اِنسانی دلوں کی لہلہاتے کشت زاروں کو اس بجلی سے خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ جذبات طبعی، آگ کی وہ چنگاریاں ہیں، جو سرسبز و شاداب مرغزاروں کو خرمن سوختہ بنا دیتی ہیں۔ محبّت کی دردمند ہستیاں کسی کے افسانۂ بربادی سے درسِ عبرت نہیں لیتیں۔ بلکہ خود اُن میں فنا ہو جاتی ہیں ستم رسیدہ انسانیت خود اپنے کو آغوشِ محبّت میں دیکھ

ہمیشہ کے لئے حجاب فنا میں مستور ہو جاتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ سہی پھر بھی خدا جانے فطرت کی کیا مصلحت خاص ہے۔ سینکڑوں تباہی کی داستانیں سنکر ہزاروں دلگداز واقعات دیکھ کر بھی ضعیف انسان کو اپنے قلب پر کچھ اختیار نہیں رہتا بربادیوں میں وہ مزا آتا ہے۔ جسے زندگی بھر کی مسرتوں کا حاصل کہتے ہیں۔

افسانہ "روحی فداک" بھی اُسی دشمن جان و ایمان، محبت کے گہوارۂ ستم کا نازپروردہ ہے۔ یہ آج سے ایک صدی قبل کا دردانگیز افسانہ پڑھیے۔ اور غور کیجیے۔ کہ اس میں کیا کچھ سبق ہیں۔

پیرس میں ایک صدی قبل ایک معزز ترک سلیم حلمی رہتا تھا۔ جو ایک شریف خاندان کا رکن تھا لیکن وہ تنہا تھا۔ صرف مرنے والے بہن اور بھنوی نے ایک ناتواں ہستی، ایک معصومہ کو اس کی امانت میں دیا تھا جس کا پیارا نام "ریحانہ" تھا۔ اور جو اپنے مرحوم والدین کی زندہ یادگار محبت تھی۔

ریحانہ کے دولتمند باپ نے بہت کچھ دولت بھی چھوڑی تھی۔ جو اس خوش نصیب یا کہئے کہ بدنصیب لڑکی کے حصہ میں آئی۔ عزیز و مہربان ماموں نے اسے مدرستہ البنات (گرلس سکول) میں داخل کرا دیا تھا کہ آرام سے رہے اور اطمینان سے پڑھے لکھے۔ ریحانہ کے ماموں سلیم حلمی کی ایک بیوہ خاتون سے دوستی کے تعلقات تھے۔ یہ خاتون جس کا نام "شفیعہ زہرہ" تھا۔ پاکباز شریف طینت اور عالی خاندان تھی۔ اور ان دونوں میں بڑی محبت تھی۔ اتفاق سے شفیعہ زہرہ کا ایک نوجوان بھتیجا رشدی نامی تھا۔ رشدی پورگون میں رہتا تھا۔ مگر اُسے سیر و شکار کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ شکاری کُتّے۔ شکاری ہتھیار اور یا وہ گو لوگوں کو دوست رکھتا تھا۔ جو اس کے خوان کرم سے ہمیشہ خوشہ چینی کرتے۔ اور اُس کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔

ریحانہ جس وقت اپنی عمر کی اٹھارہویں منزل میں پہنچی۔ تو اس کے ماموں حلمی نے اُسے مدرسہ سے اُٹھا لیا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ وہ پیرس کی اُن محفلوں میں اُسے اپنے ساتھ لیجانے لگا۔ جہاں حسن و جمال تہذیب و کمال سب کا مجمع ہوتا تھا۔ سلیم حلمی کا منشا۔ یہ تھا۔ کہ ریحانہ آدابِ معاشرت اور علمِ مجلس حاصل کرے۔ وہ ضرور اخلاق اور تمدنی معاملات سے باخبر ہو جائے۔ وہ موقع دیتا تھا کہ ریحانہ مختلف انسانوں کے آداب و اخلاق سے مفید معلومات بہم پہنچائے۔ اُن کی عادات و خصائل سے سبق لیتی رہے۔ تاکہ دُنیا کے حالات و معاملات میں بصیرت پیدا کرے۔ اور یہ سب کچھ سیکھ کر سمجھنے لگے کہ اب اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے اور یہ کہ اس کے لئے نوجوان شرفا قوم میں سے ایسے شریک زندگی

کی ضرورت ہے۔ جو اس کا صحیح طور پر رفیقِ حیات ہو سکے۔
حقیقت میں ریحانہ اس کی مستحق بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ
ایک حسین و نازنین دوشیزہ ہے۔ اُس کا خوبصورت چہرہ،
اُس کا دلپذیر قد و قامت، سحر فروش آنکھیں اور زاہد فریب
انداز ایسے ہیں، کہ وہ انسان جو دُنیا میں عشق کے نام سے
ناآشنائے محض ہے۔ وہ جو اپنے سینے میں پتھّر کا جگر اور
آتشِ محبت سے گداختہ نہ ہونے والا دل رکھنے کا مُدّعی
اُس کے لئے بھی ریحانہ کے وجود میں بہت کچھ جذب و تسخیر
کا سامان موجود ہے۔ وہ اپنی فطری دل آویزی اور رعنائی کے
علاوہ بہت بڑی دولت کی بھی مالک ہے۔ جس کے سالانہ
نفع کی تعداد پچاس ہزار فرانک تک پہنچتی ہے مختصر یہ کہ
وہ اس وقت دُنیا کی اُن خواتین میں ہے۔ جن کی ایک
جنبشِ ابرو دم بھر میں کسی کو خوش نصیب و کامگار اور
جن کی زبان کی ایک لغزش گھڑی بھر میں مایوسی و ناکامی
کا مجسمہ بنا سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چلتے پرزے صرف
اس تلاش میں رہتے ہیں۔ کہ دولتمند بیوی ملے۔ چاہے وہ
بدصورت ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اگر ریحانہ اپنے دورِ شباب
میں نوجوان نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ تو کیا تعجب ہے۔
وہ ایک حرمِ دفا ہے۔ جس کا دلدادگانِ عشق طواف کرتے
ہیں۔ اور بجا کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ سہی پھر بھی ریحانہ درحقیقت کس قدر بیگانہ خو
ہے۔ وہ نمائش پسندی اور زینت و آرائش سے طبعاً بیگانہ
ہے۔ متانت و سادگی اُن باتوں سے دلچسپی نہیں رکھتی جن
کے خوگر بہت سے ایسے نوجوان نکل آئینگے۔ جنہیں جھوٹے
اظہارِ محبت کی فکروں کے سوا دُنیا میں کوئی کام نہیں،
جنہیں دوشیزگانِ حسن کو اپنے ناپاک پھندے میں پھانسنے
کے لئے طرح طرح کے جال پھیلانے کے سوا کوئی دھندا
نہیں۔ ریحانہ کے کاموں نے خود بھی اُسے اس قدر
آزادی دے رکھی تھی۔ کہ وہ اپنا رفیقِ زندگی خود تلاش
کر سکتی تھی۔ بشرطیکہ شرافت اور دولت میں بھی اُس کا
ہم پلّہ ہو۔ مگر جب حلمی نے دیکھا کہ ریحانہ اس ذکر ہی سے
متنفر ہے۔ وہ غزالہ رعنا قیدِ عقد کو اپنے لئے پسند نہیں
کرتی۔ بلکہ نامہ و پیام سے اُسے تکلیف ہوتی تھی۔ تو حلمی
خاموش ہو رہا۔ کہ ریحانہ خود ایک ایسا متاعِ گرانمایہ ہے
جس کا گاہک ہر وقت موجود ہے۔ آخر اس نے آنے والے
نامہ و پیام کے جواب میں مجبوراً یہ کہنا اختیار کیا کہ ریحانہ
ابھی کم سن ہے۔ ابھی اُسے شادی بیاہ کا کچھ خیال نہیں
ریحانہ کا سن جتنا آتا جاتا تھا۔ اُس کا حسن و جمال بھی ترقی
پر تھا۔ اُس کی دلکشی و رعنائی بھی روز افزوں تھی۔ ایک روز
شفیعہ کچھ سوچ کر حلمی کے یہاں آئیں۔ اور اپنے قدیم دوست
سے کہا کہ ہماری آپ کی یہ حالت ہے۔ کہ لڑکا بغل میں
ڈھنڈورا شہر میں۔ میرے خیال میں رشدی اور ریحانہ

دونوں گھر ہی میں ہیں۔ اس سے بہتر عقد نہیں ہو سکتا۔ میرا بھتیجا رشدی ماشاء اللہ جوان ہے۔ تیس سال کی عمر ہے۔ اور دولت و ثروت میں شرافت ولیاقت ہیں، حسب ونسب میں غرض ریحانہ سے کسی طرح کم نہیں، علم و ادب میں بھی ریحانہ کا جوڑ ہے۔ ان سب خصوصیات کے ساتھ وہ بھی ریحانہ کی طرح دُرِّ یتیم اور گوہر یک دانہ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ اس نسبت کو قبول کریں۔ اور اثبات میں جواب دیں۔

سلیم حلمی نے شفیعہ کی رائے بہت پسند کی بالاتفاق یہ طے کر لیا۔ کہ دونوں کی شادی کر دی جائے۔ مگر شادی سے پہلے یہ بھی مناسب معلوم ہوا کہ رشدی کو ریحانہ کے دولت کدہ پر بلایا جائے۔ تاکہ وہ خود بھی اُسے دیکھ لے۔ شفیعہ نے اسی وقت اپنے بھتیجے کو خط لکھا۔ کہ کل شام تک ضرور آ جاؤ۔ رشدی خط پہنچتے ہی روانہ ہو گیا۔ اور انگورہ پہنچکر لوریز ہوٹل میں قیام کیا۔ اُسی وقت بہترین لباس بدلا۔ اور ایک عمدہ کرایہ کی گاڑی پر سوار ہو کر اپنی پھوپھی کے ہاں چل دیا۔ شفیعہ رشدی کی منتظر ہی تھی۔ نہایت گرمجوشی سے اُسے لیا۔ اور ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کہ شفیعہ نے وہی افسانہ رنگیں شروع کر دیا۔ جس کے لئے رشدی کو بلایا تھا۔ اور اپنی تمام کارروائی شروع سے آخر تک کہہ سنائی۔ رشدی نے اس لطیف تجویز کی پسندیدگی کا اظہار کر کے سرِ تسلیم جھکا دیا۔ گویا وہ کوئی نابینا اور شفیعہ اُس کی رہنما تھی۔ خاص یہ سُنکر کہ ریحانہ حسین و نازنین دوشیزہ ہے۔ اور جمالِ بے مثال کے ساتھ اخلاق و تہذیب کی بھی دیوی اور حسن سیرت کی ایک بہترین تصویر ہے۔ رشدی کے سامنے شفیعہ نے ریحانہ کی تصویر اس طرح کھینچی۔ کہ گویا وہ شبستانِ حسن کی ایک شمع فروزاں ہے۔ وہ گویا انسانی پیکر میں ایک برگزیدہ فرشتہ یا جنتِ ارضی کی حور ہے۔ شفیعہ کی تقریر اور رشدی جیسا بادۂ شباب کا متوالا سُنکر ہوش میں رہتا۔ یہ کب ممکن تھا۔ وہ ریحانہ کا مشتاقِ نادیدہ ہو رہا تھا۔

(۲)

نوجوان رشدی اس کے شریفانہ آداب تہذیب و شائستگی اور اس کے مجسم عفاف کو محسوس کر کے اُسکے دلدوز حرکات و سکنات کو دیکھ کر نقش حیرت بن گیا۔ نہ صرف نقش حیرت بن گیا۔ بلکہ بغیر کسی معاوضہ کے اپنا سرمایۂ دل ریحانہ کی نگاہِ افسوں طراز کے حوالہ کر دیا۔ رشدی کے لئے اپنی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے، جیتے جاگتے ایک مستقل دُنیائے حسن کی سیر کی، اور ہمیشہ کے لئے اُسی کا ہو رہا۔

اس معاملہ میں وہ بالکل مجبور و معذور بھی تھا۔

آج سے نوجوان رشدی کا یہ دستور ہو گیا ہے کہ

وہ روزانہ ریحانہ کے یہاں آتا ہے۔ یہانتک کہ وہ اپنے عالیشان محل، بیش بہا جائداد، قیمتی شکاری کتوں، اور گرانقدر گھوڑوں تک سے غافل ہوگیا ہے۔ ریحانہ کی لذّت ہم سخنی نے سیر و شکار کی دلچسپیوں، روزانہ دعوتوں کی مسرتوں کی جگہ لے لی ہے۔ وہ جب خیال کرتا تھا۔ کہ حسین ریحانہ کے دل کو حاصل کرنے میں بغیر کسی سخت مساعی کے کامیاب ہوگیا ہے۔ اور رضائے دوست کا بغیر مخالفانہ دشواریوں کے بغیر رقیبوں کی رخنہ اندازیوں کے مالک ہوگیا، تو وُہ اپنی خوش نصیبی پر جوشِ مسرت سے مدہوش ہوجاتا تھا۔ دوشیزہ ریحانہ کے ساتھ اُس کی محبّت کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ اور عشق کی گرمی شدید بخار کی حد تک ترقی کرجاتی تھی

سچ ہے کہ عشق و محبّت کی شدّت وہ بے پناہ حدت ہے۔ جو انسان کو گھُلا ڈالتی ہے۔ وہ غریب بیگناہ عشاق کو۔ دریوزہ گروں سے زیادہ درماندہ و تباہ بنادیتی ہے!

نوجوان رشدی اس عشرت سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ اس سبزہ زار کامرانی اور چمن زار عشرت میں محوِ سیر تھا۔ مگر بے خبر ریحانہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ رشدی سے منسوب ہوچکی ہے۔

وہ کبھی ریحانہ سے عشق و محبّت کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ اور نہ حلمی اور شفیعہ نے ہی اُس کے کانوں تک یہ بات آنے دی۔ یہانتک کہ آخر کار عشق کا دیوتا ریحانہ کی خودداریِ شباب پر غالب آیا۔ اور محبّت کے لشکر جرار نے اُس معصومہ کے کشورِ دل کو بہ آسانی فتح کرلیا!

ریحانہ کی نگاہوں میں نوجوان رشدی کی وقعت اب کچھ اور ہی تھی۔ نظامِ زندگی بدل چکا تھا۔ اور ملکہ محبّت کا سکہ رائج تھا۔ اب ریحانہ بھی مجبور و محکوم تھی!

اب اُس کا یہ حال تھا۔ کہ جو گھڑیاں رشدی کی غیر موجودگی میں گزرتی تھیں، وہ کاٹے نہیں کٹتی تھیں باوجودیکہ رشدی صبح شام ریحانہ کی زیارت کو حاضر ہوتا تھا۔ پھر بھی ریحانہ یہ محسوس کرتی کہ رشدی کو آئے بہت زیادہ زمانہ گزر گیا ہے۔

رشدی کی موجودگی میں وہ محسوس کرتی تھی کہ دلمیں ایک مسرت آمیز دھڑکن ہے۔ اُس کا خون رخساروں میں شعلہ کی طرح بھڑک رہا ہے۔ اُس کی سانس میں سرعت پیدا ہوجاتی تھی۔ لیکن وہ خود نہیں سمجھتی تھی۔ کہ یہ بات کیوں ہے؟

اُس کا حسین چہرہ کبھی سُرخ ہوکر شراب لعلین کا چھلکتا ہوا ساغر بن جاتا ہے۔ اور کبھی گیندے کے پھول کی طرح زرد اور کبھی کچھ کچھ سرخی اور زردی ممزوج ہوکر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُس کے دونوں پہلوؤں میں محبت کی جنگ ہوتی ہے۔ جس کو ریحانہ کی نازک پسلیاں نہیں برداشت کرسکتیں!

آخر ریحانہ کو یقین کرلینا پڑا۔ کہ وہ درحقیقت، نوجوان رشدی کی محبّت کا شکار ہوگئی ہے۔ عشق کا دیوتا اُس پر مسلط ہوچکا ہے۔

جو لوگ محبّت اور عشق کے تجربہ سے آشنا ہیں جانتے ہیں کہ ابتداءً ایک خفیف سا احساس ایک لطیف سی تخّیل پیدا ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ وہ ایسی صورت اختیار کرلیتی ہے کہ خود بخود دل میں، ایک نامعلوم مسرت کی جھلک سی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور سینہ کا انقباض دور ہونے لگتا ہے۔ اور کبھی وہ تخّیل افشاء راز کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اُس وقت اضطراب اور کرب کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا!

(۲)

دو مہینے پہلے جو تخّیل محبّت دل و دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ آج اُس نے عملی شکل اختیار کرکے اپنا کامیاب نتیجہ دکھایا۔ دونوں کا مقصد حیات پُورا ہوگیا۔ عقدِ نکاح نے دِل کی گرہیں کھول دیں، جو پردۂ غیریت درمیان میں حائل تھا۔ اُٹھ گیا۔ نکاح کے ایک دو دن بعد ہی ریحانہ اور رشدی نے پیرس کی راہ لی۔ اور پورے پندرہ روز اُس جنّت ارضی میں گزار کر پھر اپنے قصرِ عشرت میں واپس آتے۔

وہاں اِس قصرِ جذبات میں جہاں داعیاتِ شباب کے سوا کچھ نہ تھا۔ قابلِ رشک زندگی بسر کرنے لگے۔

شفیعہ کا دستور تھا کہ ہر سال وہ بھی یہاں آتی تھی۔ اور خریف کا زمانہ اسی محل میں گزارتی تھی۔

آغاز محبّت کا دور گزرنے کے بعد، رشدی کا ذوق قدیم پھر عود کر آیا تھا۔ پھر اُس کا یہی مشغلہ تھا کہ اس فصل میں، اپنے خاص خاص دوستوں کو شکار کے لئے مدعو کرے۔ اور ان احباب کی معیت میں زندگی کی عزیز گھڑیاں سیر و شکار کے نذر کردے۔ روزانہ رات کو اپنے محل میں آکر شکار کے کباب، اور شراب سے لطف اندوز ہوتا۔ اس سبب سے یہ محل خالی نہ رہتا تھا اور رہنے والوں کی زندگی زاہدِ خشک اور عابدِ خاموش کی زندگی سے مشابہ نہیں تھی۔

رشدی کا محل تقریباً چار پانچ میل کی مسافت پر شہر سے باہر واقع تھا۔ وہ عالیشان اور خوشنما اور پائدار و قدیم عمارات میں شمار کیا جاتا تھا۔ محل کی کرسی نہایت بلند تھی، جس کے کنارے کنارے نہایت عمدہ کام کے کنگرے بناتے گئے تھے۔ موقع کے لحاظ سے بھی بہت خوب یعنی ایک ہموار، سڈول، وسیع میدان میں واقع تھا۔ جس میں کثرت سے عمدہ عمدہ درخت لگائے گئے تھے۔ اُس کے گرد دُور تک۔ درختوں کی بلند شاخیں، بادلوں کو دبانا چاہتی تھیں۔ یہ میدان حسنِ اتّفاق سے

ایک وادی کے بالائی حصہ پر واقع تھا جس میں صاف و شفاف پانی کی ایک خوبصورت نہر ایک ادائے دلفریب کے ساتھ خراماں تھی۔ یہ حسین و نازنین نہر فطرت کے مخملی فرش پر عجب دلفریب پیچ و خم کھاتی اور سبزہ زار قدرت سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گذر رہی تھی۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا حریر سبز کی دیوار پر ایک تیغ بے نیام آویزاں ہے۔ کبھی خیال ہوتا کہ وہ ایک تیر ہے جو کسی ماہر شکاری نے چھوڑا ہے۔ اور وہ سنسناتا چمکتا، تلملاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ وہ دور سے کسی مقدس بزرگ کا عمامہ سفید نظر آتی تھی۔ کہیں دہری ہو گئی تھی۔ اور کہیں پیچ و خم کھائے ہوئے تھی۔ وہ گویا اس حسین و جمیل باغیچہ کی قدرتی شہر پناہ تھی۔ نہر کی دوسری جانب وسیع سبزہ زار ایسے معلوم ہوتے تھے کہ سبز قالینوں کے بڑے بڑے فرش ہیں۔ جن کا سلسلہ وسیع جنگلوں تک پہنچ کر ختم ہوتا ہے لطف یہ ہے کہ یہ تمام سرزمین و املاک اسی نادرۂ روزگار محل سے متعلق ہے۔ جس کی ملکیت کا فخر مدتوں سے رشدی کے خاندان کو حاصل ہے۔ اور اب رشدی کے سوا کوئی اس کا وارث و مالک نہیں ہے۔

ساتھ ہی شکار اور شکاری کتوں کے پالنے کا شوق بھی اس نے وراثت میں پایا ہے۔

آئیے اب ہم ۱۸۲۹ء کے زمانۂ خریف کی کا دلفریب سماں آپ کے سامنے پیش کریں۔

ایک روز ابر غلیظ چھایا ہوا تھا۔ اور سورج کو اس نے اپنی روائے سیاہ میں چھپا لیا تھا۔ ابر ایسا معلوم ہوتا تھا' کہ گویا حریر ہندی ہے۔ جس میں سونے کے گل بوٹے نمایاں ہیں۔ افق آسمان نے ایک نفیس و جمیل خلعت پہن لیا ہے۔ جس میں صانع قدرت نے عجب عجب رنگینیاں دکھائی ہیں۔ گویا افق آسمان' خود ایک رنگین قوس قزح' یا کسی طاؤس خوش رنگ کی دم ہے۔ کہ ایک مصور اس کے بے شمار رنگوں کی تصویر کھینچنے سے عاجز ہے۔ اگرچہ وہ مشہور رافائیل ہی کیوں نہ ہو۔

اور گویا جا بجا دیبائے سفید میں گلابی گلابی افشاں ہے جس میں کچھ خفیف سی زردی بھی جھلک رہی ہے۔ بلند و بالا درختوں کی تناور اور سربفلک شاخیں ابر بنفشی سے جا کر ٹکرا رہی ہیں۔ کچھ دور کے فاصلہ پر اس وادیٔ وسیع کی گہرائیوں میں تھوڑی دیر کے بعد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں' آپ کے کانوں میں پہنچیں گی۔ اور بگل کی صدائیں آئینگی۔ پھر تمام وادی پر سکوت و خاموشی چھا جائیگی۔ پھر کتے بھونکیں گے۔ اور کسی دور دراز مقام پر بگل بجیں گے۔ کانوں تک پہنچتے پہنچتے بگل کی آوازیں اس قدر لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر صدائے شیریں ایک دلکش نغمہ معلوم ہوتی ہے۔

آج ہی کی رات قیامت کی رات ہے۔ آج ہی خدا

خیر کرے کچھ ایسے واقعات پیش آنے والے ہیں، جو ہمارے افسانہ سے تعلق رکھتے ہیں . . . .

. . . . دیکھنا دو عورتیں محل کی کھڑکیوں سے جھانک رہی ہیں۔ ایک نازنین محل کی منزل اوّل میں ہے۔ اور دوسری ماہ جبین منزل ثانی میں دونوں کی آنکھیں ٹکٹکی لگائے غروب آفتاب کا ہوشربا منظر دیکھ رہی ہیں۔ کان نہایت غور سے اُس موسیقی کو سُننے میں مصروف ہیں۔ جو دور سے آنے کی وجہ سے بہت مدھم ہوگئی ہے۔ اور جس کی سریلی اور دلکش لے، اس فضائے مدہوش میں پھیلی ہُوئی ہے۔ مگر دونوں کچھ عجب بے نیازانہ انداز کچھ عجب شانِ استغنا کے ساتھ دیکھتی اور سنتی تھیں۔ کیونکہ کوئی شانِ تاثر اُن کے چہروں سے نمایاں نہ تھی۔ یہ دونوں بے نیازی کی دیویاں کون ہیں؟ آؤ یہ بھی معلوم کریں۔

ہاں ان میں ایک خاتون، صاحبۂ خانہ، رشدی بے کی حریم زندگی ریحانہ ہے۔ اور دوسری عورت اس کی ایک خادمہ، جو پیرس کی ایک بلائے بے درماں اور پیکرِ شباب ہے۔ جس کا نام فلورا ہے۔ اسے شفیعہ زہرا اپنے بھتیجہ کی شادی کے بعد یہاں لائی تھی۔ تاکہ ریحانہ تنہا نہ رہے۔

ریحانہ ایک زرد گدے کی کوچ پر بیٹھی ہُوئی تھی۔ اور اس کے دونوں ہاتھ شانوں تک کھُلے ہُوئے تھے۔ اُس کی چوٹی کے بال، کچھ شانوں اور کچھ پشت پر پڑے ہُوئے لہرا رہے تھے۔ اس وقت اُس کی عمر تیئیس سال کی ہوگی۔ جو شخص ریحانہ کو یہاں اس انداز سے دیکھے گا۔ تعجب کریگا کہ وہ کس قدر حزیں اور غمگین معلوم ہوتی ہے۔ باوجودیکہ تمام خوش نصیبیاں اُسے حاصل ہیں۔ وہ اقلیم مسرت کی واحد ملکہ اور دُنیائے شادمانی کی تنہا فرمانروا خاتون ہے۔ جوانی کے ساتھ حسن بھی ہے، دولت بھی ہے۔ اور ایک جان نثار حسن و شباب بھی۔ اس کے بعد عورت کو اور کس چیز کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ خادمہ بھی اُسی کی طرح ملول و حزیں سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے سوا اور کچھ سبب نہیں معلوم ہوتا کہ وہ پیرس سے دُور ہے۔ وہ پیرس جو اُس کا وطنِ عزیز، اُس کی لذائذ زندگی اور کیفیات شباب کا مرکز ہے۔ ہاں غالباً اس کے حزن کا یہی سبب ہے۔ جیسے ہی باغیچہ کی جانب آہٹ سُنی۔ پھر صاف طور پر محسوس کیا۔ کہ کوئی سوار اپنے گھوڑے کو زور سے ایڑ دیتا اور دوڑتا چلا آرہا ہے۔ جس کی ٹاپوں کی دھمک سے، باغیچہ کی زمین تک لرزاں ہے، اُس نے جھٹ کان کھڑے کئے۔ اور دریچہ سے زیادہ قریب ہوکر، خوب غور سے باغ کی طرف نگاہیں دوڑائیں اُس نے دیکھا کہ درختوں کے سایہ میں کوئی سوار اجنبی ہیئت محل کی طرف بڑھا آرہا ہے؛ قدرتی طور پر اُس کی نگاہیں سوار کا تعاقب کرنے لگیں۔ اب سوار اُترا گھوڑے کی لگام ایک درخت سے باندھی۔ فلورا سمجھی یقیناً کوئی چور ہے۔ آج

محل کی خبر نہیں۔ شاید یہ چور جانتا ہے۔ کہ محل میں نہ صاحب خانہ موجود ہے۔ اور نہ کوئی نوکر چاکر۔ چور درختوں کی آڑ میں آگے بڑھا۔ اس طرح جیسے کوئی اپنے غافل دشمن پر دھوکے سے حملہ کرنا چاہتا ہو' آخر وہ محل سے بالکل قریب کی جھاڑی میں آپہنچا۔ اب محل اور چور کے درمیان کوئی وسیع شے حائل نہ تھی۔ اُس کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں ٹھہرا رہا کیونکہ اگر ایک قدم بھی آگے بڑھتا تو جو لوگ باغیچہ یا دریچوں میں ہوں وہ پہچان سکتے تھے پھر وہ ایک درخت کی آڑ میں چھپ رہا۔ مگر فلورا کو اُس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ دیکھتے ہی اپنے جی میں کہنے لگی۔ ہاں یہ تو رشدی کا دوست فواد ہے معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس وقت یہاں کہاں؟ آخر سیر و شکار چھوڑ کر اور سب کی نگاہیں بچا کر کمبخت کو یہاں آنے کی کیا وجہ تھی؟

ادھر فواد نے اپنی نگاہیں محل کے اگلے حصہ کی طرف دوڑائیں' اور جیسے ہی اُس کی اُس کی نظر ریحانہ پر پڑی ایک موج مسرت اُس کے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ اُس کی نگاہیں اسی دریچہ میں تھی۔ جہاں نازنین ریحانہ بیٹھی باغ کی سیر کر رہی تھی۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد اُس کی نظر پہلے کمرہ سے، دوسرے کمرہ سے' دوسرے کمرہ کی طرف گئی۔ اس نے فلورا کی طرف دیکھا اور کچھ ایسی نگاہوں سے جو محبت اور تشفی کی مسرت سے مالامال تھیں۔ اب ایک انداز خاص کے ساتھ مسکرایا۔ فواد کے تبسم نے اس کی رعنائی جمال کو اور چمکا دیا تھا۔ نوجوان فلورا کا دل آئینہ حیرت بنا ہوا تھا۔ وہ خیال کر رہی تھی کہ فواد آج شاید میرے لئے محبت کا جال بچھا رہا تھا۔ اتنے میں اُس نے اپنا ہاتھ ہلایا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ نازنین فلورا کو اپنی محبت کی دعوت دے رہا ہے۔ فلورا کو فوراً حرکت ہوئی۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ فواد کے پاس تھی! مگر اس سے پہلے کہ فلورا اس راستہ پر آئے۔ جو فواد تک پہنچاتا تھا۔ فلورا نے ایک چادر لپیٹی' تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے یہانتک کہ ریحانہ بھی دریچہ کے پاس ہو تو نہ پہچانے۔ فواد کے سامنے پہنچکر اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے۔ کہ شرم و حیا اجازت بے نقابی نہیں دیتی تھی۔ فواد نے اس طرح آغاز کلام کیا۔ کہ پہلے اُس کی مہربانی، عالی ظرفی اور نرم دلی کی بہت کچھ تعریف کی' بھولی بھالی خوانین اپنی تعریف پر بہت جلد خوش ہو جاتی ہیں۔ خاصکر جس وقت حسن و نزاکت کی تعریف کی جاتے۔ اس کے بعد فواد نے ایک پر لطف مدحت آمیز تقریر شروع کی۔ گویا کسی بہترین قصیدہ کی بہاریہ تشبیب تھی۔ جس کا روئے سخن' صرف ایک خاص گل نرگس کی طرف تھا۔ ختم تشبیب کے بعد اُس کے ہونٹوں کو خفیف جنبش ہوئی۔ اور دبی زبان سے اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ اور اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا خط نکالا جس پر مہر لگی ہوئی تھی۔ مگر پتہ تحریر نہ تھا۔ اور فلورا سے کہا۔ نیکدل اور

حسین خاتون! مَیں چاہتا ہوں کہ یہ خط آپ اپنی مالکہ تک پہنچا دیں۔" فلورا یہ سُن کر خوش ہو گئی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اس خط کی تہ میں ضرور کوئی دلچسپ راز ہے۔ اور غالباً یہ مکتوب ایک داستان محبت کا دیباچہ اور فاتحۂ کتاب عشق بننے والا ہے۔ اور غالباً فواد کے تمام منصوبوں اور مختلف ارادوں کی جزئی معرفت اسی پر موقوف ہے۔

مگر ابتداءً اس نے نمائشی طور پر اس طرح اظہارِ انکار کیا:-

فلورا- جناب معاف فرمایئے۔ مَیں اس خدمت کو نہیں بجا لا سکتی۔

فواد- مگر آپ کا انکار میرے اور آپ کی مالکہ دونوں کے لئے بُرا ہے۔ اور اگر آپ نے یہ خط پہنچا دیا۔ تو آپ کی قدر منزلت اُن کی نگاہوں میں اور زیادہ ہو جائیگی۔ اور وُہ آپ کی تمام عمر کے لئے شکر گزار ہونگی۔

فلورا (اپنے جی میں) ضرور اس معاملہ میں دونوں شریک ہیں۔ اتنے میں فواد نے پھر کہا۔

فواد- فلورا! اس خط کا پہنچانا نہایت ضروری ہے۔ اس سے بے نیازی نہ کرنا چاہیئے۔

اسی طرح دیر تک دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ آخر فلورا خط پہنچانے پر آمادہ ہو گئی۔

فواد- استدعا قبول ہوئی۔

فواد نے رقعہ دیکر چرمی بٹوا اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ جس میں دس گنیاں تھیں۔ یہ گویا فلورا کی خدمت کا صلہ تھا فلورا کو اُس کے قبول کرنے میں کیا انکار ہو سکتا تھا۔

فواد- دیکھو یہ خط آج ہی اپنی مالکہ کی خدمت میں پہنچا دینا۔ دیر نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد کو کوئی اور خرابی پیش آئے۔

اس کے جواب میں فلورا نے ادب سے گردن جھکا دی۔ فواد نے آگے بڑھ کر فلورا کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ فلورا کو اس سے بھی انکار نہ تھا۔

فواد پلٹا اور گھوڑے پر سوار ہو کر ایک ایڑ دی اور ہوا سے باتیں کرتا ہُوا وادی کی طرف تھا۔

(باقی آئندہ)

گیسو

امشے نماند خلوتیانِ حجاز را دیدی تطاولِ خمِ زلف دراز را

شبلی

صید از حرم کشد خمِ جعد بلند تو فریاد از تطاولِ مشکیں کمند تو

علی حزیں

غزل

قلب کو وقفِ تپش اور چشم کو نم کیجئے　　عشرت باقی جو ہو مقصود تو غم کیجئے

اب وہ کہتے ہیں کہ کیوں آنکھیں اٹھا کر دیکھئے　　کیوں نگاہِ ناز سے عالم کو برہم کیجئے

ہو نہ جائے منتشر شیرازۂ رنگِ جہاں　　زلف کو اپنی مرے غم میں نہ برہم کیجئے

دیجئے اپنی تپش اندوزیوں کا یوں ثبوت　　نغمہائے عیش کو نالوں سے برہم کیجئے

شیام کشور نور

غزل

ترکِ وفا کے دعووں کی ہو جو کچھ حقیقت　　پھر انتظار کیوں ہو پھر اضطراب کیوں ہو

تیری تجلیوں کا جلوہ نہ ہو جو سب میں　　یہ آفتاب کیوں ہو یہ ماہتاب کیوں ہو

گر جادۂ وفا پر ہوں گامزن نہ عاشق　　بزمِ جہاں میں احسن کوئی خراب کیوں ہو

احسن علوی

اختلافِ جذبات باتحادِ قوافی

غبارِ خاطرِ عشاق مدعا طلبی ست　　بخلوتیکہ منم یادِ دوست بے ادبیست

علی سرہندی

ظہورِ بخششِ حق را ذریعہ بے سببیست　　وگرنہ شرمِ گنہ در شمار بے ادبیست

غالب دہلوی

ہزار عقل و ادب داشتم من اے خواجہ　　کنوں کہ مست و خرابم صلای بے ادبیست

خواجہ حافظ

محمد معراج الدین شامی

نقد و نظر

ناٹک ساگر

مرتبہ

نور الٰہی محمد عمر

غالباً کتاب زیر نقد کی اشاعت کے وقت مصنّفین کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آتی ہوگی۔ کہ اس کے شایع ہوتے ہی تمثیل (ڈراما) اور اس کے فرعی و اصولی لوازمات فن کے متعلق ایک طویل سلسلۂ بحث شروع ہو جائیگا۔ جس کے ضمن میں آسکر وائلڈ کی مشہور عالم کتاب پکچر آف ڈورین گرے کی طرح ایک معرکتہ الآرا کا آغاز ہوگا۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ یکسر غیر جانبدارانہ نقطۂ نگاہ سے کتاب کے اس حصّے کے متعلق جو ہندوستان کی تاریخ تمثیل سے غیر متعلق ہے۔ بالعموم اور ہندوستان کی تاریخ تمثیل کے متعلق بالخصوص اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کے متعلق جن میں کتب مطبوعہ و غیر مطبوعہ سے استمداد لیکر کسی علم پر ایک ناقدانہ تصنیف لکھی جاتی ہے۔ سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ مصنف کی کاوش ادارت و ترتیب کی دل کھولکر داد دیجائے یہ کہدینا کہ اس قسم کی کتابیں بآسانی لکھی جاسکتی ہیں، آسان ہے۔ لیکن خود کتب کثیرہ کا مطالعہ کرنا۔ مصنّفین کے تعصباتُ تاثراتِ ذاتی سے بچکر حقیقت کا اخذ و استنباط کرنا۔ اور حتیٰ المقدور فضول چیزوں سے احتراز کرکے کتاب کی رُوح کو نکال لینا۔ ایک نہایت مشکل امر ہے۔ اور ہمیں کہنا پڑتا ہے۔ کہ قابل مصنّفین نے انتہائی عرقریزی اور کاوش سے ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کرکے تمثیل کے متعلق ایک ایسی کتاب سپردِ قلم کی ہے۔ جو ہر چند کہ ہر لحاظ سے جامع و مانع نہیں کہی جاسکتی؛ (اور اس بات کے متعلق ان کو بھی اعتراف ہے کہ ڈرامے کے جملہ کوائف سے بحث کرنے کے لئے دائرۃ المعارف کی کشادہ دامانی درکار ہے) لیکن اس حیثیت سے تفوق رکھتی ہے کہ وہ اس فن کے متعلق "نقش اولین" ہے اور اس کے بعد جو کتاب بھی تصنیف کی جائیگی، وہ اِسی مشعلِ ہدایت کے نور سے کسب انوار ہوگی۔

شروع میں پنڈت برجموہن صاحب کیفی کا ایک دیباچہ ہے۔ جس میں ڈراما کے آغاز کے متعلق ایک دلچسپ بحث کا آغاز کیا گیا ہے۔ معصر نیرنگ خیال کیفی صاحب سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے رقمطراز ہے۔ کہ ڈراما یونان سے ہندوستان میں آیا۔

اس کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا۔ کہ اس نظریہ کو تسلیم کرلینے کے بعد بھی اس حقیقت ثابتہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ سنسکرت ڈراما کے اصول فن یونانی ڈراما کے اصول فن سے اسقدر مختلف و متباین ہے کہ دونوں میں کسی قسم کی اشتراک معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ کہ گویا سنسکرت ڈراما بیرونی اور خارجی تاثرات سے قطعاً پاک ہے۔ بہر حال یہ ایک فرعی بحث ہے۔

یونان۔ انگلستان۔ جرمنی۔ فرانس وغیرہ کے فن تمثیل کے متعلق کثیر مواد بہم پہنچایا گیا ہے۔ اور ممالک مذکورہ بالا میں ڈرامے کے متعلق جو ارتقائی تبدیلیاں ہوئیں ان سے جا بجا نتائج اخذ کرکے مختلف رموز فن کا انکشاف کیا گیا ہے۔ مشہور ایکٹروں کے حالات اور ان کے کمال فن کے متعلق جستہ جستہ دلچسپ لطائف بھی درج ہیں۔ لیکن ہمیں مصنفین سے اس حصے کے متعلق ایک شکایت ہے شیکسپیر اور آسکر وائلڈ کے متعلق جو کچھ انہوں نے لکھا۔ خوب لکھا۔ لیکن ایک ایسی کتاب میں جو ڈرامے سے مخصوص ہو۔ ان دو باکمال اشخاص کے متعلق صرف اسقدر لکھ دینے سے تشنگان ذوق کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ اور ہم ان کی خدمت میں درخواست کریں گے کہ آیندہ ایڈیشن میں وہ شیکسپیر اور آسکر وائلڈ کے کمال فن کے متعلق مبسوط اور علیحدہ بابوں کے ماتحت مضامین سپرد قلم فرمائیں۔

ہندوستان کے متعلق نہایت کاوش سے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ اور ہر تمثیل نگار کے متعلق ناقدانہ رائے پیش کی گئی ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معاصر نیرنگ خیال لکھتا ہے کہ "جو ڈراما نویس مرچکے ہیں اُن کی جی بھر کے تعریف کی گئی ہے۔ اور جو زندہ ہیں ان کو جی بھر کر گالیاں دی گئی ہیں" ہمیں افسوس ہے کہ معزز معاصر نے اس قسم کے خیالات کا اظہار ایسے ناگوار فقروں میں کیا۔ ہمیں تو ڈھونڈھے سے بھی اس قسم کی بات کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں یہ اور بات ہے۔ کہ جن ڈراما نویسوں کے متعلق مصنفین کو کوئی اعتراض ہو' اس کے متعلق وہ اپنی ذاتی رائے پیش کردیں۔ قطع نظر اس کے کہ مصنف موصوف بقید حیات ہے یا نہیں۔ حشر کے متعلق جو کچھ کتاب میں رقم ہے اس کا مطلب جو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنفین کو جناب حشر کے کمال کا اعتراف ہے۔ اور وہ جا بجا اس کے متعلق تعریفی کلمات کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو یہ شکایت ضرور ہے کہ حشر کی پیروی کرنے میں بہت سے ڈرامہ نگار راہ راست سے بھٹک گئے۔ ان فقرات سے یہ نتیجہ کسی طرح مترتب نہیں ہوسکتا کہ حشر کے ڈرامے ناکامیاب رہے یا ان کا طریقہ غیر مستحسن ہے۔ ان فقرات سے غالباً مصنفین موصوف کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ حشر کی پیروی کرتے تھے۔ ان میں

سے اکثر ذوقِ سلیم سے عاری تھے۔ اور اسی لئے وہ ناکامیاب رہے۔ انہوں نے حشر کے معانی بین السطور کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور محض ان کے ظاہری اندازِ فن کے تتبع میں ڈرامے لکھے۔ حشر کے متعلق یہ اعتراضات کہ انہوں نے ایک ڈرامے میں دو پلاٹ داخل کر دیتے۔ شعروں سے اسٹیج کو مشاعرہ بنا دیا۔ اور یہ کہ بھنگڑ خانے کا سوقیانہ اور فحش مذاق لٹریچر میں داخل کر دیا۔ ایک حدتک درست ہیں یہ اعتراضات ایک حدتک صحیح ہیں۔ اور ہر چند کہ عوام الناس کے مذاق کا خیال۔ مالک کمپنی کی حیات کا لحاظ اور موجودہ روش فن کو ان کے جواب میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم پھر بھی یہی کہینگے۔ کہ ہمیں حشر جیسے جادو نگار اور جوہر قابل انشا پرداز سے یہی توقع ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے علی الرغم بھی اپنی شستگی اور متانت کو نہ جانے دیں۔ کیونکہ عوام الناس کی اصلاح بھی اس قسم کے مقبولِ عام مصنفین پر منحصر ہے۔ شعر ڈرامے میں صرف کسی بلند پایہ حقیقت کا اظہار کرنے کے لئے ہونے چاہئیں اور اصلاح کے لئے بد مذاقی شراب خواری اور جوئے بازی وغیرہ کی آئینہ داری اسی حدتک مناسب ہے۔ جس حدتک مناسب و موزوں ہو۔ مقفٰے عبارات کے انقطاع کی تحریک میں ہمیں مرتبین سے کلی طور پر اتفاق ہے۔ اور ان کا استعمال اس صورت میں مناسب قرار دیا جاتا ہے۔ کہ فقرات بے ساختگی سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں۔ اور قوافی کھپانے کی خاطر خواہ مخواہ بلاغت بیان مناسبت معانی کا خون نہ کرنا پڑے۔ غرضیکہ کتاب ہر صورت سے اس قابل ہے کہ ہر تعلیمیافتہ شخص اس کو اپنے کتب خانے کی زینت بنائے۔ قیمت عہ۔ ضخامت ۵۰۴۔ شیخ مبارک علی لوہاری دروازہ لاہور سے طلب فرمائیے

صنعت و تجارت:۔ سید محبوب علی شاہ کی ادارت میں لاہور سے ماہوار شائع ہوتا ہے۔ ماہ فروری کے پرچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقاصد میں صنعتی و تجارتی کتب کا اردو ترجمہ اور بے روزگاری کو دور کرنا بھی شامل ہے۔ اگر ان مقاصد کی تکمیل کی طرف حقیقت میں کوئی قدم بڑھایا گیا۔ تو یقیناً ملک کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ مضامین عام طور پر صنعتی ہیں۔ اور تجارت پیشہ اور ہنر مند اصحاب کے لئے سود مند۔ قیمت سالانہ ۲ مینجر صنعت و تجارت لاہور سے طلب کیجئے۔

جولیس سیزر:۔ شیکسپیر کے اس نام کے مشہور ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کو تفضل حسین صاحب نے کامیابی سے انجام دیا ہے۔ زبان صاف ہے۔ لیکن کہیں کہیں خامیاں نظر آتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شیکسپیر کا ترجمہ کرنا کام ہی ایسا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود ترجمے کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور کتاب بہر نوع دلچسپ ہے۔ ۱۵۰ صفحات پر حاوی ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں ان تاریخی واقعات اور شخصیتوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ جن کا ذکر کتاب میں جا بجا آتا ہے قیمت دو روپے ملنے کا پتہ :۔ تفضل حسین ناظر مدارس کریم نگر حیدر آباد دکن۔

قیمت سالانہ چھ روپے | رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ | قیمت ششماہی ۳ فی پرچہ ۱۰

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:-

سیّد عابد علی عابد بی۔ اے | محمد اسمٰعیل | محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۶ | اشاعت ماہ مارچ ۱۹۲۵ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

جنّت کی حقیقت چاہے خیالِ محض کیوں نہ ہو۔ لیکن ہر ذی شعور ہستی کا کوئی نہ کوئی منتہائے مُراد ہوتا ہے۔ اور اسی کا شاعرانہ نام جنّت ہے۔ ہمارے تخیّل کی پرواز ہمارے شعور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری آرزوئیں ہماری خواہشیں اور کوششیں ترقی کرتے کرتے اتنی وسیع ہو جاتی ہیں۔ کہ اس دُنیا کی تنگنائے میں اُن کی سمائی نہیں ہوتی، اور وہ اپنا ایک ایسا سدرۃ المنتہیٰ قرار دے لیتی ہیں جو بہت دُور دست اور غیر ممکن الحصول ہوتا ہے۔ قرونِ قدیمہ کے انسان جن کی فضائے خیال اتنی بسیط نہ تھی۔ کہ اُس کی سرحدیں مادی کائنات کی انتہائی سرحدوں سے جا ملتیں۔ اُن کے لئے اسی دُنیا میں جنّت تھی۔ اُن کے لئے ہر وہ حسین اور دلکش منظر جو دُور سے اُن کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ ہر وہ آرزو جس کا حاصل ہونا مشکل نظر آتا تھا، جنّت کی مترادف تھی۔ ان قدیم لوگوں کی ذہنیّت اور بچّوں کی ذہنیّت میں کوئی فرق نہیں۔ اپنے ہزارہا سال پیشتر کے آبا و اجداد کی طرح بچّے بھی اپنی زندگی ایک محدود دُنیا میں گزارتے ہیں۔ اور ہر وہ چیز جو اس دُنیا کی حدود سے باہر ہو، اُن کے لئے وہی معنی رکھتی ہے۔ جو ہمارے فلک پرواز تصوّر کے لئے جنّت۔ سیرِ جنّت میں یہ حقیقت ایک ایسے عام فہم پیرائے میں بیان کی گئی ہے جو مزید توضیح کا محتاج نہیں۔

ٹیگور کی نازک بیانیوں کی تشریح کرتے کرتے ہم اکتا گئے، اور اگر ہم اس خوف سے متاثر ہو جاتے کہ کہیں یہ تسلسل ہمارے لئے یا اوروں کے لئے بیزار کن نہ ثابت ہو۔ تو ہم یقیناً اتنی جدّت کرتے کہ آگے اُس کی نسبت کچھ نہ کہتے۔ لیکن "تخیلِ محبت" میں ہمارے نزاکت آفرین افسانہ نگار نے ایک بالکل واضح مسئلہ کو ایک ایسے پیچیدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اُس کے تحلیل کرنے کی ضرورت ہمارے خوف پر غالب آ گئی ہے۔ وہ مسئلہ صرف اسی قدر ہے کہ گُناہ کا تصوّر کرتے رہنے سے وہ ضرور مجسم ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ بجراسین کے ذہن سے اپنی محبوبہ کے ایک فرضی گناہ کی یاد نہیں مٹتی اور عین اُس وقت

جب وہ اپنی تمام ہستی کو محبت کے سپرد کرنے لگتا ہے۔ یہ یاد اس کی محبوبہ کی صورت اختیار کرکے اُس کے پیش نظر ہو جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کی محبت میں اور اُس کے گناہ میں تمیز نہیں کر سکتا۔

"جلد باز" اور "مغالطہ" دونوں ظرافت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور موضوع کے لحاظ سے بھی اس قدر مشابہ ہیں۔ کہ اُن کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سب سے نمایاں صفت جو دونوں میں یکساں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ مصنّفین نے اندازِ بیان کی سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور صرف موضوع کی مضحکہ انگیزی پر اکتفا کی ہے۔ وہ اس نفسیاتی نکتے سے آگاہ ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص کوئی ہنسی کی بات سُناتے وقت خود سب سے پہلے ہنس دے تو اگرچہ وہ اپنے مقصد میں یعنی سُننے والوں کو ہنسانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن آدھے سے زیادہ لطف جاتا رہتا ہے۔

"جلد باز" میں موضوع کی مضحکہ خیزی آغاز ہی میں آپ پر اپنا اثر کرنا شروع کرتی ہے۔ لیکن "مغالطہ" آپ کو ایک کاوش میں مبتلا کئے رکھتا ہے۔ تا آنکہ آپ اس کے انجام سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس کاوش کا ردِّ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی ہنسی۔

"عاقبت بخیر" کی نسبت ہمیں اپنے اُسی فقرے کی تکرار ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جو "کہانی کی رام کہانی" کی نسبت [illegible] اشاعت میں لکھا تھا کہ اس کا روئے سخن صاحب مذاق اہل زبان کی طرف نہیں۔" لیکن جو لوگ حقیقت میں مخاطب ہیں انکی محدود ذہنیت سے ہمیں توقع ہے۔ کہ وہ اس کے حقیقی طنز یہ انداز کا احساس نہ کرتے ہوئے کہہ اُٹھینگے کہ آمیں تو تاجور اور عابد کی مذمت کیگئی ہے

جملہ معترضہ کے طور پر ہم ناظرینِ ہزار داستان سے معافی کے خواہاں ہیں کہ "اچھّا نہ کرے، اور دیکھا نہ کرے" والی غزل جو معارف میں چھپ چکی ہے۔ دوبارہ ہزار داستان میں شائع ہو رہی ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ حصّہ نظم کا معیار اس مرتبہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہے۔ علّامہ تاجور نجیب آبادی، جنابِ عندلیب شادانی، جنابِ آزاد انصاری، جناب ثاقب کانپوری، اور جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کا کلام شریکِ اشاعت ہے۔ ان عواطف کے لئے ہم اُن کے ممنون ہیں۔

ایڈیٹر

سیرِ جنّت

میرے خیال میں جنّت کا تصوّر ہر ایک فرقے کے عقاید کا جزوِ لاینفک ہے۔ دُنیا میں ایسے فرقے بھی ہیں۔ جو دوزخ کے قائل نہیں لیکن ایسا کوئی فرقہ موجود نہیں جو جنّت کا معتقد نہ ہو۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ ننھّی رضیہ کی جنّت سے کیا مراد تھی لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے خیال میں اس کا تصوّر بہت کامراں تھا۔

رضیہ میری دوست ہے۔ ہماری عمروں میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ آٹھ سال کی ہے اور میں پچیس برس کا ہوں۔ تین مہینے ہُوتے میں اُسے اتوار کے دِن نور گنج میں مِلا۔ جہاں میرے ایک دوست کی دُکان ہے۔ وہ اپنی لنگڑی بلّی سے کھیل رہی تھی۔ جونہی میں اُس کے پاس سے ہو کر گزرا وہ میرے ساتھ ٹکّر کھا کر گر پڑی۔ دونوں طرف سے عذر پیش ہُوئے۔ اور ہم دوست بن گئے۔ اُس نے تمہید کے طور پر کہا۔ "میرے چار بھائی اور ایک بلّی ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "اسی محلے میں میرے ایک دوست کی دُکان ہے کیا تم مٹھائی کھاؤ گی؟"

اُس نے سر ہلایا۔ اور میں اُسے دکان پر لے گیا۔ وہ بیٹھ گئی اور مٹھائی کھانے لگی۔ اُس کی لنگڑی بلّی بھی پاس ہی بیٹھ گئی اور ہر لقمہ کی طرف للچائی ہُوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ رضیہ نے تھوڑی سی مٹھائی اُس کے آگے ڈالکر کہا۔ "کیا جنّت میں بھی بلّیاں ہیں یا نہیں؟"

میں نے اس کے بھولے پن پر ہنسکر کہا۔ "یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہُوا۔"

رضیہ نے میری طرف بغور دیکھا اور کہنے لگی۔ "یہاں دُکان میں تو ہم بلّیاں لا سکتے ہیں، نا؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں، لیکن جنت کے قانون اور ہیں۔"

رضیہ نے ایک دُوربین مسافر کی سی آواز میں کہا۔ "میں جنّت میں جانا چاہتی ہوں۔ لیکن اگر وہ گلابو کو ساتھ لانے کی اجازت نہ دیں، میں نہ جاؤنگی۔"

بعد ازیں، دیر تک باتیں کر کے وہ چلی گئی۔

رضیہ محمد حنیف، ایک خوردہ فروش کی بیٹی تھی، جو ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ جس میں صرف دو کوٹھڑیاں اور ایک صحن تھا۔ وہ بہت ہی مفلس تھا اور محنت مزدوری سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا، اُس کی بیوی سلیمہ، سینے پرونے کا کام کرتی، اور جو کچھ حاصل ہوتا اپنے بال بچوں

کی پرورش پر صرف کر دیتی تھی۔

غربت و افلاس کے نقصانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے غلاظت کی عادت ہو جاتی ہے۔ جو دوزخ کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ہم سوچیں تو معلوم ہوگا کہ یہی افلاس دلوں میں جنّت کا شوق اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ رضیہ جنّت کی بہت شوقین تھی، اور یہی شوق تھا جس کی بدولت اُس کی زندگی میں "بید کے صندوق" کا واقعہ ظہور پذیر ہُوا۔

بید کے صندوق کی تشریح کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نور گنج ایک ایسا محلہ ہے جس میں غربا کی کثرت سے آبادی ہے۔ اسی غربت کو دیکھ کر بہت سے امرا نے اُن کی مدد کی لیکن ایک رحمدل خاتون نے جس کا میں نام نہیں لینا چاہتا اس ذمہ داری کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ اور ایک ایسا لنگر خانہ جاری کیا۔ جہاں سے غربا کو اشیائے خورد و نوش میسر آ سکتی تھیں۔

لنگر خانہ میں ہر روز باقاعدہ ایک بہت بڑا بید کا صندوق آتا جس کی آمد سے لوگوں میں ہلچل پڑ جاتی، لوگ جمع ہو جاتے، اور صندوق کو خاتون کی گاڑی سے اُترتا دیکھ کر اُتارنے والے سُرخ پوش آدمیوں کی تعریفیں کرتے یہ سرخ پوش آدمی اپنے کام میں بڑے ہوشیار رکھے۔ وہ صندوق کو بڑی دقّت سے اُتارتے اور لوگوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ نور گنج کے لوگ اس خیرات کے واقعی شکرگزار تھے۔ یا یونہی نمائش کے طور پر یہ جوش و خروش دکھاتے تھے۔ لیکن تماشبینوں کے لئے یہ منظر واقعی دلخوش کن ہوتا تھا۔

ننھی رضیہ کی اس وقت عجیب حالت ہو جایا کرتی تھی اُس کا خیال تھا کہ یہ صندوق جنّت سے آتا ہے۔ وہ اُن دو سُرخ پوش آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتی تھی "یہ دونوں فرشتے ہیں۔ اور یہ اللہ میاں کی خیراتی گاڑی ہے۔"

(۲)

ایک روز صبح کے وقت رضیہ اُس صندوق کے پاس چند رازداری کے امور پر گفت و شنید کرنے کے لئے گئی۔ یہ بھاری صندوق لنگر خانہ کے تنگ و تاریک کمرے میں پڑا تھا۔ اُس کا قفل کُھلا ہُوا تھا۔ اور اس کے تسمے لٹک رہے تھے۔ رضیہ کے لئے یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ گلابو کو لے کر کمرے میں داخل ہُوئی، وہاں پہنچ کر اُس نے ذرا تامل کیا کہ شاید وہ صندوق کچھ کہے۔ لیکن افسوس اُس متبرک صندوق سے کوئی آواز تک نہ نکلی۔ رضیہ نے آگے بڑھ کر اسکا ڈھکنا اُٹھایا۔ اور پانچ منٹ بعد ایک خوفزدہ مگر بااِرادہ لڑکی اور ایک حیرت زدہ مگر وفادار بلّی صندوق میں پہلو بہ پہلو بیٹھ گئیں۔ اور اُوپر سے ڈھکنا بند کر لیا۔ دُنیا ان کی نظروں سے غائب ہو گئی۔

ابھی مشکل سے وہ بیٹھی ہو گی کہ لنگر خانہ کے دروازے پر گاڑی کی گھنٹی کی آواز سُنائی دی۔ رضیہ نے خیال کیا۔ کہ فرشتے آرہے ہیں۔ اور اُس نے مضبوطی سے گلابو کو پکڑ لیا کمرے میں دو آدمی داخل ہُوئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا اسے اُٹھا کر گاڑی میں رکھدو۔"

دوسرے فرشتے نے اکڑ کر جواب دیا "خود رکھ لو نا کیا میں تمہارا نوکر ہوں؟"

کچھ توقف کے بعد اُس نے صندوق کو اُٹھایا اور کہنے لگا۔ "آج یہ غیر معمولی طور پر بھاری معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے نے جواب دیا۔ "کچھ پروا نہیں تم اسے گاڑی میں رکھو۔"

اُنہوں نے صندوق کو گاڑی میں رکھدیا۔ اور تھوڑی دیر میں وہ بہشتی گاڑی اپنی منزلِ مقصود کو چلدی۔ رضیہ نے گلابو سے کہا۔ "اری گلابو! ہم جنّت کو جا رہے ہیں۔"

سفر کچھ زیادہ طویل نہ تھا ـــــ اُس سفر سے بہت چھوٹا تھا۔ جسے انسان اتنا لمبا خیال کرتے ہیں۔ گاڑی ٹھہر گئی اور فرشتوں نے صندوق اُٹھا کر ایک تنگ و تاریک جگہ میں رکھ دیا۔ رضیہ اُس وقت تک انتظار کرتی رہی، جبتک اُسے یقین نہ ہو گیا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ وہ صندوق میں سے نکلی، اردگرد اندھیرا تھا۔ اور کمرے سے بو آتی تھی۔ رضیہ نے سوچا کہ وہ کسی غلط مقام پر آپہنچی ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد اُسے سیڑھیاں دکھائی دیں۔ اور وہ کہنے لگی۔ "مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ یہاں سیڑھیاں ہونگی۔"

وہ گلابو کو لیکر اُوپر چڑھی۔ اُوپر پہنچکر اُس نے ایک دروازہ کھولا۔ جہاں اُسے ایک راستہ دکھائی دیا۔ وہ اس میں سے گزرتی ہوئی ایک اور دروازے کے پاس پہنچی جس کے آگے ایک خوشنما پھولدار پردہ پڑا تھا۔ اور کمرے کے پیچھے ایک عالیشان کمرہ تھا۔ رضیہ نے حیرانی سے کہا۔ "ہم جنّت میں آگئے ہیں!"

یہ ایک کشادہ اور آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا۔ چھت میں ایک بلورین جھاڑ تھا۔ اور دیواروں پر رنگا رنگ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ رضیہ کے والد محمد حنیف کا مکان اس کے پاسنگ بھی نہ تھا لیکن ہم کون ہیں کہ جنّت اور دُنیا کا مقابلہ کریں؟

کمرے کے وسط میں ایک چمکدار میز پر چاندی کی سینی میں سیب، کیلے، سنگترے اور انگوروں کے گچھے چُنے رکھے تھے۔ رضیہ آہستہ سے آگے بڑھی۔ اور سینی میں سے ایک سنگترہ اُٹھا کر کھانے لگی۔ ابھی کھا ہی رہی تھی کہ اُسے اپنے انتخاب کی ماہیت معلوم ہو گئی۔ وہ چھلکے کو کیا کرے؟ وہ اب اُسے سینی میں بھی نہ رکھ سکتی تھی۔ وہ عجیب تذبذب کی حالت میں تھی۔

اسی اثنا میں اُسے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔

اُس نے نااُمیدی سے صاف ستھرے کمرے کو دیکھا۔ اور سنگترے کا چھلکا وفادار گلابو کے مُنہ میں دیدیا۔ پھر اُس بارعب، موٹے آدمی کو دیکھنے لگی۔ جو کمرے کے سرے پر کھڑا اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ بلاشک وشبہ یہ ایک عالی مرتبہ فرشتہ تھا۔ اُس کا کوٹ بڑا قیمتی تھا۔ جس پر ریشمی دھاگے کے بیل بوٹے بنے ہُوتے تھے۔ وہ رضیہ کے قریب آکر کہنے لگا۔ "تم کون ہو، اور کہاں سے آئی ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "میں رضیہ ہوں، اور نور گنج سے آئی ہوں۔ کیا یہاں بلّیوں کو لانے کی اجازت ہے؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔"

رضیہ نے خوشی سے کہا۔ "تو پھر میں ہمیشہ یہیں رہونگی"

فرشتہ کہنے لگا۔ "اچھا میں کسی خادمہ کو بلاتا ہوں۔"

وہ چلا گیا، رضیہ اُس کی طرف حیرانی سے دیکھتی رہی۔ اُس نے سوچا۔ شاید یہ صرف بلّیوں ہی کو یہاں رکھتے ہوں۔ اور لوگوں کو یہاں رہنے کی اجازت نہ ہو۔ اُس نے اپنے دل سے ارادہ کرلیا۔ کہ اگر وہ پوچھیں تو میں کہدونگی کہ مجھے یہاں مدعو کیا گیا ہے۔ وہ انہی خیالات میں تھی کہ ایک حور داخل ہُوئی رضیہ اور گلابو کو دیکھ کر کہنے لگی۔ "بچّی تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اُس نے فوراً جواب دیا۔ "میں یہاں رہنے کے لئے آئی ہوں۔ کیونکہ مجھے یہاں آنے کے لئے کہا گیا تھا۔

حور بڑی حیران ہوئی۔ لیکن یاد آنے پر بولی۔ "ہاں، شاید تم بھی خاتون کی منظورِ نظر ہو، میرے ساتھ آؤ۔ میں منتظمہ کو بلاتی ہوں۔"

وہ حور کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں پہنچی۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ گلابو اس کے پاؤں کے پاس بیٹھ گئی، اتنے میں ایک سفید پوش حور اٹھلاتی ہُوئی کمرے میں داخل ہُوئی اور رضیہ سے کہنے لگی۔ "ہاں، تو تمہیں سُنانے کی ضرورت ہوگی۔ مجھے بتایا گیا تھا۔ کہ تم آرہی ہو۔ خدایا یہ کونسا حیوان ہے؟"

اُس کی نگاہیں گلابو پر پڑی تھیں، جو جمائی لے رہی تھی۔ رضیہ نے کہا۔ "یہ حیوان نہیں بلکہ بلّی ہے۔"

حور نے کہا۔ "اچھا"

رضیہ، جس نے اپنے حقوق پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ کہنے لگی۔ "اسے بھی یہاں رہنے کی اجازت ہے۔"

حور نے کہا۔ "ہاں پیاری، مجھے یہ پہلے ہی بتادیا گیا تھا۔"

بعدازیں وہ حور، رضیہ اور گلابو متعدد کمروں میں سے ہوتی ہُوئی ایک کمرے میں پہنچیں۔ یہ غسل خانہ تھا۔ دس منٹ بعد حور نے رضیہ کو نہلانا شروع کیا۔ رضیہ نے اپنے دل میں خیال کیا کہ جنّت ایک ایسی جگہ کا نام ہے جس میں ایک انسان مسرت حاصل کرتا ہے۔ نہلانے کے بعد حور نے ایک نرم تولیہ سے اُس کا بدن صاف کیا۔ اور ایک سفید چادر میں لپیٹ کر

آرام کرسی پر بٹھا دیا۔ اور کہنے لگی۔ مَیں نے تمہارے لئے نئے کپڑے منگوائے ہیں۔ یہ بہت میلے ہیں۔"

رضیہ نے جواب دیا۔ "ہاں"

حور چلی گئی، اور رضیہ کسی اور عجوبہ کی انتظار میں بیٹھی رہی تھوڑی دیر بعد وہی سفید پوش حور دو چینی کی رکابیوں میں کچھ کھانا لائی۔ جس کی خوشبو سے کمرہ مہک اُٹھا۔ رضیہ نے اُنکی طرف نگاہیں پھاڑ کر دیکھا اور کہا۔ "کیا یہ سب میرا حصّہ ہے؟"

حور نے جواب دیا۔ "ہاں، لیکن جو چیز تمہیں پسند نہ ہو، چھوڑ دو۔"

رضیہ نے جلدی سے کہا۔ "نہیں مَیں کچھ نہ چھوڑونگی"

جب وہ کھا چکی تو ایک آہ کھینچکر کرسی پر لیٹ گئی۔ اور اُونگھنے لگی۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن چند لمحوں کے بعد ایک دلکش آواز نے اُسے جگا دیا۔ اُس نے آنکھیں کھولکر حور کو اپنے اوپر جُھکا ہُوا پایا۔ پاس ہی ایک کرسی پر نئے کپڑے رکھے تھے۔ حور نے کہا۔ "یہ لو تمہارے کپڑے آگئے ہیں۔"

رضیہ جوش مسرت سے اُچھل پڑی۔ حور نے اُسے کپڑے پہنائے۔ اور تھوڑے عرصے میں رضیہ ایک عمدہ پوشاک میں ملبوس نظر آنے لگی۔ اُس کی شکل اسقدر تبدیل ہوگئی۔ کہ بیچاری گلابو حیران ہوکر کرسی کے نیچے چھپ گئی۔ حور نے کہا۔ "اب ہم اوپر چلیں گے۔"

(۲)

حور، رضیہ کا ہاتھ پکڑکر سیڑھیوں پر سے ہوتی ہُوئی ایک عالیشان کمرے میں پُہنچی۔ اس کمرے میں ایک عورت بیٹھی چاے پی رہی تھی۔ جس کے پاس موٹا فرشتہ چاے دانی لئے کھڑا تھا۔ اس عورت کے پاؤں کے نیچے ایک نرم گدیلا تھا۔ جس پر تین خوبصورت برف سی سفید بلّیاں کھیل رہی تھیں۔ اُس عورت کی ہیبت سے اس کی عظیم الشان شخصیت عیاں تھی۔ شاید یہ ملکہ فردوس تھی۔ حور نے رضیہ سے کہا۔

"تم خواہ کچھ کرو۔ لیکن بلّیوں کی تعریف کرنا نہ بُھولنا"

حور، رضیہ کو چھوڑکر آگے بڑھی اور چند الفاظ ملکہ فردوس سے کہے۔ ملکہ نے اپنا شاہانہ سر بلند کیا۔ اور کہا۔ "نرگس ایں نے یتیم خانہ سے تو کوئی بچّہ نہیں منگوایا"

غریب حور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔ "شاید آپ کو مغالطہ ہُوا ہو۔"

ملکہ نے جواب دیا۔ "نہیں، مَیں یہ یقین سے کہتی ہوں"

حور نے شرمندگی سے کہا۔ "مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ مَیں بچّی کو ابھی واپس بھیجدیتی ہوں"

ملکہ نے کہا۔ "ٹھہرو! یہ ایک خوبصورت لڑکی ہے، بچی ادھر آ"

رضیہ ڈرتی ڈرتی آگے بڑھی، ملکہ نے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اُس نے جواب دیا " رضیہ "

ملکہ نے بغور دیکھ کر کہا۔" ہیں، یہ عجیب بات ہے۔ شاید واقعی مجھے مغالطہ ہُوا ہو۔ ہاں تو تم یہاں کس طرح آئیں ؟ "

رضیہ نے سادگی سے جواب دیا۔" مَیں صندوق میں آئی ہوں۔"

ملکہ اور حور نے تعجب سے کہا" صندوق میں ! "

رضیہ نے سر ہلایا، اور پھر یہ محسوس کر کے کہ گفتگو کو بدلنے کا یہ عمدہ موقعہ ہے۔ کہا۔" مَیں بلّیوں کی بڑی شوقین ہوں۔"

ملکہ کے چہرے پر تبسّم ظاہر ہُوا، اور اُس نے حور سے کہا۔" دراصل اسے یہاں ٹھہرانے کا خیال بُرا نہیں کیوں تمہاری کیا رائے ہے ؟ "

حور نے جواب دیا۔ میری رائے میں یہ حضور کی مہربانی ہوگی۔ کہ آپ اسے یہاں ٹھہرائیں۔"

ملکہ کہنے لگی۔" ہاں اور یہ بلّیوں کے لئے ایک اچھی سہیلی ثابت ہوگی۔ مَیں اکثر سوچتی تھی کہ بلّیوں کو ایک اچھے ہمجولی کی ضرورت ــــــ "

اچانک وہ خاموش ہوگئی۔ اور ایک خوفزدہ چیخ مار کر کہنے لگی۔" او خدا ! یہ کیا ہے ؟ "

رضیہ اور حور دیکھنے کے لئے پلٹیں، تینوں بلّیوں نے غرّانا شروع کر دیا۔ کمرے کے دروازے سے ایک بلّی دوڑی آرہی تھی۔ جو دوڑتے ہُوئے لنگڑاتی تھی، یہ گلابو تھی اُس نے رضیہ کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

اُس نے کہا۔" اری گلابو مجھے تیرا تو خیال ہی نہ تھا۔"

اُس نے گلابو کو اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ اس وقت اُسے اپنے خوبصورت کپڑے بھی بھول گئے۔ اسی اثنا میں ملکہ، جو بلّیوں کو چُپ کرانے میں کامیاب ہوگئی تھی کہنے لگی۔ " فیروز ! "

موٹا فرشتہ آگے بڑھ کر کہنے لگا۔" حضور ! "

ملکہ نے کہا۔" اس مہیب بلّی کو میری نظروں سے دُور کر دو۔ اِسے جلدی مکان سے باہر نکال دو۔"

فیروز نے سر جُھکا کر کہا۔" بہتر، سرکار "

لیکن رضیہ نے گلابو کو مضبوط پکڑ لیا۔ اور فرشتے کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔" مَیں تمہیں یہ نہ دُونگی، ہرگز نہیں "

سفید پوش حور آگے بڑھ کر کہنے لگی۔" شاید میرے کہنے پر وہ ــــــ "

ملکہ نے بات کاٹ کر کہا۔" ٹھہرو ! مَیں رضیہ سے پوچھتی ہوں۔ رضیہ اگر تم چاہو تو یہاں ٹھہر سکتی ہو لیکن ایک شرط پر، اور وہ یہ کہ اس ڈراونی بلّی کو چھوڑ دو۔"

رضیہ نے ایک منٹ تامّل کیا، خُوبصورت کمرے کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ غسل خانہ، کھانا اور نیا لباس

یاد آگیا۔ لیکن گلابو کا خیال آتے ہی اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اور اُس نے ملکہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مَیں گلابو کو نہ چھوڑونگی"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ملکہ بولی۔ "فیروز!"

فیروز نے کہا۔ "حضور!"

ملکہ نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "جلدی گاڑی تیار کر کے اس بچّی کو گھر چھوڑ آؤ۔"

فیروز نے جواب دیا۔ "بہتر، حضور"

موٹا فرشتہ چلاگیا، ملکہ نے درد انگیز لہجہ میں کہا۔ "غربا کی ناشکر گزاری بہت کاہش انگیز ہوتی ہے ہیں نہیں جانتی کہ دُنیا کو کیا ہوگیا ہے۔"

چند دن بعد رضیہ مجھے نور گنج میں ملی۔ وہ اپنی گلابو سے کھیل رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ "مَیں جنّت میں گئی تھی، وہ کچھ ایسی اچھی نہیں، مَیں مٹھائی کھانا چاہتی ہوں۔"

مَیں اُسے دُکان پر لے گیا۔ وہ مٹھائی کھانے لگی۔ اور مَیں خیالات میں مستغرق ہوگیا۔ مَیں نے رضیہ کے فلسفے کو سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن افسوس کہ مَیں اس اُلجھی ہوئی گتھی کو نہ سلجھا سکا۔

(ماخوذ) سراج

غزل

جو ہُوئی سحر تو ماتم ہُوئی شب تو نوحہ خوانی
وہ کہاں گیا لڑکپن وہ کہاں گئی جوانی

وُہی آبلہ جگر کا ہے مآل زندگانی
جسے سب سمجھ رہے ہیں ترے تیر کی نشانی

نہ کروں زباں سے شکوہ مگر اس کو کیا کروں مَیں
کہ ہے ترجمانِ فرقت مری مضمحل جوانی

تری شوخیوں کے شیدا کہیں اور کچھ نہ سمجھیں
مرا رنگ کہہ رہا ہے ترے رعب کی کہانی

کوئی وقت واپسیں بھی مرے سامنے نہ آیا
مجھے خاک میں ملا کر بھی گئی نہ بدگمانی

مجھے خوگرِ تسلّی نہ کریں کسی کے وعدے
کہ مٹا رہی ہے خود ہی مجھے کاوش نہانی

ترے تیر کی دُعا گو ترے حُسن کی ثنا خواں
مری خوں شدہ تمنّا مری غمزدہ جوانی

مرے حال کی تباہی مرے دل کی بے گناہی
یہ تم اپنے دل سے پوچھو نہ سنو مری زبانی

مجھے صدر درحقیقت ہے بہار سے محبت
کچھ اسی میں دل نے پایا مرے لطفِ شعر خوانی

صدرالدین سرشار کسمنڈوی

اب مجھ کو بھول جاؤ

پہلے جتا دیا تھا
سب کچھ بتا دیا تھا
پہچان جاؤ مجھ کو - ہاں جان جاؤ مجھ کو
مَے سے بھرا سبو ہُوں
ٹُوٹا تو بس گیا مَیں
دامانِ رنگ و بو ہوں
چھوٹا تو بس گیا مَیں
اب یاد کر رہے ہو - فریاد کر رہے ہو
اب تلملا رہے ہو آنسو بہا رہے ہو
بیتاب آرزو ہو سرگرم جستجو ہو
دلداریاں عبث ہیں یہ زاریاں عبث ہیں
ہاتھوں سے مجھ کو کھوکر
اب جاؤ غم نہ کھاؤ
کیوں پھر رہے ہو مضطر
دل کو کہیں لگاؤ

چھایا ترنگ بن کر
اُٹھا اُمنگ بن کر
اُترا تو آبرو ہوں نکلا تو آرزو ہوں
دیکھا مجھے! تمہاری
تقدیر بن کے بگڑا
سمجھے مجھے! کہ ساری
تدبیر بن کے بگڑا
اب ہاتھ مل رہے ہو سو چال چل رہے ہو
کیوں اس سے فائدا کیا؟ اب تم کو ہو گیا کیا؟
اب مہربانیاں کیوں شیریں زبانیاں کیوں
غمخوار ہیں کئی اور بل جائیگا کوئی اور
یہ پُر فریب باتیں
مجھ کو نہ اب سناؤ
یہ چال اور یہ گھاتیں
اغیار کو سکھاؤ

مَیں وقت تھا گیا۔بس مثل ہوا گیا - بس
اب مجھ کو بھول جاؤ
اب مجھ کو بھول جاؤ

مَیں رنگ تھا اُڑا۔بس آنسو تھا۔بہ گیا۔بس
اب مجھ کو بھول جاؤ
اب مجھ کو بھول جاؤ

فریبِ نگاہ

علی اکبر آج خلاف معمول دن کے وقت سمور کے ایک ایسے اوور کوٹ میں ملبوس جس کی بوسیدگی کو جابجا دستی کی پیوند کاریوں نے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ گھر سے باہر نکلا۔ گزشتہ چھ ماہ کے عرصہ سے اس کے لئے نظامِ کائنات یکسر تبدیل ہوگیا تھا۔ دن اس کے لئے رات کے مشابہ تھا۔ اور رات دن سے مراد تھی۔ تمام دن وہ اپنے گھر ایک مفرور قیدی کی طرح سہما ہوا سیڑھیوں پر فرضی قدموں کی چاپ سنا کرتا۔ حتےٰ کہ تذلیل کے انتہائی احساسات سے مجبور ہوکر وہ اپنے تنگ و تاریک کمرے کا وہ تنہا روشندان بھی بند کرلیتا۔ جس کے ذریعے کمرے کی نم آلود تاریکی میں سورج کی چند آوارہ شعاعوں سے ایک ناخوشگوار تنوع پیدا ہوجاتا تھا۔ امارت کے انتہائی درجوں پر پہنچکر غربت کے ذلیل ترین قعر میں جاپڑنا اسقدر مہیب اور دردناک ہوگا۔ یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ پہلے دو تین مہینے اس کے جسم کو جو ہر ایک طرح کی بہترین پرورش کا عادی ہوگیا تھا سخت تکلیف اُٹھانا پڑی۔ لیکن بعد ازاں عادی ہوجانے کے باعث صرف ذہنی کرب باقی رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنی انتہائی کوششوں سے اس تکلیف کو محو کر دینے کی کوشش کی لیکن اس کی حساس طبیعت اسے بار بار دردناک صحت سے گزشتہ واقعات اور موجودہ حالت کے تضاد کی یاد دلاتی رہی۔ آخرکار وہ تنگ آگیا۔ اور ایک زہریلا خیال اس کے دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہونے لگا۔ یہ خیال پہلے بہت مدھم تھا لیکن رفتہ رفتہ روشن اور مستقل ہوتا گیا۔ اور ایک عجیب بات یہ تھی۔ کہ وہ اس خیال پر جتنا غور کرتا۔ اسی قدر اسے اپنے دل میں طمانیت کا ایک سمندر موجزن نظر آتا۔ جس سے وہ اپنے دورِ تعیش میں بھی ناآشنا تھا۔

یہ خودکشی کا خیال تھا۔

بہت عرصہ مختلف النوع سامانِ ہلاکت کے متعلق سوچ سوچ کر وہ پاگل سا ہوگیا۔ پھر ایک دن وہ بیتاب ہوکر بغیر کچھ سوچے سمجھے نکل کھڑا ہوا۔ یہ وہی دن تھا۔ ہر طرف کہر مچائی ہوئی تھی۔ گہری۔ تاریک اور وسیع حسن اتفاق سے آج کا دن بھی ایسا تھا۔ کہ رات کو شرماتا تھا۔ گھر سے باہر نکل کر اسے ایک عجیب قسم کی مسرت محسوس ہوئی۔ یہ خیال کہ وہ آج بازاروں میں اس وقت پھر رہا تھا۔ جب اس کے بنی نوع پھرا کرتے ہیں۔ بہت دلخوش کن تھا۔ اتنے عرصہ کے بعد آدمیوں کی آوازیں اسے

اپنے دل پر موسیقی کا نشاط آفریں اثر چھوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ نازاں تھا کہ تھوڑے سے عرصہ کے لئے وہ پھر اسی کائنات کا ایک فرد تھا۔ جس کی شمولیت اب اس کے ثمر ممنوع کی طرح ایک اخلاقی گناہ تھی۔ وہ قصداً مختلف آدمیوں سے شانے چھچھلتا ہوا گزرا۔ آہ سورج کی تابناک روشنی میں اس متحرک جاندار ریل پیل میں سے گزرنا کس قدر خوشگوار ہوتا ہوگا۔ کسی تانگے پر سوار ہو کر جذبات سے بھرا نگاہوں سے اجنبی آدمیوں کی طرف دیکھنا کیسی عجیب بات ہوتی ہوگی۔ اس کی روح اس وقت کا خیال کر کے کانپ اٹھی۔ جب وہ بازار میں کھلم کھلا پھر سکتا تھا۔ اور دوسروں کو اپنی خوش پوشاکی اور خوش وضعی کی طرف حاسدانہ انداز سے دیکھتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ پانچ بجے کے قریب کہر کی تاریکی اور تاریک ہوگئی۔ اور سردیوں کی مدھم دھوپ بالکل ماند پڑنے لگی۔

کسی نامعلوم جذبے سے متاثر ہو کر وہ ایک جگہ کھڑا ہوگیا۔ اور سوچتا رہا۔ کہ خودکشی کے اقدام کے لئے کونسی تدابیر عمل میں لانی چاہئیں۔ اس کی آنکھیں خلا میں گڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کا دماغ مصروف بیکار تھا۔ یکایک پیچھے سے کوئی شخص اس کے ساتھ ٹکرایا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور ایک لمحے میں انتہائے تعجب سے وہ بھونچکا سا ہوگیا۔ اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا۔ جو ہر امکانی صورت میں بالکل اس سے مشابہ تھا۔ اور خود اس کی طرح تعجب آمیز اور وحشت آگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ ایک لمحے میں وہ چہرہ کہر کی بڑھتی ہوئی دھندلاہٹ میں غائب ہوگیا لیکن اکبر کے دل پر ایک ایسا نقش چھوڑتا گیا جس کا مٹانا اس کے لئے محال ہوگیا۔ وہ گھر کی طرف واپس مڑا۔ لیکن اب اس کے قدم اس سست رو انداز سے نہ پڑتے تھے۔ جس کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ اب ان میں چستی اور چالاکی کا ایک حیرت انگیز عنصر ملا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر وقار کے ایک خاص انداز سے بلند کیا۔ اور اپنی زندگی پر اسقدر مسرور ہوا۔ گویا آج تک اُسے کسی تکلیف کا سامنا ہی نہ کرنا پڑا تھا۔ خودکشی کا خیال اس نے اس طرح فراموش کر دیا۔ گویا کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔

کہیں دُور شاید بہت دُور اسی کائنات کا ایک فرد اس کا ہم صورت غربت اور افلاس کے بوجھ کو نہایت سکون اور اطمینان سے اُٹھاتے ہوئے اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ایں و آں سے بے پرواہ ہو کر دن کے وقت باہر نکلتا تھا۔ اور انہی لوگوں میں جلتا پھرتا تھا جو شاید اس کی طرف حقارت اور استہزا سے دیکھتے ہونگے۔ وہ مردانہ وار ان مصیبتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ جو انسان پر دورِ حیات کی ایک ناگزیر شرط بن کر نازل ہوتی ہیں۔ یہ سوچ کر وہ واپس مڑا۔

اب اسے اردگرد کی ہر ایک چیز مسرور اور شادمان نظر آتی تھی۔ اور اپنے پسینے کی گاڑھی کمائی سے پھر اسی ثروت کو پیدا کرنے کی خواہش، جو اسے مفت میں اپنے والد کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا، کہ کچھ بھی ہو۔ مگر وہ زندہ رہیگا اور نہ صرف زندہ رہیگا۔ بلکہ زندگی کو کامیاب اور فرحاں بنانے کی ہر ممکن کوشش کریگا۔ جو کام دُنیا میں ایک شخص کر سکتا ہے۔ وہ دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ اگر اسکا ہم صورت جس کے کپڑے خود اس کی اپنی طرح میلے کچیلے اور بوسیدہ تھے ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ تو وہ کیوں خاص طور پر ان باتوں کے لئے مرا جاتا ہے۔ اس کا ذہن اپنے ہم صورت کا تعاقب کر رہا تھا۔ اور وہ اُسے اپنے تصوّر کی نگاہوں سے معاش کے وسائل میں غرق دیکھ رہا تھا۔

قریب کی ایک دُکان پر جہاں قدآدم شیشے تیار کئے جاتے تھے۔ ایک نوکر کندھے پر سے ایک شیشہ اُتار کر دوسرے نوکر کے حوالے کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔" توبہ! میرا تو شانہ چھل گیا۔ راستے میں ایک بھلے آدمی سے ٹکر بھی ہو گئی۔ لیکن تھا کوئی بہت شریف بولا بالکل نہیں۔"

(ملخص) عابد

جذبات ہادی

شوریدہ سری میری مانوس ہے پتھر سے
سر پھوڑ کے اُٹھونگا بے درد ترے در سے

ہے ناز بہت دل کو بیتابیِ فرقت پر
یارب نہ اُلجھ بیٹھے ہنگامہ محشر سے

تقدیر کے لکھے کو کب تک کوئی روئے گا
اُٹھنے ہی نہیں دیتی امید ترے در سے

دیکھونگا ذرا جلوے خورشید قیامت کے
تم آنکھ ہٹا لینا ہنگامۂ محشر سے

صدقے تری آنکھوں کے وارفتہ مجھے کر دے
ساقی مری امیدیں وابستہ ہیں ساغر سے

تم اپنی محبّت کی حالت تو ذرا دیکھو
یہ بوجھ نہ اُٹھیگا مرے دلِ مضطر سے

دِل اور اُسے حاصل آرام کی دولت ہو
مَیں اور نکل جاؤں تقدیر کے چکّر سے

ہم محفلِ عشرت کے اداب کو کیا جانیں
ہم خاک نشینوں کو مطلب ہے ترے در سے

معلوم نہیں کیا تھا اُن گرم نگاہوں میں
کیوں آگ نکلتی ہے ہادیؔ دلِ مضطر سے

ہادیؔ

داغِ ناتمام

ہاں راہ و رسم عشق سے پیدا کرے کوئی
آباد اپنی رُوح کی دُنیا کرے کوئی

اللہ رعب آپ کے حسنِ غیور کا
ممکن نہیں کہ شرحِ تمنّا کرے کوئی

آرائش جمال کو جب خود وہ دیکھ لیں
پہروں پھر ان کو شوق سے دیکھا کرے کوئی

مانا تیری نگاہ بہت دلنواز ہے
دِل کو اگر قرار نہ ہو کیا کرے کوئی

صہبائے عشقِ یار سے لبریز کیوں نہ ہو
کیوں آرزوئے بادہ و مینا کرے کوئی

ہر چند بے خودی کا نشہ تیز کیوں نہ ہو
کیوں حسن پردہ دار کو رسوا کرے کوئی

جاؤ نہ بے زبانیٔ ظاہر کے رنگ پر
ایسا نہ ہو کہ رُوح کو گویا کرے کوئی

دیکھا میری طرف تو ذرا مسکرا بھی دے
اس قطرۂ جمال کو دریا کرے کوئی

یا رشتہ ہائے ضبطِ محبت کو توڑ دے
یا ناصبور دِل کو شکیبا کرے کوئی

یا راحتِ وصال کی امید چھوڑ دے
یا تلخیٔ فراق گوارا کرے کوئی

آنکھوں میں چھپ کے بیٹھ رہا پرتو جمال
ہوتا ہے کیا جو لاکھ بھی پردا کرے کوئی

آجائے شمع روئے منوّر لئے ہوئے
اس شامِ غم کو نور سراپا کرے کوئی

عابد

جذباتِ ثاقب

(۱)

دیکھیں کرشمے، اُس نگہِ سحر کار کے
قائل نہیں جو گردشِ لیل و نہار کے

پھر سامنا ہے اُس نگہِ برق پاش کا
پھر امتحان ہیں جگرِ داغدار کے

پھر کشمکش میں پڑ گئے دیوانگانِ حُسن
آثار ہیں یہ آمدِ فصلِ بہار کے

جامہ دری کی وجہ جنوں ہے نہ فصلِ گل
یہ سب کرشمے ہیں نگہِ سحر کار کے

یہ انقلاب! کل جو تھے سرمایۂ نشاط
ہیں ناگوار آج وہ جھونکے بہار کے

بُلبل ہے نالہ ریز تو گل سینہ چاک ہیں
یہ بھی ہیں شعبدے چمنِ روزگار کے

ناکامیٔ حیات کو اُس سے نہ پوچھ تو
جس کے کہ دن قفس ہی میں گزرے بہار کے

سرمایۂ حیات تھے ثاقب ہزار حیف
یہ انقلاب چند، دلِ بے قرار کے

(۲)

مدد اتنی تو کر اے جذبۂ دردِ نہاں میری
تمنّا ہے وہ میرے مُنہ سے سُن لیں داستاں میری

غمِ دُنیا و دیں سے کیا تعلق میں وہ میکش ہوں
کہ ہے خاکِ شفا خاکِ درِ پیرِ مغاں میری

ادائے دلربا ہے اُن کی چشمِ مست کی گردش
سراپا شوق و حسرت ہے نگاہِ بے زباں میری

معاف اے ہمصفیرانِ قفس جرمِ نواسنجی
ابھی نا آشنائے ضبطِ اُلفت ہے فغاں میری

وہ محفل ہے کہ ثاقب امتحاں گاہ محبت ہے
نگاہِ فتنہ زا ان کی ہے جانِ ناتواں میری

سیّد ابو محمد ثاقب

تخیّل محبّت

شاہی خزانے میں چوری ہوچکی ہے، بادشاہ کو توال کو حکم دے رہا ہے کہ اگر چور جلد از جلد گرفتار نہ کیا گیا تو تیرا چراغ زندگی ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جائیگا اس عتاب آمیز شاہی حکم کو سُنکر پہرہ داروں نے گھر گھر چور کی تلاش شروع کی۔

شہر سے دُور ایک شکستہ مندر کے کھنڈر میں ایک غریب الوطن تاجر بحراسین بیخبر سو رہا تھا۔ وہ گھوڑوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اور اسی غرض سے کاشی آیا ہُوا تھا۔ مگر تمام مال چوری جانے کی وجہ سے ناکام۔ وطن واپس جانے والا تھا کہ شاہی پہرہ داروں نے چور سمجھ کر گرفتار کر لیا اور ہتھکڑی ڈالکر اُسے قید خانے کی طرف لے چلے۔

اس وقت خوبصورت شیامہ اپنی کھڑکی میں بیٹھی ہُوئی سڑک سے گزرتے والوں کی آمد و رفت کا تماشہ دیکھ دیکھ کر اپنا وقت گزار رہی تھی۔ اسے یہ مجمع خوابیدہ مسافروں کی ایک لہر معلوم ہو رہا تھا۔

یکایک وہ اپنی اس خیالی بسیرے سے چونک کر کہنے لگی۔

"خدا جانے یہ خوبصورت شخص جس نے مندر کے حسن کو بھی شکست دیدی ہے۔ سپاہی کیوں اسے اس طرح ہتھکڑی ڈالے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔"

یہ سوچکر اس نے اپنی خادمہ سے کہا۔ "جا اور میری طرف سے کوتوال سے کہہ کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس ہوتے جائیں۔"

کوتوال جو اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا۔ لڑکی کی زبانی شیامہ کا یہ پیغام سُنکر چونک پڑا۔ اس کے سارے جسم میں جذبات کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور فوراً قیدی کو اپنے ساتھ لئے ہُوئے شیامہ کے مکان کی طرف چلدیا۔ غریب بحراسین کا چہرہ شرم و ندامت سے جھکا ہُوا تھا۔

کوتوال نے مکان پر پہنچکر یوں کلام کی ابتدا کی۔ "معلوم نہیں آپ نے اس بیوقت مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ میں سرکاری کام میں مصروف ہوں اجازت دیجئے کہ رُخصت ہوں۔"

بحراسین جو اب تک شرم سے گردن جھکائے ہُوئے خاموش کھڑا تھا۔ یکایک سر اُٹھا کر کہنے لگا۔ "اے حسین عورت کیا کسی غریب الوطن اور بیگناہ مسافر کو اپنے گھر بُلانے کے بعد اس کے زخموں پر نمک چھڑکنا جائز ہے۔ اگر نہیں تو پھر یہ کس قسم کا مذاق ہے۔"

شیامہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "آہ اے بیگناہ پردیسی یہ تمہارے ساتھ کسی قسم کا مذاق نہ تھا۔ کاش میں اپنے زیورات

اور تمام روپیہ دیکر تمہارے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑی خود پہن سکتی۔ یقین کرو کہ تمہاری اس ذلّت کے احساس سے میرا دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔"

شیامہ نے یہ جملہ کچھ اس طرح ادا کیا۔ گویا وہ اپنے الفاظ اور آنسوؤں سے اس کی ذلّت کے داغوں کو دھونا چاہتی ہے۔

شیامہ نے کوتوال کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا۔ کہ "جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لیلو اور اس غریب قیدی کو چھوڑ دو۔" مگر کوتوال نے کہا کہ مجھے اپنی اس مجبوری پر افسوس ہے کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ شاہی خزانے کی چوری نے بادشاہ کی آتش غضب کو مشتعل کر دیا ہے۔ جو بغیر کسی انسانی خون کے نہیں بجھ سکتی۔"

یہ سُنکر شیامہ سنّاٹے میں آگئی اور عاجزی سے کوتوال کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔ "خیر اگر آپ اس کی جان نہیں بچا سکتے تو کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف دو دن تک آپ اسے قید میں رکھ سکیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس آخری التجا کو رد نہ کرینگے۔"

کوتوال نے سر جُھکا کر کہا۔ کہ میں آپ کے اس حکم کی تعمیل کرونگا۔

(۲)

ایک رات گزر جانے کے بعد دوسری رات کو جب شیامہ اپنے ہاتھوں میں چراغ لئے ہوئے قیدخانے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ بجراسین اپنی بیگناہی کا اظہار کر کے خدا سے تخفیف سزا کی دُعائیں مانگ رہا ہے۔

شیامہ نے یہ دیکھ کر محافظ کو اشارہ کیا جس نے فوراً بجراسین کی ہتھکڑیاں کھولدیں۔

قیدی نے حیرت سے شیامہ کے خوبصورت کنول جیسے چہرے کو دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آہ اس بدقسمتی کے تاریک لمحوں میں یہ کون ہے جو فرشتۂ رحمت بن کر نازل ہوا ہے۔ اے رحمدل اور میری محسن حسینہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آپ کے اس احسان کا شکر ادا کر سکوں۔

"میں اور" فرشتۂ رحمت "میں اور" رحمدل" یہ الفاظ تھے جنہیں بار بار دُھرا کر وہ ہنسی اور کوٹھڑی قہقہوں سے لبریز ہو کر اور بھی زیادہ مہیب معلوم ہونے لگی۔ دیوانگی اور خوف سے لبریز قہقہے اسی طرح بلند ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں کے عمیق سمندر میں غرق ہو گئے۔

اس نے اپنی آواز کو تیز کر کے کہا "ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس عظیم الشان عمارت میں ایک پتھر بھی ایسا نہیں جو شیامہ کے دل سے زیادہ سخت ہو یہ کہکر وہ بجراسین کو اپنے ساتھ لئے ہوئے باہر نکل آئی۔

جنگل کے مشرقی حصے میں برنا ندی کے کنارے جہاں

اشنان گھاٹ پر ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی طلوعِ سحر میں تبدیل ہو رہی تھی۔

خوبصورت عورت نے کشتی میں کھڑے ہو کر کہا میرے پردیسی اور عزیز مسافر آ اور دیکھ کہ شیامہ تیرے اور صرف تیرے لئے دُنیا کے تمام مضبوط سے مضبوط رشتوں کو توڑ کر اپنی قسمت کا لنگر ایک دریا اور ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر اُٹھا رہی ہے۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر کشتی کو گھاٹ سے کھول دیا۔

ندی کے دونوں طرف خوبصورت پرندے نغمہ سنجی میں مصروف تھے۔ مرد نے عورت کا سر اُٹھایا۔ اور اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگا "میری محسنہ مجھے بتاؤ۔ کہ میری رہائی کے لئے تم نے کسقدر کثیر رقم صرف کی ہے تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ یہ بے سروسامان انسان تمہارا کسقدر رہینِ منت ہے۔"

شیامہ نے اسے گلے لگا کر کہا میرے پیارے ابھی اس کے بتانے کا وقت نہیں آیا۔

پانی کی روانی اور ہوا کی تیزی سے کشتی سرعت کیساتھ ندی میں جا رہی تھی آفتاب اپنی منزل طے کر چکا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں نہا کر اپنے گیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی پانی کے گگرے لیکر اپنے اپنے مکانوں کو واپس جا رہی تھیں۔ صبح کا شور و غل عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا۔ دریا کے دونوں طرف کامل سکوت تھا۔ یہانتک کہ راستے میں بھی کوئی رہگیر دکھائی نہ دیتا تھا۔

پیپل کے نیچے پتھر کا بنا ہوا ایک مضبوط گھاٹ تھا۔ جہاں دونوں نے نہا کر کچھ کھانے کے لئے کشتی کو ایک سہارے سے باندھ دیا۔ بڑے اُونچے اور وسیع درختوں کا سایہ بتحیر ساکت تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس خاموش طلسم کو فاختہ کی "کو کو" توڑ دیتی تھی۔ دوپہر کی ہوا پختہ اناج کی خوشبو سے لبریز تھی۔ کہ دفعتاً شیامہ کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب اُلٹ گئی۔ اور بجرامین کے دل میں محبت کا دریا جوش مارنے لگا۔ اُس نے بھاری لیکن رُکتی ہوئی آواز میں جھک کر کہا۔

"حقیقت میں تم نے مجھے قید کی زنجیروں سے نجات دلا کر اپنے احسان کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ خُدا کے لئے مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ کہ تم نے مجھے اس قید کی رہائی سے کیونکر نجات دلائی ہے۔"

عورت نے شرم سے اپنا مُنہ آنچل میں چھپا کر کہا۔

"اے میری آرزوؤں کے مرکز ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اس کے متعلق میں تمہیں کچھ بتاؤں۔"

جب آفتاب کی سُنہری کشتی اپنا لنگر اُٹھا کر مغرب دور دراز ساحل پر چلی گئی تو شیامہ کی کشتی کو بھی نسیم کے جھونکوں نے ایک خوشگوار کنارے پر لگا دیا

۳

چاند مغرب کی تاریکی سے طلوع ہو رہا تھا۔ اُس کی دُھندلی روشنی خاموش پانی کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی

تھی گھنے درختوں میں چھائی ہوئی تاریکی جھینگروں کے بے پناہ شور سے بربط کے تاروں کی طرح لرز رہی تھی۔ چراغ بجھ گیا تھا۔ جنوبی ہوا تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اور شیامہ نوجوان کے ہاتھوں پر سر رکھے ہوئے گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اسکے حسین و معطر بال نوجوان کے زانو پر بکھرے ہوئے تھے شیامہ نے ایک کمزور آواز میں کہا۔ "میں نے جو کچھ تمہاری جان بچانے کے لئے کیا ہے۔ اگرچہ وہ بہت مشکل کام تھا لیکن اسکا تمہارے سامنے بیان کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ مگر نہیں اب وقت آگیا ہے۔ کہ میں نہایت اختصار کیساتھ تمہیں اس واقعہ کی تفصیل بتا دوں۔ لیکن میری محبت کا واسطہ کہ جب تم سن چکو تو اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے دل سے بھلا دینا۔

رتیا جو میرے حسن کا پرستار اور میری محبت میں دیوانہ تھا۔ اسی نے آہ اسی نے میرے ایک اشارے پر تمہاری چوری کا الزام اپنے سر لے لیا۔ اگرچہ یہ میری زندگی کا بدترین اور ناقابل معافی گناہ ہے۔ مگر میں خوش ہوں کہ یہ سب کچھ تمہاری حفاظت کے لئے کیا گیا ہے۔

چاند ڈوب چکا تھا جنگل کے درخت ہزاروں پرندوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ آخر کار بجراسین کے وہ ہاتھ جو شیامہ کی کمر سے لپٹے ہوئے تھے۔ ڈھیلے ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ ان دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل حائل ہو گئی۔

بجراسین خاموش ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ دفعتاً ایک مجروح جھینگر کی طرح شیامہ نے اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ اور گہری سیاہی تمام سطح آب پر پھیل گئی۔

بدبخت شیامہ جس کے آنسو تک خشک ہو چکے تھے۔ نوجوان بجراسین کے پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر کہنے لگی۔

"میرے پیارے میں نے جو کچھ تمہارے بچانے کے لئے کیا ہے۔ خدا کے لئے اسے معاف کر دو۔ میں خدا کے ہاتھوں سے اس گناہ کی سخت سے سخت سزا برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر تمہارے ہاتھوں سے کسی قسم کی سختی برداشت نہیں کر سکتی۔"

بجراسین نے اپنا پاؤں سختی کے ساتھ جھٹک کر چھڑا لیا اور غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "اے سیاہ کار عورت تجھے میری زندگی سے کیا واسطہ، آہ تو نے میری زندگی کو اپنے ناپاک مقصد کے لئے خرید کر تاریک کر دیا ہے۔

رات کی تاریکی میں کشتی کسی غیر معلوم سمت کو چلی جا رہی تھی۔ خشک پتے پاؤں کے نیچے دب کر کھڑکھڑا رہے تھے ہوا بند ہو گئی تھی۔ اور اونچے اونچے درختوں کے تنوں سے گویا ہزاروں وحشتناک شکلیں تمام جنگل میں پھیلی ہوئی تھیں۔

تھکا ہوا مسافر زمین پر بیٹھ گیا۔ باوجود تاریکی اور نزاکت کے شیامہ بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی جب بجراسین نے اتنی مسافت طے کرنے کے بعد بھی اسے اپنے

ساتھ ہی دیکھا تو نہایت خشمگین آواز میں چلّا کر کہنے لگا۔

" اے ناپاک عورت تو اب بھی میرے ساتھ ہے "

مگر شیامہ بغیر جواب دیتے ہُوئے بجلی کی تیزی کی طرح اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

اس کی آواز جس میں عاجزی و انکسار تھا۔ کانپ رہی تھی۔ وہ مجنونانہ بیخودی میں برابر کہہ رہی تھی۔ ہاں تم مجھے مار ڈالو اور میری سیہ کاریوں کی سزائیں دیدو۔ مگر مجھے اپنے قدموں سے علیحدہ کرنے کی کوشش نہ کرو "

جنگل کی چھائی ہُوئی تاریکی جو ستاروں کی روشنی سے محروم تھی۔ یکایک کسی نامعلوم غصّے سے لرزنے لگی۔ اور درختوں کی جڑیں خوف سے زمین میں ہل گئیں۔ کچھ دیر تک عورت کی منت اور عاجزانہ درخواست کی آوازیں آتی رہیں۔ مگر فوراً ہی ایک چیخ کے ساتھ کسی کے پتّوں میں گرنے کی آواز آئی۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

(۴)

جس وقت بجراسین جنگل سے گزر رہا تھا۔ اس وقت طلوعِ سحر کی مدھم روشنی گنگا کے دوسری طرف مندر کے عکس پر پڑ رہی تھی۔ اُس نے آج کا تمام دن گنگا کے اس ریتلے کنارے پر گزارا۔ جہاں سورج اپنی پوری تیزی کے ساتھ اس کے جسم پر چمک رہا تھا۔

گاؤں کی ایک دوشیزہ لڑکی جو پانی بھر کر واپس جا رہی تھی۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر کہنے لگی۔

" شاید تم کوئی مسافر ہو۔ اگر تمہارے رہنے کی یہاں کوئی جگہ نہ ہو تو میرا گھر تمہارے لئے شوق سے حاضر ہے۔ جہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ لیکن بجراسین نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، پیاس کی شدّت سے قریب تھا کہ اس کا دم نکل جائے۔ مگر اس نے اس بہتے ہُوئے دریا کا ایک قطرہ بھی نہ پیا۔

جب دن ختم ہو گیا تو اس کو اپنے جسم میں بخار کی سی تپش محسوس ہونے لگی۔ اور وہ مجروح طائر کی طرح کشتی میں پڑا ہُوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کشتی میں بستر پر صرف ایک ہی پازیب پڑی ہُوئی ہے جسے اُٹھا کر اس نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اگرچہ اس کی آواز تیر کی طرح اس کے سینے سے پار ہُوئی جاتی تھی۔

(۵)

پانچویں رات کا چاند سپتا پرنا کے درختوں سے طلوع ہو رہا تھا۔ اور بجراسین اپنے ہاتھوں کو جنگل کی طرف اُٹھائے ہُوئے کہہ رہا تھا۔

" آہ یہ کس حسنِ محبوب کا جلوہ ہے۔ جو اس جنگل کی خوفناک تاریکی میں دریا کے کنارے دکھائی دے رہا ہے آ۔ آ۔ اے میری محبّت آ "

ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ شیامہ دوڑتی ہُوئی آئی اور

اس کے قدموں پر سر رکھ کر کہنے لگی۔

" خدا کے لئے مجھے معاف کردو۔ اب مَیں اس محبّت کی کافی سزا پاچکی ہوں۔

بجراسین نے مشتاق نظروں سے شیامہ کی طرف دیکھا۔ اور وفور شوق سے مجبور ہوکر اسے اپنی آغوش محبت میں لینے کے لئے ہاتھ پھیلا دیتے۔ مگر فوراً جھجک کر کہنے لگا۔

" آہ! اسے گزشتہ گناہوں کی یاد تو پھر یہاں رہ گئی۔"

اور یہ کہہ کر اس نے اس کی پازیب اپنی بغل سے نکال کر ایک بھڑکتے ہُوئے شعلے کی طرح دور پھینک دی۔ اور اپنی آنکھیں بند کرکے شیامہ کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔

عورت خاموش ہوگئی۔ اور دو زانو ہوکر مرد کے پاؤں پر سر رکھ کر تیز بہنے والے دریا کے کنارے آہستہ آہستہ اس طرح غائب ہوگئی جس طرح یکایک آنکھ کھُل جانے کے بعد رات کی تاریکی میں خواب جذب ہوجاتا ہے۔

(ٹیگور)

سیّد ابو محمد ثاقب

غزل

دستِ نازک سے اُٹھایا کبھی ساغر رکھا ساقیِ بزم نے پیاسا مجھے شب بھر رکھا
پرسشِ فرطِ معاصی تھی ندامت انگیز اشکِ خجلت نے مجھے حشر میں بھی تر رکھا
پرسشِ حالِ دلِ زار تھی تمہید فغاں جوشِ گریہ تھا مری نوکِ مژہ پر رکھا
واقفِ رمزِ محبّت نے پئے رنجِ ملال نام ناکامیِ پیہم کا مقدّر رکھا
نامۂ شوق کے آنے کی مسرت۔ اللہ کبھی آنکھوں سے لگایا کبھی سر پر رکھا

مَیں ہوں سو جان سے قربانِ قناعت شامیؔ
اس نے غربت میں بھی شاکر مجھے اکثر رکھا

محمد معراج الدین شامیؔ

نغماتِ آزاد

محبت میں بقا میری محبت میں فنا میری
محبت ابتدا میری۔ محبت انتہا میری

جفاؤں پر جفائیں کر کہ مجرم ہے وفا میری
سزاؤں پر سزائیں دے کہ ثابت ہے خطا میری

نہ اب ربطِ دوا باقی۔ نہ اب خبطِ شفا میری
ترا غم ہی دوا میری۔ ترا غم ہی شفا میری

گلا ناحق جو ناخوش ہو۔ کوئی خوش ہو تو کیا خوش ہو
ادائے غم ادا میری۔ صدائے غم صدا میری

تری اُلفت مرا مذہب تری عظمت مرا مشرب
شریعت بھی جُدا میری طریقت بھی جُدا میری

رہینِ داد فرمایا۔ درست ارشاد فرمایا
نہ اُلفت ہی بجا میری۔ نہ کلفت ہی بجا میری

اُسی بیم و رجا میں ہوں اُسی دُہری بلا میں ہوں
وہی تو اور جفا تیری وُہی میں اور وفا میری

شہیدِ نازِ اُلفت ہوں قتیلِ رازِ وحدت ہوں
بقا میری فنا میری۔ فنا میری بقا میری

خوشا وہ دن کہ میرا درد تیرے دل میں پیدا ہو
خوشا وہ دن۔ کہ تیرے مُنہ سے نکلے التجا میری

ستم پرور! سماعت ہو تو صرف اتنی گزارش تھی
مجھے حکمِ سزا منظور۔ لیکن کچھ خطا میری؟

خوشی سے شکلہائے مختلف میں جلوہ فرما ہو
تمہیں لاکھوں میں پہچانے نگاہِ آشنا میری

محبت کے ستم دُنیا کے غم عقبیٰ کی تشویشیں
ہجومِ صد بلا ہے اور جانِ مبتلا میری

وُہی آزاد! تم ہو اور وہی دُنیائے آزادی
وہی میں اور وہی جانِ گرفتارِ بلا میری

آزاد انصاری

جلدباز

شام کو پانچ بجے فریبنڈ کمپنی کے دفتر کا دروازہ کھلا۔ اور ایک نوجوان سراسیمہ و پریشان باہر نکلا۔ اپنے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے میں چھتری لئے ہوئے وہ برآمدہ سے گذر کر زینہ کی طرف بڑھا۔ اور بیتابانہ نیچے اُترنے لگا۔ مسقف پیچدار زینہ اُس کے قدموں کی آواز بازگشت سے گونج اُٹھا۔

باہر نکلکر اُس نے کہرآلود فضا میں ان گاڑیوں کی لالٹینوں کی دھندلی روشنی دیکھی۔ جو کچھ فاصلہ پر کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ دیوانہ وار اُن کی طرف دوڑا۔ ایک گاڑی کے نزدیک پہنچکر اپنا اپنا سوٹ کیس کوچبان کے حوالہ کیا۔ اور خود بعجلت دروازہ کھولکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور کوچبان سے کہا " جلدی کرو۔ جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے "

گاڑی میں مقابل کی نشست پر ایک نوعمر حسین دوشیزہ سر سے پاؤں تک سمور کے لبادہ میں ملفوف خاموش بیٹھی ہوئی کسی گہرے خیال میں منہمک تھی۔ گاڑی انتہائی تیزی کیساتھ روانہ ہوئی۔ کھڑکیوں کے شیشے کہرسے ماند ہو رہے تھے اور راستہ کی لالٹینوں کی زرد دھندلی روشنی ان میں سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ دونوں مسافر اپنی اپنی جگہ ساکت وصامت بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ایک کو دوسرے کی طرف مطلق توجہ نہ تھی۔

نوجوان نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی اور دیا سلائی روشن کرکے وقت دیکھا۔ دیا سلائی کی رگڑ کی آواز سُنکر دوشیزہ اِدھر متوجہ ہوئی اور نوجوان کے چہرہ پر نظر پڑتے ہی وہ حیرت زدہ سی ہوگئی۔ اس کے چہرہ پر خوف و دہشت کے آثار چھا گئے۔ نوجوان نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ دیا سلائی جل بجھی۔ اُس نے جلدی سے دوسری دیا سلائی جلائی اور اپنے ہمراہی کے چہرہ کو بغور دیکھ کر بے اختیار چِلّا اُٹھا۔

"الہی خیر! میری بہن ——— ؟"

حسین دوشیزہ نے خوف آمیز لہجہ میں کہا "تم نے سخت غلطی کی۔ تم اس گاڑی میں کیوں سوار ہوئے؟ مہربانی کرکے گاڑی روکو۔ فوراً روکو۔ تم نے غلطی سے میری گاڑی کو اپنی سمجھ لیا۔ مَیں تو اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کر رہی تھی" مگر نوجوان نے گاڑی روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور دوشیزہ نے کانپتی ہوئی آواز سے پھر کہا۔ "گاڑی روکو۔ گاڑی روکو"

دوشیزہ کے اس مطالبہ نے نوجوان کو پریشان کردیا۔ مگر اس نے مستقل مزاجی سے جواب دیا۔ " مَیں گاڑی روک لوں؟

ہرگز نہیں۔ دُنیا میں کوئی شے مجھے ایسا کرنے کی ترغیب نہیں دے سکتی۔"

"نہیں تم کو گاڑی روکنی ہوگی۔"

"یہ تو ممکن نہیں۔ میرے پاس ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کے لئے نہیں۔ وقت بہت کم ہے۔"

"تو کیا تم گاڑی سے نہیں اترو گے؟"

"میں تم سے التجا کرتا ہوں ذرا صبر سے کام لو۔"

اتنے میں گاڑی کو یکایک ایک جھٹکا لگا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے اُوپر گر پڑے۔ نوجوان جلدی سے سنبھلکر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور دوشیزہ اپنی جگہ اور دونوں ایک دوسرے کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ گھوڑے اپنی پوری رفتار سے جا رہے تھے۔ دوشیزہ نے کھڑکی سے ہاتھ نکالکر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اور نوجوان نے اس سے ایسا کرنے سے باز رہنے کی درخواست کی۔ جس کے جواب میں اُس نے کہا۔ "بزدل" اور پھر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر وہ نہ کھُلا۔

"بزدل" کا لفظ سنکر نوجوان کا چہرہ سُرخ ہوگیا اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ نوجوان مرد تھا۔ حسین تھا۔ اور آج سے پہلے کبھی اپنی نسبت ایسا توہین آمیز لفظ نہ سنا تھا اُس نے کہا۔ "اگر میں بزدل ہوتا تو گاڑی کو روک کر اُتر جاتا۔ مجھے اپنی زندگی میں یہ پہلا واقعہ پیش آیا ہے۔ کہ ایک لڑکی نے مجھے حیران و پریشان بنا دیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو میری وجہ سے تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتیں۔ کہ مجھے بھی اپنی غلطی پر بیحد افسوس اور ندامت ہے۔ مجھے گاڑی سے اُترنے میں ہرگز تامل نہ تھا۔ اگر ایسا کرنے میں ایک نوجوان کی زندگی کے برباد ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ میری زندگی نہیں۔ اگر میرا ذاتی معاملہ ہوتا تو مجھے ذرا بھی پروا نہ ہوتی۔"

دوشیزہ نے ملامت آمیز انداز سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم کہتے ہو کہ تم کو جلدی ہے۔"

"ہاں حیرت انگیز اور پریشان کن جلدی۔"

"افسوس! مجھے بھی ایسی ہی جلدی ہے اور تمہاری حماقت کی ممنون ہوں کہ اب مجھے بغیر اپنے بھائی کے تنہا سفر کرنا پڑ گیا۔" یہ کہکر وہ خاموش ہوگئی اور تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد پھر نوجوان سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"تم جانتے ہو کہ یہ گاڑی کہاں جا رہی ہے؟"

"ہاں۔ کورٹ اسٹریٹ۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

مگر فوراً ہی نوجوان کو خیال ہوا کہ اُس نے تو صرف کوچبان کو جلدی چلنے کا حکم دیا تھا۔ منزل مقصود کا پتہ اس کو نہیں بتایا تھا۔ اس خیال کے دماغ میں آتے ہی اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ اور وہ کھڑکی کے گرد آلود دھندلے شیشوں سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اس کو معلوم نہ ہو سکا۔ کہ

گاڑی کس طرف جارہی تھی۔ اُس نے حسرت آمیز نظروں سے دوشیزہ کی طرف دیکھا اور اس کے چہرہ پر نفرت و کدورت نہ دیکھ کر اُس کو کسی قدر اطمینان ہُوا۔ اور جب اس کو معلوم ہُوا کہ وہ بھی کورٹ اسٹریٹ جارہی ہے۔ تو اس کا چہرہ بحال ہوگیا

"میرے خیال میں میری طرح تم بھی "عدن" کے ذریعہ سے سفر کرنا چاہتی ہو۔"

"ہاں — مگر میرا بھائی ! —— اللہ !

مَیں کیا کروں ؟ میرا ٹکٹ اور سفر خرچ تو میرے بھائی کے پاس ہے۔"

گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔ اور وہ رُک گئی۔ ایک قُلی نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور بیتابانہ چلّانے لگا۔

"عدن۔ عدن۔ خاتون ! جلدی' جلدی۔ پھاٹک بند ہونے والا ہے۔"

وہ دونوں جلدی سے گاڑی سے باہر آئے۔ اور قلی نے ان کا اسباب اُٹھالیا۔

دوشیزہ نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ "آہ ! مَیں کیا کروں ؟ میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں۔"

نوجوان نے کوچبان کو کرایہ دیتے ہُوئے جواب دیا۔

"کچھ پروا نہیں' میری بہن کا ٹکٹ میرے پاس موجود ہے۔"

قلی اسباب لیکر گھاٹ کی طرف دوڑا اور وہ دونوں بھی اس کے پیچھے جلد جلد روانہ ہُوئے جیسے ہی وہ جہاز پر سوار ہُوئے مسافروں کی نگاہیں اُن پر پڑنے لگیں۔ اور ایک شخص نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ " اہا ! ہمارا سفر بہت مُبارک ہے۔ اس حسین دوشیزہ کے ساتھ راستہ مزے سے کٹے گا۔ اور سفر کی تکان محسوس نہ ہوگی۔"

دونوں نووارد مسافر پہلو بہ پہلو کھڑے ہُوئے تھے۔ دوشیزہ جہاز کی پشت کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گویا اسکو کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ نوجوان اس کے پاس کھڑا ہُوا ' اپنے خیالات کو مجتمع کرنے اور اس سے سلسلۂ کلام شروع کرنے کی فکر میں تھا مگر جسقدر اُس نے غور کیا اسی قدر اس کی پریشانی میں اضافہ ہُوا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی عجلت پر افسوس کرتا اور دوشیزہ کی طرف دزدیدہ نظر سے دیکھتا رہا۔ اور پھر اسکو مخاطب کر کے تسلّی بخش لہجہ میں کہنے لگا۔ "تم فکرمند نہ ہو۔ میرے پاس میری بہن کا ٹکٹ ہے۔ جو تمہارے کام آسکتا ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب پریشان ہونے سے کیا حاصل ؟"

دوشیزہ نے کسی قدر رُکھائی سے جواب دیا۔ مَیں نے تو تم سے گاڑی روکنے کو باربار کہا تھا۔ لیکن تم ——"

نوجوان نے اس کے مُنہ کی بات چھین لی۔ "ہاں مَیں نے گاڑی نہیں روکی۔ لیکن اگر مَیں گاڑی روک لیتا تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی منزل مقصود تک نہ پُہنچ سکتا۔"

" غلط بالکل غلط۔ اگر تم میرا کہنا مان لیتے' تو مَیں

ٹھیک وقت پر گھاٹ پر پہنچ جاتی۔ اور میرا بھائی میرے ساتھ ہوتا۔ مگر اب تو میں بالکل بے دست و پا ہوں۔"

نوجوان نے تاسف آمیز نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ دوشیزہ بول اٹھی اور ملامت آمیز لہجہ میں کہنے لگی۔

"تم بڑے خودغرض معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا طرزِ عمل انتہائی خودغرضی پر مبنی ہے۔ اور تمہاری عقلمندی یا حماقت کی بدولت مجھے مجبوراً تمہارا احسانمند ہونا پڑیگا۔"

نوجوان نے ہمدردانہ طریقہ سے جواب دیا۔ "اوہ اصرف ایک ٹکٹ کا احسان کوئی بڑا احسان نہیں ہوسکتا۔"

دوشیزہ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور نوجوان نے تھوڑی دیر خاموش رہکر کہا۔ "کیا تم کمرہ میں چلنا پسند کروگی؟ یہاں تو بہت سردی ہے۔"

اس نے صرف اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی جذبہ سے متاثر ہوکر سرخ ہوگیا۔ اس نے مسافروںکے وہ الفاظ سن لئے تھے جو جہاز پر سوار ہونے کے وقت اس کی نسبت کہے گئے تھے۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کمرہ میں جاکر، جہاں کثرت سے مسافر بھرے ہوئے تھے اور کافی روشنی تھی۔ لوگوں کی نگاہوں کو دعوت نظارہ دے، اس کے لئے تاریکی اور سردی کی تکلیف برداشت کرنا زیادہ آسان تھا۔ بہ نسبت اس کے کہ کمرہ میں جاکر وہ مسافروں کو اپنے حسن پر تبصرہ کرنے کا موقع دے۔ اس کا چہرہ بالکل اداس اور پریشان تھا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرآتے تھے۔

نوجوان سخت پریشان اور مضطرب تھا۔ وہ اسکو تسلی دینے اور خوش کرنے کی تدابیر سوچتا رہا۔ مگر اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح اس کو اطمینان دلائے۔ آخر اس نے اپنے دل میں فیصلہ کرکے دوشیزہ سے مخاطب ہوکر کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری جلدبازی اور حماقت سے تم کو بیحد تکلیف پہنچی مگر کاش! تم کو میری مجبوری کا بھی علم ہوتا۔ میرا بھائی فلورڈا میں ایک ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اور مجھے اسکی مدد کے لئے جلد از جلد پہنچنا ضروری ہے۔ اگر یہ جہاز مجھکو نہ ملتا تو یقیناً اس کی زندگی برباد ہوجاتی۔ اگرچہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب بھی میں وقت پر پہنچکر اس کی مدد کرسکونگا۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت ناخوش ہو اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں تم کو خداحافظ کہوں۔ اچھا الوداع!

دوشیزہ نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔ "نہیں تم کہیں نہ جاؤ۔ تم کو معلوم ہے کہ میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں اگر تم مجھسے جدا ہوگئے تو یہ چھتیس گھنٹے کا طویل سفر بغیر آب و دانہ کے طے کرنا میرے لئے مصیبت ہوجائیگا۔ اور میری جان پر بن جائیگی۔ بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں۔ میں اس وقت ایک ناگہانی آفت میں مبتلا ہوں۔ میری عزت و آبرو معرض خطر میں ہے۔ کاش!

میرا بھائی میرے ساتھ ہوتا۔ خدا جانے مسافر ہماری نسبت کیا کیا گمان کرتے ہونگے۔"

نوجوان نے سنجیدگی کے ساتھ مگر بعجلت کہا "مسافروں کے گمان کی تم پروا نہ کرو۔ میں تم کو اپنی بہن مشہور کردونگا اور پھر کسی کو کسی قسم کا شک نہ ہوگا" لیکن دوشیزہ اب بھی مطمئن نہ ہوئی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ پریشان اور غمگین ہوگئی۔

اس اثنا میں ایک سیاہ فام حبشی سیاہ وردی پہنے ہوئے اُن کے نزدیک آیا۔ اور باادب سلام کر کے کہنے لگا۔ "کھانا تیار ہے۔ اگر آپ کچھ کھانا پسند فرمائیں تو کھانے کے کمرہ میں تشریف لے چلئے"

کھانے کے کمرہ میں مسافروں کی پوری توجہ انکی طرف مبذول ہوگئی۔ اور وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے اور ہنسنے لگے۔ اس وقت دوشیزہ بہت ہی برہم معلوم ہوتی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف مُنہ کئے خاموش بیٹھی ہوئی کسی گہرے خیال میں محو تھی۔ کھڑکی کا شیشہ رات کی تاریکی اور کہرے کی قلعی سے ایک آئینہ بن گیا تھا۔ جس میں ایک مضمحل و مضطرب حسینہ جلوہ فرما تھی۔

وہ دراصل حسین تھی۔ ایسی حسین کہ ادنے و اعلےٰ سب کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مسافروں میں ایک معمر پادری بھی تھا۔ جس کا چہرہ اور لباس اس کے زہد و اتقا کی کافی ضمانت تھا۔ مگر بایں ہمہ اُس کی برکت آمیز نظریں دوشیزہ کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔

کھانا چُنا گیا اور وہ بادلِ ناخواستہ دسترخوان کی طرف متوجہ ہوئی۔ نوجوان اس کے مقابل سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نوجوان نے سر اُٹھایا اور دوشیزہ نے بھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور وہ مسکرائے۔

"تم کیا خیال کر رہے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ شاید تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

"ہاں، غالباً"

"اور شاید اب میں تمہاری نظر میں بزدل اور خودغرض بھی نہیں۔"

"غالباً نہیں"

نوجوان مسکرایا اور کہنے لگا۔ "اگر شہر میں کسی دوسرے سلسلہ سے، مجھے تم سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست نہ بن جاتے"

"بیشک کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی۔"

"اچھا اگر بار خاطر نہ ہو تو میں تم کو اپنے اس سفر کا مقصد ذرا تفصیل سے بتاؤں۔ کیا تم سُننا پسند کروگی؟"

دوشیزہ نے سر کے اشارہ سے اپنی رضامندی کا

اظہار کیا اور نوجوان نے اس طرح سلسلہ کلام شروع کیا۔

"شام مجھے اپنے چھوٹے بھائی کا تار ملا جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے حسب ونسب کا کچھ حال ہم کو معلوم نہیں۔ میں اس بیوقوف جلد باز نوجوان کو اس کے ارادہ سے باز رکھنے کے لئے فلورڈا جا رہا ہوں۔ والدین مکان پر موجود نہ تھے۔ اس لئے مَیں نے اور میری بہن نے بعجلت سامان سفر درست کر کے فوراً روانگی کا ارادہ کر لیا۔ وہ مجھ سے پہلے روانہ ہوئی تاکہ گاڑی کا انتظام کر سکے۔"

دوشیزہ نے دریافت کیا۔ "اس لڑکی کا نام کیا ہے؟"

"میری ریڈمنڈ"

"میری ریڈمنڈ! وہ تو میری بہن ہے۔"

"ایں تمہاری بہن!"

دونوں حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

دوشیزہ نے کہا "کیا تماشا ہے! مجھے بھی شام میری بہن کا تار ملا، وہ ایک نوجوان جیمس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور مَیں اس کو اس مصیبت سے بچانے کے لئے جا رہی ہوں۔ مَیں اس کو اس کے لئے مصیبت اس لئے سمجھتی ہوں۔ کہ جیمس کے متعلق ہم کو کچھ واقفیت نہیں ہے۔ اُسکے خاندان اور حالات سے بالکل ناواقف ہیں۔"

نوجوان نے کہا "جیمس ہی تو میرا بھائی ہے۔ عجیب واقعہ ہے۔ بالکل عجیب!"

دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔ اُن کے قہقہوں سے کمرہ گُونج اُٹھا۔ اور مسافر حیرت واستعجاب کے ساتھ ان کی طرف دیکھنے اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

نوجوان نے کہا۔ "جلد بازی تو ہمارے خاندان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ میرے دادا نے دادی سے متعارف ہونے کے بعد تیسرے دن اور والد نے والدہ سے متعارف ہونے کے بعد دوسرے ہی دن شادی کر لی تھی۔ اب میرا جلد باز بھائی ایسی لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔ جس سے وہ صرف کل ملا ہے۔"

دوشیزہ نے مسکرا کر پوچھا "خیر اب یہ بتاؤ کہ کیا تم اپنے بھائی کو اس کے ارادہ سے باز رکھوگے؟"

"ضرور، مگر مَیں سمجھتا ہوں کہ جیمس اسقدر جلد باز اور ضدی ہے کہ شاید مَیں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکوں۔"

دونوں خاموش ہو گئے اور ہر ایک اپنے اپنے خیال میں محو ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد نوجوان نے کہا "کیا تمہاری بہن بالکل تمہاری جیسی ہے؟"

"ہاں، صرف مجھ سے ایک سال چھوٹی ہے اور تمہارا بھائی؟"

"وہ بالکل مجھ جیسا ہے، البتہ مجھ سے عمر میں ایک سال چھوٹا ہے۔"

"خوب! تو کیا تم ان دونوں کو ایکدوسرے کا رفیقِ زندگی نہ بننے دو گے؟"

"نہیں، وہ اپنا ارادہ پورا کر سکتے ہیں بشرطیکہ تم اس کی مخالفت نہ کرو۔ اور اپنی بہن کو اجازت دیدو۔"

"اچھا، میں اس کو منع نہ کرونگی۔"

نوجوان کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ دوشیزہ کی طرف جھک گیا۔ اور کہنے لگا۔

"تم بڑی اچھی لڑکی ہو، تم بہت حسین ہو، آج سے پہلے کوئی ایسی حسین لڑکی میری نظر سے نہیں گزری ——— اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرلو۔ تو یقیناً تم مجھے دیوانہ نہ سمجھوگی، کیوں؟"

دوشیزہ حیرت زدہ ہو کر نوجوان کا منہ تکنے لگی۔ اُس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اور سرنگوں ہو کر ایک گہرے خیال میں ڈوب گئی۔

نوجوان نے کہا۔ "کیا تم ناخوش ہو؟"

اُس نے صرف اپنا سر ہلایا۔ ایسے انداز سے کہ نہ اقرار سمجھا جا سکتا تھا اور نہ انکار۔

مسافروں کا ایک گروہ کھانے سے فارغ ہو کر میز سے اٹھا۔ اور ہنستا ہوا ان کے پاس سے گزر گیا۔ مگر ان دونوں کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ وہ اپنے سوائے دُنیا و مافیہا سے بالکل بیخبر تھے۔

نوجوان میز پر کہنیاں ٹیک کر اور دونوں ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ کر دوشیزہ کی طرف جھک گیا اور کہنے لگا۔ "دیکھو مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہیں دل سے پیار کرتا ہوں لیکن پھر بھی میں نہایت صفائی اور دیانتداری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کر سکتا ہوں کہ اگر تمہاری بہن میرے بھائی کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ نہ رکھتی تو میں کبھی تم سے شادی کی درخواست نہ کرتا۔"

دوشیزہ نے آہستگی سے جواب دیا۔ "درست ہے۔"

نوجوان نے جلد جلد اپنی سرگزشت حیات مختصر الفاظ میں بیان کرنی شروع کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک طالب علم اپنا آموختہ فرفر سُنا رہا ہے۔ دوشیزہ کچھ دیر تک خاموش سر جھکائے ہوئے اُس کی رام کہانی سُنتی رہی۔ اور آخر اُس بے محل طویل گفتگو سے اُکتا کر بولی۔

"تم مجھے اپنے حالات کیوں سُنا رہے ہو؟"

"اس لئے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور میری شریک زندگی بننے سے پہلے تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم میرے حالات سے بخوبی واقف ہو جاؤ۔"

"تم کب شادی کرو گے؟"

"ابھی"

"ابھی!"

"ہاں ابھی، مَیں اس زرّیں موقعہ کو کبھی ضائع نہ ہونے دُونگا۔ مجھے امید تھی۔ کہ ایک نہ ایک دن مَیں کسی کے دامِ محبّت میں ضرور گرفتار ہوجاؤنگا۔ اور آج تمہاری محبّت کا جادو مجھ پر چل گیا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ مَیں اپنی دیرینہ امید کا خُون ہونے دوں۔ انسان زندگی میں صرف ایک بار محبت کر سکتا اور کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے آج وہ موقعہ میرے ہاتھ آگیا ہے کیا تم کو میری محبّت میں شک ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"تو پھر ہم کو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہیئے۔"

"مَیں کیا کروں؟"

"صرف عہدِ محبت"

"تو کیا تم عہدِ محبت اور ایفائے عہد کرنے کے لئے تیار ہو؟"

"بیشک۔ مَیں عہد کرتا ہوں کہ زندگی بھر تمہاری محبّت کا دم بھرونگا۔ کیا تم بھی میری محبت کا اقرار کروگی؟"

دوشیزہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا اور سر جُھکا کر آہستگی سے کہا۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔"

راز چاندپوری

جذباتِ احسن

زندگی سوزِ نہانی کے سوا کچھ بھی نہیں
اس جہاں میں جانستانی کے سوا کچھ بھی نہیں

ہم نے دیکھے غور سے سب رنگِ تصویرِ حیات
زندگی اِک نقشِ فانی کے سوا کچھ بھی نہیں

ڈھونڈتی ہیں بلبلیں بُوئے وفا لیکن کہاں
ان گلوں میں دلستانی کے سوا کچھ بھی نہیں

صبح ہو یا شام، ہے پیہم دواں دائم رواں
موجِ ہستی میں روانی کے سوا کچھ بھی نہیں

کاش تو سمجھے ذرا اے عندلیبِ خوش نوا
خندۂ گل خونچکانی کے سوا کچھ بھی نہیں

احسنؔ نالاں دیارِ عشق میں غم کا علاج
ایک مرگِ ناگہانی کے سوا کچھ بھی نہیں

احسن علوی

چاند

دیکھو دیکھو یہ کیا یہ کیا تاریکی میں نور یہ کیا
شاہدِ رعنا۔ ماہ دو ہفتہ حجلۂ شب سے باہر نکلا

چہرہ کچھ کملایا سا ہے
جیسے ابھی سو کر اُٹھا ہے

یہ تھوڑی سی کملاہٹ بھی کاش اگر زائل ہو جاتی
پھر تو غضب ڈھاتی شکل اس کی بھولی بھولی پیاری پیاری

لو وہ اُبھرا لو وہ نکھرا
کیا صورت ہے سبحان اللہ

نور کا ٹکڑا نور کا بقعہ نور کا چشمہ نور کا دریا
نور کی بستی نور کی دُنیا نور سراسر نور سراپا

مظہرِ یکتائے نورِ حق
طورِ تجلّی نورِ مطلق

الھڑ متوالا البیلا ہوش نہیں جس کو سر و پا کا
چلنا آہستہ آہستہ جیسے کوئی از خود رفتہ

اف یہ تیری مستانہ خرامی
یہ رعنائی یہ پندرامی

آرائش کا شوق ہے کیسا سامنے ہے آئینہ دریا
حُسن سے اپنے جی نہیں بھرتا دیکھے ہی جاتا ہے آئینہ

ہائے یہی ان کی عادت ہے
میرے لئے تو بھی آفت ہے

یاد ہے کچھ اے چاند وہ نقشہ اِک شب میں اور وہ بت ترسا
آتے تھے یاں برلبِ دریا اور اُلفت کا عہد کیا تھا

محرم رازہمارا ہے تُو
اس لئے مجھ کو پیارا ہے تُو

فطرت کی دُلہن نے پہنا نور کا گہنا نور کا جوڑا
حسن قیامت زا نیچر کا ہر شے سے پھوٹا پڑتا تھا

نور میں سطح آب کی چادر
تھی گویا سیماب کی چادر

ٹوٹتے تھے رہ رہ کر تارے نور کے چھٹتے تھے فوارے
ہر شے مست خوشی کے مارے خشک و تر خنداں تھے سارے

ہر قطرہ دریائے تبسّم
ہر ذرّہ دُنیائے تبسّم

چھیڑ وہ لہروں سے کرنوں کی لہروں کا شوق اور بیتابی
باہمدگر کھینچا تانی مستی میں وہ ہاتھا پائی

کیا کہوں کیا کیا یاد آتا تھا
دِل بیتاب ہُوا جاتا تھا

عندلیب شادانی بی۔اے

عاقبت بخیر

ارکانِ ڈراما

عسکری مرزا، امراؤ مرزا ۔۔۔۔۔۔ ناکام عشاق	قمرن جان ۔ ادا ۔۔۔۔۔۔۔ دختر مچھو خاں
نواب سرشت الدولہ زعفران زار جنگ بدر قطانوی ۔ المعروف ممن ۔ ملازم عسکری مرزا	لاڈو خانم ۔ نزاکت ۔۔۔۔۔۔ برادر زادی مچھو خاں
معصفر نواز جنگ قاقلہ قنبی المعروف بدھن ۔۔۔ ملازم امراؤ مرزا	گویّے وغیرہ
مچھو خاں ۔۔۔۔۔۔۔ والد قمرن	مقام ۔۔۔۔۔۔ دہلی
منظور ۔۔۔۔۔ خادم قمرن	پوشاکیں ۔۔۔ دہلی والوں کی
	وقت ۔۔۔۔۔۔ آجکل

سین

ایک مکمل طور پر آراستہ کمرہ مگر نشست کا کوئی سامان نہیں

پردہ اُٹھنے پر قمرن اور لاڈو کرسیوں پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی ہیں۔ سٹیج کے ایک سرے پر قمرن کی اور دوسرے پر لاڈو کی کرسی ہے۔ عسکری قمرن کے پاس اور امراؤ لاڈو کے پاس کھڑا ہے

عسکری ۔ پورا گھنٹہ ہونے کو آیا۔ مگر آپ نے چھوٹے مُنہ سے کچھ نہ فرمایا۔

قمرن ۔ اُونٹ بڈھا ہوگیا۔ مگر اسے بیٹھنا نہ آنا تھا۔ نہ آیا۔

(کرسی سرکاتی ہے)

امراؤ ۔ زبان کہتے کہتے سوکھ گئی۔ ٹانگیں کھڑے کھڑے شل ہوگئیں۔ مگر میرے سوال کا جواب نہ ملا۔ اگر چندے

یہی حالت رہی تو سمجھ لیجیے۔ کہ میرا کام تمام ہے

لاڈو ۔ بندی کا اس عجلت اور زود پسندی کو دور ہی سے سلام ہے (کرسی سرکتی ہے)

قمرن ۔ زود پسندی اور دور۔ واہ سبحان اللہ۔ روانیٔ طبیعت اسی کا نام ہے۔

لاڈو ۔ آداب۔ تسلیم

(دونوں کھڑی ہو کر دیر تک آداب بجا لاتی رہتی ہیں)

عسکری ۔ یہ ڈراما میں نے جی بھر کر دیکھ لیا ہے۔ اب کہو۔ مجھے فرزند— مطلب یہ کہ غلامی میں قبول....

قمرن ۔ چل بے مجہول (کرسی سرکتی ہے)

امراؤ ۔ خلاصہ کہہ ڈالیے نا۔ میری عرض منظور ہے۔

لاڈو ۔ عرض کو طول دینا محض بیکار ہے۔ جب جوہر نہ ہو۔ عرض جسم بے جان ہے۔ نوج اتنا نہیں جانتے نسوانیت حسن تکلم پر قربان ہے (کرسی سرکتی ہے)

قمرن ۔ ماشاءاللہ کیا پھول جھڑتے ہیں آپ کے منہ سے عرض طول۔ جوہر عرض۔ نسوانیت حسن۔ جان قربان واہ واہ وا۔

(عسکری۔ امراؤ مڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے قمرن۔ لاڈو بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کو جھک جھک کر سلام کرتی۔ کرسی سرکاتی اندر چلی جاتی ہیں)

عسکری ۔ ایک دفعہ اور۔

امراؤ ۔ فی الفور۔

(مڑتے ہیں۔ کوئی دکھائی نہیں دیتا)

عسکری ۔ کیا سمجھے۔

امراؤ ۔ صرف اتنا۔ کہ دو اوڑھنیوں نے دو دستاروں کی پگڑی اچھال دی۔ اور بس

(ہنستا ہے)

عسکری ۔ دانت نکالنے کا کون محل ہے یہ۔ ذرا متانت سے گفتگو کرو۔

امراؤ (منہ بنا کر) متانت ہی لیجیے۔

عسکری ۔ بری ہوتی۔

امراؤ ۔ کوئی سنیگا تو کیا کہیگا۔

عسکری ۔ میرا تو ڈوب مرنے کو دل چاہتا ہے۔

امراؤ ۔ اور میرا دل زندہ رہنا چاہتا ہے کہ اس حماقت کی یہی سزا ہے۔

عسکری ۔ سیدھے منہ بات تک نہ کی۔

امراؤ ۔ بیٹھنے کو کرسی تک نہ دی۔

عسکری ۔ کوئی کسی کمینہ سے یہ سلوک نہیں کرتا۔

امراؤ ۔ کوئی کسی پاجی سے یوں کلام نہیں کرتا۔

عسکری ۔ سزا دینے کو دل چاہتا ہے۔

امراؤ ۔ بشرطیکہ کوئی ایسا قانون پاس کرا دے۔

عسکری (ایک طرف دیکھ کر) دیکھو میرا ذکر من۔

امراؤ (دوسری طرف دیکھ کر) اور دیکھو میرا بدھن۔
عسکری۔ دونوں شاعری کا دم بھرتے ہیں۔
امراؤ۔ اپنی زباندانی اور لیاقت پر مرتے ہیں۔
عسکری۔ ان دونوں سے یہ کام نکلیگا۔

(ممن اور بدھن داخل ہوتے ہیں۔ ایک طرف سے ممن۔ دوسری طرف سے بدھن۔ ممن کے گلے میں ایک تختی پڑی ہے جو پیٹ کے وسط تک پہنچتی ہے۔ اس تختی پر موم بتی جل رہی ہے۔ اور ایک کتاب کھلی ہے۔ ممن نے چشمہ لگایا ہے۔ اور پڑھ رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں برش اور دوسرے میں بوٹ ہے۔ وہ بھی صاف کئے جارہا ہے۔

بدھن بھی اسی طرح ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے میں شلغم ہے۔ اسے چھیل رہا ہے)

عسکری۔ دیکھو ممن۔
ممن۔ قبلہ حاجات۔ باعث نجات۔ ارشاد صادر فرمایئے۔ اس جاں نثار کی سرفروشی ملاحظہ فرمایئے۔ زمین شعر کو آسمان۔ ذرے کو مہر تاباں۔ حیوان کو انسان بنانا میرا کام ہے۔ کیونکہ بندہ ایک شاعر شیریں کلام مطرب خوش الحان ہے۔ ابھی ابھی ایک رباعی ہوئی ہے۔ معرفت اور مجاز کی جنگ ہے۔ جناب عرض کیا ہے

زاہد ہوکر جو شغل مے چھوڑ دیا
اللہ رے فساد خون بدن چھوڑ دیا
فریاد ہے مجھ شکستہ دل کی یا رب
توبہ کی دوستی نے مجھے توڑ دیا

امراؤ۔ دیکھو بدھن
بدھن۔ اے باعث نشو ونما۔ دارو ے درد بے دوا۔ در کلام کو کشتی نطق میں غلطاں دیکھنے کا انتظار ہے۔ بیابان حماقت کو نسیم فراست سے پریشان دیکھنے کا انتشار ہے۔ جناب جوش سلمہ نے اپنے دو اشعار میں وجدانیات۔ جمالیات۔ ذہنیات۔ حیات و اہیات کو بند کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اہا ہا کس شان سے فرماتے ہیں۔۔۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

مرے کمبخت پہلو میں انی بھالے کی رہنے دو
تڑپ بجلی کی ہونے دو۔ ٹپک چھالے کی رہنے دو
نہ یوں ساز طرب چھیڑو۔ فلک تک جس سے گونج اٹھے
فضا میں غافلو کچھ تو جگہ نالے کی رہنے دو

عسکری۔ سنو ممن۔ بدھن۔ آج تمہاری لسانی اور زباندانی کا امتحان ہے۔ یہاں دو لڑکیاں ہیں۔ جو بہت دُون کی لیتی ہیں۔ اگر انہیں اپنی فصاحت سے رام کرو۔ تو بڑا کام کرو۔ ہدایتیں لکھ لو۔ اور باقی تمہاری طبیعت۔
ممن۔ حاضر۔ مگر جناب کپڑے
عسکری۔ ہمارے لیلو۔
بدھن۔ جناب۔ ڈاڑھی کے لئے خضاب
امراؤ۔ میرے استروں سے اڑادو۔

(ممن۔ بدمن جاتے ہیں۔ مچھو خاں داخل ہوتا ہے)

مچھو خاں۔ حضرات۔ آپ نے قمرن اور لاڈو سے ملاقات کی۔ کہئے کیسی گزری۔

عسکری۔ انہیں سے پوچھئے۔

امراؤ۔ ہم فقط آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

(عسکری ایک طرف اور امراؤ دوسری طرف سے چلے جاتے ہیں)

مچھو۔ الٰہی خیر۔ یہ تو کچھ کھوئے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں دریافت کرنا چاہئے۔ آخر انہیں ہوا کیا۔ ارے کوئی ہے۔

(منظور آتا ہے)

منظور۔ اپنے کو آپ نے پکارا۔

مچھو۔ بیگمات کہاں ہیں۔

منظور۔ سنگار گھر میں براج رہی ہیں۔ جمور۔ ہونٹوں کو جلانے کے لئے ٹھنڈی آگ بناتی ہیں۔

مچھو۔ سرخی۔ غازہ۔ سرمہ بس دن بھر یہی کام۔ بلاؤ انکو

(منظور جاتا ہے۔ قمرن اور لاڈو آتی ہیں)

مچھو۔ اُن شرفا سے کیا سلوک کیا۔ جو وہ بھاگتے نظر آئے تم سے مَیں نے کہا تھا۔ کہ اُن سے باخلاق پیش آنا تاکہ وہ شادی پر رضامند ہو جائیں۔

قمرن۔ ابّا۔ کیا آپ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ ایسے بدتمیزوں کو مُنہ لگائیں۔

لاڈو۔ ابّا۔ کیا کسی سمجھدار لڑکی سے یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ انہیں آنکھ بھر کر دیکھنا بھی گوارا کرے۔

مچھو۔ آخر ان میں کیا عیب ہے۔

قمرن۔ عجب بے ہنگم انسان ہیں۔ چھوٹتے ہی شادی کا پیغام ہے۔

مچھو۔ تو انہوں نے کیا بُرا کیا۔ نہایت شریفانہ طریق سے دعوت ازدواج دی۔ اور تم جیسی ناچیزوں کو بیاہنے پر آمادہ ہو کر میری اور تمہاری عزت افزائی کی

قمرن۔ ابّا۔ معاف کرنا۔ یہ الفاظ زبان پر لاکر آپ اپنے بیہودہ پن کو طشت از بام کر رہے ہیں۔ آپ کو اس طرح سرگرم تکلم دیکھ کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ رہا ہے۔ اب شہر میں آئے ہو تو ذرا تہذیب سیکھو۔

مچھو۔ بس بس۔ تہذیب دہذیب رہنے دو۔ شادی ایک مقدس پیمان ہے۔ اور اُنہوں نے جو کچھ کیا نہایت شریفانہ تھا۔ اور مجھے ازبس پسند ہے۔

قمرن۔ اگر دُنیا آپ جیسی گنوار ہوتی۔ تو محبت کی دلبستگیاں ختم ہو جاتیں۔ اور لیلےٰ مجنوں۔ وامق عذرا اور ہیر رانجھا کا قصہ لٹریچر سے خارج ہو جاتا۔

مچھو۔ سڑن ہو گئی۔ ہو گیا۔ کوئی ٹھکانے کی بات کرو۔

لاڈو۔ میری بہن کا مجھ سے اتفاق ہے کہ شادی بغیر

کسی نچلے پن کے ناروا ہے۔ جو مرد شادی کا خواہاں
ہو۔ اسے جاننا چاہیے۔ کہ ٹھنڈی سانسیں کیسے
بھرتے ہیں۔ نالہ گردوں شگاف کسے کہتے ہیں۔
اور بلند بانگ وعدے وعید کس طرح ہوتے ہیں۔

قمرن۔ ہر بات کا ادب قاعدہ بندھا ہے۔ اور شادی کے
یہی مقبول عام اصول ہیں۔ پہلے کہیں دُور دُور سے
آنکھیں لڑیں۔ پھر تعارف ہو اور میل ملاقات کی
راہ کھُلے۔

لاڈو۔ اور مرد کوئی ایسا عظیم الشان کام کرے۔ کہ تمام
عالم نسواں ہمہ تن تحسین بن جائے۔

قمرن۔ اس کے بعد مرد کسی باغ کی پرسکون خلوت میں اپنی
محبت کا اظہار کرے۔

لاڈو۔ ہم اس پر فوراً بگڑ کھڑی ہوں۔ اور کچھ دنوں کے لئے
وہ مرد ہمارے یہاں باریاب نہ ہو سکے۔

قمرن۔ پھر وہ ہمیں منانے کی کوشش کرے۔ اور آہستہ
آہستہ وحشی طبیعت کو اپنے جذبات کا متحمل بنائے
اور ہمیں بادل نخواستہ شادی کے اقرار کرنے پر
آمادہ کرے۔

لاڈو۔ پھر ایک رقیب پیدا ہو۔ اور چندے رقابت
کی آگ بھڑکے۔

قمرن۔ جب یہ مرحلے طے ہو تو والدین شادی پر رضامند
نہ ہوں۔

لاڈو۔ اور لے بھاگنے تک نوبت آجائے۔

قمرن۔ جب اتنے پاپڑ بیلے جائیں۔ تو

لاڈو۔ کہیں شادی ہو تو ہو۔

مچھو۔ یہ بیہودہ گفتگو ہے۔ شریفوں میں شادیاں ایسے
نہیں ہوتیں۔

قمرن۔ نہیں تو ایسے ہوتی ہیں۔ کہ جس نے آکر سوال کیا
بیٹی کو اس کے بھیک کے ٹھیکرے میں ڈال دیا۔
آپ جیسے ناعاقبت اندیشوں نے ذی علم اور پُروقار
خواتین کو بازاروں کی مٹھائی بنا رکھا ہے۔ ان کا مُنہ
تھا ہم سے شادی کا سوال کرنے کا؟ غضب خدا کا
نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ کپڑے پہننے کا قرینہ چلے
میاں فضیحتا جورو بیاہ لانے کو۔

مچھو۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ دہلی میں آکر تمہارا سر پھر گیا ہے۔
قسم لے لو۔ جو کچھ بھی سمجھا ہوں۔ کہ کیا کہہ رہی ہو۔
لاڈو اور قمرن خوب کان کھول کر سنو۔

قمرن۔ معاف کرنا ابّا۔ ہمیں پھر ان ناموں سے نہ پکارنا۔
جن میں ادبیت نام کو نہیں۔ یہ دقیانوسی نام ہمیں
پسند نہیں۔ جو تخلص کے کام نہیں آسکتے۔

مچھو۔ کیا اب اپنے نام بھی تمہیں پسند نہیں۔ تو پھر تمہیں
کس نام سے پکارا جائے۔

قمرن۔ مجھے "ادا" کہتے اور انہیں "نزاکت"

لاڈو۔ یہ ہمارے تخلص ہیں اور مہذب سوسائٹی کا ہر رکن تخلص ہی سے یاد کیا جاتا ہے۔ نام لینے سے گنوارپن کی جھلک آتی ہے۔

مچھو۔ یہ تمام بک بک۔ جھک جھک فضول ہے۔ مَیں دو لفظوں میں فیصلہ کئے دیتا ہوں۔ مَیں تمہیں کوئی اور نام نہ رکھنے دُونگا۔ اور تمہیں ان سے شادی کرنی پڑیگی۔ خدا غارت کرے ان ٹکیل تھیٹروں اور آنہ سیر ناولوں کو جنہوں نے بچوں کے اخلاق کو تباہ کر ڈالا۔

(جاتا ہے)

لاڈو۔ بہن تمہارے ابّا کو کیا ہو گیا۔ سمجھ کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ پتھر پڑ گئے ہیں۔ بچارے کی عقل پر۔

قمرن۔ اب مَیں کیا کہوں۔ اب سے دُور انہیں ابّا کہتے لاج آتی ہے۔ باور نہیں آتا کہ مَیں ان کی بیٹی ہوں۔ شاید کسی سے مانگ کر لیا ہو۔ بہن دیکھ لینا۔ ایک دن دُنیا پر ظاہر ہو جائیگا کہ مَیں کسی بلند پایہ ادیب کی بیٹی ہوں۔

لاڈو۔ عین ممکن ہے۔ اور جب مجھے یہ خیال۔

(منظور آتا ہے)

منظور۔ ایک آدمی باہر کھڑا ہے۔ پُوچھتا ہے۔ ملنے آؤں۔ اور یہ کاغذ دیا ہے۔

لاڈو۔ ابھی تک بات کی تمیز نہ آئی۔ گدھا کہیں کا۔ یوں کہنا تھا۔ ایک صاحب تشریف لاتے ہیں" یا صاحب نے تشریف ارزانی فرمائی ہے۔ یا قدم رنجہ فرمایا ہے اور یہ کارڈ پیش کرتے ہیں۔

منظور۔ بیگم۔ مَیں شاعر نہیں، جو ایسی باتوں سے سر پھراؤں مَیں گدھا کمہار کا مجھے رام سے کام۔

لاڈو۔ اچھا۔ کارڈ لا۔ (کارڈ لیکر) باجی نواب سرشت الملک زعفران زار جنگ بدر قطانوی

قمرن۔ نواب اور ادیب۔ دیکھتی ہو۔ بدر تخلص قطانوی کنیت

لاڈو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ادیب ہمارے علم و فضل کی شہرت سُن کر آیا ہے۔ آؤ جھٹ پٹ بال سنوارلیں۔

منظور۔ جلد ہمارا مشیر حسن لاؤ۔

منظور۔ یہ کس جانور کا نام ہے۔ اب بندوں کی سی باتیں کرو۔ تو کوئی کچھ سمجھے۔ یہ فارسیاں کون بوجھے۔

قمرن۔ کمبخت ہما۔ آئینہ اُٹھا لا۔

منظور۔ آئینہ کیا کریگا۔ کیا شکل بدل دیگا۔ بانو اب اِسی شکل پر گزارہ کرو۔ دن اچھے آئینگے تو کوئی ٹوٹا پھوٹا خاوند بھی منظور کر ہی لیگا۔

لاڈو۔ بڑا بیہودہ ہے۔ جا دو کرسیاں اُٹھا لا۔ اور پھر نواب صاحب کو بُلا لا۔

(منظور جاتا ہے۔ دو کرسیاں لاتا ہے۔ اور دونوں بیٹھ

جاتی ہیں۔ پھر منظور چلا جاتا ہے)

(ممن آتا ہے۔ فرشی سلام کے بعد)

ممن۔ خواتین والاشان کو اس خاکسار ذرۂ بیمقدار کی اس جسارت ناہنجار پر حیرت گوناگوں اور تعجب بوقلموں تو ضرور ہوا ہوگا۔ کہ ناخواندہ مہمان کہاں آکودا ہے۔ مگر اس کا ذمہ دار آپ کا حسن سیرت وصورت ہے۔ کہ آپ کو اس ہیچمدان سے ملاقات کی زحمت اُٹھانا پڑی۔ سعدی فرما گئے ہیں ہر کجا چشمہ بود شیریں وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ

(جھک کر سلام عرض کرتا ہے اور "وغیرہ" رٹے جاتا ہے)

لاڈو۔ اگر آپ کو حسن ذہنی کی تلاش ہے۔ تو وہ اب تک اس مکان میں عنقا تھا۔

قمرن۔ اور ابھی ابھی آپ کی ذات کے ساتھ آیا ہے۔

ممن۔ اس زرّیں رائے سے اعراض کی اجازت چاہتا ہوں شہرت آپ کی غمازی کر رہی ہے۔ طبع خداداد کے جوہر چھپائے نہیں چھپتے۔ حاسد اگر جوہر نہ کر بیٹھیں تو کہنا۔

لاڈو۔ آپ کا حسن ظن مبالغہ کی حدود سے تجاوز کر رہا ہے والمیک کی بلاغت اور فردوسی کی فصاحت ماند ہو رہی ہے۔

قمرن۔ دو ننھے سے دلوں کا اللہ ہی والی ہے۔

لاڈو۔ بہن کرسی منگواؤ آپ کیلئے۔

قمرن۔ منظور آلہ گفتار یعنے کرسی لاؤ۔

(منظور جاتا ہے)

ممن۔ پہلے یہ کہئے۔ یہاں کوئی خطرہ تو نہیں۔

لاڈو۔ آپ کو کیا اندیشہ ہے۔

(منظور کرسی لاکر رکھ دیتا ہے)

ممن۔ کوئی دل نہ چرالے۔ کوئی قید میں نہ ڈالے۔ میرے سامنے دو آنکھیں ہیں۔ جن کی میرے دل پر آنکھ ہے میرے سامنے دو مشکیں زلفیں ہیں۔ جو مشکیں باندھنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ ایک گرہ میں اسیر کرتی ہے۔ اور دوسری ایک ہی وار میں نخچیر کرتی ہے۔ مجھے ان دونوں سے اندیشہ ہے۔ اور جبتک معقول ضمانت نہ ہو۔ مَیں یہاں نہیں ٹھہرنے کا۔

قمرن۔ تو اندیشہ نہ کیجئے۔ ان آنکھوں نے ابھی رہزنی نہیں سیکھی۔ ان بیماروں میں تو ابھی چلنے کی سکت نہیں۔ مَیں ان کی معصومیت کی گواہ اور ضامن ہوں آپ ان کی طرف سے خاطر جمع رکھئے۔

لاڈو۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) مگر اس بے زبان پر رحم فرمایئے۔ جو آغوش شوق کھولے دیر سے آپ کا استقبال کر رہی ہے۔

(ممن فرشی سلام کے بعد بیٹھ جاتا ہے)

ممن - دہلی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

قمرن - جو دُنیا کی رائے ہے۔

ممن - یعنے ....

لاڈو - اس سے بڑھ کر مردم خیز شہر روئے زمین پر کوئی نہیں۔

قمرن - لکھنؤ بھی ہے۔ مگر نقل کو اصل سے کیا نسبت۔

لاڈو - میری یہ رائے ہے کہ دہلی سے باہر رہ کر کوئی شخص زبان پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

ممن - بالکل دُرست۔ اگر یہ نہ ہوتا۔ تو جناب یہ زود گام پنجابی کلاہ افتخار میں ایک پر نہ رہنے دیتے۔ دیکھئے نا۔ ایک شہر لاہور سے اسقدر کتابیں۔ اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ کہ باقی تمام ہندوستان مجموعی طور پر اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔

قمرن - مگر سب زبان کی خامیوں سے پُر ہیں۔

لاڈو - مَیں کہتی ہوں۔ کہ یہ لوگ کیوں نہیں چند سال کےلئے دہلی میں آ بستے۔

قمرن - یہاں کون معلم زبان ہیں آجکل۔

ممن - اُستاد تو آجکل الاماشاءاللہ۔ مگر دہلی کی آب وہوا میں خُدا نے ایسی تاثیر رکھی ہے۔ کہ یہاں کا ہر زاغ داغ کا ہمصفیر ہوتا ہے۔ ہاں کہئے آپ کے پاس کون کون ادیب تشریف لاتے ہیں۔

قمرن - ابھی تو ہمارا حلقۂ ملاقات محدود ہے۔

لاڈو - مگر ایک صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان سب حضرات سے ہمارا تعارف کرائیں گے۔ جن کا کلام ہمایوں میں شائع ہوتا ہے۔

قمرن - مگر عجیب بات یہ ہے کہ ہمایوں لاہور سے نکلتا ہے۔ اور اہل دہلی اس میں اپنے مضامین کی اشاعت گوارا کرتے ہیں۔

ممن - تو کیا ہوا۔ ایڈیٹر تو دہلی کا ہے۔

قمرن - مگر لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ نجیب آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔

ممن - بات یہ ہے کہ شاہجہان آباد کی طرح نجیب آباد بھی دہلی کا ایک نام ہے۔

لاڈو - مگر یہ جغرافیہ کی بحث ہے۔ اس سے ہمیں کیا کام۔

ممن - جی ہاں۔ ہمیں تو صرف زبان دیکھنا ہے۔

قمرن - مجھے تو جملہ اصناف کلام سے سراپا بہت پسند ہے۔

ممن - مگر اس کا لکھنا نظر چاہتا ہے۔ میرے بیاض میں پندرہ موجود ہیں۔

لاڈو - مجھے رباعی کا اختصار بہت بھاتا ہے۔

ممن - چیز ہی ایسی ہے۔ آج صبح لاحول پڑھکر جو قلم اُٹھاتا ہوں۔ تو چار رُباعیاں صفحۂ قرطاس پر تڑپ رہی تھیں۔

قمرن ۔ مسدس بھی مزے کی چیز ہے۔

ممن ۔ سبحان اللہ ۔ مسلسل مضمون کو سنبھالنا اسی کا کام ہے۔ آجکل خمخانہ جاوید کو اسی کے سانچے میں ڈھال رہا ہوں۔

لاڈو ۔ خوب ۔ مجھے بھی ایک نسخہ عنایت فرمایئے گا۔

ممن ۔ وقت پر کہا آپ نے ۔ صرف دس ہزار جلدوں کا مختصر ایڈیشن شائع ہو رہا ہے ۔ اور فقط پانچ کاپیاں بچتی ہیں ۔ باقی سب کے لئے آرڈر رجسٹرڈ ہو چکے ہیں

قمرن ۔ اپنا نام کسی رسالہ میں چھپا ہوا دیکھنا عجب فرحت بخش ہوتا ہے۔

ممن ۔ اس مزے کو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے ۔ بسا اوقات جی میں آتا ہے ۔ کہ اپنے آپ کو بھی چھپوا دوں ۔ اگر آپ کی سمع خراشی نہ ہو ۔ تو ایک غزل سناؤں ۔ جو کل میں نے منسٹر صاحب کے بنگلہ پر فی البدیہہ کہی تھی ۔

لاڈو ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ ۔

ممن ۔ میں لے میں پڑھا کرتا ہوں ۔ اس سے بندش چست معلوم ہوتی ہے ۔ مگر آواز ذرا خراب ہے ۔ اس کا خیال نہ فرمایئے گا۔

قمرن ۔ دو آتشہ اسی کو کہتے ہیں۔

ممن ۔ اور دلنشین کرنے کے لئے بتا دا بھی ہو جاتے تو مضائقہ ہے۔

لاڈو ۔ اس کا نام سہ آتشہ ہے۔

ممن ۔ ذرا اپنی گھڑی جیب سے نکال لیتے ۔ یہ میرے گانے کے لوازمات سے ہے۔

(گاتا ہے)

مجھے تو کہتے ہو رنگ تیرا گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
زمانے کی طرح ڈھنگ کس کا گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
کسے بھروسہ کہ دم کا نقشہ گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
گھڑی کی صورت لگا ہے کھٹکا ۔ گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
نہ کیجو ہمدم ذرا بھی غفلت کہ مثل اخگر ہے دم کی حالت
جو دم میں زندہ تو پل میں مردہ ۔ گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
نہ باغ سپہر جہاں پہ پھولو بدّر یہ نیرنگ ہے نہ بھولو
کہ ایکٹروں کا یہ ہے تماشا ۔ گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

تخلص تو بدر ہے مگر ضرورت شعری کے لئے بدّر بھی جائز ہے۔

لاڈو ۔ واہ وا ۔ یہ گانا آپ نے کہاں سے سیکھا۔

ممن ۔ ہم لوگ بغیر سیکھنے کے سب کچھ جان جاتے ہیں۔

قمرن ۔ ماشاءاللہ کیا طبیعت پائی ہے۔

ممن ۔ تسلیم ۔ آداب ۔ کچھ آپ بھی۔

قمرن ۔ ہمارا کیا منہ ہے۔

لاڈو ۔ اب تو سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

ممن ۔ تکلف برطرف ۔ کچھ فرمایئے۔

قمرن۔ تو بہن آپ ہی گنگناتیے۔

لاڈو۔ (گاتی ہے)

لینگے نہ میرے موسنے میرا اسلام کب تک
مجھ سے نہ وہ کریں گے وکیھوں کلام کب تک
ڈولی منگا کے ان کے گھر آپ ہوں مَیں جاتی
غیروں کے ہاتھ باجی بھیجوں پیام کب تک
یہ حسن کے ہیں گاہک مردوں کو خوب دیکھا
یوسف بنا رہیگا بی بی غلام کب تک

ممن۔ آپ نے بہت ریاض کیا ہے۔ اسی کا ثمرہ ہے۔ مگر میری عجیب حالت ہے۔ کہ بغیر پڑھنے کے سب کچھ سیکھ جاتا ہوں۔

قمرن۔ خداداد طبیعت ہے۔

لاڈو۔ اللہ کی دین ہے۔

ممن۔ آپ سارا دن کیا کرتی ہیں۔

قمرن۔ بیکار وقت ضائع ہوتا ہے۔

لاڈو۔ آج آپ آ نکلے ہیں۔ ورنہ دل بہت پریشان رہتا ہے

ممن۔ تو چلو کل تھیٹر چلیں۔

قمرن۔ شوق سے۔

ممن۔ ایک نیا کھیل ہے۔ جس میں تین پلاٹ ہیں۔

لاڈو۔ ایک ڈرامے کے تین پلاٹ۔

ممن۔ حیرت کی کون بات ہے۔ اب تک دو روا تھے۔ اب تین ہو گئے۔ پھر چار پانچ چھ غرضیکہ ہندوستان کے ڈراما نگار ایک درجن پلاٹوں کا ایک ڈرامے میں داخل کرنے کا دم رکھتے ہیں۔

قمرن۔ کیا آپ نے بھی کچھ ڈرامے لکھے ہیں۔

ممن۔ کوئی نصف درجن۔ مگر ڈراما کوئی بلند صنف کلام نہیں۔ ہر شخص لکھ سکتا ہے۔

(منظور آتا ہے)

منظور۔ سرکار جو کچھ آپ نے ان کے (ممن کی طرف اشارہ کر کے) آنے پر کہا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا آپ اپنے دل میں خود ہی کہہ ڈالئے۔ اور اُس نے یہ پوسٹ کارڈ دیا ہے۔ (کارڈ پیش کرتا ہے)

قمرن۔ (کارڈ لیکر) نواب معصفر نواز جنگ قافلہ قنبی

ممن۔ حضرت قافلہ قنبی۔ زہے نصیب۔ بڑے خوش فکر ادیب ہیں۔

لاڈو۔ آپ جانتے ہیں انہیں۔

ممن۔ میرے کرم فرما ہیں۔

قمرن (منظور سے) جلد بلا کر لا۔ (منظور جاتا ہے)

ممن۔ ان کی شاعری کے جھنڈے گڑے ہیں۔

(بدھن آتا ہے۔ اور ممن پیشوائی کر کے اس سے بغلگیر ہوتا ہے)

ممن۔ کہئے مزاج کیسے ہیں۔

بدھن۔ آپ کی دعا سے اچھا ہوں اب۔ ذرا چلتا پھرتا ہوں تو پیاس لگ جاتی ہے۔

لاڈو۔ کیا پیئنگے آپ۔

قمرن۔ آتشِ سیال یا آبِ زلال۔

ممن۔ اس جوانی میں تو جامِ ارغوانی ہی زیب دیتا ہے۔

بدھن۔ نہیں میرے لئے پانی ہی کافی ہے۔

ممن۔ ارے میاں کس کی رہی اور کس کی رہ جائیگی
بندے مر جاتیں سگے وسکی رہ جاتے گی

طالب فرماگتے ہیں۔

بدھن۔ مجبور ہوں۔

ممن۔ آخر وجہ

بدھن۔ ایک نہیں تین

(اوّل) کل سے کچھ توبہ سی کر لی ہے

(دوم) ابھی ابھی مجھے ٹمپرنس سوسائٹی کے جلسہ کی صدارت کرنا ہے۔

(سوم) اور بھائی میں ابھی ابھی تین پگ پی کر چلا آرہا ہوں۔

ممن۔ اچھا جانے دو۔ (لاڈو اور قمرن کو مخاطب کر کے) مجھے اجازت دیجئے کہ اپنے محب صادق کو آپ کی خدمت میں باریاب کروں۔ جو ہر پہلو سے آپ کی مجلس کے قابل ہیں۔ آؤ بھائی ایک دفعہ پھر سینہ کو آئینہ کر دو۔

(بغلگیر ہوتے ہیں)

بدھن۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے علم و فضل۔ سیرت صورت کے حضور خراج تحسین ادا کریں۔ اے ملکۂ حسن اپنے غلام کا نیاز قبول کر!

(دو زانو ہو جاتا ہے)

قمرن۔ آپ کی قدر افزائی اسقدر بے پایاں ہے کہ ہمارے خانۂ دل میں اس کی سمائی نہیں۔

لاڈو۔ آج کا دن ہماری زندگی میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔

قمرن۔ ارے منظور تجھ پر خدا کی سنوار۔ جلد کرسی لا۔ (منظور کرسی لاتا ہے)

ممن۔ آپ ایک مرض صعب سے جانبر ہوتے ہیں اس لئے اسقدر زرد ہو رہے ہیں۔ ورنہ آپ کا اصلی رنگ روپ گلاب کو شرماتا ہے۔

بدھن۔ یہ سب لٹریری کاوش کا ثمر ہے۔

ممن۔ تشریف رکھئے۔

بدھن۔ پہلے آپ۔

ممن۔ پہلے آپ۔

(بیٹھ جاتے ہیں)

ممن۔ نواب۔ آپ کی گاڑی باہر کھڑی ہے کیا۔

بدھن - ہاں۔ کیوں؟

ممن - ذرا انہیں قطب تک گھما لائیں۔

قمرن - آج ہمیں فرصت نہیں۔ پھر کسی دن سہی۔

ممن - تو پھر نواب اپنے گویوں کو یہیں بلواؤ۔ ذرا دو گھڑی جلسہ رہے۔

بدھن - بسر و چشم۔ بیگم۔ بیگم۔ اپنے خادم با ادب کو ایما فرمایئے کہ میرے ملازم کو ضروری ہدایات دے۔

قمرن - منظور۔

منظور (آتا ہے) حضور

لاڈو - آپ کے کسی نوکر کو کہو۔ گویّوں کو بُلا لاتے۔ اور تم ہمسایوں کو کہنا۔ کہ ذرا یہاں قدم رنجہ فرمائیں۔

منظور - پھر آگئیں نہ آپ اپنی اصلیت پر۔ فارسیاں بولنی ہیں تو کوئی مغل نوکر رکھ لو۔ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ گھر کا کام کاج بھی کروں اور یہ بڑی بڑی الفاظیں سر پر اُٹھائے پھروں۔

قمرن - بہت بکو نہیں۔ اور ہمسایوں کو بھی بُلا لاؤ۔

منظور - یہ ہوئی نہ بات۔ ابھی لو۔

(جاتا ہے)

ممن - قافلہ قنبی صاحب۔ آپ کی ان آنکھوں کے متعلق کیا رائے ہے۔ ہے نا دو چھلکتے ہوئے جام

بدھن - بلکہ دو میخانے جناب۔

ممن - تیر برساتی ہیں۔

بدھن - جادو جگاتی ہیں۔

ممن - مَیں تو ابھی ان کی شان میں فی البدیہہ قصیدہ کہتا ہوں

بدھن - مَیں بھی کچھ فکر کرتا۔ مگر عینک گھر بھول آیا ہوں۔

لاڈو - کچھ فرماتے تو ہماری سعادت کا باعث ہوتا۔

بدھن - مَیں پہلا مصرعہ تو بلا تکلف کہہ لیتا ہوں۔ ہاں دوسرے مصرعہ میں ذرا سر دردی کرنی پڑتی ہے۔

ممن - مَیں فی البدیہہ میں بند نہیں۔ صرف سوچنے کے لئے ایک دو گھنٹے دیدیجئے۔ پھر سُنتے جایئے۔

قمرن - مہمان آگئے۔

(چند ہمسائے اور گویّے آتے ہیں۔ قمرن اور لاڈو انہیں مناسب جگہوں پر بٹھاتی ہیں۔ تکلفات وغیرہ۔ بزنس رسمی باتیں)

بدھن (گویّوں سے) میاں کچھ ہو جائے۔

گویّا - (گاتا ہے)

ان کو اس حسرتِ انداز سے دیکھا نہ کرے
آنکھ کمبخت مرے راز کو افشا نہ کرے
ہائے وہ عشق کی آشفتہ سری کا بندہ
جو کبھی مصلحت کار کی پروا نہ کرے
صبر دو دن بھی نہ اندوہ جدائی سے ہوا
ہم نے چاہا تھا کہ اب دل تجھے چاہا نہ کرے

اس ہوس کار کو کیا لذّتِ اُلفت کی خبر
جو ترے زہر تغافل کو گوارا نہ کرے
اضطرابِ شب فرقت سے نہ ہو جان رہا
یاد آکر جو تری دل کو شکیبا نہ کرے

ممن۔ یہ کس کا کلام خوش نظام ہے۔
گویا۔ جناب عابد کا۔
ممن۔ کون عابد۔
بدھن۔ اجی وہی ہزار داستان کے ایڈیٹر۔
ممن۔ تب ہی زبان صاف نہیں۔ کسی پنجابی کا کلام اہلِ ذوق کے سامنے پڑھنا ادب کی توہین ہے۔
بدھن۔ بھئی جوش صاحب کی وہ غزل سنانا..... گیا لڑکپن
گویا۔ بہت خوب (گاتا ہے)

گیا لڑکپن نئی جوانی نئی ادائیں سکھا رہی ہے
نگاہوں میں بھر رہی ہے جادو نظر کو بجلی بنا رہی ہے
نگاہ میں وہ گلابی پن ہے کھُلا ہو جیسے شرابخانہ
نظر میں ہے وہ خمار گویا۔ ذرا ذرا نیند آ رہی ہے

بدھن۔ بس کیا۔
گویا۔ حضور دو شعر ہی کہا کرتے ہیں۔

(عسکری اور امراؤ مرزا ہنٹر لئے داخل ہوتے ہیں)

عسکری (ممن و بدھن سے) او خبیث کے بچو۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ نہ گاڑی دہوئی۔ نہ برتن صاف کئے۔ اور یہاں رنگ رلیاں منانی شروع کیں۔

(دونوں کو پیٹتے ہیں)

ممن۔ صاحب یہ مار پیٹ کی اچھی نہیں۔ ہدایتوں میں اس کے متعلق کچھ درج نہیں۔

(کاغذ جلدی سے نکال کر پیش کرتا ہے۔ عسکری لے لیکر پھینک دیتا ہے)

لاڈو۔ یہ کیا معاملہ ہے۔
بدھن۔ بے تکلف دوست ہیں۔ مگر ذرا اُجڈ سے ہیں۔
قمرن۔ مگر ہمارے مکان میں یہ دست درازی کیسی
بدھن۔ مجھے حرارہ آ رہا ہے۔ ذرا سٹیم تیز ہو جاتے تو ابھی رُوئی کی طرح توم کر رکھدوں۔
امراؤ۔ بدمعاشو۔ کیا بُڑ بُڑا رہے ہو۔ چلو سیدھے ہو کر۔ ورنہ مارے قمچیوں کے کھال اُدھیڑ دُونگا۔
قمرن۔ اس مداخلت بیجا کے کیا معنے۔
عسکری۔ تو کیا آپ چاہتی ہیں۔ کہ ہمارے نوکر ہم سے بہتر سلوک کے مستحق ہیں۔
امراؤ۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہمارے نوکر آپ کے خوش گپیاں اُڑاتے رہیں۔ اور ہمارے گھر کا کام یونہی پڑا رہے
لاڈو۔ آپ کے نوکر۔
عسکری۔ اور کیا۔ بیگم یہ کسقدر نامناسب ہے کہ آپ انہیں بلا کر ہمیں تکلیف دے رہی ہیں۔

قمرن (ممن کی طرف اشارہ کر کے) یہ کون ہیں رئیس۔

عسکری۔ میرا سائیں۔

لاڈو۔ اس قدر گستاخی

امراؤ۔ اگر آپ انہیں پسند کرتی ہیں تو ہمیں اپنے کپڑے اُتروا لینے دیجئے۔ پھر شوق سے انہیں پیار کیجئے۔

(بدھن سے) اتار دے کپڑے

بدھن (کوٹ اُتارتا ہے) اے نوابی الوداع۔

ممن (کوٹ اُتارتا ہے) اے شاعری خدا حافظ۔

عسکری۔ لچے کہیں کے ہماری جگہ شادی کرنا چاہتے تھے۔

امراؤ۔ اور پھر ہمارے کپڑے پہنکر۔

لاڈو۔ (قمرن سے) بہن ناک کٹ گئی۔

قمرن۔ اور چوٹی بھی رہتی نظر نہیں آتی۔

گوئیے (ممن سے) اور میری اُجرت۔

ممن (بدھن کی طرف اشارہ کر کے) نواب قافلہ قنبی سے پوچھو۔

گویا۔ (بدھن سے) حضور ......

بدھن (جلدی سے) نواب بدر قطانوی سے کہو۔

(مچھو خاں آتا ہے۔ لاڈو ایک طرف او رقمرن دوسری طرف اس سے چمٹ جاتی ہیں)

مچھو۔ جو کچھ میں نے سُنا اور دیکھا ہے۔ یہ تمہارے کئے کی سزا ہے۔ جو ہمسائے یہاں سے گئے ہیں انہوں نے شہر بھر میں ہلڑ مچا رکھا ہے۔

قمرن۔ ابا۔ ہم سے داؤں کھیلا گیا۔

مچھو۔ اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ جنہوں نے ایسے شریف آدمیوں کی توہین کی۔

عسکری (بدھن و ممن سے) بدمعاشو نکل جاؤ اِس مکان سے۔

ممن۔ (جاتا ہے) ایک نواب کی یہ توہین۔

بدھن (دوسری طرف سے جاتا ہے) ایک شاعر کی یہ ہتک۔

ممن۔ دُنیا کا یہی طریق ہے۔ گاہے چنیں گاہے چناں۔

بدھن۔ بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔

(چلے جاتے ہیں)

قمرن۔ ابا ہم اب شادی بیاہ کے معاملہ میں نہ بولینگے۔

لاڈو۔ خواہ ہمیں انہیں سے بیاہ دو۔

مچھو (عسکری سے) کیا آپ کو منظور ہے۔

عسکری۔ آپ کا فرمانا میرے سر پر

مچھو (امراؤ سے) کیا آپ کو منظور ہے۔

امراؤ۔ آپ کا فرمانا میری آنکھوں پر

(پردہ جلدی سے گرتا ہے)

ڈرامی

ادب العالیہ

اسی میں خدا کی رضا چاہتا ہوں
بتوں کو بنام خدا چاہتا ہوں

ملامت گروان کو ضد پر تمہاری
نہیں بھی اگر چاہنا چاہتا ہوں

ترا در داب جانستاں بن چلا ہے
مٹا جا رہا ہوں مٹا چاہتا ہوں

محبت کی باتیں محبت کی گھاتیں
نہیں جانتا جاننا چاہتا ہوں

نہ ہو گا کوئی مجھ سا ننگ محبت
کہ اس درد کی میں دوا چاہتا ہوں

کوئی کاش اس بزم میں مجھ سے پوچھے
میں کیوں مضطرب ہوں میں کیا چاہتا ہوں

خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں

سزاوارِ تعزیر ہے گر محبت
تو اس جرم کی میں سزا چاہتا ہوں

میں کیا چاہتا ہوں بتاؤں تمہیں کیا
میں خود سوچتا ہوں میں کیا چاہتا ہوں

نظر بھر کے جو دیکھ سکتے ہیں تجھ کو
میں ان کی نظر دیکھنا چاہتا ہوں

تاجور

مغالطہ

مس لوسی ملسوم کا خط اپنی سہیلی کے نام
ایلویرا کاٹیج
ٹوکیم
۸۔ مئی ۱۹۰۸ء

پیاری ایملیا

مَیں تمہیں ایک خوشخبری سُناتی ہوں۔ وہ یہ کہ ابّا جان کو نیوزی لینڈ میں ایک عمدہ ملازمت مِل گئی ہے۔ آئندہ مہینے ہم سب نیوزی لینڈ کو روانہ ہو جائینگے مَیں خوش ہوں اور خوش ہونے کی بات بھی ہے۔ کہ اب ابّا جان تنگیِ معاش کے ہاتھوں پریشان نہ رہینگے قرضہ کا بار تو آہستہ آہستہ ہی سر سے اُتریگا۔ مگر کفایت شعاری کی اس کتر بیونت سے اُن کو ضرور نجات مِل جائیگی۔ اپنی گزشتہ زندگی پر جب مَیں غور کرتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ بچپن سے ابتک ہماری زندگی کس نکبت اور افلاس میں گزری ہے اور ہم کو اپنی ظاہرداری قائم رکھنے میں کن کن دقتوں کا سامنا رہا ہے۔ تو مجھے اس خوش آیند مستقبل پر شبہ ہو جاتا ہے اور مجھ کو یقین نہیں آتا کہ ہم کو کبھی خوشی بھی نصیب ہو گی۔

مجھ کو اس تبدیلیِ حالت پر خوش ہونا چاہیے۔ مگر مجھے غم ہوتا ہے۔ اپنی اس حالت سے مجبور ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا۔ کہ مَیں نے فریڈرک اسکیٹرگڈ کے متعلق کیا کہا تھا۔ خدا جانے مجھے کیوں ایسا یقین ہو گیا ہے۔ کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ یقین جانو کہ اس کا برتاؤ میرے ساتھ نہایت ہی پُر خلوص ہے۔ اس کے طرزِ عمل اس کی جان نثاریوں کو دیکھتے ہُوئے کسی قسم کے شک و شبہ کی ذرا سی بھی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی۔ بجز کھلے الفاظ میں اپنی دلی تمنّا کے اظہار کے اُس نے سب کچھ کیا۔ مدت تک مَیں اس کے اس پُر معنی تذبذب کو نہ سمجھ سکی۔ یہ راز تو گزشتہ ہفتہ ہی کُھلا جب اسکے تند خو اور زود رنج چچا ولیم اسکیٹرگڈ ہمارے یہاں مہمان تھے۔ انہیں کی زبانی اصلی سبب معلوم ہُوا۔

ولیم اسکیٹرگڈ بڑے دولتمند اور مالدار ہیں۔ بلکہ یہ کہنا کہ ان کے پاس دولت کے انبار ہیں مبالغہ نہ ہو گا۔ ان میں ایک عیب ہے۔ وہ غریبوں کو بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں۔ وہ کئی مرتبہ ہم لوگوں سے باتوں ہی باتوں میں یہ کہہ گئے کہ میری خواہش یہی ہے کہ فریڈ کسی دولتمند لڑکی سے شادی کرلے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو یقیناً مَیں اس سے ہر قسم کے تعلقات قطع کرلونگا۔ اور اس کی صورت نہ دیکھونگا۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ غریب کے پاس دھرا ہی کیا ہے؛ علاوہ اس کے سوائے فریڈ کے ولیم کا کوئی اور

عزیز بھی نہیں۔ ان کے بعد جب دولت فریڈ ہی کو ملیگی بس اب تو تم سمجھ ہی گئی ہوگی کہ فریڈ کیوں چپ ہے؛

جب اس کے چچا ہمارے یہاں مہمان تھے۔ اس وقت میں کچھ تو حکمت عملی اور کچھ مہمان نوازی کے خیال سے ان سے نہایت توجہ کے ساتھ پیش آتی تھی۔ میرے اس طرز عمل سے وہ بہت خوش ہوتے۔ بلکہ وہ مجھے پسند کرنے اور چاہنے بھی لگے تھے۔ مگر میں یہ خوب سمجھتی ہوں کہ وہ گرگ باراں دیدہ سے کچھ کم نہیں میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ اور اپنی قسمت کو روتی ہوں قبل اسکے کہ اس کا کچھ علاج ہو۔ تقدیر کا چکر مجھ کو دنیا کے اس کونہ میں پھینک چکیگا۔ اور مجھ کو اس شخص سے ہمیشہ کے لئے جدا کرکے چھوڑیگا۔ جس کی محبت میرے ہر رگ و ریشہ میں سرایت کرچکی ہے۔

ابھی تو ہم اپنے دوستوں کی الوداعی ملاقات کے لئے جا رہے ہیں۔ اور غالباً پندرہ دن تک یہی سلسلہ قائم رہیگا۔ سب سے پہلے ہم مِن تنسنر کے مہمان ہونگے مگر جب ہم اپنے دوستوں سے رخصت ہوکر واپس آئینگے۔ اور اپنے روانہ ہونے کی تیاری میں مصروف ہونگے۔ اس وقت تم چند دنوں کے لئے ضرور آنا۔ مجھ کو تم سے ملنے کی بڑی تمنا ہے۔ اور چاہتی ہوں کہ تم سے اپنا دردِ دل کہوں۔

ابا جان نے مکان بیچ ڈالا ہے۔ جس دن ہم یہاں سے روانہ ہونگے۔ اسی دن لانگ فورڈ اس پر قابض ہوجائیگا۔ ابا جان تمام چوبی اسباب یہیں فروخت کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں۔ کہ وہاں جاکر نیا اسباب خرید لینا بہتر ہے۔ بہ نسبت اس سامان کے لیجانے کے۔ کیونکہ کرایہ قیمت سے زیادہ لگ جائے گا۔ بہن تم یقین جانو کہ اس طرح اپنے سب سامان کو علیحدہ کرنے میں بڑا افسوس ہوتا ہے۔ خصوصاً اپنے پالے ہوئے جانوروں کو جدا کرنا بڑا شاق گزرتا ہے۔ میرا کارلو (کتا) فاسٹر کے یہاں رہیگا۔ وہ لوگ اُسے پیار محبت سے رکھینگے بھی۔ اب رہی میری فارسی بلی اس کو ساتھ لے جانے کی میں نے بڑی کوشش کی، ابا جان کی بڑی بڑی منتیں کیں۔ مگر وہ ذرا بھی نہ پسیجے۔ وہ تو اُلٹا یہی کہنے لگے۔ کہ اتنے بڑے سفر میں بلی کا لیجانا کتنی بڑی زحمت اور کیسی کچھ جھنجھٹ ہے۔ بلی ہے قیمتی اس لئے ہم نے اُس کو فروخت کرنے کا اشتہار ڈیلی رکارڈر میں دیدیا ہے۔ کوئی نہ کوئی خریدار مل ہی جائیگا۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ تم سے ملنے کا مجھ کو بڑا اشتیاق ہے۔

میں ہوں

تمہاری بہن

لوسی ملسوم

۲۔ مضمون اشتہار جو گربہ فارسی کے فروخت کرنے کے لئے "ڈیلی رکارڈر" میں شائع ہوا۔

ایک خاتون غیر ملک کے سفر پر جارہی ہیں۔ وہ اپنی

فارسی بلی بیچنا چاہتی ہیں۔ بلی اصیل ہے۔ دو نمائشوں میں دوسرے درجہ کا انعام مل چکا ہے۔ قیمت لگائیے۔ اور خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کیجئے۔

پتہ :- ڈی ۲۴۔ بتوسط ڈیلی رکارڈ آفس۔

۳۔ مسٹر ولیم اسکیٹر گڈ کا خط۔ ڈی ۲۴ بتوسط ڈیلی رکارڈ آفس کے پتہ پر۔

کرومر ہاؤس

بالہم ۱۱۔ مئی ۱۹۰۰ء

خاتون محترم۔

ڈیلی رکارڈر کی امروزہ اشاعت میں مَیں نے آپ کا اشتہار دیکھا۔ مَیں آپ کی فارسی بلی کی قیمت پانچ گنی پیش کرتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ اصیل ہو۔ اور اس کی صحت اچھی ہو۔ براہ کرم مفصل حالات سے مطلع فرمائیے۔

اگر مَیں نے آپ کی بلی خرید لی تو یقین رکھئے کہ اُسے شفیق لوگ اور اچھا گھر ملیگا۔ اور سب اُسے پیار محبت سے رکھیں گے۔

جواب بواپسی ڈاک عنایت فرمائیے۔

آپ کا

ولیم اسکیٹر گڈ

۴۔ مسٹر ٹامس بلنگٹن کا خط مسٹر ولیم اسکیٹر گڈ کے نام

۲۷۔ ورنارڈو

سڈن ہم

۱۳۔ مئی ۱۹۰۰ء

میرے محب ولیم

آج میرے دیرینہ کرم فرما مسٹر ٹوفم نے لکھا کہ مسٹر نیوزی لینڈ جانے والے ہیں۔ آئندہ مہینے وہ جہاز پر سوار ہونگے۔ یہ خبر سُنتے ہی مجھ کو یاد آگیا۔ کہ مَیں نے ابتک تمہارے اس عجیب و غریب خط کا جواب نہیں دیا ہے۔ جو گزشتہ ہفتہ مجھ کو ملا تھا۔

یقین جانو کہ تمہارا خط دیکھتے ہی مَیں متحیر سا رہ گیا۔ مَیں تمہیں آج ساٹھ سال سے جانتا ہوں۔ مَیں نے تمہارا لڑکپن دیکھا تمہاری جوانی دیکھی اور اب تمہارا بڑھاپا دیکھ رہا ہوں۔ اور تمہارے مزاج سے خوب واقف ہوں۔ مَیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تمہاری اور میری عمر میں کوئی فرق نہیں۔ اس حساب سے اس وقت تم ۷۳ سال کے بڈھے خرانٹ ہو۔ تمہارے سب بال جھڑ چکے ہیں۔ اور سر گنجا ہو گیا ہے مُنہ میں ایک دانت نہیں۔ تم پر یہ مثل حرف بحرف صادق آتی ہے۔ کہ نہ مُنہ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت۔ چندیا پہ یہ جو چار بال نظر آتے ہیں اور مُنہ میں یہ جو سفید چوکڑی چمکتی ہے۔ حجام اور دندان ساز کی صناعیوں اور کار فرمائیوں کی رہین منت ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ایک مدت سے تم گٹھیا کا شکار ہو رہے ہو۔ یہ

نامراد مرض سال ہیں کم از کم چھ مہینے تمہیں اپنے کمرے میں قید رکھتا ہے۔ اب تک تو ہم سب تم کو تجرد کا دیوتا سمجھتے تھے۔ لیکن یک بیک تم نے بڑی سنجیدگی سے یہ اعلان کرکے کہ تم ۱۸ سالہ نوجوان زاہد فریب خاتون سے شادی کرنے کے متمنی ہو، مجھ کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔

تمہاری لغویت کی بھی کوئی حد ہے۔ تمہارا اصرار تو یہ ہے کہ تمہارا بھتیجا فریڈ کسی دولتمند لڑکی سے شادی کرے اور تم ایک مفلس و قلاش دوشیزہ کے متمنی ہو۔ لاحول ولا قوۃ! یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مس لوسی ملسوم تم جیسے بڈھے خرانٹ کو پسند کریگی؟ ذرا ہوش کی لو! تمہاری لغویت پر وہ قہقہہ لگائیگی۔

تم لکھتے ہو کہ جب تم ملسومز کے مہمان تھے۔ اس وقت وہ تم سے بڑی توجہ اور ہمدردی سے پیش آیا کرتی تھی۔ اور اُسے تمہارا بڑا خیال رہا کرتا تھا۔ بلکہ اس نے تمہیں یہ سمجھ لینے کا پورا پورا موقع دیا کہ وہ تمہاری قدردانی اور محبت کا اعتراف کرتی ہے۔ پھر اس سے کیا مطلب؟ کیا تم نے اپنے بال دھوپ میں سفید کئے ہیں؟ جوان نوخیز زاہد فریبوں کی عادات سے اتنے ناواقف ہو گئے؟ یہ بت کسی کے ہوتے ہیں جو تمہارے ہونگے؟ یہ تو انہی کے ہو رہیں گے جو ان کی پرستش کریگا۔ اور دم بھریگا۔

مس لوسی کو تمہاری ضعیفی اور تکلیفوں پر رحم آتا ہوگا اس لئے وہ اتنی توجہ سے پیش آتی تھی جو انسانیت کا تقاضا ہے۔

تحفہ کے متعلق مجھ کو تم سے بالکل اتفاق ہے۔ اور چونکہ اُسے جانوروں کے پالنے کا حد سے زیادہ شوق ہے۔ اسلئے اگر تم اسے فارسی بلّی تحفہ میں دو تو بہت ہی مناسب ہوگا۔ ماسوا اس کے اگر کہیں تمہیں یہ خیال ہو کہ لوسی تمہاری زوجیت میں آنا قبول کریگی تو یہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ یقیناً تم سٹھیا گئے ہو اور یہ تمہارے بڑھاپے کی سنک ہے۔ والسلام

تمہارا صادق دوست

ٹامس بلسنگٹن

مکرر آنکہ۔ لو اس کا فیصلہ تو آپ ہی آپ ہوا جاتا ہے ملسومز نیوزی لینڈ کو روانہ ہو رہے ہیں۔ بن سنسر سے ملنے گلوسٹر شایر گئے ہیں۔ اور بھی دوستوں سے ملینگے۔ اور آئندہ مہینے میں ضرور نیوزی لینڈ روانہ ہو جائینگے۔ اب تمہیں ان سے ملنے کی امید نہیں۔ چند ہی مہینوں میں یہاں سے آٹھ ہزار میل دور نیوزی لینڈ کے نوجوانوں کو لوسی اپنا والہ و شیدا بنائیگی۔ اور تم اپنی تمناؤں بلکہ ارمانوں کا ماتم کرتے ہوگے۔

۵۔ مسٹر ولیم اسکیٹرگڈ کا خط مسٹر ٹامس بلسنگٹن کے نام

کرومر ہاؤس

بالہم۔ ۱۴۔ مئی ۱۹۰۸ء

میرے پیارے ٹامس!

آپ کے خط مورخہ دیروزہ کی کرخت و ناملائم تحریر کو دیکھکر

کوئی دوسرا شخص، جس کو آپ سے اتنی مودت نہ ہوتی کہ مجھ کو ہے یقیناً برافروختہ اور ناراض ہو جاتا۔ مگر چونکہ میں آپ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لئے میں نے آپ کے خط کو اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے جس خیال سے کہ وہ لکھا گیا ہے چونکہ عنقریب ایک حور شمائل اور زاہد فریب نازنین میرے خانۂ دل کو آباد کرنے والی ہے۔ اس لئے آپ کو رشک ہوتا ہے۔

میں پھر بھی کہتا ہوں کہ جب میں ان کے یہاں مہمان تھا۔ اس وقت مس لوسی کی توجہات بہت نمایاں تھیں۔ آپ کو یاد نہیں میں آپ سے گیارہ مہینے دو دن چھوٹا ہوں۔ جہاں آپ نے میری برائیاں چن چن کر گنائی ہیں۔ وہیں آپ نے میرے محاسن اور خوبیوں پر ارادۃً پردہ ڈالا ہے۔ سب سے بڑی خوبی مجھ میں یہ ہے کہ میں دولتمند ہوں۔ اسے آپ نے بالکل نظرانداز ہی کر دیا ہے۔ میں ایسی لڑکی کے لئے جس کی ساری عمر کوڑی کوڑی جوڑنے اور پائی پائی کا حساب رکھنے میں گزری ہو۔ شاہانہ عشرت سے معمور مکان مہیا کر سکتا ہوں۔

مجھ کو اس کی قطعی خبر نہ تھی کہ ملسوم ترک وطن کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ تو آپ کے خط سے معلوم ہوا۔ اس عجلت میں مجھے وہ تدریجی طریقہ چھوڑنا پڑتا ہے۔ جو میں اس شادی کے متعلق اختیار کئے ہوئے تھا۔ یہ بھی شومیٔ قسمت کا ایک کرشمہ ہے کہ ان دنوں مرض کا زیادہ زور ہے اور میں اس قابل نہیں ہوں کہ اپنے کمرے سے باہر نکل سکوں۔ ولو فرضاً میں اچھا بھی ہوتا تو کیا ان لوگوں کو ڈھونڈھتا پھرتا خصوصاً جبکہ وہ اپنے دوستوں کی الوداعی ملاقات میں مصروف ہیں۔ کیا کچھ کم معیوب ہے اِنہی تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ شادی کی درخواست مس لوسی ملسوم کی خدمت میں ڈاک کے ذریعے بھیجوں۔ آپ ان لوگوں کے موجودہ پتہ سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے میں آپ کی خدمت میں سربمہر لفافہ ارسال کرتا ہوں۔ اور آپ سے التجا ہے۔ کہ آپ اس پر پتہ لکھ کر پہلی ڈاک سے اسے مس لوسی کی خدمت میں بھیج دیں۔ وقت بہت کم ہے اگر حسب مراد جواب آیا۔ جس کی کہ مجھ کو قوی امید ہے تو شادی کی رسم کو ان لوگوں کے یہاں سے روانہ ہونے کے قبل ادا ہو جانا چاہئے۔ والسلام

آپ کا نیاز مند قدیم

ولیم اسکیٹر گڈ

مکرر آنکہ میں مشکور ہوں کہ آپ نے تحفہ بھیجے جانے کے متعلق مجھ سے اپنا اتفاق ظاہر کیا ہے۔ میں نے فارسی بلی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جس کا اشتہار دیکھا تھا۔ اور اس کے لئے لکھ بھی دیا ہے۔ لیکن جواب اب تک نہیں آیا۔ زیادہ تردد کا مقام نہیں۔ ایسی رواروی میں تحفے اور سوغات بھی عذابِ جان ہو جاتے ہیں۔

دیکھئے۔ وہ خط فوراً ہی بھیج دیجئے گا۔ دیر نہ ہو۔

۶۔ ولیم اسکیٹر گڈ کا خط۔ مس لوسی ملسوم کے نام (یہ وہی خط ہے۔ جو لوسی کے پاس بھیجنے کے لئے مذکورہ خط کے اندر ملفوف کیا گیا ہے)

کروم ہاؤس

بالہم

۱۴۔ مئی ۱۹۰۸ء

میری پیاری لوسی

تم لوگوں کے انگلستان چھوڑنے کی خبر نے مجھ کو بہت مایوس کر دیا ہے۔ اب مجبوراً میں تم سے اس امر کے متعلق جس کے لئے میں تمہیں زیادہ وقت دینا چاہتا تھا اچانک درخواست کرتا ہوں۔ اس عجلت میں اس کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ تم خود سمجھ سکتی ہو۔

جب میں تمہارے ہاں مہمان تھا۔ اس وقت کی خوشگوار اور لطف بخش ملاقاتیں اور بے تکلفیاں جرأت دلاتی ہیں کہ میں تم سے اسی امر کے متعلق درخواست کروں۔ جس کی تم کو میری ذات سے امید ہے۔ اور اب میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میرے دین و ایمان، دل و دماغ کی ملکہ بننا قبول کر لو۔

تم کو میرے سن و سال کے شخص سے یہ امید نہیں ہو سکتی کہ تمہاری انتہائی توقیر میرے دل میں جاگزیں ہے جو کچھ میں زبانی کہہ سکتا ہوں اس سے زیادہ تم عزت و حرمت کی مستحق ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی محبت اور فدویت کا پورا پورا ثبوت بہم پہنچاؤں گا۔

میری مالی حالت اس امر کی کافی ضمانت دے سکتی ہے کہ میں تمہارے لئے شاہانہ عشرت سے معمور مکان مہیا کرنا چاہتا ہوں۔ سات سمندر پار تمہارے والدین کو یہ امر باعث تشفی ہو گا کہ انہوں نے تمہیں ایسے شوہر کی نگرانی اور حفاظت میں چھوڑا ہے۔ جو بلحاظ عمر و تجربہ ہر طرح اس کا اہل ہے کہ تمہاری اس چھوٹی سی عمر اور ناتجربہ کاری میں تمہارا نگران اور محافظ بنے۔

مجھ کو قوی امید ہے کہ تمہارے احساسات خود ہی اس درخواست کا امید افزا جواب دینے میں تمہاری رہنمائی کریں گے۔

تمہارا شیدا

ولیم اسکیٹر گڈ

۷۔ ڈی ۲۴ کا جواب مسٹر ولیم اسکیٹر گڈ کے نام

گیبلس رنگ وڈ۔

گلاوسٹر شایر

۱۶۔ مئی ۱۹۰۸ء

ڈیئر مسٹر اسکیٹر گڈ

میں آپ کے اس خط کے جواب میں جو ہم کو یہاں بھیجا گیا ہے، اپنی پیاری لوسی کی طرف سے لکھتی ہوں کہ ہم کو آپ کی

درخواست منظور ہے۔

مالی پہلو کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ہم کو کئی درخواستیں آپ کی درخواست سے بھی اچھی موصول ہوتی ہیں۔ لیکن آپ کے ساتھ دیرینہ تعلق کی وجہ سے ہمیں ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہماری ناز و نعم سے پلی ہوئی لوسی کی قدر جو آپ کے یہاں ہوگی اُس کی دوسری جگہ امید نہیں۔ آپ کو تو یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم لوگ نیوزی لینڈ جا رہے ہیں۔ ہم کو اپنے نئے مسکن میں پہنچکر ہمیشہ اطمینان رہیگا کہ ہم اُسے اپنے ایک دوست کے گھر چھوڑ آئے ہیں۔ جہاں اس کے ساتھ شفیقانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس لئے بلا پس و پیش آپ کی درخواست منظور کی جاتی ہے۔ اور ہم کو مسرت ہے۔

آپ سے اور لوسی سے کئی مرتبہ اس کے متعلق گفتگو بھی ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب مجھ کو اس کی ضرورت نہیں کہ میں صحت وغیرہ کے متعلق یقین دلانے کی کوشش کروں ہم آئندہ ہفتہ یٹوک ہم کو واپس ہونگے اور اسی وقت اس کو اپنے نئے گھر بھیجنے کے متعلق ایسے مشورہ لینگے۔ یوں تو ہم اُسے اخیر وقت تک اپنے ہمراہ رکھنے کے متمنی ہیں۔ والسلام

آپکی

ایلنز املسوم

۸۔ ولیم اسکیٹر گڈ کا خط مس لوسی ملسوم کے نام

کرومر ہاؤس

بالہم

۱۷ مئی ۱۹۰۸ء

میری پیاری لوسی

تمہاری والدہ محترمہ کے خط سے مجھ کو بیحد مسرت ہوئی مجھ کو یہ تمنا تھی۔ کہ میں تمہارے قلم سے اپنی درخواست کی منظوری کی خبر سُنوں۔ مگر یہ دیکھ کر کہ میری تجویز پر تمہارے والدین کو کسی قسم کا اعتراض نہیں اور نہ وہ کسی قسم کی رکاوٹ ڈالینگے۔ اُن کی اس رضامندی کا علم میرے لئے کچھ کم باعث اطمینان نہیں۔

ایسے وقت اور موقع پر میں اپنے احساسات اور دلی جذبات کو سپرد قلم کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ انہیں میں زبانی عرض کرنے کا متمنی ہوں۔ برائے خدا جلد لکھ بھیجو کہ تم یٹوک ہم کب واپس آؤگی۔ سارا انتظام ابھی باقی ہے، کچھ بھی نہیں ہوا اور تمہارے والدین کے روانہ ہونے میں بہت کم وقت رہگیا ہے۔

بجز اپنی دائمی محبت کے اظہار اور اشتیاق دیدار کی تمنا کے اور کیا لکھوں۔

تمہاری محبت کا بندہ

ولیم اسکیٹر گڈ

۹۔ مسٹر فریڈرک اسکیٹرگڈ کا خط اپنے ایک دوست کے نام

دی گیبلس انگ وڈ

گلاؤسسٹرشایر

۱۸۔ مئی ۱۹۰۸ء

شفیق جیک

غالباً تم کو بھی معلوم ہوگیا کہ ملسومز آئندہ مہینے کی ۲۰۔ تاریخ کو نیوزی لینڈ روانہ ہو جائینگے۔ اس خبر نے تو مجھ کو کہیں کا نہ رکھا تھا حسرت اور ناکامی کے سوا مجھ کو اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لوسی کا دُنیا کے دوسرے کونے پر مجھ سے دُور جاکر آباد ہونا گویا میری تمام امیدوں پر پانی پھیرنا اور مجھ کو زندہ درگور کرنے کے مترادف تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بن سنسر نے فرشتے کا کام کیا۔ جب ملسومز اُن کے یہاں ملنے گئے تو انہوں (بن سنسر) نے مجھ کو بھی بُلا بھیجا۔ اس طرح کہ گویا وہ میرے اضطراب سے واقف تھے۔ وہیں لوسی سے ملاقات ہوگئی۔ اور مجھ کو اپنی تمنّا کے اظہار کا موقع مل گیا۔

پہلے تو اس کے والدین اپنی لڑکی کو انگلینڈ میں چھوڑ جانے پر راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ مگر پھر رفتہ رفتہ اُن کے ہر اعتراض کی تشفی ہوگئی۔ اور یہ قرار پایا کہ ان کے یہاں سے روانہ ہونے کے پہلے شادی ہو جائے۔ چنانچہ وہ آئندہ ہفتہ ٹیوک ہم پہنچکر شادی کے انتظام میں مصروف ہو جائینگے۔ نکاح کی تاریخ کے تعین ہونے کے بعد مَیں تم کو اطلاع دونگا اور تمہیں شادی میں ضرور شریک ہونا پڑیگا۔

اب تو تم میری خوشی کا اندازہ خود ہی کرسکتے ہیں لیکن ہم لوگوں کو نہایت خاموشی سے رہنا پڑیگا۔ اور شادی کے بعد بڑی کفایت شعاری برتنی پڑیگی۔ لوسی کو اس کے متعلق ذرا سا بھی تردد نہیں اور نہ وہ اس کی ذرّہ برابر پروا کرتی ہے۔ مجھ کو اگر کوئی فکر ہے۔ تو صرف چچا ولیم کی ہے۔ مَیں یہی سوچ رہا ہوں۔ کہ اُن کو کس طرح اپنی شادی کی اطلاع دوں۔ اُن کا اصرار تھا کہ مَیں کسی دولتمند بیوی سے شادی کروں۔ میری اس شادی سے ان کو رنج ہوگا۔ وہ مجھ سے یقیناً ناراض ہو جائینگے۔ اور میری آئندہ توقعات پر پانی پھر جائیگا۔

بہرحال ہم نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ اخیر وقت تک اس شادی کی خبر مخفی رکھیں۔ اور نکاح ہو جانے کے بعد تک ان کو اس کا علم نہ ہونے دیں۔ ان کو اس کا علم اسی وقت ہو جبکہ پھر کسی تبدیلی کی گنجائش تک باقی نہ رہے۔ وہ سخت زود رنج اور غُصّہ ور ہیں۔ عقد کے پہلے اگر یہ واقعہ اُن کو معلوم ہوگیا تو خدا جانے اُن کا غُصّہ کیا کچھ خرابیاں نہ پیدا کرے۔ اس لئے مَیں احتیاطاً تم کو بھی لکھتا ہوں کہ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا۔

تمہارا قدیمی نیازمند

فریڈ اسکیٹرگڈ

۱۰- لوسی ملسومر کا خط اپنی سہیلی مس ٹوفم کے نام

ایلوبرا کاٹیج

ٹیوک ہم

۲۲-مئی ۱۹۰۸ء

پیاری امیلیا

آج ہی ہم ٹیوک ہم واپس آتے ہیں۔ کتنی واقعات ایسے ہوتے جن کے لکھنے کو دل بے اختیار چاہتا تھا۔ آج موقعہ ملا اور لکھ رہی ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ بن سنسر کے یہاں فریڈ سے ملاقات ہو گئی۔ جس دن وہ آیا اُسی دن رات کو اس نے اپنی زوجیت میں آنے کے لئے مجھ سے درخواست کی اور مَیں نے بھی بلا پس وپیش اور بلا توقف اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کے بعد ہی ہم کو شادی کی تیاری اور انتظام کے لئے لوٹنا پڑا۔ کیونکہ امّاں اور ابّا جان کے یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ہی ہمارا نکاح ہو جانا ضروری ہے۔ ابّا جان وغیرہ ۲-جون کو ضرور بالضرور جہاز پر سوار ہو جائینگے۔ اس تعجیل میں رازداری کی ضرورت ہے اور وقت پر سب کام کا انجام پانا بھی ضروری ہے۔

فریڈ کو سب سے زیادہ دھڑکا اپنے چچا ولیم کا تھا اُسے یقین تھا کہ مجھ جیسی مفلس و بے نوا سے شادی کرتے ہی اسکے چچا جان خفا ہو جائینگے۔ اور اس سے اپنے تمام تعلقات قطع کر کے ایک ایک کوڑی کو محتاج کر دینگے۔ مگر مجھ کو اس مفلسی کی کچھ پرواہ نہیں تھی۔ البتہ خاندان میں بدمزگی کا باعث ہونے اور اپنے پیارے شوہر کی تمام بلند ابدوں پر پانی پھیرنے کا سبب بننا سخت دلشکن اور صبر آزما تھا۔ لیکن ایک طویل مباحثہ کے بعد یہ بات قرار پائی۔ کہ سب رسمیں نہایت خاموشی سے اور خفیہ طریقہ پر ادا کی جائیں۔ اور چچا ولیم کو قبل از نکاح کسی قسم کی اطلاع نہ ہونے پاتے۔

مگر اس قصہ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور عجیب حصہ یہ ہے کہ کل تو ہم لوگ واپس آتے اور آج صبح چند ضروری باتیں طے کرنے کے لئے فریڈ آیا۔ ہم ابھی دیوانخانہ میں بیٹھے ہوتے باتیں کر رہے تھے کہ دروازہ کھلا۔ اور چچا ولیم اندر تشریف لائے۔ مَیں تو بھانپ گئی کہ باوجود ہماری اخفائے راز کی کوششوں کے انہیں خبر ہو گئی ہے۔ مجھ کو اُن کی ذات سے ایسی حالت میں قطعی طور پر یہ امید نہ تھی کہ وہ اس طرح پیش آئینگے۔ جیسا کہ اُنہوں نے برتاؤ کیا۔

وہ سیدھے میرے پاس آئے اور میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر ان پر بزرگانہ اور شفیقانہ بوسہ دیا۔ اور کہا۔ "اے میری عزیز نوجوان خاتون تم نے اپنے اس فیصلہ سے مجھ کو بیحد مسرور کیا۔ مَیں تم کو یقین دلاتا ہوں۔ تمہارا یہ فیصلہ آئندہ کبھی تمہارے لئے باعث تاسف نہ بنے گا۔"

پھر اُنہوں نے فریڈ سے مخاطب ہو کر جو وہیں تصویر حیرت بنا کھڑا تھا۔ اپنے عزیزوں سے رازداری برتنے کی لغویت پر

چند جملے کہے اور اپنے بھتیجے کے استعجاب پر ایک لطیف مذاق سا کیا۔ ہم سب کے سب حیرت زدہ تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا ہماری جواب دینے کی قوت سلب ہو گئی ہے۔ پھر تو فوراً ہی چچا جان مجھ کو اسی کمرے کے ایک کونہ میں لے گئے۔ اور وہ اس طرح کہ گویا کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ وہ بھی راز کی بات ہے۔

وہاں وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں کہاں رہنا پسند کرونگی۔ مجھ سے انہوں نے یہ بھی کہا۔ لندن کے قریب میں جس ضلع میں رہنا پسند کروں۔ وہاں وہ مکان خریدیں۔ میں نے اپنا خیال اُس خوبصورت مکان کے متعلق ظاہر کیا۔ جو رچمنڈ میں ہے باوجودیکہ یہ ایک فضول خرچی ہے۔ لیکن انہوں نے فوراً اس کے خریدنے کا وعدہ کر لیا۔ اور اس کو اعلےٰ پیمانہ پر سجانے کا بھی اقرار کر گئے۔

اس کے بعد اُنہوں نے مجھ کو ایک خوبصورت انگوٹھی دی اور کہا۔ "میری خاطر اسے ہمیشہ پہنے رہنا۔" پھر اُنہوں نے اپنی دادی کے تمام جڑاؤ زیورات جو اپنی ندرت اور قیمت کے لحاظ سے ضرب المثل ہیں۔ نکاح کے وقت چڑھاوے میں دینے کا وعدہ کیا۔ علاوہ ازیں نکاح کے دن میرے نام ایک بڑی رقم خاص میرے اخراجات کے لئے دینے کا وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ میں یہ رقم تمہارے نام اس لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ضروری اخراجات کے متعلق تم بار بار اپنے شوہر کے پاس جانے کی زحمت سے بچو۔

بڑی دیر تک وہ مجھ سے اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ یہانتک کہ گاڑی کا وقت ہو گیا۔ وقت پر اسٹیشن پہنچنے کے لئے انہیں ہم لوگوں سے بڑی عجلت میں رخصت ہونا پڑا۔ چلتے وقت انہوں نے فریڈ کو علیحدہ لیجا کر کہا۔ "تمہیں ذرا سی بھی فکر نہ کرنا چاہیئے۔ میں خود تمہارا سب خاطر خواہ انتظام کئے دیتا ہوں۔"

کیا یہ کچھ کم حیرت افزا ہے؟ خدا جانے کیوں میں نہیں گرگ باراں دیدہ سمجھتی تھی۔ آج تو اُنہوں نے فرشتوں جیسا برتاؤ کیا۔ تم اس خط کے دیکھتے ہی چلی آؤ۔ ملنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔

تمہاری بہن

لوسی ملسم

مکرر آنکہ۔ ہم نے بلی کا جو اشتہار ڈیلی رکارڈر میں دیا تھا۔ اس کے خریدنے کے لئے بہت سے لوگ تیار ہیں۔ منجملہ ان کے چچا ولیم کی بھی درخواست ہے۔ چونکہ ہم نے پورا پتہ نہیں دیا تھا۔ صرف نمبر ڈیلی رکارڈر کے دفتر کے پتہ پر دیا تھا۔ اس لئے غالباً انہوں نے لاعلمی میں لکھا ہو۔ اُنہوں نے بلی کی قیمت ۵ گنی لگائی ہے۔ اماں جان نے اس خیال سے کہ بلی انکے یہاں اچھی رہیگی۔ ان کی درخواست منظور کر لی ہے۔ جب وہ آئے تو ہم لوگ اس شادی کے انتظام کی مصروفیت کی وجہ سے بلی کا ذکر کرنا بالکل بھول ہی گئے۔

۱۱-مسٹر ولیم اسکیپٹر گڈ کا خط لوسی کے باپ مسٹر ملسوم کے نام

کرومرہاؤس

بالہم

۲۳-مئی ۱۹۰۸ء

محترم ملسوم

کل ہماری گفتگو کے متعلق آپ کی صاحبزادی نے جو رائے قائم کی ہے وہ نہایت صحیح ہے لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ فریڈ کی وہاں کیا ضرورت تھی۔ اور اُسکو ان باتوں سے کیا واسطہ ہے۔ میں آپ کی صاحبزادی کے لئے رچمنڈ میں مکان خرید رہا ہوں۔ اور ڈیک ہم کمپنی کو مکان کی آرائش کا آرڈر بھی دیدیا ہے۔

جس دن نکاح ہوگا اسی دن اس کے نام ۳۶۰ پونڈ سالانہ کی رقم اس کے ذاتی اخراجات کے لئے مخصوص کر دونگا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ذراسی بات بھی اپنے شوہر سے کہے۔

دوسرے عطیات کے متعلق مزید وعدہ کی ضرورت نہیں اس کا احساس شکریہ میرے لئے کافی ہے۔ میں ہر ممکن طریقہ پر یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ میں اُس کی متاہل زندگی کو ہمیشہ خوشگوار بنانے کی کوشش کرونگا۔ اور اس امر میں کوئی دقیقہ اپنی طرف سے اٹھا نہ رکھونگا۔

آپکا صادق

ولیم اسکیپٹر گڈ

۱۲-ولیم اسکیپٹر گڈ کا خط اپنے بھتیجے فریڈ کے نام

کرومرہاؤس

بالہم

۲۳-مئی ۱۹۰۸ء

پیارے فریڈ

کل اچانک ایک نئے انداز سے ملسوم کے یہاں تیرے جانے سے یقیناً تم کو اپنے مستقبل کے متعلق تردد اور پریشانی ہوئی ہوگی۔ ایسے خوشی کے وقت میں تم کو بیم و رجا کے عالم میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ فی الحقیقت میرے بعد یہ شادی جایداد کے متعلق تمہارے مفاد میں کسی قدر حایل ہو۔ لیکن فی الحال میں چاہتا ہوں کہ تم مالی کاوشوں سے بالکل آزاد ہوکر اپنے مذاق سلیم کے مطابق فن لطیف کی ترقی و تکمیل میں مصروف ہوجاؤ اور اس فن سے پورے طریقہ پر متمتع ہو۔ چنانچہ تمہارے وظیفہ کی رقم کو دو چند کرنے کا میں نے فیصلہ کرلیا۔ اور اپنے وکیل کو اطلاع دے دی ہے کہ اب وہ تمہیں تین قسطوں میں ۵۰۰ پونڈ سالانہ دیا کرے۔

تمہارا دعاگو

ولیم اسکیپٹر گڈ

۱۳ ۔ مسٹر ڈابسن و فریری وکلا کا خط ولیم اسکیٹر گڈ کے نام

لنکنسن ان

لندن ای سی

۳۰۔ مئی ۱۹۰۸ء

جناب من

مسٹر فریڈرک اسکیٹر گڈ کے وظیفہ میں جو کچھ آپ نے اضافہ کیا اس کے متعلق آپ کی مرسلہ ہدایتیں موصول ہوئیں۔ ہم نے حسب ہدایات مذکورہ اپنے خزانچی کے نام احکام جاری کر دئے ہیں۔ کہ نئے اضافہ کے مطابق ہر سہ ماہی میں مسٹر فریڈرک کو وظیفہ دیا جائے۔

لاس کوم وِلا واقع رچمنڈ کے خریدنے کی کارروائی تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ ہمارا محرر بیعانہ کی دستاویز پر آپ کے دستخط لینے کو دوشنبہ کے دن حاضر ہوگا۔

ہم اس خط کے ہمراہ لاس کوم ولا کے آراستہ کرنے کا تخمینہ بھی بھیجتے ہیں۔ یہ تخمینہ میسرز ڈک ہم کمپنی کا ہے۔ ابھی منظوری کی اطلاع براہِ راست کمپنی مذکور کو دیدیجئے۔ تاکہ وقت پر مکان آراستہ ملے۔

مس ملسوم کو جو عطیات دئے جائینگے اُن کے متعلق تمام کاغذات تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن آپ نے مس ملسوم کے شوہر کے نام سے اطلاع نہیں دی ہے۔ نام معلوم ہوتے ہی دستاویزیں مکمل کر دی جائینگی فقط۔

ہم ہیں

آپ کے خادم

ڈابسن اور فریری

---

۱۴ ۔ مسٹر ولیم اسکیٹر گڈ کا خط اپنے دوست مسٹر ٹامس بلینگٹن کے نام۔

کرومرہاؤس

بالہم

۲۔ جون ۱۹۰۸ء

پیارے ٹامس

دیکھئے آپ نے کتنی بڑی غلطی کی تھی؟ اس لڑکی نے میری درخواست منظور کرلی۔ اور اس کے والدین کے روانہ ہونے سے پہلے پہلے شادی بھی ہو جائیگی۔

آجکل مَیں شادی کے انتظامات میں مصروف ہوں گئے ہفتہ سے اس موذی مرض کا سخت دورہ ہے اور مَیں باہر نکلنے کے قابل نہیں۔ اس وجہ سے مجھے تمام انتظامات خط و کتابت کے ذریعہ سے کرنے پڑتے ہیں مَیں نے رچمنڈ میں لاس کوم وِلا خرید لیا ہے۔ اور اُس کو آراستہ کرنے کے لئے میسرز ڈک ہم کمپنی کا تخمینہ منظور کرلیا ہے۔ مَیں نے اپنے وکلاء کو لکھدیا ہے۔ کہ مس لوسی کو جو عطیے دئے جانے والے ہیں۔ ان کے متعلق تمام کاغذات مرتب کرلیں۔ کاغذات تیار ہو رہے ہیں مگر میرے

ان علیات کو دیکھ کر میری فیاضی کا اعتراف کریں گے۔ میں نے اپنے بھتیجے فریڈ کا وظیفہ بھی دو چند کر دیا ہے۔ تاکہ اس کو میرے خیالات کی تبدیلی کی وجہ سے کسی قسم کا نقصان نہ ہو۔

لیکن میں ان تمام مصروفیتوں اور کاوشوں کے باوجود آپ کی اس عنایت کو نہیں بھول سکتا۔ جس کی بدولت آج مجھ کو یہ خوشی نصیب ہوئی ہے۔ اگر آپ میرا خط لوسی کو نہ بھیجتے تو یہ دن دیکھنا کہاں نصیب ہوتا۔ میں آپ کی اس عنایت کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ سے التجا ہے کہ آپ اپنے ایک نیاز کیش کی شادی میں شرکت فرما کر اسے سپاس اندوزی کا شرف بخشینگے۔ طبیعت کے اچھے ہوتے ہی تاریخ مقرر کرونگا۔ والسلام

آپ کا محب صادق

ولیم اسکیبرگڈ

---

۱۵ مسٹر بلیسنگٹن کا خط ولیم اسکیبرگڈ کے نام۔

۲۷۔ ورنا روڈ

سڈن ہم

۳۔ جون ۱۹۰۰ء

مشفق ولیم

آج صبح تمہارا خط ملا۔ اور اس نے مجھے دوبارہ حیرت زدہ کر دیا۔ اس قسم کا تعجب خیز واقعہ زندگی بھر میں یہ مجھے دوسری مرتبہ پیش آیا ہے۔

محض تم کو اپنی حماقتوں سے بچانے کی خاطر میں نے عمداً تمہارا خط مس لوسی کے پاس نہیں بھیجا اور اس وقت تک کے لئے روک لیا تھا۔ کہ میں تم سے تمہاری لغویت اور حماقتوں پر گفتگو نہ کر لوں۔ اور موقع کا متلاشی تھا۔ چونکہ تم کو لوسی سے ملنے کا موقع مل گیا۔ اس لئے اب میں اس خط کا لوسی کے پاس بھیجنا فضول سمجھتا ہوں۔ اور تمہارے پاس واپس کرتا ہوں۔ مجھ کو کبھی یقین ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ لوسی تم سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائیگی۔ مگر تم خود ہی لکھتے ہو۔ اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ورنہ میں کبھی اس خبر پر اعتبار نہ کرتا۔ کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ اس معاملہ میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے؟ میرے شبہ کو تقویت اس امر سے اور بھی ہو گئی ہے۔ کہ کل شام ہی کو تمہارا بھتیجا فریڈ آیا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اس کی منگنی لوسی سے ہو گئی ہے۔ نیز اُن کی اس شادی کے متعلق تمہارا طرز عمل قابلِ تحسین ہے۔ یہ ہے کیا تماشا؟

میں ہوں

تمہارا صادق

ٹامس بلیسنگٹن

۱۶۔ مسٹر فریڈرک اسکیٹر گڈ کا خط اپنے چچا کے نام۔

دی اسٹوڈیو

لایم اسٹریٹ

ٹومس بری

۳۔ جون ۱۹۰۸ء

قبلہ چچا جان!

مَیں آپ کی عنایات بزرگانہ کا جو مجھ پر اور میری پیاری لوسی پر ارزانی ہو رہی ہیں۔ کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ ان نوازشوں نے ہمارے دل پر گہرا اثر پیدا کیا ہے۔ اور مَیں صرف یہی عرض کرتا ہوں کہ ہم اپنی منا کحانہ زندگی میں آپکے احسانات سے گرانبار ہوکر قدم رکھینگے۔

نکاح پنجشنبہ کو قرار پایا ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ آپکی گٹھیا نکاح میں شرکت کرنے سے نہ روکے گی۔

مَیں آپ کی فیاضی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں

آپ کا فرمانبردار

فریڈ

۱۷۔ مس ملسوم کا خط مسٹر ولیم اسکیٹر گڈ کے نام

ایلویرا کاٹیج

ٹیوک ہم

۳۔ جون ۱۹۰۸ء

چچا جان قبلہ

القاب کی ندرت سے غالباً آپ خفا نہ ہونگے۔ کیونکہ بہت ہی جلد یہ امر خیال سے واقعیت کی صورت اختیار کریگا آپ کو فریڈ کے خط سے نکاح کی تاریخ کا علم تو ہو ہی چکا ہوگا مجھ کو امید ہے کہ آپ ضرور بالضرور تشریف لاکر شرکت فرمائیگا۔

مَیں آپ کو یہ خط بلّی کے متعلق لکھتی ہوں۔ کیا آپ اس کو ضرور خرید تے گا؟ مجھ کو تو امید نہیں کہ آپ اسے خریدینگے۔ کیونکہ اب مَیں انگلستان ہی رہونگی۔ اور اسے مَیں جُدا کرنا نہیں چاہتی۔

لیکن چونکہ آپ نے ہمارا اشتہار دیکھ کر اسکے خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی اسلئے اگر اب بھی آپ اس کے خریدنے پر اصرار فرمائینگے۔ تو بلّی آپ کی خدمت میں بھیجدی جائیگی۔

۱۸۔ ولیم اسکیٹر گڈ کے خط کا اقتباس جو اُس نے مسٹر ٹامس ملینگٹن کو لکھا تھا۔

× × × × × × ×

- - - - - - - - -

آپ نے تو سارا تماشا دیکھ ہی لیا۔ یہ بھی ایک عجیب معمّا تھا۔ آپ نے میرا خط مس لوسی کو نہیں بھیجا اور اس نے بڑا غضب ڈھایا۔ لوسی کو میرا جو خط ملا۔ وہ بلّی خریدنے کی درخواست تھی۔ جسے مَیں نے ۵ گنی میں خریدنا چاہا تھا آپ نے جو کچھ

غلطی کی ہے۔اس کے متعلق میں آپ کو کچھ نہیں کہتا۔کیونکہ اگر آپ اس خط کو بھیج بھی دیتے تو نتیجہ قریب قریب وہی ہوتا جو ہوا۔ بلکہ میری حماقت کا اظہار اس شخص کے سامنے بھی ہو جاتا۔ جس سے میں خاصکر چھپانا چاہتا ہوں۔ میری بیوقوفیوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔اور مجھے تجربہ ہو گیا کہ مس لوسی کی عمر کی لڑکیاں مجھ جیسے بڈھوں سے محبت نہیں کر سکتیں۔آپ نے جو مجھے یہ لکھا تھا کہ میں سٹھیا گیا ہوں اور بڑھاپے کی سنک میں عجیب عجیب بیوقوفیاں کر رہا ہوں۔ سچ مچ بالکل ٹھیک تھا۔میں نے سراسر حماقت کی ہے۔ اور آپ ہمیشہ پردہ پوشی کی کوشش کرتے رہے۔میں آپ کی ان کوششوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اب میں ملتجی ہوں کہ آپ مجھ پر اپنی وہی عنایات قائم رکھیں۔میں نے بہت غور کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس بیوقوفی کا مشتہر کرنا اور بھی حماقت ہے۔آپ کے سوا کوئی اس راز سے واقف نہیں۔اور مجھ کو اخفائے راز کی پوری امید ہے۔میں نے جو انتظامات کر دئے ہیں۔ انہیں قائم رکھنا چاہتا ہوں۔میں یہی ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔کہ جو کچھ ہوا۔اس کا مجھ کو پہلے سے علم تھا۔اور میرا مقصد ان تمام کارروائیوں سے یہی تھا کہ میرا بھتیجا اپنی مناکحانہ زندگی کے دور میں بیفکری سے قدم رکھے۔

میرے اس رویہ سے تمام خانگی بدمزگیاں رفع ہو جائینگی۔ فریڈرک ہے بھی بڑا سلیم الطبع لڑکا۔اور میری امداد کا ہر طرح مستحق ہے۔ اس کی دُلہن کے لئے میں نے جو کچھ کیا ہے۔اس کی قدر افزائی کے لئے کافی ہے۔اور میرے دل میں اس کی بہت توقیر ہے۔

اب میری التجا آپ سے صرف اتنی ہے کہ ہم لوگوں کی خاطر اس راز کو افشا نہ کیجئے۔میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے مذاق کا پردہ اخفا میں رکھنا کیسا کچھ صبر آزما ہے۔لیکن میں آپ کو اپنی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔اور آپ سے التجا کرتا ہوں۔کہ آپ اپنی زبان ذرا قابو میں رکھئے۔اور اپنے پُرانے نیازمند کو جو اپنی غلطیاں خوب سمجھتا ہے لوگوں کی نظروں میں احمق بننے سے بچائیے۔

آپکا نیازمند قدیم

ولیم اسکیٹرگڈ

مکرر آنکہ

وہ کمبخت بلی صندوق میں بند ابھی پہنچی ہے۔

(ترجمہ)

عبدالستار خاں

(پانی پت)

وحدانیت

میرا بس ہو تو کیفِ بیخودی کو جاوداں کر لوں
متاعِ ہوش کو غرقِ شرابِ ارغواں کر لوں

ضیائے شوق سے رنگیں کروں کاشانۂ غم کو
وہ آئیں یا نہ آئیں میں خیال آرائیاں کر لوں

غرورِ ناروا ہے ان کو تمکینِ خود آرا پر
بیانِ غم کروں تو خود انہیں محوِ بیاں کر لوں

اگر پہلو میں ان کے دِل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے
ملیں مجھ سے کہ دم بھر میں نہیں آتش بجاں کر لوں

کبھی آ کر تماشا دیکھ میری چشمِ رنگیں کا
جو چاہوں گلفشاں کر لوں جو چاہوں خونچکاں کر لوں

وہ بزم افروز ہے یا بارشِ انوار جاری ہے
یہی جی چاہتا ہے ان کو آنکھوں میں نہاں کر لوں

شکایت ان سے خوئے بے نیازی کی نہیں اچھی
یہی اچھا کہ دِل کو بے نیازِ دو جہاں کر لوں

نہیں تم کو یقینِ عشق تو اِک دن چلی آؤ
تمہیں کو ہمنوا کر لوں تمہیں کو ہم زباں کر لوں

وہ عطرِ عشق میں بس کر میرے دل میں چلی آئیں
مہک اُٹھیں فضائیں گر کسی کو رازداں کر لوں

کلیجے میں جگہ دے لوں نگاہِ کیف پرور کو
یونہی بیہوش ہو جاؤں یونہی مے نوشیاں کر لوں

کبھی تنہا ملیں گی وہ تو عابدؔ شرم آئیگی
کہ یوں کرنے کو محفل میں تو میں گستاخیاں کر لوں

عابدؔ

روحی فداک

گزشتہ سے پیوستہ

(۴)

فلورا محل میں واپس آکر اپنے کمرہ میں داخل ہوئی، اور خط کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اس آرزو میں کہ ان دس کے علاوہ اور دس گنیاں اس خط کو پانے والی ہستی سے ملیں گی۔ غرض دیر تک روشنی کے سامنے الٹ پلٹ کرتی رہی۔ بہت غور کے بعد اتنا پڑھنے میں آیا۔ کہ "میرے دل کی مالکہ" یہی رات ہمارے وعدے کی رات ہے۔ ایفائے وعدہ میں کوتاہی نہ ہو" فلورا یہ عبارت پڑھکر بہت خوش ہوئی۔ اور اس خیال سے زیادہ تسلی پائی کہ جو گنیاں رشوت میں مل چکی ہیں یہ تو گویا رقم بیعانہ ہے۔ اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ کیونکر خط پہنچائے کہ اتنے میں شفیعہ کے کمرہ سے گھنٹی کی آواز آئی۔ فلورا جھٹ لفافہ اپنی جیب میں رکھ کر شفیعہ کے کمرہ کی طرف دوڑی۔

نازنین شفیعہ اس وقت سنگار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی رات کے ملنے بننے سنورنے میں ہمہ طرح مصروف اور ایک اعلےٰ ترین حلبی بلوریں آئینہ کے سامنے محو آرائش تھی۔ میز پر آئینہ کے علاوہ مختلف قسم کے بہترین عطر، خوشبودار تیل، اور طرح طرح کے غازے، خوشنما شیشوں میں رکھے تھے۔

شفیعہ کی حرکات آرائش دیدنی تھیں۔ گویا وہ آئینہ پیرس کی ایک کیمیاوی زینت کی مشین تھا۔ جو اپنے اندر عجیب و غریب تاثیر رکھتا تھا۔ یعنے جو اُسے دیکھتا ہے۔ بندروں کی طرح سے عجیب وغریب حرکتیں، اور خود بخود آرائشیں کرنے لگتا ہے۔

شفیعہ کو دیکھ کر ایک بیگانہ جذبات انسان ضرور خیال کریگا۔ کہ یہ پاگل ہوگئی ہے۔ اس کے دماغ میں کچھ خلل آگیا ہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک دولتمند بیوہ ہے۔ اُس کے شوہر کی وفات کو بہت زمانہ گزر گیا۔ خدا مغفرت کرے وہ ایک نیک نیت، پاک دل آدمی تھا۔ اُس کی موت کے بعد دلشکستہ شفیعہ کو اس کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ کہ خود آرائش کرے اور محظوظ ہو۔ اپنے کو خوبصورت بنانے میں، کپڑوں کی زیبائش و آرائش میں، عزیز وقت صرف کیا کرے، اور خوش ہوا کرے۔ مگر خدا جانے اس زیب و زینت کا منشاء کیا تھا۔ ممکن ہے کہ زینت سے نوجوانوں کی نگاہوں کو حسن کی طاقت مقناطیسی دکھانا مدنظر ہو۔ تاکہ اسے محبت سے

دیکھیں، یا شاید اس طریقہ سے اپنی پچاس برس کی عمر کو بیس برس کی بنانا چاہتی ہو کہ یہ زمانہ عشق و محبت کی دلپذیر حکایات اور داعیات شباب و ہنگامۂ جذبات کا زمانہ ہے کم از کم اس دور کی یاد ہی تازہ ہو جاتی ہے۔ جو جانِ زندگی اور حاصلِ جوانی تھا اور گزر گیا۔ آپ حیرت نہ کریں۔ حسین و نازنین عورتیں کبھی اپنے کو بوڑھا نہیں سمجھتیں۔ اُن کا بڑھاپا صرف اُن کی موت ہوتی ہے۔ جس وقت فلورا اُس کے کمرہ میں داخل ہوئی ہے وہ اپنی زینت ختم کر چکی تھی۔

شفیعہ نے اُس سے مشورہ لیا کہ آج کی شب کون کون زیور پہنے، فلورا اُسے مشورہ دینے لگی۔ اور اُس کے حسن و جمال کی تعریف میں بہت زیادہ تمسخر و مضحکہ آمیز مبالغہ سے کام لیا۔ شفیعہ اپنے کمرہ میں ٹہلتی جاتی تھی جس طرح کوئی خوشنما طاؤس رقص کر رہا ہو۔ ابھی دونوں اسی حالت میں تھیں کہ محل سے قریب ہی [illegible] بندوق چلنے اور بگل بجنے کی آواز سنائی دی۔ شفیعہ نے فلورا سے کہا۔

شفیعہ۔ تمہیں معلوم ہے کہ آج کی رات ہمارے یہاں کون کون آئیگا۔ اور کس کس کی دعوت ہے؟

فلورا۔ ہاں ہاں فلاں فلاں دولتمند اور افیسر لوگ ہیں ان میں فواد بھی ہے۔

شفیعہ۔ کیا ان مہمانوں میں فواد بھی ہوگا۔ تجھے خدا کی قسم فلورا! سچ بتانا تیرے خیال میں یہ نوجوان کیسا ہے؟

فلورا۔ میری رائے اور میری نگاہ میں تو ان سب احباب سے بہتر ہے۔

شفیعہ۔ تو نے سچ کہا۔ بیشک یہ ایسا جوان ہے کہ عورت کا دل سینے سے کھینچ لیتا ہے۔ وہ کیسی ہی عورت کیوں نہ ہو، اُس کا سنہرا رنگ، دونوں بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ مونچھیں۔ قیامت ہیں۔ میں تو نہیں جانتی کہ خدا نے کسی اور انسان کے بشرہ کو ایسی حسین مونچھیں عنایت کی ہوں۔ مگر اُس کا حسن خود اس کے لئے مصیبت بن گیا ہے ظالم نے اپنی تمام گانے والیوں کی محبت، اور عمدہ عمدہ گھوڑوں کی قیمت میں، خدم حشم اور صبح و شام آنے والوں کی مہمانیوں میں لٹا ڈالی کمبخت اسقدر محبت کی داستانوں کا ہیرو ہے۔ اور عشق کے اتنے کھیل کھیلا ہے۔ کہ اس کے واقعات حد شمار سے باہر ہیں۔ اور اسقدر ہنگامے اس کی فتنۂ آشوب حسن کی بدولت برپا ہوتے ہیں۔ کہ جن کا حساب نہیں۔ عالی خاندان، معزز، شریف النسب بیاہتا بیویوں تک کی موتی سی آبرو اس سے محفوظ نہیں رہی۔ مگر یاد رہے کہ اگر کسی عورت کے شوہر کو اپنی بیوی کے عشق اور اس کے عاشق نار کا یہ راز معلوم ہو گیا اور اُس کے دل میں فواد کی عداوت کا جذبہ پیدا ہو گیا تو دیکھنا یہ افشاء راز کیا رنگ لاتا ہے۔ ایسا حملہ کریگا۔ کہ اس کی تیغ خون آشام کا ایک وار ہی کام کر دے گا۔ فواد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیگا۔ دیکھئے تقدیر کیا کچھ دکھاتی ہے۔

فلورا یہ سُنکر ہنس پڑی۔ پھر تمسخر آمیز انداز میں کہنے لگی میں سمجھتی ہوں۔ کہ اس معاملہ میں جناب کی رائے بھی ریحانہ کی رائے کے موافق ہے۔

شفیعہ کانپ گئی۔ اور زور سے چلّا پڑی۔ یہ تو نے کیا کہا۔

فلورا۔ اس میں تو کوئی بات ایسی تعجب کی نہیں ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ بیگم صاحبہ بھی فواد پرمٹ رہی ہیں۔ اور اس معاملہ کی تصدیق مجھے اس سے ہوئی ہے۔ کہ بیگم صاحبہ روز بروز دُبلی اور زرد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ان دنوں بات چیت بھی بہت کم کر دی ہے۔ اور اکثر کچھ کھوئی ہُوئی سی رہتی ہیں۔ جس روز سے اس نوجوان فوادؔ نے محل میں آنا شروع کیا ہے میں دیکھتی ہوں کہ وہ نہایت اداس، غمگین و دلشکستہ نظر آتی ہیں۔ اُن کے چہرہ کی وہ آب و تاب، آنکھوں کی وہ چمک دمک ہی نہیں رہی، جس وقت ان کی آنکھ فوادؔ پر پڑتی ہے نگاہوں اور چہرہ کی کچھ حالت ہی اور ہو جاتی ہے جو اس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شاید میرا یہ قیاس غلط نہ ہو۔

شفیعہ۔ تجھے وہم ہوگیا ہے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے عزیزہ ریحانہ کے بیاہ کو صرف چار سال کا عرصہ ہُوا ہے کبھی کسی وقت ایسا نہیں ہُوا۔ کہ اُس نے اپنے شوہر کو رنجیدہ کیا ہو دیکھنے والا تو بے اختیار کہدیگا۔ کہ اس عورت کا ماہ روشن یا معبود اکبر رشدی ہی ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر کرکے دیکھو تو ایمان کی بات یہ ہے کہ ریحانہ جسقدر حسین و نازنین ہے اسی قدر وہ نیکدل، خوش اطوار اور مہذب لڑکی ہے۔ بہرحال تو نے یہ خوب کیا کہ مجھے ہوشیار کر دیا۔ اب خدا نے چاہا۔ تو میں اس رازِ محبت کا پتہ لگاؤنگی۔ اور پوری کوشش کرونگی کہ اصل حقیقت کا انکشاف ہو جاتے۔ زمانہ کے عبرت خیز حالات سے جو جو سبق میں نے لئے ہیں۔ جو جو تجربات مجھے حاصل ہُوتے ہیں، اُن سے کام لونگی۔ اور جب کوئی ایسی بات دیکھوں گی تو سمجھا بُجھا کر، ڈرا دھمکا کر راہ راست پر لاؤنگی۔ میری ایسی عقلمند اور تجربہ کار بیوی کا یہی فرض ہے جو نہ خود اپنے شوہر کے سوا کسی سے محبت رکھتی تھی نہ اُس کا شوہر اُس کی محبت کے سوا کسی اور کا پرستار تھا۔

یہ کہہ کر شفیعہ ریحانہ کے کمرہ میں گئی۔ دیکھا کہ وہ بیٹھی ہُوئی ہے۔ ہاتھ میں ایک کتاب ہے اور سامنے بہترین خوشبودار پھولوں کا ایک گلدان رکھا ہُوا ہے۔

شفیعہ بیٹھ گئی اور غور سے نگاہیں گاڑ کر ریحانہ کے چہرہ کو دیکھنے لگی۔

ریحانہ۔ خیر تو ہے آج آپ کی نگاہیں مجھ پر بے طرح پڑ رہی ہیں۔

شفیعہ۔ اس لئے کہ میں دیکھتی ہوں تم کچھ دنوں سے روز بروز دُبلی ہوتی جاتی ہو۔ اور تمہارا گلاب سا شباب روز بروز کمھلاتا

چلا جاتا ہے، اگلے سال تک تمہارا شباب، تمہارا پیارا چہرہ ایسا تھا جیسے کوئی شگفتہ کلی یا تازہ گلاب کا پھول۔ کلی تو اب بھی وہی ہے۔ لیکن تازگی و شگفتگی باقی نہیں رہی پہلے چہرہ گویا انار و برف ممزوج تھا۔ مگر اب یہ صرف برف ہی برف باقی ہوں۔ اس طرح کی باتیں شفیعہ نے بتانا شروع کیں۔ اور کچھ ایسے ایسے پہلو پیدا کئے، ایسے ایسے جال پھیلائے۔ وہ وہ چالبازیوں سے، باتوں ہی باتوں میں کام لیا۔ کہ کوئی ایسا ویسا آدمی ہوتا تو ضرور اُس کے دامِ فریب میں آجاتا مگر ریحانہ اُس کی باتیں سُن سُن کر اور ہوشیار ہوتی جاتی تھی۔ اور برابر اس کی تردید کر رہی تھی۔ اِدھر شفیعہ لگاتار ہیر پھیر کے ایسی باتوں پر لاتی تھی کہ حسبِ امید جواب ملے۔ اور خیال کی تصدیق ہو جائے۔

ریحانہ برابر یہی کہے جاتی تھی کہ نہیں میری حالت میں کچھ تغیر نہیں ہوا۔ جو حالت پہلے تھی وہی اب بھی ہے۔ میں ویسی ہی اپنے شوہر کو عزیز رکھتی ہوں۔ اور اس کے سوا کسی کو نہیں چاہتی۔ آخر شفیعہ نے صاف صاف کہدیا کہ نہیں تمہیں فواد سے محبت ضرور ہے۔ فواد کا نام سنتے ہی ریحانؔ کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ اور تمام جسم میں لرزہ سا پڑ گیا۔ جیسے کوئی جنون یا کسی عصبی مرض کا دورہ پڑا ہو۔ یا چکر آگیا ہو۔ دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے روئی اور چند چیخیں مار کر بیہوش ہو کر گر پڑی شفیعہ گھبرا گئی۔ اور چاہا کہ گھنٹی بجا کر کسی آدمی کو مدد کے لئے بلائے مگر پھر فوراً ہی یہ خیال کر کے چپ ہو رہی کہ ایسا نہ ہو سارا راز فاش ہو جائے۔ اور رسوائی ہو۔ وہ خود اُٹھی اور ہوش آور و خوشبودار چیزیں ریحانہ کو سُنگھانا شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں مریضِ غم کو افاقہ ہوا۔ اس نے اپنی دونوں بیمار آنکھیں کھول دیں۔ ہوش آتے ہی سب سے پہلا جو کلمہ ریحانہ کی زبان سے بے اختیارانہ نکلا وہ یہ تھا "ہائے پیارے فواد" لیکن فوراً اُس نے دانائی سے کام لیا۔ اور دو چار کلمے ملامت، نفرت کے اُس کے ساتھ ملا دئے۔ اور بگڑنے خفا ہونے لگی۔ کہ آخر میرے سامنے کیوں یہ نام لیا گیا۔ پھر جھلّا کر شفیعہ سے بولی۔

ریحانہ۔ جناب آپ یہ چاہتی ہیں کہ خواہ مخواہ میں ایک ایسی بات مان لوں۔ جو کسی طرح ماننا نہیں چاہتی۔ اور کبھی اپنے لئے یہ ذلّت گوارا نہیں کر سکتی، بیکار آپ مجھے مجبور کرتی ہیں کہ بلاوجہ اپنے دل کی کُرید، اپنے سینہ اور اعضاء و جوارح کی چھان بین کروں۔

شفیعہ کے ہونٹوں پر تبسم جلوا ریز ہوا۔ گویا اُس نے اپنی مُنہ مانگی مُراد پالی۔ اور کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔ پھر ریحانہ سے کہنے لگی۔

شفیعہ۔ پیاری ریحانہ ایسے راز اگر سینے میں دفن کر دئے جائیں تو آدمی کو ہلاک کر دیتے ہیں، انہیں ظاہر کر نیکے سوا

تسکین وراحت کی کوئی صورت ممکن نہیں، کم سے کم مجھ سے تو اپنا راز کہو۔ اور اپنے دل کی کچھ حالت بتاؤ۔ تم سوچو سمجھو تو اسی میں تمہارے لئے کچھ آرام اور تشفی ہے۔ میں ایک سچی رازدار وہمدرد ثابت ہونگی، یہ کہکر ریحانہ کے گلے میں باہیں ڈال کر اُسے پیار کیا۔ اور اپنے سینے سے اس طرح لگالیا جیسے کوئی مہربان ماں اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ اور پھر وہی اپنی پہلی تقریر کا سلسلہ شروع کیا۔ غرض دیر تک اسی صورت سے دونوں میں اُلٹ پلٹ اور بحث تکرار ہوتی رہی۔ آخر پھر ریحانہ سے کہا۔

شفیعہ۔ تم بیکار اپنی محبت کو پردہ میں رکھنے اور عشق کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہاں چند آنکھیں اور بھی ہیں۔ جو تمہارے دل کی دھڑکن تمہارے چہرہ کی فسردگی اور تمہارے نم چشم کی گواہ عادل ہیں۔

ریحانہ۔ (بلند آواز سے) وہ میرے مکنونات کے شاہد کون ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔

شفیعہ۔ ایک تو میں۔ دوسری تمہاری خادمہ فلورا ابھی کوئی ایک گھنٹہ ہوا کہ مجھے کپڑے پہناتی اور تمہارا افسانہ محبت سُناتی جاتی تھی۔

ریحانہ (زور سے) ہائے میری شرم ہائے میری غیرت آہ! میں اس درجہ کو پہنچگئی کہ میری ماما تک اُن رازوں کو جان گئی۔ جو میرے دل کے کسی نامعلوم گوشہ میں مدفون تھے آہ! جنہیں تنہا خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا، یہ کہکر اپنے دونوں ہاتھ مُنہ اور آنکھوں پر رکھ لئے اور سسکیاں لے لے کر زار زار رونے لگی۔

شفیعہ اس کو نہایت نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ دلاسے اور تسلیاں دے رہی تھی۔ کہ ریحانہ گھبراؤ نہیں، ہر نوکر اپنے آقا کا اور ہر ماما اپنی مالکہ کے راز سے آشنا ہوتی ہے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مگر ریحانہ کو نہایت شاق تھا کہ فلورا کو اُس کے دل کا محبوب و محفوظ راز کیوں معلوم ہوگیا۔ اُس نے سوچا کہ اب فلورا کو اپنے یہاں رکھنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بلکہ ایک دائمی عذاب اور مستقل سامان اضطراب ہے۔ لہٰذا اُسے جلد سے جلد نکال دینا چاہتے۔

یہ سوچکر چاہتی تھی کہ گھنٹی بجائے اور فلورا کو بُلا کر اُس کا حساب کردے۔ اتنے میں محل کی صدر گھنٹی بجی اور رشدی کے ایک نوکر نے آکر اطلاع دی۔ کہ تقریباً ۵ منٹ بعد وہ مع اپنے شکاری دوستوں کے یہاں پہنچ جائینگے اس کے بعد ہی خانساماں نے رات کے کھانے کی پہلی گھنٹی بجائی۔ شفیعہ کمرہ سے نکلکر اپنے بھتیجے رشدی اور اس کے عزیز مہمانوں کے انتظار واستقبال کے لئے بڑے ہال میں آگئی، ریحانہ تنہا اپنے کمرہ میں، اپنے پریشان خیالات اور منتشر افکار کے دریا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حزن و ملال نے اُس پر غلبہ کر لیا تھا۔ جو کچھ واقعات پیش آگئے تھے۔

اُن کے خوفِ انجام سے وہ نہایت ہراساں اور بدحواس تھی۔ اُس کے آنسو کسی طرح نہیں تھمتے تھے۔ اتنے میں کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ ریحانہ نے جھٹ ریشمی رومال سے آنسو پونچھ کر کہا۔ کون ہے آجاؤ۔ یہ اندر آنے والی، ریحانہ کی خادمہ فلورا تھی۔ جس نے یہ ساری آگ لگائی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ فلورا نے اندر آکر کمرہ کی تمام موم بتیاں روشن کر دیں۔ ریحانہ اُس کو دیکھتی جاتی تھی۔ اور اُس کا خون جوشِ غضب سے رگوں میں کھول رہا تھا۔

پھر فلورا آکر اپنی مالکہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور کہنے لگی:۔

فلورا۔ کھانے سے پہلے کوئی کام ہو تو بتایئے۔

ریحانہ (سخت لہجہ میں) نہیں کوئی کام نہیں جاؤ!

فلورا۔ میں دیکھتی ہوں کہ حضور کے سایہ کے بند کھلے ہوئے ہیں۔ اجازت ہو تو باندھ دوں۔

ریحانہ (غصّہ اور نفرت سے منہ بنا کر) میں تجھ سے کہہ چکی کہ کوئی کام نہیں یہاں سے دُور ہو۔

فلورا (یہ دیکھ کر کہ مالکہ آج اس سے بےطرح بگڑی ہوئی ہے) اچھا تو میں جاتی ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے ایک امانت اپنی مالکہ کے حوالہ کرنا چاہتی ہوں۔ جس کی میں ذمہ دار بنائی گئی ہوں۔

ریحانہ۔ وہ امانت مجھے ابھی لا کر دے۔ اور میرا پیچھا چھوڑ۔

فلورا (جیب سے خط نکال کر) یہ خط حضور کی خدمت میں بھیجا گیا ہے۔

ریحانہ۔ تجھے کس نے دیا؟

فلورا (ذرا جواب میں گھبرا اور لڑکھڑا کر) جن صاحب نے دیا ہے۔ میں اُنہیں نہیں پہچانتی۔

ریحانہ۔ میں کبھی نہ مانوں گی۔ کہ تو اُس شخص کو نہ جانتی ہو۔ اگر نہیں جانتی تو میں بھی کسی مجہول و نامعلوم شخص کا خط نہیں لے سکتی۔ آخر اُس نے ڈاک سے کیوں نہ بھیجا۔ یہ لے اپنا خط اور اپنا کالا منہ کر۔

فلورا کو اپنی مالکہ کا یہ غیض و غضب دیکھ کر اقرارِ حقیقت کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ اس وقت اس کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ ریحانہ اس بُری نظر سے اُسے گھور رہی تھی۔ کہ اُس کے دلی غصّہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے ضبط سے کام لیا۔ اور اپنے کو سنبھال کر کہا۔ سچ سچ بتا کیا یہ خط فواد ہی نے دیا ہے۔

فلورا۔ جی ہاں اور یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری بیگم صاحبہ کا اس سے واقف ہو جانا ضروری اور عین مصلحت ہے ہر چند میں نے اُس کے لینے میں تردد کیا مگر اپنی دلیل سے اُنہوں نے مجھے خاموش و مجبور کر دیا۔ آخر مجھے راضی ہو جانا پڑا۔ نیز حضور کا احترام بھی ہرگز اجازت نہیں دیتا تھا۔ کہ میں کوئی بُرا خیال دل میں لا کر خط لینے سے انکار کر دوں۔

ریحانہ نے ایک چھوٹی سی صندوقچی کھول کر ایک روغنی کاغذ نکالا۔ جس میں کچھ اشرفیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اور وہ کاغذ فلورا کو دیکر کہا۔ کہ لو یہ تمہارے ایک سال کی تنخواہ ہے۔ اب یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔ اور پھر کبھی یہاں نہ آنا۔

یہ ماجرا دیکھ کر فلورا حیران تھی۔ مگر فوراً مسئلہ کی تہ کو پہنچ گئی۔ اور بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگی۔

فلورا۔ مگر حضور کو مجھے اس طرح بے قصور نکالنے پر آئندہ افسوس کرنا پڑیگا۔

ریحانہ۔ میرے خیال میں تو کوئی افسوس کی بات نہیں۔

فلورا۔ مگر مجھے اسکا یقین ہے بہر حال میں جناب سے رخصت ہوتی ہوں۔ میں محل میں تو رہونگی۔ مگر جناب کے پاس نہ آؤنگی۔

یہ کہہ کر فواد کا خط چھوٹی سی میز پر رکھدیا۔ اور دروازہ کی طرف چلی۔

ریحانہ (فلورا کو پکار کر) تو کوئی چیز یہاں بھول چلی ہے۔

فلورا۔ نہیں! خط جس کے نام کا تھا اُس کو پہنچ گیا۔ اب وہ واپس نہیں جا سکتا۔

ریحانہ۔ میں حکم دیتی ہوں کہ خط یہاں سے لے جا۔ اور جس نے دیا ہے اُسی کو واپس دے۔

فلورا۔ بیگم صاحبہ کو معلوم ہے کہ اب میں اُن کی نوکر نہیں رہی ہوں۔ لہٰذا اب میں کسی حکم کو ماننے کے لئے بھی مجبور نہیں ہو سکتی۔ یہ کہکر باہر نکل آئی۔

ریحانہ کی نظر خط پر پڑی تو وہ اپنے جی میں کہنے لگی۔

شفیعہ سچ کہتی تھی۔ کہ مردوں کو جب کوئی غرض ہوتی ہے تو وہ ذرا بھی احتیاط سے کام نہیں لیتے، فواد نے محض اس امید پر یہ خط لکھنے کی جرات کی کہ میں پڑھ لونگی لیکن میں قسم کھاتی ہوں کہ یونہی سربند اُن کا خط اُن کے پاس واپس جائیگا۔ اور میں اس طرح بھیجے ہوئے خط کو ہرگز نہیں پڑھ سکتی اُنہیں بھی تو معلوم ہو کہ میری ساری کوشش رائگاں گئی۔ اور بے احتیاطی کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی ہوتا ہے۔ اب وہ یہ سوچنے لگی کہ یہ خط فواد تک واپس کیونکر پہنچایا جائے۔ مگر کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں نہ آیا جو خطرہ سے محفوظ ہو۔ آخر یہ تدبیر سوجھی کہ خط کو جلا دینا چاہیے۔ چنانچہ اس کا ایک سرا پکڑ کر چراغ کے قریب لے گئی، ریحانہ کا نازنین ہاتھ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے ہاتھ میں کوئی ناگن لئے ہو۔ لیکن کاغذ روغنی تھا۔ اس وجہ سے وہ خط مطلق نہ جلا بلکہ صرف اُوپر کا حصہ سیاہ ہو گیا۔ ریحانہ کو اور زیادہ غصہ آیا۔ اُس نے سُرخ لاکھ کی مہر چھُڑانا چاہا۔ تاکہ خط نکالکر آسانی سے جلا سکے۔ لفافہ کھولا تو بلا ارادہ اُس کی نگاہ خط پر گئی۔ اس نے دیکھا کہ نہایت باریک حرفوں میں ایک طولانی داستان تحریر ہے۔ ریحانہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ لکھتے وقت فواد کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اور وہ مشکل سے سیدھی سطریں لکھ سکا ہے۔ وہ اپنی نگاہ پر ملامت کرنے لگی۔ خط کے کاغذ کو چراغ کی لو سے لگانے ہی کو تھی کہ دہلیز پر کس کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی

ریحانہ فوراً سمجھ گئی کہ آنے والا اُس کا شوہر رشدی ہے۔ اُسنے بڑی پھرتی کے ساتھ خط کو اپنے سینہ بند میں رکھ کر اس طرح چھپالیا، جیسے کوئی عزیز ترین راز سینے میں مستور کیا جاتا ہے رشدی نے آکر دیکھا کہ ریحانہ پریشان و اداس کھڑی ہوئی ہے۔ چہرہ کا رنگ زرد ہے۔ اور کچھ آثار اضطراب نمایاں ہیں۔ ریحانہ کا یہ اضطراب اور یہ چہرہ کی زردی دیکھ کر اُس کی طرف بڑھا جس طرح کوئی عاشق ناشکیب اپنی محبوبہ کو پیار کرنے کے لئے اُس نے ریحانہ کے گلگوں مگر افسردہ چہرہ کو دیکھ کر کہا۔

رشدی۔ پیاری! کیوں کیسا مزاج ہے۔

ریحانہ۔ کوئی ایک گھنٹہ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ دم گھٹا جاتا ہے۔ سینہ میں اُلجھن ہے۔ اور ہلکے ہلکے چکّر آرہے ہیں خدا جانے کیا بات ہے، سر گھوم رہا ہے۔ اور سر بیٹھا جاتا ہے۔

رشدی۔ کچھ تعجب نہیں، فضا کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہوا کہربائیت سے لبریز ہے۔ آسمان سخت آندھیوں کی وجہ سے گرد آلود ہو رہا ہے۔ اور پیاری ریحانہ تم اسقدر نازک ہو کہ ایسی تیز ہوا تمہارے جسم نازنین پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی، تو کیا ہمارے ساتھ کھانا نہ کھا سکوگی۔

ریحانہ۔ نہیں میں کھانے کے کمرہ میں چلنے کو تیار ہوں۔ یہ ارادہ سُنکر رشدی کا دل مسرتوں سے لبریز ہوگیا۔ اُس نے ریحانہ کے شانہ میں ہاتھ دیدیا۔ ریحانہ سہارا دیتے ہوئے کھانے کے کمرہ میں اُتری۔ مگر اس طرح جیسے کوئی غزالۂ رعنا اپنے غزال مست کے ساتھ خراماں پہاڑ کی چوٹی سے دامن کوہسار میں اتر رہی ہو۔

(۵)

رشدی بے کے احباب، رشدی کے اپنی بیوی کے پاس جانے سے پہلے دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ کچھ تو شفیعہ خانم سے باتیں کرنے لگے۔ جو ایک آرام کرسی پر ایک ادائے خاص کے ساتھ بیٹھی ہوئی تبسّم ریز لبوں، اور سحر فروش نظروں سے نوجوانوں کو پیامِ خود رفتگی دے رہی تھی۔ اپنا حسین و جمیل پنکھا ہاتھ میں لئے تھی۔ جس کی رنگینیاں ساعدِ سیمین کی خفیف سے خفیف دلربایانہ جنبش کے ساتھ ملکر حُسن پرست دلوں میں ارتعاشِ عظیم پیدا کر رہی تھیں اُس کی ہر ہر بات اور ہر ہر ادا سے شانِ نمائش نمودار تھی۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے اُس نے اپنا کتنا عزیز وقت صرف کیا ہے۔ رشدی کے چند رفقاء دریچہ کے قریب حسن و نمائش کے اس مرقع سے بالکل الگ بیٹھے محو راز و نیاز تھے۔ یہ چار شخص تھے۔ جن میں ایک فواد بے بھی تھا، ایک صاحب اُس سے پوچھ رہے تھے۔ کہ شکار میں اخیر وقت تم ہم لوگوں سے الگ ہو کر کیوں اور کہاں چلے گئے تھے۔ فواد کہہ رہا تھا۔ کہ مَیں راستہ بھول گیا تھا۔

مگر چونکہ آخر وقت تک کتّے برابر بھونکتے رہے۔ اور سیٹیاں بجا کی تھیں، جو بتاتی تھیں کہ سب شکاری اطراف وادی میں ہیں۔ اس وجہ سے فواد کا یہ جواب معقول نہیں سمجھا گیا تھا۔ احباب فواد کو بہت تنگ کر رہے تھے اور لگاتار سوالات کا سلسلہ جاری تھا۔ فواد جواب دینے میں اس طرح بغلیں جھانک رہا تھا اور پہلو بچانا چاہتا جیسے لومڑی اِدھر اُدھر جگہ ٹٹولتی ہے۔ اتنے میں محل کا ایک خدمتگار کمرہ میں آیا۔ اُس نے فواد کو ایک خط لاکر دیا۔ اور کہا کہ یہ خط آپ کا نوکر لایا ہے۔ جو ابھی سر پٹ گھوڑا دوڑاتا ہُوا بروصہ سے آیا ہے۔ فواد اپنے احباب سے اجازت لیکر چند قدم کے فاصلہ پر ہٹ آیا۔ لفافہ کھولکر دیکھا۔ تو معلوم ہُوا کہ خط بہت طولانی ہے۔ اور شہر مذکور کے کسی وکیل کے پاس سے آیا ہے۔ خلاصہ مطلب یہ تھا کہ عدالت کل صبح تک آپ کے مکان کا تمام سامان، گاڑیاں، گھوڑے، قرضخواہوں کے مطالبہ میں قرق کرنے والی ہے۔ پھر بھی تقریباً پندرہ ہزار فرنگ کا قرض اور ایسا رہ جائیگا جس کی وجہ سے آپ کی گرفتاری کا اندیشہ ہے۔ وکیل صاحب نے یہ رائے بھی دی تھی کہ فواد بروصہ واپس نہ آئے۔ بلکہ سو یترہ (پیرس) یا کسی اور طرف چلا جائے۔ اور مقام جنیف لوزان سے اپنے قرضخواہوں کو ایک تحریر لکھ بھیجے کہ اُسکے تمامتر املاک اور مکان کے ذمہ دار و مختار وکیل صاحب ہیں۔ اس صورت سے غالباً وہ لوگ راضی و مطمئن ہوجائینگے اور بتدریج ادائے قرض کی تدبیر ہوجائیگی۔ خط میں پوری تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ رہن شدہ زمین کی بیع کا کس طریقہ سے انتظام کیا گیا ہے۔ جس سے زر رہن نکل آئیگا۔ اور خط کا آخری فقرہ تھا کہ فواد کو زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹے کے اندر ضرور یہ مقام چھوڑ دینا چاہیئے۔

فواد خط پڑھکر ختم نہ کرنے پایا تھا کہ اس کی حالت بدل گئی۔ چہرہ پر ہوائیاں چھٹنے لگیں۔ کیونکہ اُسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ معاملہ اسقدر طول کھینچ جائیگا۔ اور ساری تدبیریں بیکار و بیوقت ہوجائیں گی۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم فواد بے کے کچھ سوانح زندگی مختصر طور پر ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔

(باقی آئندہ)

محوی صدیقی

برسات

(۱)

ہر شے میں کمال دلبری ہے — ہر نقش میں وصف دلکشی ہے
بلبل کی چہک میں جنت گوش — پھولوں کی مہک میں عشرت ہوش
اک دفترِ حسن ہر کلی میں — کیا رنگ بیاں ہے سادگی میں
ہے سازِ سکوت کوہ و بن میں — اہنگ طرب ہے انجمن میں
ہے جلوۂ آفتاب میں حسن — آئینۂ ماہتاب میں حسن
دن میں ہے مزا تو رات میں لطف — فطرت کی ہے بات بات میں لطف
ہے پیکرِ حسن بزمِ ہستی — خمخانۂ بےخودی و مستی

اک حسن کا بحرِ بیکراں ہے
اک نغمۂ عشقِ جاوداں ہے

(۲)

اندوہ ربا ہے منظرِ ابر — کیا روح فزا ہے منظرِ ابر
مستانہ خرام آ رہا ہے — گلزار پہ بن پہ چھا رہا ہے
میخانہ بدوش ہیں گھٹائیں — پیغام سروش ہیں صدائیں

گلہائے چمن کھلے ہوتے ہیں یا مے سے سبو بھرے ہوئے ہیں
اِک لطف ہے نغمہائے نے میں اِک رنگ ہے جامہائے مے میں
اِک سوز ہے قمریوں کی کُو میں اِک کیف ہے نعرہ ہائے ہُو میں
باغوں میں ہیں جمع مہ جبینیں کیا جھول رہی ہیں نازنینیں
مِل مِل کے ملہار گا رہی ہیں گا گا کے وُہ مُسکرا رہی ہیں

کیا راگ میں رنگ مِل گیا ہے
کیا رنگ میں چنگ مِل گیا ہے

(۳)

اس راحتِ جاں سے دُور ہوں میں مجبور ہوں ناصبور ہوں مَیں
اِک محشرِ آرزو بنا ہوں وارفتہ جستجو بنا ہوں
سوسن میں سمن میں نسترن میں گلہائے چمن کے پیرہن میں
ہر مطرب خوش گلو کی لے میں ہر بربط آب جو کی لے میں
ہر رنگ میں اس کو ڈھونڈتا ہوں ہر چنگ میں اس کو ڈھونڈتا ہوں

وحشت ہے مجھے گل و سمن سے
نفرت ہے ہجوم انجمن سے

اثر صہبائی

بامُراد بیوہ

اُف! یہ آدھی رات، ہر سو خامشی چھائی ہوئی
آہ، یہ خوابِ گراں کی بیہُشی چھائی ہوئی
پتّہ پتّہ ذرّہ ذرّہ دہر کا خاموش ہے
یعنی ہر ذی رُوح ہستی خواب سے ہمدوش ہے
ہے فضائے گلستاں آئینۂ صبر و سکوں
پتّیاں خاموش ہیں اور ڈالیاں ہیں سرنگوں
بے خبر ہیں پھول سارے، سو رہی ہے ہر کلی
حُسن ہے خوابیدہ، فطرت ہے بلائیں لے رہی

اپنے غم خانے میں ہے بیٹھی ہوئی اک نازنیں
فکر میں ڈوبی ہوئی افسردہ و اندوہگیں
دیکھتی ہے وہ کبھی کھڑکی سے سوئے گلستاں
یک بیک سینے سے اس کے اُٹھنے لگتا ہے دھواں
چودھویں کا چاند ہے سطحِ فلک پر جلوہ گر
ہے نمود کہکشاں بھی جاذبِ ذوقِ نظر
مرتعش ہوتی ہیں کرنیں ہر طرف گلزار میں
چبھتے ہیں نشتر سے پیہم اُس کے قلبِ زار میں
چپکے چپکے کہہ رہی ہے بیٹھ کر وہ نازنیں
ان مناظر سے مجھے دلبستگی مطلق نہیں
سال بھر کی بات ہے آئے تھے وہ گھر خیر سے
سال بھر کے بعد پھر شکووں کے تھے دفتر کھلے
میرا کہنا "ہے جدائی آپ کی صبر آزما"
اُن کا فرمانا کہ "اُلفت کا یہی تو ہے مزا"
"ہے یہی شرطِ محبّت، ہے یہی شرطِ وفا
ہجر کے صدمے اُٹھاتے تم نے تو اچھا کیا"
"رنجِ فرقت ہے اگرچہ رُوح فرسا، دلگداز
اہلِ دل کے واسطے ہے مایۂ صد امتیاز"
"چاہتا ہے جو کہ لُوٹے دل لگانے کے مزے
ہجر کے صدمے اُٹھائے، صبر سے وہ کام لے"
"اک نہ اک دن اُس کو پھر اس کا صلا بل جائیگا
خود بخود آکر کوئی دردآشنا مل جائیگا"
اتنا کہکر ہنس پڑے وہ ہاتھ میرا چوم کر
جوشِ اُلفت میں اُٹھے اپنی جگہ سے جھوم کر
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی چار سو گلزار میں
غنچہ و گل سب کے سب تھے سُرخ رو گلزار میں

پیاری پیاری چاندنی تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی تھی ہوا
منظرِ گلزار تھا حیرت نما، راحت فزا
تھی مجھے قسمت سے اُس وقت ان کی ہمدوشی نصیب
بادۂ اُلفت سے تھی دونوں کو مدہوشی نصیب

آج بھی تو ہے وُہی منظر مگر بے لطف ہے
دل لگی کا کوئی بھی ساماں نہیں میرے لئے
رہ گئے ایسے کہ ابتک کچھ خبر اُن کی نہیں
کچھ نہیں معلوم وُہ خوش ہیں کہ ہیں اندوہگیں
ہے کوئی ایسا کہ جو اُن کی خبر لادے مجھے
یا پھر اُن کے پاس تک ہی کوئی پہنچا دے مجھے
اُن کی صورت دیکھ کر آجائیگا دل کو قرار
بے رُخی پر اپنی ہو جائیں گے وہ بھی شرمسار
لیکن اس دُنیائے فانی میں یہ ممکن ہی نہیں
آرزوئے دل جو بر آئے نہیں اس کا یقیں
موت آجائے تو شاید اُن کی صورت دیکھ لوں
منحصر ہے دید ہی اس پر تو اچھا مر رہوں

قصد کرتی ہے وہ اپنی جان دینے کا - مگر
یک بیک اُٹھتی ہے بچّے کی طرف اُس کی نظر
کشمکش میں پڑ گئی پھر اُس کی جان نازنیں
سوچتی ہے اس طرح مرنا مجھے زیبا نہیں
زندگی ہے تلخ میری، دل بھی میرا ہے اُداس
یہ مگر "ننھا" رہیگا بعد میرے کس کے پاس؟

وہ نہیں دُنیا میں اچھا تھا یہی حکمِ خدا
آ مرے "ننھے" کہ اب تو ہی ہے میرا آسرا
زندگیِ تلخ میری تجھ سے اب وابستہ ہے
مَیں جیوں گی تیری خاطر دل اگرچہ مُردہ ہے
یاد جب آئیگی اُن کی شامِ فرقت دیکھ کر
دل ہرا ہو جائیگا پھر تیری صورت دیکھ کر
تیری صورت میں تجلّی ریز ہے اُن کا جمال
تیری صورت دیکھ کر مٹ جائیگا دل سے ملال
مرنے والے کی محبّت کی ہے تو ہی یادگار
آنکھ کا تارا ہے میری اور دل کا ہے قرار

راز

نقد و نظر

باغبان

مولوی حامد حسین صاحب قادری ہندوستان کی اُن چند مغتنم ہستیوں میں ہیں جن کی زندگی کا واحد مقصد ادبی خدمت ہے۔ آپ کے ذوقِ سلیم اور مذاقِ شعری کا اندازہ ادیب الٰہ آباد اور مرحوم نقّاد آگرہ کے ان گزشتہ پرچوں سے ہو سکتا ہے۔ جو آجتک آپ کے رشحاتِ قلم کی خاموش داد دے رہے ہیں۔

یوں تو آپ نے ہندوستان کے مختلف رسائل میں مضامین لکھے ہیں۔ مگر جناب دلگیر سے ذاتی مراسم کی بناء پر "نقّاد" ہی وہ پرچہ ہے جو آپ کی مستقل قلمی امداد پر بجا فخر کر سکتا ہے۔

لیکن یارانِ طریقت کی برہمی اور ہمنواؤں کی خاموشی کے بعد لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ شاید اب آپ خدانخواستہ ہمیشہ کے لئے گوشہ گیر ہو چکے ہیں۔ مگر "باغبان" کی اشاعت نے اس مایوسی میں پھر امید کی ایک جھلک پیدا کر دی ہے۔ خواہ یہ بھی فریبِ خیال کیوں نہ ہو۔

آپ ہندوستان میں وہ پہلی ہستی ہیں جس نے ٹیگور کی شاعری کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ اور ایک کافی عرصے تک آپ کے تمام تر خیالات اس کی شاعرانہ بلند پروازیوں میں غرق رہے ہیں۔ جس کے بعد یہ کہنے میں ذرا بھی اندیشۂ تردید نہیں۔ کہ آپ نے ٹیگور کی شاعری کو جس حد تک سمجھا ہے۔ شاید وہانتک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوئی ہے۔ میں خود ٹیگور کی شاعری کا قائل نہ تھا، اور متعدد لوگوں کے تراجم دیکھ کر یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ اس کی شاعری محض مجذوب کی بڑ ہے یا شاندار الفاظ کا محل استعمال قابلِ داد ہے۔ بطور نمونہ دو تین ٹکڑوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

جو کچھ تمہارے رضامند ہاتھوں سے ملیگا۔ لیلونگا۔
مَیں اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔
ہاں، ہاں، مَیں تمہیں جانتی ہوں۔ قانع فقیر جو کچھ کسی کے پاس ہے تم وہ سب مانگتے ہو۔
اگر میرے لئے ایک آوارہ شاخ پھول ہی ہے۔
تو مَیں اس کو بھی اپنے دل میں رکھ لونگا۔
لیکن اگر کانٹے ہوں۔
مَیں انہیں بھی برداشت کر لونگا۔

ہاں، ہاں میں تمہیں جانتی ہوں قانع فقیر؟ جو کچھ کسی کے پاس ہے تم وہ سب مانگتے ہو۔

اگر صرف ایک بار تم اپنی محبت آمیز آنکھیں میرے چہرے کی طرف اُٹھا دو تو وہ میری حیات ایسا شیریں بنا دیگی کہ پھر اس پر موت کا قابو نہ چل سکیگا۔

لیکن اگر ستم آمیز نگاہیں ہوں ؟

مَیں ان کو بھی اپنے دل کے پار ہونے دُونگا۔

ہاں، ہاں مَیں جانتی ہوں اے قانع فقیر! جو کچھ کسی کے پاس ہے تم وہ سب مانگتے ہو۔

(۲)

پیارے مَیں تم سے محبت کرتی ہوں، مجھے محبت میں معاف رکھو، مَیں ایک گم کردہ طائر کی طرح محبوس ہوگئی ہوں جب میرے دل پر صدمہ پہنچتا ہے۔ تو وہ بے نقاب و عریاں ہوجاتا ہے، پیارے ترحم سے اس کی پردہ پوشی کرو۔ اور محبت میں مجھے معاف رکھو۔

پیارے اگر تم مجھ سے محبت نہیں کرسکتے تو دُور سے مجھے ترچھی نظر سے نہ دیکھو، مَیں کونے میں چھپ جاؤنگی اور تاریکی میں بیٹھ جاؤں گی، مَیں دونوں ہاتھوں سے انفعال رسوا کو چھپالونگی۔ پیارے اپنا چہرہ میری طرف سے پھیر لو۔ اور مجھے دردو الم میں معاف رکھو۔

پیارے اگر تم مجھ سے محبت نہیں کرسکتے تو مجھے مسرت میں معاف رکھو۔

جب "سیلاب نشاط" میرے دل کو بہالیجاتے تو میری خطرناک وارفتگی پر خندہ زن نہ ہونا۔ جب مَیں اپنے تخت پر بیٹھوں اور "ستم محبت" کے ساتھ تم پر حکومت کروں، جب دیوی کی طرح تمہارے لئے فرمان عنایت لکھوں، تو پیارے میرے غرور کو برداشت کرنا اور مجھے اس مسرت میں معاف کردینا۔

(۳)

نہیں میرے دوستو! مَیں جوگی نہیں بن سکتا، تم جو چاہو کہو مَیں ہرگز جوگی نہیں بن سکتا۔ جبتک کہ وہ میرے ساتھ جوگن بننے کا عہد نہ کرے۔

یہ میرا مصمم ارادہ ہے کہ اگر مجھے کوئی سایہ دار جائے امن اور کوئی شریک ریاضت نہ مل سکیگا مَیں ہرگز زہد اختیار نہ کرونگا۔

نہیں میرے دوستو! مَیں ہرگز اپنا گھربار نہیں چھوڑ سکتا، اور "خلوت صحرا" اختیار نہیں کرسکتا۔ اگر اس کے گونج پیدا کرنے والے سایہ میں کوئی خندۂ مسرت زمزمہ سنج نہ ہو۔ اگر کسی زعفرانی دوپٹے کا پلّو ہوا میں نہ اُڑتا ہو، اگر اس "خلوت صحرا" کا سکوت آہستہ سرگوشیوں سے زیادہ گہرا نہ بن جائے، مَیں ہرگز جوگی نہ بنونگا۔

سیّد ابو محمد ثاقب

ایک روپیہ کی کتابیں تین آنہ میں

رعایتی اعلان یہ کتابیں جو ہر ایک پہلو سے نہایت سبق آموز عمدہ اور ملک کے ہر حصہ میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ صرف تھوڑے عرصہ کیلئے رعایتی قیمت پر دی جا رہی ہیں۔ اتنی عظیم الشان رعایت آجتک کسی کتب خانہ کی طرف سے نہیں ہوئی۔ کتب فروشوں کو اکٹھا سٹاک منگوا کر رکھ لینا چاہیئے ایک روپیہ سے کم کتب کا آرڈر ارسال نہیں کیا جائے گا۔ محصولڈاک بذمہ خریدار۔

نام کتاب

مسٹریز آف انڈیا ہر دو حصہ
مسٹریز آف افریقہ
مسٹریز آف کشمیر
مسٹریز آف کوارٹ
مسٹریز آف پنجاب
مسٹریز آف سانگر
مسٹریز آف انگلینڈ
مسٹریز آف کابل
مسٹریز آف دہلی
مسٹریز آف پولیس
مسٹریز آف جہانات
مسٹریز آف شاہان ایران
مسٹریز آف لنڈن
مسٹریز آف دنیا
مسٹریز آف سمرقند
مسٹریز آف جاپان
مسٹریز آف خانگی

عجیب و غریب ناول

کشورہ بھر خون
بیزار خاوند
ایک انوکھی عورت
گستاخ عورت
وہ عورت جسنے کرکے دکھایا
ایک عورت چار خاوند
بے صبر عورت
وفادار عورت
خوبصورت مالن
چالاک عورت
تعلیم نسوان
فریبی عورت
خیر دل یا بدکاری

نام کتاب

زبردستی کی شادی
بہن کا سرمایہ بھائی نے اڑایا
بچھڑی ہوئی دلہن
انتخاب دلہن
مایوس دلہن
شوہر کی بیٹی
کرنیل کی بیٹی
عالمگیر کی پیاری بیٹی زیب النساء
خون عاشق
بامراد عاشق
کامیاب عاشق
نتیجہ عشق
آئینہ عشق
گلزار عشق
انجام عشق
شعلہ عشق
قتل عشاق
عاشق صادق
ناکام محبت
بدقسمت معشوقہ
انجام محبت
انجام الفت
محبت کا چشمہ
وصل ممتاز
حسرت وصل
راز دل
عورت کا قاتل
خون آرزو
کشتہ محبت
جعلی معشوقہ
رشک قمر
شبیہ ادا

نام کتاب

کامل عیار
خوبصورت ڈاکو
پراسرار ڈاکو
انارکلی کلاں
راز محبت
اسرار حسن
انمول ہیرا
یوسف زلیخا ناول
نظارہ عبرت
جوانا مرگ
میرے خاوند کا راز
جمیل و شکیلہ
سوہنی مہیوال
بلطرز ناول
ہیر رانجھا بطرز ناول
پریتم تارا
رنج و ملال
بارہ مصالحہ کی چاٹ
حسن کشمیر
شہنشاہ جہانگیر
انتقام ہر دو حصہ
روح لیلےٰ
تقدیر کا چکر
دھوکہ یا کمالات انگلستان
عصمت پاشا مکمل
جنت الفردوس
شاد کام
جادوگر
اسرار حرم
سپاہی کی دلہن
آہ مظلوم
گردش تقدیر

نام کتاب

خون مظلوم
کنیز فاطمہ
کامنی
شمسہ ہر دو حصہ
لال کپتان
نیم حکیم خطرہ جان
جانگداد
جفائے پدر
بنگالے کا چاند
نقلی بابو
بنگالی جنٹلمین
دو جورو کا شوہر
منوہر لتا
خودکشی
صبح زندگی
رسم و رواج
چالاک مرد
رشک حور
فریب محبت
نل دمینتی
سوت پر فتح
جوہر زندگانی
قتل الگزینڈر
ممتاز ناول
انجنا کماری
آفت نصیب
جان اسیر
نیرنگ دنیا
من موہنی
ارزر دھم
مذہبی قربانی
مرقع اقوام عالم
عیار ملزمہ
سحر حروف

نام کتاب

شادی غم
چالاکیوں کا مرقع
جنٹلمین بنکے کیوں میری مٹی خراب کی
شکوک پولیس
پھر تو آج سے میری زوجہ نہیں
آغاز عالم
گلدستہ پارسائی
ہفت عجائبات عالم
ناول دلسوز
ناول دلنواز
گدڑی میں لعل
واقعات عجیبہ یورپ
عیار قلندر
بائیسکل کا شوقین
گنجینہ سخن
مرنے کے بعد کیا ہوگا
ملک عدم کی خبریں
فاتح بنگال
محبوبہ کشمیر
ناول مریم
ہم خرما و ہم ثواب
گورو گوبند سنگھ جی
گورو نانک دیو
جی مہاراج
گورو تیغ بہادر
مہاراجہ رنجیت سنگھ
ہری سنگھ نلوہ
ناول لیلاوتی
مہارانا پرتاب سنگھ
مہاراجہ پرتھوی راج
سری کرشن جی
مہاراجہ سری رامچندر جی

نام کتاب

مہاتما بدھ
راجہ ہری چند
بکرماجیت اعظم
مہاراجہ بھوج
رانا سانگا
سوامی دیانند سرستی
راجہ بیربل
حیات ٹوڈرمل
ملا دوپیازہ
حالات تان سین
تانتیا بھیل
جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ ہند
سکندر اعظم
شیخ ابوالفضل
حضرت ابوبکر صدیق رضہ
حضرت عثمان رضہ
دوست محمد خان
قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ
حیات حیدر
حیات ٹیپو سلطان
مرد بیوہ فانلنگ
شہنشاہ بابر
حیات اورنگزیب
قزاق کی بیٹی
خواتین اسلام
نواب زیب النساء بیگم
نورجہاں جہانگیر
مہاتما بدھ کے درشن
شکنتلا ناٹک
بھول بھلیاں ''
گلزار زرینہ ''
خون دلربا ''

نام کتاب

دارالقضاۃ ناٹک
اٹھتا جنازہ ''
خوبصورت بلا ''
راجہ بھرتری ''
اسیر حرص ''
کنک تارا ''
ستارہ گردش ''
حقیقت کے دھرم ''
دلفگردش ''
موتیوں کی لڑی
جنتر درپن
گلزار لطف
پتی برتا استری کا دل
دولتمندی کے راز
معلومات ہزار کی
کریم اللغات
تاسدن کا خزانہ
ہنسانے کی کل

جاسوسی کے عمدہ ناول

وفادار جاسوس
طلسمی جال
جاسوسی کہانیاں
شاہی جاسوس
بنگالی دیوی
خوفناک ڈاکو
خوفناک بھوت
بہادر سراغرسان
بے خوف رانی
خونی چور
چالاک مجرم ہر دو حصہ
قاتل کی غلطی
ہیرے کی انگوٹھی
خوبصورت یہودن
چاند کی چوری

ملنے کا پتہ ﴿ کے آر مہرہ برادرس بکڈپو شاہ عالمی گیٹ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے　　رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴　　قیمت ششماہی ۳؎ فی پرچہ ۱۰؍

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:-

سیّد عابد علی عابد بی اے　　محمد اسمٰعیل　　محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۶　اشاعت ماہ اپریل ۱۹۲۵ء　نمبر ۴

فہرست مضامین

وجدانیات

اب وہ رنگینیِ جمال کہاں — اب وہ بیہوشیِ خیال کہاں

اب کہاں وہ نگاہِ شوق کے رنگ — گفتگوئے زبانِ حال کہاں

حسرتِ شوخیِ جواب کسے — ذوقِ گستاخیِ سوال کہاں

جستجوئے سکونِ عیش کسے — فرصتِ کوششِ محال کہاں

اے دل نکتہ سنج و شعلہ نوا — اب وہ تعریفِ خط و خال کہاں

ہائے اے ساقیانِ عشوہ طراز — بیخودی کے وہ ماہ و سال کہاں

اب کہاں دورہ ہائے شرب مدام — اب وہ بیفکریِ مآل کہاں

میکدے سے بنا تھا جس کا خمیر — اب وہ پیمانۂ سفال کہاں

زخم ہی اب نہیں ہیں سینے میں — شورِ تدبیر اندمال کہاں

یوں تو عابد ہیں خوش جمال بہت
جلوۂ حسنِ بے مثال کہاں

عابد

اُردو

پسندِ اہلِ عالم ہو رہی ہے بالیقیں اُردو
کہ ہے دلچسپ اُردو دلکش اُردو دِلنشیں اُردو

مسلماں اس پہ نازاں ہیں کہ وارث ہیں یہیں اسکے
فقط ہندوستاں میں بولتے ہیں اِک ہمیں اُردو

مگر اب تو یہ انگلستان میں بھی بولی جاتی ہے
بنی ہے گوری گوری شکل والوں میں حسیں اُردو

رہیں اس کی مربّی مدّتوں وکٹوریہ کوئین
زباں زد تھا سبق اس کا ہُوتی تھی دلنشیں اُردو

عرب میں اس کی شہرت ہے تو کابل میں ہے غل اس کا
نکلکر ہند سے پہنچی ہے تا جاپان وچیں اُردو

یہی حالات ہیں تو پھیل جائیگی یہ دُنیا میں
کوئی باقی نہ چھوڑیگی جہاں کی سر زمیں اُردو

چلیگا اس کا سکّہ ایک دِن سارے زمانے میں
کریگی ہفت کشور کو کبھی زیرِ نگیں اُردو

کوئی بولی ہو اس کے لفظ لے لیتی ہے خوش ہو کر
زبانِ غیر سے رکھتی نہیں ہے بغض وکیں اُردو

زباں ہے ایک لیکن نام پاتے ہیں کئی اس نے
کہیں ہندوستانی ہے کہیں ہندی کہیں اُردو

مکرتے ہیں مخالف اس کے لیکن نقش ہے دل پر
مٹاتے ہیں مگر افسوس مٹ سکتی نہیں اُردو

کبھی گھبرا کے خود کہہ دیتے ہیں وہ اپنے ہی مُنہ سے
زبانِ مشترک اس مُلک کی ہندی نہیں اُردو

یہاں جو گھر ہے اس میں دخل پاؤ گے ضرور اس کا
نہیں ایسا مکاں کوئی نہ ہو جس کی مکیں اُردو

تعجب ہے کہ اہلِ ہند کو اس سے عداوت ہے
کوئی صورت بھی ہو دیسی ہے پردیسی نہیں اُردو

سدیشی چیز ہے ہندوستاں کی ساخت ہے بالکل
کسی نے کی ہو پیدا تو ہُوئی آخر یہیں اُردو

بُرا کہنا اسے توہین ہے بیشک سدیشی کی
نہ کیونکر ہند میں اس غم سے ہو اندوہگیں اُردو

یہی لے دے کے اب اک یادگارِ دورِ شاہی ہے
مسلمانو! زباں ہے خوب معنی آفریں اُردو

یہ قومیت کو زندہ رکھنے والی ہے زباں بیشک
تمہارے خرمنِ اقبال کی ہے خوشہ چیں اُردو

غضب ہوگا جو تم نے بھول کر بھی اس سے غفلت کی
یہ قومی مسئلہ ہے صرف اِک بولی نہیں اُردو

گریگی ناگری ہندی کا سر کٹ جائیگا دھڑ سے
دکھائیگی ذرا غصّے میں جب یہ چیں جبیں اُردو

اسے مٹنے نہ دو اس کے لئے تم آپ مٹ جاؤ
بگاڑو گے تمہیں اُردو بناؤ گے تمہیں اُردو

اگر یہ مٹ گئی تو دیکھ لینا مٹتے مٹتے بھی
تمہیں پر ڈالیگی بس اِک نگاہِ واپسیں اُردو

وجاہت اس زباں کی کیوں نہ ہم دل سے کریں عزّت
کہ ہے دلچسپ اُردو دلکش اردو دلنشیں اُردو

مَیں باغی ہُوں

مَیں نے بغاوت پر کمر باندھ لی ہے! جیسے مَیں باغی ہوں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ میری دلائل آپ سُنیں۔ اور میری طرح باغی نہ ہو جائیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ بغاوت! کس قدر دہشتناک لفظ ہے۔ شاید ایڈیٹر صاحب کو تو فکر دامنگیر ہوگی، کہ کمبخت باغی کہیں ہمارا رسالہ ضبط کرانے پر تو نہیں تلا ہُوا۔ کئی احباب یہ سُنکر نہایت بیتاب ہونگے۔ کہ اگر اس بیوقوف باغی کے صحیح پتہ کا سراغ چل جائے۔ جو یوں لایعنی طور پر اس دریدہ دھنی سے اپنی بغاوت کا اشتہار دیتا پھرتا ہے۔ تو ابھی گورنمنٹ سے اس کا تعارف کرا کے ایک اوّل درجہ کی سنہری سند حاصل کی جائے، اور خدانخواستہ میرے والدین مرحوم اگر اپنی زندگی میں کہیں ان چند سطور بالا کا مطالعہ کر لیتے۔ تو فوراً دہیں کا ارادہ کر لیتے جہاں پر آج کل تشریف فرما ہیں۔

لیکن میں ایسا بیوقوف اور جاہل مطلق نہیں ہوں جیسا شاید سمجھا جا چکا ہوں۔ اور مَیں کیا کسی بھی فوجی خاندان سے تعلق رکھنے والے متنفس سے اس قسم کی حرکت کا سرزد ہونا خلاف فطرت کہیں تو بیجا نہیں۔ کیونکہ حکومت کے لیئے ایک سپاہی منش شخص کے لئے بغاوت کرنے سے مر جانا بدرجہا بہتر ہے۔ اور پھر ایسا آدمی جو اپنے آپ کو وکلاء کی جنس میں لانے کے لئے بھی ہاتھ پاؤں مار رہا ہو، ایسے جرم سنگین کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا۔ قانون انسان کو اسقدر محتاط (یا صحیح معنوں میں بُزدل کہہ لیجئے) بنا دیتا ہے۔ کہ سارے جیل بھر میں سوائے سیاسی قیدیوں کی فہرست کے ایک بھی تو وکیل کی قسم کا انسان نہیں مل سکتا۔ جیل خانہ میں جاتی دفعہ بھی یہ لوگ اپنے جرم اس خوبصورتی سے ایسے قالب میں ڈھال لیتے ہیں کہ ان کے لئے چکّی پیسنا تو درکنار، وقت بیوقت بات کرنا بھی داروغہ صاحب کے لئے بجائے خود ایک جرم بن جاتا ہے۔ کبھی بچپن میں جب مَیں وکیلوں کو رائے بہادر اور خان بہادر ہوتے سُنا کرتا تو بیحد متعجب ہوتا۔ کہ الٰہی وکیل کی قسم کا آدمی کیسے بہادر ہو سکتا ہے۔ لیکن خیر وہ میری نادانی اور لاعلمی کیوجہ سے تھا۔ اب معلوم ہُوا ہے کہ بہادری کا خطاب دلاوری کے لئے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ شاید ہوشیاری اور چالاکی کے صلہ میں دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بلوچستان کی طرف سُنا ہے کہ چٹھی رسان بھی خان صاحب اور خان بہادر ہوتے ہیں۔ اور ڈپٹی صاحبان کو سرکاری طور پر خطاب کرنے کے لئے

تو یہاں بھی ڈپٹی صاحب بہادر لکھنا پڑتا ہے۔ چاہے ڈپٹی صاحب نے ساری عمر میں اپنے ہاتھ سے مرغ بھی نہ ذبح کیا ہو۔

یہ میں کہاں سے کہاں جا نکلا۔ معمولی کتابوں سے بغاوت کرنا بھی نہایت خوفناک انجام رکھتا ہے۔ میں علم سے باغی ہو رہا تھا۔ تعلیم سے ترک موالات کی ٹھانی تھی۔ اس کا صلہ ملاحظہ فرمایئے۔ چند ہی منٹ میں کیا ہرزہ گوئی شروع کر دی۔ خیر میں اب اتنی تیزی سے تو اپنے ارادے کو ہرگز تبدیل نہیں ہونے دونگا۔ اپنی دلیل پیش کرونگا۔ آپ بھی اس پر غور کریں۔

اگلے روز جو بازار سے میرا گزر ہوا۔ شومئے قسمت کہئے یا تقاضائے طبیعت کہ چھ ماہ سے کوٹ پہن رہا ہوں اور بٹن ابھی تک نہیں دیکھے۔ ایک روشناس خیاط سے دوچار ہو گیا۔ میں نے کہا بھئی بٹن تو ٹانک دیجیو۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو گرتے گرتے چھ میں سے تین ہی رہ گئے تھے۔ خیر "ایں ہم غنیمت است" اگر وہ بھی گر جاتے، تو ان کا کیا بگاڑ لیتا۔ بٹن لگاتے ہی درزی نے ہاتھ میری طرف پھیلایا۔ میں سمجھا کہ شاید تاگا کاٹنے کو قینچی مانگتا ہے۔ میں نے کہا بھئی میرے پاس نہیں ہے۔ میرا یہ الفاظ منہ سے نکالنا تھا کہ وہ سیخ پا ہو گیا۔ اور کہنے لگا اجی صاحب پیسے جیب میں نہیں تھے تو بٹن ٹنکوانے کی کیا اتنی ضرورت تھی۔ چار مہینے بے بٹنوں کے گزر لئے دو اور گزر جاتے۔ لایئے میرے تین آنے کے پیسے ورنہ کوٹ رکھ جایئے۔ میں سخت پریشان ہوا اور کہا کہ بھائی پیسے تو میرے جیب میں موجود ہیں تم ناحق بگڑتے ہو۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ کام معمولی سا تھا اور اجرت زیادہ ہے۔ اس پر وہ دریدہ دہن یوں بڑبڑایا۔ کہ واہ جی واہ۔ یہی تو ہماری لوگوں کی محنت ہے اور اگر ایسے کاموں کے دام کم ملینگے تو پھر ہم مٹی کھود کر لائیں گے کیا؟ میں نے چپکے سے پیسے نکال اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

کل اتفاقاً اسی درزی کے کوچہ کی طرف جا نکلا۔ درزی کی عورت اپنے گھر سے نکل کر میری طرف لپکی۔ میں سہم گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر کہیں یہ عورت غلطی سے یہ سمجھ رہی ہو کہ میں نے ابھی اس کے خاوند کے بٹن ٹانکنے کی قیمت ادا نہیں کی تو غضب ہی ہو جائیگا۔ اور لرزہ تو مجھ پر اس لئے چھا رہا تھا۔ کہ پرانے ملنے والوں میں سے ایک آشنا میرے ہاں مہمان تھے۔ اور اس وقت بھی ہمرکاب تھے۔ میں نے کہا کہ یوں اکیلے دوکیلے اگر دوچار سر میں بھی پڑ جائیں تو مضائقہ نہیں۔ اور شریف آدمی کھایا ہی کرتے ہیں۔ لیکن آپ لوگ خود دانا ہیں۔ ذرا غور فرمایئے۔ کہ ایک باہر سے آئے ہوئے دوست کے سامنے

ایک بڑھیا کا گزر تے ہوتے دامن پکڑ لینا اور کہنا کہ مُوا اتنے روز سے تین آنے کے پیسے ادا نہیں کئے بلاؤ دام نہیں تو اُتارتی ہوں کوٹ، کسقدر خوفناک ہے۔ بھئی میں تو جب کبھی اس امر پر غور کرتا ہوں تو رعشہ سے بدن کانپنے لگتا ہے۔ چنانچہ میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور دوست کا ہاتھ زور سے جھٹک کر اس بلائے ناگہانی سے بچنے کے لئے پچھلے پاؤں لوٹا۔ اور دوست سے عذر کیا کہ یار میں اپنا انڈیپنڈنٹ گھر بھول آیا۔ ذرا واپس چلیں لیتے آئیں اُنہوں نے جواب دیا۔ تو کیا ضرور ہے۔ اتنی دیر کے لئے میرا رکھے رہو۔ اسی کھینچ تان میں بڑھیا ہم تک آ ہی لی۔ میں نے سمجھا کہ بس اب عزت کا خاتمہ ہے اور کبوتر کی طرح بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار تیرا کہ لاج رکھ لی۔ اور یوں سمجھو کہ جان رکھ لی۔ ہاں بھئی بے عزتی کی بھی کوئی زندگی ہے۔

بڑھیا نے لفافہ میری طرف بڑھایا اور کہا۔ بابوجی ذرا خط تو سُنانے جاتیو۔ نگوڑے پڑھے ہوئے یہاں کتنے ہیں۔ مارے مارے پھرتے ہیں۔ نوکریوں کی تلاش میں آج صبح سے راہ دیکھ دیکھ آنکھیں پتھرا گئیں نگوڑا ایک بھی نہیں گزرا۔ لوجی بابوجی سُنا دو خط ہم کو۔ پڑھو بابوجی خط کو۔ میں ذرا کم سُنتی ہوں اونچے پڑھیو۔ للی۔ لیکن اتنا خیال رہے ساتھ والے گھر میں میری نند رہتی ہے۔ وہ نہ آہٹ پالے۔ اُنہوں نے جو کہیں سُن لیا تو آفت آ جائیگی۔ میں نے ہچکولے کھا کھا کر ٹھوکریں لے لیکر پڑھ دیا۔ اور جب والدہ کریمن کو سلام اور چھوٹی نذیرن کو پیار پر پہنچا تو جان میں جان آئی۔ اور ایک پُر تسکین سانس لیکر کہا۔ کیوں بڑی بی بس۔ لیکن بڑی بی کہاں اتنی آسانی کے ساتھ اتفاق سے ہاتھ لگے ہوئے بابو کو چھوڑنے والی تھیں۔ کیا معلوم شام تک کوئی اور نگوڑا بابو آتے نہ آتے۔ تو ہاتھ لگا ہُوا کیوں جاتے۔ فرمانے لگیں اس کا جواب بھی لکھ دو احسان سے۔ اب میں نے بھی دل میں کچھ سوچا اور کہا۔ بی احسان کا ہے کا ہمارا تو کام ہے۔ وہ شاید نہ سمجھ سکی۔ دل میں آیا ہو گا کہ ان پڑھے لکھے بابوؤں کا یہی پڑھنا لکھنا تو کام ہے۔ پڑھ دیا۔ اب لکھ بھی دے گا۔

میں نے خط لکھنا شروع کیا۔ کہنے لگیں لکھو اب میں اس انتظار میں ہوں کہ کچھ ارشاد فرمائیں۔ تو لکھوں۔ اور وہ زور دیتے جاتی ہیں۔ کہ تم لکھو تو لکھواؤں میرے دوست بہت دانا آدمی ہیں۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ اُنہوں نے مجھے انگریزی میں سمجھایا کہ یونہی سوکھے قلم کو کاغذ پر چلانا شروع کر دو۔ پھر یہ کچھ مُنہ سے بکیگی۔ تب لکھ دینا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔

غرضنکہ کیا عرض کروں کہ اس خط کی لکھوائی نے

میرا کتنا وقت ضائع کیا۔ اور اخیر میں وہ بڑھیا بولی۔ یہ لفافہ بند مت کیجو۔ مجھے کسی اور سے پڑھوانا ہے۔ ذرا تسلی کر لوں۔ ٹھیک تو لکھا ہے۔ مجھ کو غصّہ آیا۔ لفافہ دوسرے ہاتھ میں تھام کر میں نے کہا۔ لاؤ بڑی بی ۸ ر آٹھ آنے کے پیسے میری اُجرت۔ پہلے تو وہ عورت بہت ششدر رہوئی۔ لیکن جونہی اپنے خاوند درزی کو گلی کے کونے سے آتے ہُوئے دیکھا، تو لگی مجھے کوسنے۔ جب خاوند آیا تو وہ بھی شور مچانے لگا۔ اجی واہ جی واہ بابوجی یہ بھی کوئی کام تھا۔ دو حرف پڑھ دیتے اور دو ڈال دیئے تم نے کونسا یہاں پر تاگا خرچ کیا ہے۔ جو اُجرت مانگتے ہو میں نے نہایت نرمی سے جواب دیا۔ بھئی یہی تو ہمارا کام ہے۔ اور نہیں تو کہیں ہم لکڑیاں تھوڑے ہی پھاڑا کرتے ہیں۔ کہ وہاں سے کچھ آجائیگا۔ لیکن جی ہمارے فلسفہ کو وہاں کون سُنتا تھا۔ اسی تکرار میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور سب مجھی کو ملامت کرنے لگے۔ جب میں نے ان کو تین آنے کا قصّہ سُنایا تو سب یکزبان ہو کر کہنے لگے۔ اجی ان بیچاروں کا کیا ہے۔ یہ ہُوتے مزدوری دار انہوں نے تو پیسے لینے ہی تھے۔ تب تو مجھے نہایت طیش آیا۔ ارے بھائی وہ مزدوری دار ہیں تو ہم کونسے کسی ریاست میں رزیڈنٹ مقرر ہو گئے ہیں۔ اور جو ریزیڈنٹ ہیں تو بھی مزدوری دار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ درزی نے صرف ہاتھ سے کام کیا۔ اور ہم نے ہاتھ اور دماغ دونوں سے۔ اس نے تاگا خرچ کیا اور ہم نے سیاہی۔ لیکن صاحب ان دلائل کو تو وہ سُنے جس نے فلسفہ کا امتحان دینا ہو۔ انہیں کیا پڑی تھی۔ آخر ہمیں ناکام ہی آنا پڑا۔

گھر پر آکر میں نے رات کو سوتے وقت گزشتہ واقعہ پر غور کرنا شروع کیا۔ یہ علم نفسیات شاید اسی لئے وضع ہُوا ہے کہ آدمی کچھ تو ناکام ہونے سے پیشتر وقت ضائع کر چکتا ہے۔ اور کچھ بعد میں اس کا سبب دریافت کرنے میں گنوا ڈالتا ہے۔ آخر مجھے کیوں ناکامی ہُوئی۔ اور وہ کمیں کا جاہل مطلق خیاط کیوں جیت گیا۔ خوب غور کرنے پر ثابت ہُوا کہ موقع پر ناخواندہ زیادہ تھے۔ اور پڑھے ہُوئے صرف دو۔ اور چونکہ تعداد کے لحاظ سے ان پڑھوں کے ووٹ بہت افراط سے تھے۔ اس لئے وہ جیت گیا اور میں ہار گیا۔ چاہے میں اُس سے قابل ہی سہی۔ لیکن جی ووٹوں کے سامنے قابلیت کیا کہتی ہے۔ اگر ایک حجام کونسل کا ممبر ہو سکتا ہے۔ تو درزی جیت گیا تو کیا۔

کل کوئی کہہ رہا تھا۔ تعداد پر کیا موقوف ہے اگر چند لاکھ مسلمان قابل ہوں تو ان آٹھ کروڑ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے بہتر ہیں۔ تعداد میں فوقیت نہ بھی ہو تو کیا۔ لیکن

انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ بات ہندوستان کے مسلمانوں پر صادق نہیں آتی۔ یہ مقولہ ہوگا کہیں فرانسیسیوں کے لئے۔ جب ووٹوں کا سوال بیچ میں اڑگیا، تو قابلیت آپ کی کیا کرے گی۔ گارا؛ ان چند لاکھ مسلمانوں کو تو درزی کے ساتھی اپنے ووٹوں ہی میں اس خوبصورتی سے ریختہ کردینگے۔ کہ چین کی دیوار کی طرح قیامت تک ہلنے کا نام بھی نہ لیں۔

ہاں تو میں اب عجیب معمہ میں پڑا ہوا ہوں۔ کہ ایک درزی جس نے ایک سال کی محنت کے بعد کام سیکھ لیا۔ تین منٹ میں تین آنے لے گیا۔ اور میں پندرہ سولہ سال تحصیل علم میں مغز مارنے کے باوجود بھی اس قابل نہ ہوسکا۔ کہ پورا گھنٹہ ضائع کرنے کے بعد ایک آٹھ آنے کا حقدار ہوتا۔ اب آپ لوگ ہی انصاف کریں۔ کہ ایسی تعلیم سے بغاوت کیجائے یا نہ کیجائے۔

سجاد حیدر بی اے

غزل

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ازل سے اپنی گردن پر ہے احساں اپنے چلّو کا
خدا جانے کسے ساغر کسے پیمانہ کہتے ہیں

ہنسانا اور رُلانا بیوفا دُنیا کی خصلت ہے
ہم اس انداز کو اندازِ معشوقانہ کہتے ہیں

ہمارا اور واعظ کا کبھی جُھک جاتے گا قصہ
وہ دیوانہ ہمیں اور ہم انہیں دیوانہ کہتے ہیں

جگہ پائی ہے جن احباب نے بزمِ حقیقت میں
تجھے شمعِ تجلی اور مجھے پروانہ کہتے ہیں

چھپاؤ لاکھ پر صورت پرستی سے نہیں خالی
جو ہیں اہلِ نظر کعبے کو بھی بتخانہ کہتے ہیں

انہیں غزلوں پہ حال آتے ہیں میخانے میں رندوں کو
انہیں شیروں کو سکش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

بسے ہیں کیسے کیسے ذی شرف گورِ غریباں میں
بڑے بے درد ہیں بستی کو جو ویرانہ کہتے ہیں

تعلق لاکھ ہو پھر بھی جہاں سے بے تعلق ہو
اسی کو تیرے عاشق ہمتِ مردانہ کہتے ہیں

ریائی بزم میں اے محتسب گوشے بہت سے ہیں
انہیں گوشوں کو شاید شیخ خلوتخانہ کہتے ہیں

تڑپنا ہے تو جاؤ جاکے تڑپو شاد خلوت میں
بہت دن پر ہم اتنی بات گستاخانہ کہتے ہیں

شاد

کھلونا

وہ نئے نئے کھلونے بنایا کرتا، اور یہ کھلونے راجکماریوں کے کھیلنے کو بناتا تھا۔

ہر سال شاہی محلوں کے صحن میں کھلونوں کا میلہ ہوا کرتا تھا۔ اس میلے میں بڑے بڑے کاریگر آتے اور اپنے اپنے کھلونے لاتے تھے۔ مگر سب سے زیادہ تعریف اُسی کے کھلونوں کی ہوتی، اور اُسی کے کھلونے پسند کئے جاتے تھے۔ سبھی اُس کی صناعی کی داد دیتے۔

جب وہ ستّر برس کا ہوگیا۔ تو اس میلے میں ایک نیا کاریگر آیا۔ اس کاریگر کا نام کشن لال تھا جیسی اس کی نئی عمر تھی ویسا ہی اس کا نیا طریقہ تھا۔

وہ جو کھلونے بناتا ان میں کچھ تو گڑھتا اور کچھ نہ گڑھتا تھا۔ کچھ رنگتا اور کچھ یونہی بے رنگے چھوڑ دیتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ کھلونے کبھی ختم ہی نہ ہونگے۔ ان کی تکمیل ہی نہ ہوگی۔ اور نہ یہ سلسلہ اختتام کو پہنچے گا۔

نوجوان کہنے لگے "اس کاریگر کا صنعتی ناق قابلِ تعریف ہے۔"

ماہرین نے کہا "یہ صنعتی مذاق نہیں ڈھیٹ پنا ہے۔"

مگر نئے دور میں نئی چیزیں ہی پسند کی جاتی ہیں۔

اس دور کی شاہزادیوں نے کہا۔ "ہمیں تو یہ کھلونے چاہئیں۔"

قدامت پسندوں نے کہا۔ "چھی! یہ تو بُرے ہیں۔"

شاہزادیوں کو ضد ہوگئی۔

بُوڑھے کاریگر کی دُکان پر اس مرتبہ بھیڑ نہ ہوئی۔ اس کے کھلونے ٹوکرے میں یُونہی رکھے رہ گئے۔ جیسے دریا پار کشتی کے انتظار میں مسافر بیٹھے ہوئے مُنہ تاکا کرتے ہیں۔

سال ختم ہوگیا۔ بُوڑھے کا نام بھی سب بُھول گئے شاہی محلوں کے کھلونے بازار میں کشن لال کی طوطی بولنے لگی۔ اور وہ سب کا سردار بن بیٹھا۔

(۲)

بڈھے کی ہمّت ٹوٹ گئی۔ اب اُسے اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لالے پڑ گئے۔ بالآخر اس کی لڑکی نے آکر کہا۔

"ابا تم ہمارے گھر چل کر رہو۔"

داماد نے کہا "کھاؤ پیو۔ آرام کرو اور کھیت کی نگرانی کیا کرو۔"

بڈھے کی لڑکی دن بھر اپنے گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ اس کا داماد مٹی کے دیئے بنایا کرتا۔ اور انہیں ناؤ پر لاد کر شہر میں بیچنے لے جایا کرتا۔

بوڑھا نہ سمجھ سکتا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اسی طرح وہ بھی نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کی نواسی اب پندرہ سال کی ہو گئی ہے۔

وہ درخت کے نیچے بیٹھا ہوا کھیت کی رکھوالی کیا کرتا۔ اکثر تھک کر وہیں سو بھی جایا کرتا تھا۔ وہیں اسکی نواسی پیچھے سے چپ چاپ آتی، اس کے گلے میں باہیں ڈال کر لد جاتی اور گردن پکڑ لٹک جاتی۔ اس وقت بڈھے کا رونگٹا رونگٹا خوش ہو جاتا۔

ایک دن بوڑھے نے پوچھا "بیٹا! تم کیا لوگی؟"

اس کی نواسی نے کہا "نانا جان! ہمارے لئے کھلونے بنا دو۔"

بوڑھے نے کہا۔ "بیٹا! کیا تم میرے بنائے ہوئے کھلونے پسند کرو گی؟"

اس کی نواسی بولی۔ "تم سے بھی اچھا کوئی کھلونا بنا سکتا ہے؟"

بوڑھے نے کہا "کشن لال تو بناتا ہے۔

"وہ بھلا کیا بنائیگا۔"

اس روز سے ان دونوں میں یہی گفتگو ہوئی۔ اور روز روز وہ دونوں یہی باتیں کیا کرتے۔ اس کے بعد بڈھا اپنے جھولے سے اوزار اور سامان نکالتا چشمہ لگا کر کھلونے بنانے بیٹھ جاتا۔ لیکن فوراً کھیت کا خیال آجاتا۔ اور کہتا "بیٹی! چڑیاں کھیت کھا جائینگی۔"

اس کی نواسی کہتی۔ "چڑیوں اور کوّوں کو میں ہانکونگی۔"

(۳)

بڈھے کو سب سے زیادہ اپنی لڑکی کا ڈر لگا رہتا تھا اس کی حکومت تھی سخت۔ وہ انتظام خانہ داری میں مستعدی سے منہمک رہتی تھی۔

بڈھا بڑے انہماک اور یکسوئی سے کھلونے بنا رہا تھا۔ پیچھے سے اس کی لڑکی آ گئی۔ اس کی آواز سنتے ہی بڈھا اپنا چشمہ اٹھا کر اس کی طرف نادان بچّوں کے معصومانہ انداز سے دیکھنے لگا۔

اس کی لڑکی نے کہا۔ دودھ دوبار رکھا ہے۔ سوبھدرا کو تم لئے ہوتے یہاں بیٹھے ہو۔ اتنی بڑی لڑکی کیا اب کھلونے کھیلے گی۔ یا گھر کا کام دھندا کریگی۔"

بڈھا فوراً بول اٹھا۔ "نہیں نہیں یہ کھلونے محلوں میں بیچ آؤنگا۔ اور جب سوبھدرا کی شادی ہوگی تو اسے موہن مالا پہناؤنگا۔ اسی کے لئے روپیہ کمانے کی فکر میں ہوا۔"

لڑکی نے جھلا کر کہا۔ "محلوں میں تمہارا کھلونا کوئی خریدیگا بھی؟"

بڈھے کا سر جھک گیا اور وہ خاموش ہوگیا۔

سوبھدرا نے سر ہلا کر کہا۔ "مَیں دیکھتی ہوں۔ بھلا محلوں میں نانا کے کھلونے کون نہیں خریدتا۔"

(۴)

دوسرے ہی دن سوبھدرا نے اپنی ماں کو ایک اشرفی لا کر دی۔ اور کہا۔ "لو! یہ نانا کے کھلونے کی قیمت ہے۔"

ماں نے پوچھا۔ "کہاں ملی؟"

لڑکی نے کہا۔ "مَیں خود محلوں میں جا کر کھلونے بیچ لائی۔"

بڈھا ہنس کر کہنے لگا۔ "بیٹا! اب تو تمہارے نانا کے ہاتھ کانپنے لگے ہیں۔ اور آنکھوں سے بھی نہیں دکھتا"

ماں نے خوش ہو کر کہا۔ "اسی طرح سولہ اشرفیاں ہوجائیں تو سوبھدرا کے لئے ہار بن جائیگا۔"

بڈھے نے کہا۔ "اب کوئی فکر نہیں۔"

سوبھدرا نے بڈھے کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے۔ اور کہا۔ "کیوں نانا! کیا اب میرے بر کی بھی فکر نہیں؟"

بڈھا ہنسنے لگا۔ اور آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپک پڑا۔

(۵)

اب تو گویا بڈھے کی جوانی عود کر آئی۔ وہ جھاڑ کے نیچے بیٹھ کر کھلونے بنایا کرتا۔ اور سوبھدرا کوئے اڑایا کرتی تھی۔ ایک ایک کرکے سولہ اشرفیاں جمع ہوگئیں اور سوبھدرا کا ہار پورا ہوگیا۔ ماں نے کہا۔ "اب تو بر آنا چاہئے۔"

سوبھدرا نے بڈھے کے کان میں کہا۔ "نانا! بر تو مل گیا ہے۔"

بڈھے نے پوچھا۔ "کہاں ملا؟" سوبھدرا بولی۔ "جس روز کھلونا بیچنے مَیں محلوں میں گئی۔ اُس دن دربان نے کہا۔ 'یہ کھلونے تو پرانے ہوگئے ہیں۔ اب انہیں کوئی نہ خریدے گا' مَیں ناامید ہو کر لوٹنے لگی۔ مجھے غمگین دیکھ کر ایک آدمی نے کہا۔ 'مجھے یہ کھلونے دو۔ مَیں انہیں رنگ دوں تو بک جائینگے۔ نانا اگر آپ بھی اُسے پسند کریں تو مَیں اُسے جے مالا پہنا دوں۔ (مَیں اس سے شادی کرلوں)"

بڈھے نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

سوبھدرا نے کہا۔ "وہ باہر کھڑا ہے۔"

وہ اندر آیا۔ بڈھے نے دیکھتے ہی کہا۔ "یہی تو کشن لال ہے۔"

کشن لال نے بڈھے کے قدم چھوئے اور کہا۔ "جی ہاں مَیں ہی کشن لال ہوں۔"

بڈھے نے کشن لال کو اپنے سینے سے چمٹا کر کہا۔ "ایک دن تو تم نے مجھ سے ہاتھ کے کھلونے چھین لئے۔ اور آج تم میرے دل کا کھلونا چھین رہے ہو۔"

(ٹیگور) عبدالستار خاں

غزلیات

(۱)

پوشیدہ رہ سکا نہ تبسم نقاب میں
تابندہ برق چھپ نہیں سکتی سحاب میں

مارا مجھے تو تیری جوانی نے فتنہ گر
یوں مجھ کو ورنہ موت نہ آتی شباب میں

اچھا اگر بُروں سے تمہیں واسطہ نہیں
پھر کس لئے ستاتے ہو آ آ کے خواب میں

ساقی تیری نظر ہی نے مخمور کر دیا
اب رہنے دے یہ کیف نہ ہوگا شراب میں

آتا ہے یوں خیال خزاں میں بہار کا
گویا کہ دن بہار کے دیکھے تھے خواب میں

ہلکا ابھی تھا رنگ ابھی شوخ ہو گیا
رُخ کی سی تیرے بات کہاں ہے گلاب میں

بستر مہک رہا ہے مرا بوئے گل سے آج
تھا شب ترا خیال ہم آغوش خواب میں

نالاں ہے فصلِ گل میں نہ بے وجہ عندلیب
اندیشۂ خزاں ہے کہ ہے اضطراب میں

عندلیب

---

(۲)

کبھی گھر گیا نہ تھا آج تک میرے دِل میں سوز و گداز نے
مجھے لطفِ عشق سے آشنا کیا حسنِ بندہ نواز نے

مرے سازِ دل سے نکل رہے ہیں وہ نغمہ ہائے طرب فزا
کہ جنہیں چھپایا ہے مدّتوں سے سکوتِ پردۂ ساز نے

مجھے کبر کیسے پسند ہو کہ مرا یہ عجز وہ عجز ہے
پئے عفوِ جرم جِسے چُنا ہے مری جبینِ نیاز نے

نظر آتیں حق کی تجلیاں رہا پردہ کوئی نہ درمیاں
مِرے دِل کو طور بنا دیا ہے لباسِ عشقِ مجاز ہیں

احسن علوی

ولیم ٹیل

مصنفہ شلر

مترجمہ غلام ربانی

سین پہلا

ولیم ٹیل، اس کی بیوی اور دو چھوٹے لڑکے اپنی جھونپڑی میں بیٹھے ہیں۔ صبح کا وقت ہے، ٹیل اپنے ہتھوڑے اور اوزاروں سے کچھ کام کر رہا ہے۔ بیوی ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہے۔ والٹر اور ولیم ایک کمان سے کھیل رہے ہیں۔

بیوی۔ ابھی ان بچوں کی عمر ہی کیا ہے، ابھی سے انہیں کیوں تیراندازی سکھاتے ہو؟

ٹیل۔ کیوں نہیں؟ اگر ان کو اچھا نشانہ باز بننا ہے تو ابھی سے سیکھنی چاہیے۔

بیوی۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ یہ کام انہیں بالکل نہ آئے!

ٹیل۔ یہ تمہاری غلطی ہے۔ ہر انسان کو لازم ہے۔ کہ وہ دشمنوں سے محفوظ رہے۔

والٹر۔ ابا جان، میری ڈور ٹوٹ گئی۔ اسے باندھ دیجئے۔

ٹیل۔ نہیں بیٹے، میں نہیں باندھوں گا۔ ہر شخص کو اپنی مدد آپ کرنی چاہیے۔

بیوی۔ آج تم کہاں جا رہے ہو؟

ٹیل۔ الٹروف، والد صاحب سے ملنے۔

بیوی۔ مگر تمہارا جانا خطرناک ہے، کیوں!

ٹیل۔ تم کو یہ خیال کیسے ہوا۔

بیوی۔ لوگوں میں چرچا ہے۔ کہتے ہیں کہ قسمیں لی جا رہی ہیں اور آسٹریا اور گورنر کے خلاف ایک بڑی سازش ہو رہی ہے۔

ٹیل۔ میں نے اب تک قسم نہیں کھائی ہے۔ لیکن اگر ملک کو میری ضرورت ہوئی تو میں ہرگز پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

بیوی۔ لیکن وہ تم کو بڑی جان جوکھوں کا کام دیں گے۔ کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

ٹیل۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ ہر شخص کو وہی کام دیا جاتا ہے جس کا وہ اہل ہوتا ہے۔

بیوی۔ دیکھو مجھے تمہاری سب باتیں معلوم ہیں۔ ابھی

چند روز ہوتے۔ تم نے کیا غضب کیا! تم نے جھیل کو خوفناک طوفان کی حالت میں عبور کیا۔ اور گورنر کے ایک مجرم کے بچاؤ کے لئے اپنے تئیں خطرہ میں ڈالا۔ ٹیل تم کو اس وقت اپنے بیوی بچوں کا خیال بھی آیا تھا؟

ٹیل - آیا کیوں نہیں، یہ تمہارا ہی خیال تھا۔ اور اسی لئے میں نے چاہا۔ کہ وہ خیریت سے اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچ جائے۔

بیوی - سُنا ہے کہ لہریں بڑی خوفناک تھیں۔ اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کشتی اس میں چل سکے گی۔ پیارے شوہر! تم بہت ہی اچھے ہو۔ کیسی نیکی کرتے ہو۔ خدانخواستہ تم کسی بلا میں پھنس گئے۔ تو کون چھڑائیگا۔

(ٹیل کھڑا ہوتا ہے اور اپنی تیر کمان سنبھالتا ہے)

بیوی - تم کو اس تیر کمان کی کیا پڑی ہے۔ اسے یہیں چھوڑ دو۔

ٹیل - ہرگز نہیں، یہ مجھ سے جُدا نہیں ہوسکتی۔

والٹر - ابّا جان! آپ کہاں جاتے ہیں۔

ٹیل - تمہارے دادا جان کے پاس، الڈروف، کیوں کیا تم بھی چلتے ہو؟

والٹر - جی ہاں، میں بھی چلونگا۔

بیوی - ٹیل، دیکھو گورنر وہاں موجود ہے۔ الڈروف نہ جاؤ۔

ٹیل - وہ آج جا رہا ہے۔

بیوی - اچھا تو پہلے اسے چلا جانے دو۔ تم جانتے ہو۔ کہ اسے تم سے عداوت ہوگئی ہے۔

ٹیل - میں اس کی اور اس کی عداوت کی کچھ پروا نہیں کرتا حق پر چلتا ہوں۔ اور کسی سے نہیں ڈرتا۔

بیوی - مگر وہ راستبازوں سے نفرت کرتا ہے۔

ٹیل - کیونکہ وہ ان کا کچھ کر نہیں سکتا۔ میں اس سے کترا کر ہرگز نہیں جاؤنگا۔ اور وہ مجھے تلاش بھی نہیں کریگا۔

بیوی - صرف آج ٹھہر جاؤ۔ اچھا تم شکار کو چلے جاؤ۔

ٹیل - بیوی۔ یہ تم کو ہو کیا گیا ہے۔ ہیں۔ تم تو کانپ رہی ہو!

بیوی - ہاں مجھے ایسا ہی خوف ہے۔ آج تم الڈروف نہ جاؤ۔

ٹیل - لیکن تمہارے ڈرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو!

بیوی - کوئی وجہ نہیں ٹیل خدا کے لئے آج ٹھہر جاؤ۔

ٹیل - پیاری بیوی، میں وعدہ کر چکا ہوں۔

بیوی - اچھا یہ بات ہے تو ضرور جاؤ۔ لیکن لڑکے کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔

والٹر۔ نہیں امّی امّاں! میں ضرور جاؤنگا۔

بیوی۔ بیٹا، تم اپنی ماں کو چھوڑے جاتے ہو۔

والٹر۔ میں تمہارے واسطے الڈروف سے بہت اچھی اچھی چیزیں لاؤنگا۔

ولہم۔ امّاں جان، میں تمہارے پاس رہونگا۔

بیوی (پیار کر کے) تم بہت اچھے بیٹے ہو۔

(ٹیل اور والٹر دونوں جاتے ہیں۔ بیوی ان کو دور تک دیکھتی رہ جاتی ہے)

سین دوسرا

(ایک کھلا میدان جس کے بیچ میں ایک لمبا بانس نصب ہے۔ بانس پر ایک ٹوپی ٹنگی ہوئی ہے۔ دو سپاہی پہرہ دے رہے ہیں)

پہلا سپاہی۔ یار ہم ناحق وقت ضائع کر رہے ہیں بھلا کسے پڑی ہے کہ یہاں آئے۔ اور اس ٹوپی کو سلام کرے۔ اس جگہ کھوے سے کھوا چلتا تھا۔ مگر آج سناٹا ہے۔

دوسرا سپاہی۔ اس ٹوپی سے کتراتے ہیں، تمام معزز اور شریف آدمی چکر کاٹ کر نکل جاتے ہیں۔

پہلا سپاہی۔ ٹون ہال جانے والوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس راستہ سے جائیں۔ تو ہم بہت سوں کو گرفتار کر لینگے۔

(ٹیل اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑے نمودار ہوتا ہے)

والٹر۔ ابّا جان، کیا ایسے بھی ملک ہیں، جہاں پہاڑ نہیں ہیں؟

ٹیل۔ ہاں، اگر تم ان پہاڑوں سے نیچے اترو۔ اور پگڈنڈیوں پر دور تک چلے جاؤ۔ تو پھر ایک نہایت ہموار ملک آئیگا۔ جہاں نالے خاموشی کے ساتھ بہتے ہیں۔ دور تک کھیت ہی کھیت نظر آتے ہیں۔ اور تمام زمین گلزار بنی ہوئی ہے۔

والٹر۔ اوہو! وہ ایسی خوبصورت جگہ ہے۔ تو پھر کیوں نہ ہم وہاں چلے چلیں۔ یہاں ہرگز نہیں رہنا چاہئے یہاں آپ کو بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

ٹیل۔ زمین تو بہت خوبصورت ہے اور زرخیز بھی بہت ہے۔ مگر وہاں کے لوگ اپنی محنت کا پھل نہیں پاتے۔

والٹر۔ کیوں! کیا وہ اپنی زمین پر آزادانہ نہیں رہتے جیسے آپ رہتے ہیں۔

ٹیل۔ نہیں بیٹے، زمین آزاد نہیں ہے۔ اور وہاں کے باشندے بھی آزاد نہیں ہیں۔ اور وہ بہادر اور

سچّے بھی نہیں ہیں۔ اُس مُلک میں کوئی اپنے ہمسایہ
پر بھروسہ نہیں کرتا۔

والٹر۔ کیا وہ جنگل میں شکار نہیں کر سکتے۔

ٹیل۔ نہیں، کیونکہ جانور اور پرندے امیروں کا مال ہیں۔

والٹر۔ لیکن وہ دریا میں سے مچھلیاں تو پکڑ سکتے ہیں؟

ٹیل۔ دریا اور سمندر سب بادشاہ کی ملک ہیں۔

والٹر۔ ابّا جان، میرے لئے تو وہ وسیع مُلک قید خانہ
بن جائے۔ اس سے تو ہماری سرو پہاڑیاں
اچھی ہیں۔

ٹیل۔ ہاں بیٹے، کسی سرسبز اور زرخیز مُلک میں بُرے
آدمیوں کے ساتھ رہنا اچھا نہیں، اس سے
ہماری یہ ویران پہاڑیاں اچھی ہیں۔

والٹر۔ ابّا جان، دیکھنا اس بانس پر ٹوپی کیسی ہے۔

ٹیل۔ ہونے دو۔ ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں
چلے چلو۔

پہلا سپاہی۔ شہنشاہ آسٹریا کے حکم سے ٹھہرو۔

(ٹیل اپنی برچھی سنبھالتا ہے)

ٹیل۔ کیوں! کیا چاہتے ہو،

دوسرا۔ تم نے بڑی نافرمانی کی، گورنر بہادر کی ٹوپی کو
سلام نہیں کیا۔ ادھر آؤ ہمارے ساتھ۔

ٹیل۔ مہربان دوست، مجھے جانے دو۔

پہلا۔ جیل خانہ کو! کیوں!

والٹر۔ میرا باپ جیل خانہ کو! دُہائی ہے، دُہائی ہے!
لوگو دوڑو۔

چند شہری۔ کیوں، کیا معاملہ ہے۔ تم اس شخص کو کیوں
گرفتار کرتے ہو۔

سپاہی۔ یہ باغی ہے۔

ٹیل۔ ہیں! مَیں باغی

شہری۔ نہیں نہیں، تم کو مغالطہ ہُوا ہے۔ یہ تو ٹیل ہے
یہ ہمارے ہاں کا ایک معزز اور شریف آدمی ہے

والٹر۔ دادا جان، چھڑائیے، یہ تو سچ مچ جیل خانہ لئے
جاتے ہیں۔

پہلا۔ لڑکے تو بھی اپنے باپ کے ساتھ چل۔

دادا۔ ٹھہرو، مَیں ضمانت دیتا ہوں، خدا کے لئے یہ
بتاؤ واقعہ کیا ہے۔

دوسرا سپاہی۔ اس نے گورنر صاحب کی ٹوپی کو سلام
نہیں کیا۔

دادا۔ صرف اتنی سی بات پر جیل خانہ لئے جاتے ہو
دوستو مَیں ضمانت دیتا ہوں۔ اسے جانے دو۔

سپاہی۔ تم اپنے لئے ضمانت پیش کرو۔ مَیں اپنا فرض منصبی
پُورے طور سے انجام دُونگا۔ الگ ہٹو۔

چند شہری۔ اوہ غضب! ہم یہ نہیں دیکھ سکتے۔ ہم زیادہ

طاقتور ہیں۔ یارو دیکھتے کیا ہو، مقابلہ کے لئے جم جاؤ۔

سپاہی۔ یہ کون ہے گورنر بہادر کے حکم کا مقابلہ کر رہا ہے۔

(سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ تین آدمی اور آتے ہیں)

ہم آپہنچے ہیں۔ کیا معاملہ ہے، گرادو ان کو۔

ٹیل - بھائیو۔ میں خود اپنی مدد کرونگا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ان کے نیزوں سے ڈرتا ہوں۔

سپاہی۔ کیا تم اس کو ہم سے چھڑا کر لیجاؤ گے۔ تم میں اتنی ہمت ہے ؟

آوازیں۔ چپ چپ

سپاہی (زور سے) بغاوت، غدر

(کچھ فاصلہ سے بگل کی آواز آتی ہے)

مجمع - گورنر کی سواری ہے۔

سپاہی (زور سے) بغاوت، خون، کوئی بچاؤ۔

دادا - ارے غضب ہو گیا۔ گورنر آپہنچا۔ اب کیا ہوگا۔

آوازیں۔ راستہ چھوڑ دو گورنر بہادر کے لئے۔

جیلر۔ کون مدد کے لئے پکارتا ہے۔

(کوئی جواب نہیں دیتا ہے)

جیلر - یہ کون تھا، بتاؤ!

پہلا سپاہی۔ حضور اس شخص نے کلاہ مبارک کو سلام نہیں کیا۔ میں نے ان کو گرفتار کر لیا۔

جیلر۔ ٹیل، کیا تم شہنشاہ کی نافرمانی کرتے ہو، اور میں اس کا نائب ہوں۔ کیا تم میرا حکم نہیں مانوگے۔ اچھا اس ٹوپی کو سلام کرو۔

ٹیل۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا !

جو سر کہ جھکا خالقِ سبحان کے آگے
وہ جھک نہیں سکتا کسی انسان کے آگے
گو جان شہنشاہ کے قبضے میں ہے میری
پر جان کی پروا نہیں ایمان کے آگے

جیلر۔ ہوں ... تم بڑے نشانہ باز ہو، میں نے سنا ہے تمہارا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔

والٹر۔ جناب یہ بالکل سچ ہے۔ میرے والد ایک سیب کو سو قدم کے فاصلہ سے اُڑا سکتے ہیں۔

جیلر۔ ٹیل، یہ تمہارا بیٹا ہے۔

ٹیل۔ جی، یہ میرا بیٹا ہے۔

جیلر۔ تمہارے اور کے بچے ہیں۔

ٹیل۔ حضور والا، دو لڑکے

جیلر۔ ان میں سے تم کو کونسا زیادہ پیارا ہے۔

ٹیل - مجھے دونوں سے یکساں محبت ہے۔

جیلر۔ چونکہ تم ایک سیب کو سو قدم سے اُڑا سکتے ہو، مجھے اپنے کمال کا ثبوت دو۔ تیر کمان لو اور اپنے بیٹے کے سر پر سیب کا نشانہ بناؤ! دیکھو پہلے

ہی نشانہ میں سیب اُڑ جاتے ورنہ تمہارا سر اڑا دیا جائیگا

ٹیل۔ اوہ! کیسا خوفناک حکم! میں اپنے بچّہ کے سر کو نشانہ بناؤں۔ نہیں نہیں حضور یقیناً آپ کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ ایک باپ سے ایسا کہیں۔

جیلر۔ میں حکم دیتا ہوں تم کو ایسا کرنا پڑیگا۔

ٹیل۔ مجھے سیب کا نشانہ بنانا پڑیگا اپنے لڑکے کے سر پر! میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

جیلر۔ نشانہ لگاؤ۔ ورنہ تم اور تمہارا بیٹا دونوں جان سے جائیں گے۔

ٹیل۔ میں اپنے بچّہ کا قاتل ہونگا۔ حضور آپ صاحب اولاد ہیں۔ کیا آپ کے دل میں پدری محبت کا جوش نہیں ہے۔

ایک عورت۔ حضور ان بچاروں سے دل لگی نہ کیجئے۔ دیکھئے ان کے چہرے سفید پڑ گئے ہیں مارے خوف کے کانپ رہے ہیں۔ یہ آپ کے مذاق کے عادی نہیں۔

جیلر۔ کون بکتا ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں، سیب لو اور جگہ کرو! پورے سو قدم کا فاصلہ ناپو۔ اچھا ٹیل، اب تم نشانہ لگاؤ۔ دیکھو خطا نہ ہونے پاتے۔

ایک امیر۔ لڑکے تم گورنر صاحب کے قدموں پر گر پڑو۔ اور جان بخشی کرالو۔

ایک لیڈی۔ سرکار بس کیجئے۔ آپ کی تفریح ہو رہی ہے اور ان غریبوں کی جان نکلی جاتی ہے۔ اب ان کو جانے دیجئے۔

جیلر۔ چلو، بڑھو، جلدی! کیوں تم کو تامل کیوں ہے، میں تمہاری قسمت تمہارے اختیار میں دیتا ہوں اس کو تم سختی نہیں کہہ سکتے، کون کہتا ہے کہ تم اپنے لڑکے کو مارو۔

دادا۔ حضور والا، ہم آپ کی طاقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اب ہمیں اپنے رحم کی ستائش کرنے دیجئے۔ رحم کیجئے۔ میرا نصف مال و دولت لے لیجئے۔ بلکہ سب لے لیجئے۔ للہ ان کی جان بخش دیجئے۔

والٹر۔ دادا جان، اس بُرے آدمی کے قدموں پر نہ جھکئے۔ بتایئے میں کہاں کھڑا ہوں۔ مجھے ذرا خوف نہیں ہے۔ میرے ابّا تو اڑتے پرندکے بازو کو چھید دیتے ہیں۔ تیر مجھے چھوئیگا بھی نہیں

ایک جنٹلمین۔ جناب عالی۔ اس بچّہ کی معصومیت کا اثر آپ کے دل پر نہیں ہوتا؟

دوسرا۔ دیکھئے خدا کو بھی مُنہ دکھانا ہے۔ اس کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑیگا۔

جیلر۔ لڑکے کو پرے درخت سے باندھ دو۔

والٹر۔ کیا مجھے باندھ دو! نہیں مَیں بندھونگا نہیں۔
مَیں ایک بھیڑ کی طرح چپ چاپ کھڑا رہوں گا
بلکہ سانس تک نہ لونگا۔ اگر تم مجھے باندھ دو گے
تو تھک جاؤنگا۔ اور کھڑا نہ رہا جائیگا۔
جنٹلمین۔ لڑکے اپنی آنکھیں تو بندھوالو۔
والٹر۔ کیوں آنکھیں کیوں بندھوالوں۔ کوئی مَیں ڈرتا
ہوں۔ ابّا جان جلدی کیجئے۔ یہ ظالم یقین نہیں کرتا
اس کو دکھا دیجئے۔ آپ کیا کر سکتے ہیں۔
(ٹیل تیر کمان اُٹھاتا ہے۔ اور ایک تیر
کمان میں لگاتا ہے)
ایک آواز۔ ہیں ہیں، ٹیل کیا کرتے ہو، تمہارے ہاتھ
کانپ رہے ہیں۔ دیکھو تم گرے پڑتے ہو؟
ٹیل۔ تمام چیزیں مجھے پھرتی ہُوئی نظر آتی ہیں۔ میری
آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔
مجمع۔ افسوس، افسوس!
ٹیل۔ اس نشانہ کو رہنے دیجئے (کوٹ کے بٹن کھولکر)
لیجئے میرا دل حاضر ہے۔ سپاہیوں کو حکم دیجئے۔
وہ اس کو نکال لیں۔
جیلر۔ مَیں تمہاری جان نہیں چاہتا۔ نشانہ چاہتا ہوں
ٹیل تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ لوگ کہتے ہیں تم کسی
چیز سے نہیں ڈرتے۔ تم لوگوں کی جانیں بچانے
کے لئے سمندر میں کود پڑتے ہو۔ تمہیں سخت سے
سخت طوفان کی پروا نہیں۔ تم نے بہت لوگوں
کو بچایا ہے۔ اب اپنے تئیں بچاؤ۔
(اچانک وُہ ہوشیار ہوتا ہے۔ گویا نیند
سے بیدار ہُوا۔ وہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے
آنکھیں نکال کر ترکش پر ہاتھ ڈالتا ہے
اور ایک تیر نکال کر اپنی پیٹی میں لگا
لیتا ہے)
والٹر۔ مجھے بالکل خوف نہیں ہے۔ ابّا جان آپ
نشانہ لگائیں۔
ٹیل۔ بیشک! تم کو خوف نہیں ہونا چاہئے۔
ایک امیر۔ حضورِ عالی۔ اب رحم کیجئے۔ یہ صرف آپ کی
ایک آزمائش تھی۔ آپ آزمائش نہیں کرینگے۔
اب معاملہ حد سے گزرا جاتا ہے۔
جیلر۔ خاموش، تم سے کون بولتا ہے۔
وہی امیر۔ مَیں بولونگا۔ ضرور بولونگا۔ شہنشاہ کی عزت کا
مجھے خود خیال ہے۔ لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ
ہرگز جائز نہیں۔ اور آپ کو ایسا کرنے کا کوئی
حق نہیں۔
جیلر۔ ہیں، تمہاری یہ جُراَت۔
وہی امیر۔ شہنشاہ میرا آقا ہے۔ آپ نہیں ہیں۔ اپنے

سپاہیوں کو اشارہ کیجئے۔ میرے پاس بھی تلوار
ہے۔ دیکھوں تو کون میرے قریب آتا ہے۔

سپاہی۔ (زور سے) ارے! سیب گر پڑا، لڑکا
مسکرا رہا ہے۔

بہت سی آوازیں۔ سیب کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

جیلر۔ اس نے نشانہ لگا دیا! کیونکر، بالکل
دیوانہ۔

والٹر۔ ابّا جان! لیجئے یہ سیب، کیا میں نہیں جانتا
تھا۔ کہ مجھے ذرا ضرر نہیں پہنچیگا۔

(ٹیل زمین پر بیٹھ جاتا ہے)

سپاہی۔ یہ نشانہ ہے۔ لوگ سینکڑوں برس اس کو یاد
رکھیں گے۔

امیر۔ جب تک یہ پہاڑ قائم ہیں، ٹیل کا اور اس تیر کا
ذکر باقی رہیگا۔

جیلر۔ سبحان اللہ! سیب کے عین بیچ میں نشانہ لگا
ہے۔ مجھے داد دینی چاہئے۔ ٹیل ادھر آؤ۔

ٹیل۔ جناب اب کیا ارشاد ہے؟

جیلر۔ میں نے دیکھا، تم نے ایک تیر اپنی پیٹی میں
لگایا تھا۔ اس سے تمہارا کیا مقصد ہے۔

ٹیل۔ یہ ہمارے ہاں کا رواج ہے۔

جیلر۔ نہیں تمہارے جواب سے مجھے اطمینان
نہیں ہوتا۔ سچ بتاؤ۔ جلدی، یہ دوسرا
تیر۔ ۔ ۔ ۔

ٹیل۔ اچھا تو اے مغرور آدمی سُن، تیری موت
قریب آ گئی تھی۔ اگر میرا نشانہ خطا ہو جاتا
تو میرا بچّہ بغیر انتقام کے نہ مرتا۔ تو بھی
اس کے ساتھ تڑپتا۔ دیکھ یہ دوسرا تیر
تیرے سینہ کے پار ہوتا۔ اب جا اور خدا
کا شکر کر کہ میرا پہلا تیر صحیح پڑا۔ خدا حق
کی مدد کرتا۔ اور باطل کو کچلتا ہے۔ وہ مغرور
کو شرمندہ کرتا اور زیردستوں کو زبردستوں سے
بچاتا ہے۔

(ماخوذ)

شلر "ولیم ٹیل"

غلام ربانی

بہت لذّت سے آتا ہے زباں پہ میری نام اس کا
خدا چاہے تو آیا چاہتا ہے کچھ پیام اس کا

ضرورت کیا کہ اب ساقی اسے لبریز مے کر دے
کہ عکسِ رُخ سے رنگیں ہو گیا ہاتھوں میں جام اس کا

دُعا

(۱)

بزمِ ہستی میں، مَیں اک سازِ پریشانی ہُوں — سازِ ہستی میں اِک آوازِ پریشانی ہوں

مطرب زمزمہ پرداز پریشانی ہُوں — سینۂ دہر میں اک رازِ پریشانی ہوں

مضطرب رُوح مری عرصۂ پیکار میں ہے

لمعۂ برق تپاں ابرِ شبِ تار میں ہے

(۲)

جوشِ وحشت میں کبھی بادیہ پیما ہوں مَیں — کیفِ حیرت میں کبھی زمزمہ پیرا ہوں مَیں

محفلِ حسن ہے اور محوِ تماشا ہوں مَیں — ایک گم گشتۂ صحرائے تمنّا ہوں مَیں

اِک بگولا ہوں کہ آوارہ ہوں صحراؤں میں

صورتِ موجِ پُر آشوب ہوں دریاؤں میں

(۳)

ایک دریا ہے اگر دہر تو گرداب ہوں میں — ایک صحرا ہے اگر ماہیِ بے آب ہوں مَیں

برقِ بیتاب ہُوں، شعلہ ہوں کہ سیماب ہوں میں — یاالٰہی یہ مجھے کیا ہے کہ بیتاب ہوں مَیں

کیوں نہیں ملتا مرا ساغرِ تسکیں مجھ کو!

کیوں نہیں ملتا مرا گوہرِ رنگیں مجھ کو!

(۴)

اے کہ حاوی ہے ہر اک چیز پہ ہستی تیری — پھول میں حُسن ترا خار میں مستی تیری

عرش کا اوج ترا فرش کی پستی تیری — کونسی بستی ہے جس میں نہیں بستی تیری؟

اے کہ تو بحر میں ہے کوہ میں ہے کاہ میں ہے!
شوخیِ مہر میں، پاکیزگیِ ماہ میں ہے!

(۵)

غوطہ زن بحرِ عقیدت میں ہے درباں تیرا ڈھونڈھنے آیا ہے یاں سایۂ داماں تیرا
عالمِ وجد میں ہے مرغِ خوش الحاں تیرا تیرے دربار میں پہنچا ہے ثنا خواں تیرا
اپنے الطاف کے پھولوں سے یہ جھولی بھر دے
اشک جو آنکھ سے ٹپکے اُسے گوہر کر دے

(۶)

بادۂ ناب سے معمور ہو ساغر میرا! ایک خمخانۂ جاوید ہو پیکر میرا!
منسلک سلکِ محبت میں ہو گوہر میرا صورتِ مہرِ درخشاں ہو مقدر میرا!
پھول ہو جاؤں چمن میں کہ صبا ہو جاؤں
کچھ بھی ہوں تیری محبت میں فنا ہو جاؤں!

(۷)

ساغرِ دل کو مرے ساغرِ پُر نور بنا بادۂ حُسن پلا کر مجھے مخمور بنا
ایک ذرّے کو تجلّی گہِ صد طور بنا مری ہر سانس کو اک نعرۂ منصور بنا
ذرّے کو مہرِ منور میں فنا ہونے دے
قطرے کو موجِ سمندر میں فنا ہونے دے

اثرؔ صہبائی

انجامِ وفا

کڑکڑاتے جاڑوں کی ایک رات ۹-۹½ بجے
کسی نے دروازہ پر آواز دی۔ یہ آواز گوش آشنا اور مانوس
تو ضرور تھی۔ لیکن اس سے توحش اور پریشانی ظاہر ہو رہی
تھی۔ بغیر جواب دیتے ہوئے۔ مَیں نے اُٹھ کر دروازہ
کھول دیا۔ محمود اپنا اور کوٹ پہنے ہوئے اندر آگیا۔

اس کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کا مُنہ
دیکھتے ہی میرا کلیجہ دھک سے اندر بیٹھ گیا۔ مَیں نے کبھی
اُس کو اتنا پریشان نہ دیکھا تھا۔ اس کی ملتجی نگاہیں میری
متجسسانہ نظروں سے دوچار ہوتے ہی جُھک گئیں۔

مَیں نے پُوچھا۔ "خیر تو ہے؟"

"ہاں نوازش ہے۔"

"آج تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں"

"تم چھپاتے ہو۔"

رُک رُک کر کہنے لگا۔ "کیا۔۔۔۔عرض کروں۔
شامتِ اعمال۔"

ہر لفظ کے بعد رُکتا، زبان خُشک ہوتی جاتی تھی
چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا

مجھ کو فکر ہُوئی۔ مَیں نے بہت دلاسا دیا۔ بہت سمجھایا
جب اُسے میری پُرخلوص ہمدردی کا یقین ہوگیا تو اُس نے
اپنا قصّہ یوں شروع کیا۔

"میرا اور اسمٰعیل مرحوم کا خاندانی تعلق ہے۔ بلکہ قریبی
رشتہ ہے۔ اُن کی پہلی شادی داروغہ نورعلی کی صاحبزادی
سے ہُوئی۔ دونوں میاں بیوی میں انتہائی محبت تھی لیکن
کوئی اولاد نہ تھی۔ اولاً تو انہیں اس کا کچھ خیال ہی نہ ہوتا۔
لیکن جب عمر کھسکنے لگی تو اپنی لااولادی پر تاسف ہونے لگا
ان کی بی بی نے ہزاروں جتن کئے۔ مگر امید بر نہ آئی۔ ایک
دن بیوی نے کہا۔ "میری قسمت میں تو اولاد نہیں۔ خدا کا دیا
سب کچھ ہے۔ صرف ایک بچّے کے نہ ہونے سے یہ گھر قبر
سے بدتر ہو رہا ہے۔ اس لئے اب تم دوسری شادی کرلو۔
اسمٰعیل۔ جب زمانہ تھا تو شادی نہ کی۔ اب کیا کرونگا۔ لوگ
کہینگے کہ بڑھا بھس لگی ہے۔ خدا کو اگر منظور ہے۔ تو اولاد تم
ہی کو دیگا۔ میری طبیعت تو گوارا نہیں کرتی۔ کہ اب اِس
بُڑھاپے میں تم پر سوکن لاؤں۔

بیوی۔ "تمہاری یہ شادی کچھ شوقیہ تو ہے نہیں۔ جو تمہیں
ان تمام باتوں کا خیال ہو۔ یہ نکاح صرف بچّے کی خاطر ہے

جب میں خود ہی اس کی محرک ہوں تو تمہیں سوکن اور جلاپے کا خیال کیسا؟"

اسمٰعیل۔ جو کچھ بھی ہو میری طبیعت گوارا نہیں کرتی۔

بیوی۔ "تم کہنا مانو۔ خدمت کرو تمہیں ایسی ہی آپس کی بدمزگی کا خیال ہے تو اپنی نئی دلہن کو اس دوسرے مکان میں رکھنا۔ اس طرح ہم لوگ الگ بھی رہینگے اور ایک جگہ بھی

مگر اسمٰعیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کی بیوی نے میری والدہ سے اس امر کی تحریک کی۔ اسمٰعیل بہت متمول تھا۔ اس کی بیوی ہمیشہ بیمار رہا کرتی تھی۔

اماں جان کو بھی کچھ یہ بات پسند آگئی۔ اب آپس میں صلاح مشورہ ہونے لگا۔ سبھوں نے اسمٰعیل کو سمجھایا۔ لوگوں کے اصرار سے اسمٰعیل بھی راضی ہو گیا۔

فوراً ہی خاندان میں ایک نوجوان لڑکی سے نسبت لگ گئی۔ اور تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ ایک مہینہ کے اندر اندر شادی بھی ہو گئی۔ کسی نے غریب ناصرہ سے یہ بھی نہ پوچھا کہ تم اس شادی پر رضامند بھی ہو یا نہیں۔ بیچاری کو اپنے والدین اور اعزہ کے انتخاب شوہر پر مارے حجاب اور شرم کے ہاں ہی کہتے بنا۔ جوانی کا شوق اور امنگیں لئے ہوئے ایک بوڑھے دولہا کی دلہن بن گئی۔

سال بھر کے اندر ہی خدا نے بیٹا دیا۔ اسمٰعیل اور اس کی بیوی کی مرادیں پوری ہو گئیں۔

(۲)

ادھر ناصرہ کی قسمت پھوٹی۔ سولھویں شادی ہوئی اٹھارہویں میں بیوہ ہو گئی۔ ماں باپ اقربا کو ناصرہ کے پھوٹے نصیبوں پر رنج ہوا لیکن اسمٰعیل کا ترکہ تو لا نہ ان کے اطمینان کا باعث بھی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ناصرہ بیوہ ہوئی تو کیا' آج وہ لاکھوں نقدی اور سینکڑوں کوٹھیوں کی مالک ہے۔ اُس کی تمام عمر شاہانہ عشرت و بے فکری سے کٹے گی۔ رہا سوکن کا دھڑکا تو وہ بیچاری یوں بھی ماجائی بہن کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ دوسرے اس کی صحت خراب ہے۔ اُس کو بھی چند دنوں کا مہمان سمجھنا چاہیئے۔

لیکن ناصرہ کی دلی کیفیت کا ان ظاہر بینوں نے ذرا سا بھی اندازہ نہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں یہ گھر بار اور یہ مال و دولت خاک نظر آتا تھا۔

ناصرہ کے نازک دل پر اسمٰعیل کی موت کا دوسرا چرکہ تھا۔

یہ کہکر محمود یک بیک رُک گیا۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔ مجھے استعجاب ہوا میں نے تسلّی دینا چاہی۔ میرے ہر لفظ تشفی پر اُس کی بیقراری بڑھتی گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اُسے پکڑ کر ایک آرام کرسی پر لٹا دیا۔ اور قریب ایک اسٹول

کھینچکر اُس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اور اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی اور مَیں خاموش تھا۔

(۳)

تھوڑی دیر کے بعد جب محمود کو ذرا تسکین ہوئی، تو اُس نے پھر اپنا قصّہ یوں شروع کر دیا۔

"میرا اور ناصرہ کا بچپن ساتھ گزرا ہے۔ ہم دونوں ساتھ کھیلتے اور طفولیت کے بھولے پن سے عجیب عجیب عہد و پیمان کیا کرتے تھے۔ ہماری محبت اور آپس کی جان نثاریوں کو دیکھ کر گھر کی بوڑھیاں اکثر کہا کرتیں کہ ان میں ازلی محبت ہے۔ خُدا اسی طرح قائم رکھے۔ اولاً تو ہمارے والدین کا بھی یہی ارادہ تھا کہ جس طرح آسمانی قوانین کے ماتحت ہماری زندگیاں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح اُن کو انسانی قوانین کے رشتہ سے منسلک کر کے دائمی بنا دیا جائے لیکن افسوس کہ اسمٰعیل کا تموّل، ناصرہ کی بے زبانی، میری طالب علمانہ زندگی، والدین کا اصرار اور رواج کے جکڑ بند کے آگے ایک نہ پیش گئی۔ یہ شادی نہ تھی، بادِ سموم تھی جس کے آگے ایک ہی جھونکے میں ناصرہ کے دل کی ادھ کھلی کلی مرجھا کر رہ گئی۔ مَیں دم بخود تھا۔ میری حالت تصویر حیرت سے کم نہ تھی۔ مَیں بے بس تھا۔ اور ناصرہ بے دست و پا۔

"وہ خاموش تھی اس نے اپنے کو تقدیر کے سپرد کر دیا۔ اپنے کملاتے ہوئے دل کو پہلو میں دبا کر اپنے ماحول سے مطابقت کی کوشش کرنے لگی۔ والدین کے عہد و پیمان کا پاس۔ شوہر کی خدمت کا فرض۔ رسم و رواج کی پابندی اور فطری رجحان کی ایک کشاکش میں مبتلا ہو گئی۔

اس نے اپنے جذبات کو دبایا اور وہ اخگر پنہاں ہو کر رہ گئے۔

یہی بے بسی میری چارہ ساز ہوتی میری ذرا سی بیقراری، میرا ذرا سا اضطراب ناصرہ کے لئے ناموس سوز ثابت ہونے والا تھا۔ اور یہ مجھ کو اپنی حیات کی قیمت پر بھی گوارا نہ تھا۔ مجھے اپنے استقلال، اپنے صبر اور اپنے سکون ہی میں ناصرہ کا مستقبل روشن اور اس کا ناموس پاک نظر آیا۔ اور مَیں نے اپنے کو قسمت کے حوالہ کر دیا۔

میری خاموشی مصلحت کے تقاضے کے مطابق تھی لیکن میرے سینہ میں وہی التہاب باقی تھا۔ اُسکے شعلہ زن ہونے میں صرف حسب حال ماحول کا انتظار تھا۔

اسی کاوش میں ہم پر دو جاڑے، دو گرمیاں اور دو برساتیں گزر گئیں۔ اور فطرت اپنا کام کرتی رہی۔

موسم کا ہیر پھیر، زمین کی گردش اور زمانہ کا انقلاب نہ تو اخگر پنہاں کو خاک سیاہ بنا کر اُڑا سکے۔ اور نہ التہاب میں برف کی خنکی پیدا کر سکے۔

۴

اسمٰعیل کی وفات کے بعد جو ظاہرا اسباب حائل تھے

وہ جاتے رہے۔ یکسر مایوسی کی جگہ کبھی کبھی امید کا درخشاں منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ میری پرانی حالت عود کر آتی۔ مَیں ہمیشہ اس دعا میں مصروف رہتا۔ الٰہی مجھے اپنی زندگی کے ازلی مقاصد سے ہمکنار فرما اور ناصرہ کے مفارقت کے الم سے بچا۔

ناصرہ کی عدت کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس کی حالت میں ایک گونہ فرق آگیا تھا۔ شوہر کی وفات کا رنج زمانہ کی بعدیت کم کرتی جاتی تھی۔ اسی عالم میں ہماری عمروں نے ڈیڑھ منزلیں اور بھی طے کرلیں۔

اب ناصرہ ہر جگہ اور تقریب میں حصّہ لیتی تھی۔ اعزہ و احباب کے دعوت نامے آتے اور وہ وہاں جاتی۔ اسمٰعیل کی پہلی بیوی کی علالت میں روز بروز ترقی ہی تھی۔ حالانکہ وہ صاحب فراش نہ ہوئی تھی۔ تاہم اس کی صحت اس قابل نہ تھی۔ کہ وہ عزیزوں کے یہاں ہر تقریب میں شرکت کرسکے بدیں وجہ ناصرہ کی شرکت ان تقریبوں میں اور بھی لابدی ہو گئی تھی۔

جب وہ شادیوں کی تقریبوں میں جاتی تو اس کی خاک شدہ امنگیں ابھرنے لگتیں۔ اس لئے کہ انہیں زبردستی گھونٹا گیا تھا۔ اور ان میں ہیجان پیدا ہوجاتا۔

جب وہ عزاداری تقریب میں شریک ہوتی تو اسے اسمٰعیل کی موت یاد آجاتی اور اپنی خاص زندگی کا تاریک نقشہ پھر ایکبار اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔

وہ عموماً اس قسم کے متضاد خیالات میں پڑجاتی اور ایسی کشاکش کے عالم میں گھنٹوں اپنے دل سے باتیں کیا کرتی۔

(۵)

الہ آباد میں معین کے یہاں شادی تھی۔ دعوتیں آچکی تھیں۔ شادی میں ہماری شرکت کا اصرار تھا خط و کتابت کے بعد اب تار آنے لگے تھے۔ میری والدہ تو پندرہ سے پہلے الہ آباد پہنچ گئی تھیں۔ مگر اوروں کی شرکت کے لئے اصرار ہو ہی رہا تھا۔

دسمبر کی چوبیسویں تاریخ کو والد نے بُلاکر مجھ سے کہا۔ آجکل تمہارا کالج بڑے دنوں کی تعطیل کی وجہ سے بند ہے۔ معین کے یہاں شادی میں تمہاری والدہ نے تم کو اور ناصرہ کو بلوایا ہے۔ آج ہی شب کی گاڑی سے تم دونوں روانہ ہوجاؤ۔ اچھا جاؤ اپنی تیاری کرلو۔

مَیں نے اپنے والد کے ارشاد کے مطابق تیاری کرلی۔ مگر مَیں سوچتا تھا۔ والدہ نے بلایا ہے۔ مجھ کو اور ناصرہ کو، مَیں ناصرہ کے ہمراہ الہ آباد جاؤنگا۔ میرا اور ناصرہ کا ساتھ ہوگا۔ ناصرہ کو لیکر کوتی اور کیوں نہیں جاتا ہم دونوں کو کیوں بُلایا ہے۔ کیا ناصرہ میرے ساتھ یقیناً جائیگی۔ کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا۔ کہ ناصرہ سے جاکر پوچھوں کہ وہ

میرے ساتھ چلنے پر تیار بھی ہے یا نہیں مگر خدا جانے کیوں جب میں جانا چاہتا رک جاتا تھا۔

مجھ کو ۹ بجے رات کے شدید انتظار تھا۔ شام ہونے کو نہ آتی تھی۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ مغرب بعد والد نے بلایا اور ضروری باتیں سمجھا دیں۔ میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا مگر عجیب کیفیت تھی۔ لقمہ حلق سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ دیر ہو جانے کا خوف دل کو بٹھائے دیتا تھا۔

وقت ہوا کریم نے دروازہ پر تانگہ لا کھڑا کیا۔ سامان رکھا گیا۔ پردہ ڈالا گیا۔ اور حمید ناصرہ کو لینے گئے۔ چند منٹ میں ہم سب اسٹیشن پر تھے۔ ابھی گاڑی آنے میں پندرہ بیس منٹ کی دیر تھی۔

حمید نے ہم لوگوں کے لئے ٹکٹ خریدے کریم نے اسباب ایک جگہ رکھا۔ یونہی انتظار کی ساعتیں کٹ گئیں

(۶)

گاڑی آئی حمید اور کریم کی نظریں ڈبہ کے انتخاب میں مصروف ہو گئیں۔ انہوں نے ایک خالی ڈبہ دیکھ لیا۔ اس میں سامان رکھا گیا۔ وقت پر گاڑی نے سیٹی دی۔ اور کریم نے خدا حافظ کہا۔ اور ہم دونوں الہ آباد کو روانہ ہو گئے۔

شب خنک و تاریک تھی۔ مجیط ابر گھرا ہوا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے دل کے اندر پہنچ پہنچ کر حواس مختل کئے دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ترشح بھی شروع ہو گیا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے پانی کی بوندوں کے لئے اندر آتے اور غریب مسافروں کا کلیجہ ہلا دیتے۔

ہم نے ان کے بے پنہاں حملوں سے بچنے کیلئے دونوں طرف کی کھڑکیاں چڑھا لیں۔ اور اپنی اپنی دولائیاں کاندھوں پر ڈال لیں۔

اس کمپارٹمنٹ میں صرف ہم ہی دو تھے ہمارے لبوں پر سکوت کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خیالات کا ہجوم تھا۔ جس سے تکان کا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔

ناصرہ نے اس دماغی کوفت کو زائل کرنے کے لئے اپنا پان دان کھولا۔ دو پان لگائے۔ اور دوسرا مجھے دیتے ہوئے کہنے لگی۔ "محمود! لو۔ ہوا بڑی سرد ہے اور طوفان سخت ہے۔ میرا دل سہما جاتا ہے۔"

میں نے پان لے لیا۔ اور کہا۔ "جی ہاں! بڑی سردی ہے۔"

بتدریج گفتگو کا رخ خاص اس موضوع کی طرف پلٹتا گیا۔ جو ابتک عالم سکوت میں ہمارے دماغ پر مسلط تھا۔

دو چار جملوں کے بعد ناصرہ نے پوچھا۔ "ہمیں کیوں بلوایا ہے؟"

- مجھے مطلق علم نہیں۔ والد نے یک بیک آج دوپہر کو مجھے بلا کر کہا تم کو ناصرہ کے ہمراہ آج ہی شب کی گاڑی سے الہ آباد جانا ہوگا۔

چچی جان کو آجکل تمہاری شادی کی بڑی فکر ہے۔ غالباً اسی خیال سے بلایا ہو۔ اس تقریب میں سب اعزہ جمع ہونگے۔ اور اس قسم کی گفتگو کا پورا موقع ملے گا۔

میں اس کے مخالف ہوں۔ میں ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ میری مرضی کے خلاف میری شادی ہو۔

"آخر تم کبتک شادی نہ کروگے؟"

"ابھی نہیں میں کسی سے شادی نہ کرونگا۔"

- کیوں؟

مجھ کو تم سے ازلی محبت ہے

یہ سنتے ہی ناصرہ ایک عالم سکوت میں ہوگئی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے کہ مجھ سے اور تم سے ارضی تعلقات قائم ہوجائیں

مگر مجھ کو تو غیر ممکن نظر نہیں آتا۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ میں کچھ سوچ رہا تھا ناصرہ گہرے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گاڑی پوری رفتار سے جارہی تھی ہم کو علم نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ یک بیک گاڑی رکی اور قلیوں کی چیخ پکار سے معلوم ہوا کہ ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

میں نے دروازہ کھولا۔ ان لوگوں سے ملاقات ہوگئی، جو ہمیں اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم مکان پر تھے۔

(۷)

دوسرے ہی دن وہ باتیں ہونے لگیں جن کے لئے میں تیار نہ تھا۔ اور جو میرے لیئے ایک غیر مختتم سلسلہ کوفت پیدا کرنے والی تھیں۔ پہلے تو مجھ سے کسی نے کچھ نہ کہا بالآخر میرے ان ہم عمر عزیزوں اور احباب کے توسط سے جو اس کے لئے موزوں تھے مجھ سے کہلایا گیا۔ کہ احمد علی صاحب مجھے اپنی فرزندی میں لینے پر رضامند ہیں۔ اور میرے والدین کی بھی یہی خواہش ہے۔

اس خبر نے مجھ پر عجیب اثر کیا۔ نفرت اور وحشت کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوگیا۔

میرا چہرہ متغیر ہوگیا۔ شدید نفرت کی لہریں دل میں اٹھنے لگیں۔ کبھی ملامت آمیز غصہ آتا۔ اور کبھی حقارت خیز تاسف کبھی ناامیدی حسرت۔ ہمت شکن اور جرأت آزما حسیات کی کشاکش تھی۔ اور جس نے میری قوت گویائی گویا سلب کرلی تھی۔ میں خلا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، یا افسردگی سے کبھی کبھی اپنے ان احباب کی صورتیں ایک احمقانہ انداز سے دیکھنے لگتا۔ جو اپنے خیال میں قاصد فرخ پیام ہوکر آئے تھے۔

وہ منتظر تھے کہ میں کچھ کہوں۔ وہ مجھے خوش قسمت سمجھ رہے تھے۔ اور انہیں اپنے خیال کے مطابق حوصلہ افزا جواب کا انتظار تھا۔ ان کی امید افزا بیصبری اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ آہ! مگر وہ ناواقف تھے۔

اسی عالم تذبذب میں قریب قریب ایک گھنٹہ ختم ہوگیا۔ اب میری خاموشی اُن کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہونے لگی۔ اُنھوں نے ہر چند کوشش کی کہ کچھ کہوں مگر اُن کی ہر سعی رائگاں اور ہر کوشش ناکام ثابت ہُوتی اُنھوں نے میری خاموشی کی تاویلیں کرنی شروع کر دیں۔ اور اپنے اپنے خیال کے مطابق تاویلیں کر کے اُٹھ گئے۔ مگر میں خاموش تھا۔

مجھے خبر بھی نہ ہُوئی کہ اُنھوں نے کیا کیا اور کیا کہا؟

مگر انھوں نے میری خاموشی کو میری نیم رضامندی سے تعبیر کیا۔ اور یہی جا کر سب سے کہدیا۔ مگر مجھ کو اس کا علم نہ تھا۔ میں خاموش تھا اور افسردہ خاطر۔

اسی دن ناصرہ سے اس کی چند سہیلیوں اور ہمجولی لڑکیوں نے کہا "تمہاری چچی وغیرہ چاہتی ہیں کہ تم اپنے اس سن وسال پر رحم کھاؤ۔ اور اپنا دوسرا عقد کرلو۔ انھوں نے ساجد کا انتخاب کیا ہے۔ وہ بھی راضی ہے۔ تم دیکھتی ہو کہ ساجد خُدا کے فضل سے نوجوان اور صاحب روزگار ہے تمہارا جوڑا بھی اچھا ہوگا۔"

اتنا سُنتے ہی ناصرہ غصّہ سے سُرخ ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ جھلا کر بول اُٹھی۔" ایک مرتبہ تو میں نے ان لوگوں کے حکم کی تعمیل میں سینہ پر پتھر کی سل دھرلی۔ اب دوبارہ پھر مجھے دوزخ میں جھونکنا چاہتی ہیں مجھ کو منظور نہیں۔"

ناصرہ کا جواب سُنکر سب کو تعجب ہُوا۔ اُنھوں نے ہر چند سمجھانا چاہا۔ لیکن اس کے استقلال میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ وہ اپنی رائے پر قائم تھی اور خوش۔

(۸)

یکم جنوری کو میں تنہا واپس آگیا۔ سب کو میرے امتحان اور نتیجہ امتحان کا انتظار تھا۔ وہ وقت بھی خیرو خوبی سے گزر گیا۔ میں امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ واقعات نے کچھ عجیب وغریب شکلیں اختیار کیں۔ مجھے ملازمت کرنی پڑی۔ میری ملازمت میرے والدین کے لئے باعث تشفی ہُوئی۔ اب میری شادی کا خیال اور بھی زیادہ اہم ہوگیا۔ احمد علی صاحب کا اصرار ناقابل برداشت ہورہا تھا۔ والد نے مجھے لکھا۔ مگر میں پھر بھی خاموش تھا۔ وہی جذبات اور وہی افسردگی تھی۔ میں نے سوچا کہ ناصرہ سے جاکر زبانی عرض حال کروں۔ اگر وہ منظور کرلے تو ہمّت باندھ کر والد صاحب کو صاف جواب دیدوں۔ اس خیال کا عملی جامہ میں منتقل ہونا ایک مشکل امر تھا۔ مگر میں نے جُراٴت کی اور

آج ہی شام کو ناصرہ کے گھر گیا۔

اتفاق سے وہ تنہا مل گئی۔ میں نے بڑی ہمت کر کے سب کچھ کہدیا۔ وہ چپ چاپ سُنتی رہی۔ اخیر میں اُس نے صرف اتنا کہا۔ "غیر ممکن"

میں نے پھر بھی چاہا کہ اُسے یقین دلاؤں لیکن اُس نے ذرا سی بھی توجہ نہ کی۔ ترش ہو کر جھڑک دیا۔ کمرہ کے اندر ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ چہرہ سے غُصّہ عیاں تھا۔ آنکھیں شعلہ فشاں ہو رہی تھیں۔ آواز میں تھراہٹ اور بدن میں لرزہ۔

میرے شیشۂ دل کو چور کرنے کے لئے یہ صدمہ کافی ہے۔ یہ دُنیا میری آنکھوں میں سیاہ ہو رہی ہے۔ میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔"

اس قصّہ کو ختم کرتے ہی محمود ایک جوش کے ساتھ سنبھل بیٹھا۔ میں کچھ جھجکا۔ میرے سنبھلتے سنبھلتے اس نے اپنی جیب سے پستول نکالا۔ اور اس کی نال اپنے سر کی طرف کر کے داغ ہی تو لیا۔ خدا جانے کیسے عین فیر کرتے وقت میرے ہاتھ کا ایک غیر اختیاری دھکّا اُسے لگا۔ اور نشانہ خطا کر گیا۔ گولی اُوپر ایک تصویر میں لگی۔

اتنے میں میں نے جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ مگر وہ میری طرف بیوقوفانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، کہ وہ اپنی زندگی سے سیر ہے۔

(۹)

میں نے اسی وقت محمود کے والد کو بُلوا بھیجا۔ وہ آگئے۔ اُسے وہیں چھوڑ جیب سے کہا۔ کہ محمود کو کہیں جانے نہ دینا۔ اس کے والد کے ہمراہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اُن سے تمام واقعات بیان کئے۔ محمود کی والدہ کو خبر ہوگئی۔ ناصرہ کو بھی معلوم ہو گیا۔ اب وہ خاموش تھی۔

اسی کمرہ میں جہاں محمود اپنی آخری سانسیں توڑنے والا تھا۔ ناصرہ سے عقد ہو گیا۔

عبدالستار خاں

قید میں وردِ زباں شکوۂ صیاد رہے — لبِ فریاد نہ بیگانۂ فریاد رہے

خود فراموش محبت کو بھی کرنا کبھی یاد — اور مرے وعدہ فراموش اگر یاد رہے

غم نوازی نے تری کر دیا غم دوست ہمیں — شاد ہم تیری بدولت دلِ ناشاد رہے

کیفیات

زندگی جب سے مری موردِ آفات ہوئی — میرے ہی حال کی توضیح تھی جو بات ہوئی
شبِ وعدہ سے شبِ غم بھی نہیں کم میری — جب ذرا آنکھ لگی اُن سے ملاقات ہوئی
بختِ بیدار نے جب سے ترا جلوہ دیکھا — میری دُنیائے خوشی میں نہ کبھی رات ہوئی
عشق میں ولولۂ شوق کی قوّت دیکھو — میری خواہش نہ کبھی صرفِ عنایات ہوئی
دیکھ کر عجز، ندامت کی بلندی سرِ حشر — بخشش آزردۂ کمظرفیِ طاعات ہوئی
آؤ اور دیدۂ بیدار سے میرے دیکھو — میری دُنیائے مصیبت میں کہاں رات ہوئی
کون پھر در پہ ترے ناصیہ فرسا ہوتا — زندگی داخلِ ارکانِ عبادات ہوئی
عشق میں سارے زمانے سے تعلق چھوٹا — آرزو سے نہ مگر ترکِ موالات ہوئی
زندگی اک عدمِ احساس کا افسانہ ہے — خوابِ غفلت سے نہ چونکے تھے کہ پھر رات ہوئی
جو ترے غم میں کٹی دیدۂ بیدار کے ساتھ — زندگی میں مری محبوب وہی رات ہوئی
پھر فراوانیِ غم نے مجھے چھیڑا ہادیؔ — آہ پھر صبحِ مصیبت کی مری رات ہوئی

رودادِ دل

بیکار میں کب اے جذبۂ غم فرقت کی شب میں روتا ہوں — ہر قطرۂ اشکِ مصیبت سے اِک داغِ جگر کا دھوتا ہوں
احساس مجھے کب ہوتا ہے اُس بزمِ طرب کی رونق کا — اے بیخبری کیا حال کہوں آپے میں کہاں مَیں ہوتا ہوں
آلودہ نہ ہو دامانِ ستم بدنام نہ ہو شمشیرِ جفا — رو رو کر دل کے زخموں کو آنسو سے ہر دم دھوتا ہوں
ایسا بھی بے بس دُنیا میں مشکل سے نظر آئے گا کوئی — جب دل پہ نہیں قابو چلتا تو پہروں بیٹھ کے روتا ہوں
کیا ہوگا وہی اب تیرا بھی جو صبر و سکوں کا حشر ہوا — اِک تو ہی تھا اے دل مونسِ غم کیا تجھ کو بھی مَیں کھوتا ہوں
یہ سوزشِ پنہاں کی شدت یہ زخمِ نمایاں کی صورت — تقدیر رُلاتی ہے مجھ کو مَیں حالتِ دل پر روتا ہوں

کیوں سازِ طرب بیدار کرے کیوں نغمۂ راحت چونکائے
آغوشِ مصیبت میں ہادیؔ آرام سے مَیں تو سوتا ہوں

ہادی مچھلی شہری

حُسنِ اتّفاق

۱۸۱۱ء کے آخر کا ذکر ہے۔ کہ نیکدل گارل اپنی جاگیر نسزاڈا میں مقیم تھا۔ اُس کی خلقی ہمدردی اور مہمان نوازی کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ گرد و نواح کے لوگ متواتر اس کے یہاں آتے اور اس کی دریا دلی و سیر چشمی کی بدولت لذت کام و زبان حاصل کرتے تھے۔ ان روزانہ آنے والے مہمانوں میں بعض تو محض کھانے پینے اور مزے اڑانے کے لئے آتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جنکی اصلی غرض گارل کی شریک زندگی پٹرونا کے ساتھ تاش کھیلنا یا اُس کی نورِ نظر میریا کے حسن و جمال کے نظارہ سے اپنی آنکھوں کو پُر نور بنانا ہوتی تھی۔ میریا ایک حسین نازک اندام نوعمر دوشیزہ تھی۔ اس کے حسن جہاں افروز نے ایک زمانہ کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور ہر نوجوان کی یہ تمنّا اور کوشش تھی کہ وہ اس کو اپنی رفیقِ حیات بنا کر عمر بھر کے لئے حقیقی مسرت کا مالک بن جاتے۔

روسی نژاد میریا کی تعلیم و تربیت فرانسیسی طریقہ پر ہُوئی تھی۔ اور اس لئے "محبت" اس کی زندگی کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس کی نظر انتخاب نے ایک حسین نوجوان مگر غریب فوجی افسر کو اپنے لئے پسند کیا۔ جو کسی وجہ سے اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر آجکل خانہ نشین تھا۔ نوجوان نے بھی اس کی نگاہ محبت کو اپنے دل میں جگہ دی اور روزانہ ملاقاتوں نے بہت جلد ایک کو دوسرے کا گرویدہ بنا دیا۔ لیکن میریا کے والدین نے اس کے اس انتخاب کو بنظر استحسان نہ دیکھا۔ اور اس کو نوجوان سے ملنے کی ممانعت کر دی۔ نوجوان کی اس ناکامیِ قسمت کا سبب صرف اس کا افلاس تھا۔

اگرچہ اب ان وارفتگانِ محبت کو آزادی کے ساتھ ملنے اور ہمکلام ہونے کا موقع نہ ملتا تھا۔ مگر وہ اپنے اپنے دردِ دل کا اظہار بذریعہ تحریر کرتے رہتے۔ اور قریب قریب روزانہ صنوبر کے جنگل کے کسی گوشہ میں یا قدیم معبد کے کھنڈروں میں چند لمحوں کے لئے ایک جگہ جمع ہو کر شوق دیدار پُورا کر لیتے تھے۔ یہاں پر وہ کبھی تو ایک دائمی اور ابدی محبت کا عہد و پیمان کرتے، کبھی اپنی قسمت کا رونا روتے اور کبھی حصول مقصد کے لئے نئی نئی تدابیر سوچتے۔ آخر کار ایک مدت کی گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ:-

اگر ہم ایک دوسرے کے بغیر خوش نہیں رہ سکتے

اور بے رحم والدین ہمیں اپنی چند روزہ زندگی کو خوشگوار بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔ تو ہم کیوں اُنسے کنارہ کش نہ ہو جائیں؟"

یہ خیال سب سے پہلے نوجوان کے دل میں پیدا ہُوا۔ اور میریا نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

موسم سرما کے آتے ہی ان کی پوشیدہ ملاقاتیں یکقلم موقوف ہوگئیں۔ مگر سلسلۂ خط وکتابت پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ ولیڈمیر نے ہر ایک محبت نامے میں میریا کو ترغیب دی کہ وہ اس کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کوشش کرے یعنی وہ دونوں خفیہ طریقہ پر شادی کرلیں۔ اور کچھ عرصہ کے لئے کہیں چلے جائیں۔ پھر کسی مناسب موقع پر واپس آئیں اور اعتراف قصور کے ساتھ اپنے والدین کے قدموں پر سر رکھ کر معافی کے خواستگار ہوں یقین ہے کہ وہ انکی وفاداری اور محبت کی مجبوریوں پر نظر کر کے ان کی خطا سے درگذر ینگے اور دوبارہ اپنی آغوشِ محبت میں جگہ دینگے۔

میریا عرصہ تک پس وپیش کرتی رہی، اور ولیڈمیر نے فرار ہونے کی جسقدر تدابیر پیش کیں اُس نے سب مسترد کر دیں لیکن آخرکار جذبۂ محبت کی کشش رنگ لائی اور وہ رضامند ہو گئی۔

مقررہ تاریخ جسقدر نزدیک ہوتی گئی، میریا کی پریشانی اُسی قدر بڑھتی گئی۔ اور ایک روز پہلے سے تو وہ بالکل افسردہ و مضمحل نظر آنے لگی۔ اُس نے دن بھر مطلقاً کھانا نہیں کھایا۔ اور سرِشام ہی سے دردِ سر کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اپنی ریشمی پوشاکیں اور دوسری ضروری اشیاء ایک جگہ جمع کیں اور لکھنے کی میز پر جا بیٹھی۔ اُس نے ایک طویل وپُر درد خط اپنی ایک ہم عمر سہیلی کو اور ایک مختصر خط اپنے والدین کو لکھا جس میں اُس نے نہایت درد انگیز الفاظ اور غم آموز لہجہ میں اُن سے جُدا ہونے کی اجازت طلب کی۔ اور ان کو یقین دلایا۔ کہ وہ محبت کے ہاتھوں مجبوراً گھر بار چھوڑتی ہے۔ آخر میں اُس نے اپنی تمنائے دلی ظاہر کی کہ اگر اس کو کبھی قدمبوسی حاصل کرنے کی اجازت دی گئی تو وہ دن اس کے لئے بڑی خوش نصیبی کا دن ہوگا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور میریا بھی کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ آخر دونوں خطوط سربمہر کرنے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اور اُس پر ایک غنودگی کا عالم چھا گیا لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ متواتر خوفناک خواب دیکھ دیکھ کر چونک اُٹھتی تھی۔ سب سے پہلے اُس نے دیکھا۔ کہ جس وقت وہ گھر سے نکلکر اُس گاڑی میں بیٹھنے کے لئے جارہی تھی۔ جو اُس کے انتظار میں باغ کے اس طرف کھڑی ہوتی تھی۔ تو یکایک اُس کا باپ آگیا اور اس کو برف پر گھسیٹتا ہُوا دور تک لےگیا۔ اور آخرکار ایک

عمیق غار میں ڈال دیا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ ولیڈی میر فرشِ سبز پر زخمی پڑا ہوا کراہ رہا ہے۔ اور آخری وقت بھی اسی کی یاد میں محو ہے۔ ان کے علاوہ اور طرح طرح کے وسوسے اور خطرے اس کو پیش آتے رہے۔ اور وہ رات بھر اطمینان کی نیند نہ سو سکی۔

صبح کو جب وہ اپنے کمرہ سے باہر آئی تو اس کا چہرہ بالکل زعفرانی تھا۔ اور درد کی وجہ سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اُس کے والدین اس کی اس حالت کو دیکھ دیکھکر پریشان تھے۔ اور بار بار اس کی طبیعت کا حال دریافت کرتے تھے۔ ماں باپ کے اس محبت آمیز برتاؤ سے میریا کے دل پر ایک چوٹ لگتی تھی۔ اور اس سے متاثر ہو کر اُس نے کئی بار فرار ہونے کا قصد ملتوی کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ولیڈیمیر کی خیالی تصویر اس کے سامنے آموجود ہوتی۔ اور اس کا ارادہ پھر بدل گیا۔ الغرض اسی کشمکش میں دن تمام ہو گیا۔

رات کے کھانے کا وقت آیا۔ دستر خوان چنا گیا۔ مگر میریا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اور والدین سے اجازت چاہی۔ اُنہوں نے حسب معمول اس کی پیشانی پر بوسہ دیکر دعائیں دیں۔ میریا کا دل بھر آیا۔ اور وہ بمشکل تمام ضبط گریہ کر سکی۔ اور منہ پھیر کر فوراً کمرہ سے نکل گئی۔

خوابگاہ میں پہنچکر میریا ایک کرسی پر جا گری، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے سے اس کا دل کچھ ہلکا ہوا۔ اور کچھ اپنی رازدار خادمہ کو تسلی و تشفی سے ہمت بندھی اور وہ خاموش ہو کر مقررہ وقت کا انتظار کرنے لگی۔

یکایک آسمان پر ابر نمودار ہوا۔ ہوا تیز ہو گئی۔ اور برف گرنے لگی۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ اور پردے کھڑکھڑانے اور ہلنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کمرہ کی ہر شے اُس کی مفارقت سے بیقرار ہے۔ مکان میں بہت جلد خاموشی چھا گئی۔ اور ہر متنفس بے خبر سو گیا۔ میریا نے اپنے نازک جسم کو ایک گرم لبادہ میں چھپایا۔ خادمہ نے اسباب اُٹھایا۔ اور دونوں صحن باغ میں پہنچ گئیں۔ برف کا طوفان ہنوز زور پر تھا۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے ان دونوں کو تھپیڑے دے دیکر پیچھے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ گویا وہ ان نو عمر ناتجربہ کار گناہگاروں کو فرار ہونے سے باز رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ باغ کے اُس طرف سڑک پر ایک گاڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ گھوڑے سردی کی وجہ سے بیقرار ہو رہے تھے۔ اور ولیڈیمیر کا کوچبان ان کو خاموش رکھنے کی غرض سے ان کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ گاڑی کے نزدیک پہنچکر میریا نے اپنے مکان اور باغ پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور خدا کا نام لیکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور گھوڑے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

ولیڈ میئر دن بھر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا علی الصبح وہ جڈربنو کے پادری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بمشکل تمام اس کو نکاح خوانی کے لئے رضامند کیا۔ اس کے بعد وہ گواہوں کی تلاش میں روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک ریٹائرڈ رسالدار سے ملا۔ جو اُس کا شناسا تھا۔ رسالدار نے اسکی درخواست کو بخوشی قبول کر لیا۔ اور ولیڈ میئر کی سرگزشت سُنکر اس کو اپنا عہد شباب یاد آگیا۔ اُس نے ولیڈی میر کے ساتھ ہمدردی اور عزت کا برتاؤ کیا۔ اور دو اور گواہوں کے مہیا کرنے کا بار اپنے سر لے لیا۔ دوپہر سے قبل سروتیر اور پولیس کپتان کا نوعمر حسین لڑکا اہلن وہاں آئے۔ اُنہوں نے ولیڈ میئر کی تجویز کو بنظر استحسان دیکھا۔ اور اس سے وعدہ کیا۔ کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ دونوں اس کے لئے اپنی جانیں قربان کر دینگے۔ ولیڈی میر نے ان کا شکریہ ادا کیا اور دوسرے انتظامات کی تکمیل کے لئے اپنے گھر کی طرف واپس ہوا۔

شام ہو چکی تھی۔ اور ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی ولیڈی میر نے اپنے وفادار کوچبان کو تمام نشیب و فراز اور ضروری باتیں سمجھا کر حکم دیا۔ کہ وہ فوراً گاڑی لیکر نتزاڈا چلا جائے۔ اور اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرے۔ بعدازاں وہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر جڈربنو کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں دو گھنٹہ کے بعد میریا کے ساتھ اسکا عقد ہونے والا تھا۔

ولیڈ میئر ابھی گھر سے نکلا ہی تھا کہ برف کا طوفان آگیا۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ اور ایک لمحہ میں سڑک برف کی اور دوسری اردگرد کی چیزیں کہرے کی چادر میں چھپ گئیں۔ ولیڈی میر راستہ میں بھٹک گیا۔ اس کا گھوڑا بیقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھنے اور قدم قدم پر برف کے تودوں سے ٹھوکریں کھانے لگا۔ اُس نے راستہ معلوم کرنے کی بہت کچھ کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا۔ مگر جڈربنو کا جنگل نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس کے مکان سے جڈربنو تک صرف بیس منٹ کا راستہ تھا۔ دس منٹ اور گزر گئے۔ لیکن منزل مقصود کا اب بھی پتہ نہ چلا آخرکار اُس کو معلوم ہوا کہ وہ غلط راستہ پر جارہا ہے۔ اُسنے گھوڑے کو آگے سے روکا۔ اور صحیح راستہ دریافت کرنے کی فکر کرنے لگا۔ مگر کہر آلود فضا میں اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے دل نے اس کو داہنی طرف جانے کی ہدایت کی۔ اور وہ اپنے ضمیر کی رہنمائی میں داہنی طرف روانہ ہوا۔ مگر وہ جسقدر آگے بڑھتا گیا جڈربنو اسی قدر دُور ہوتا گیا۔ اور اُس کے دل پر رنج و یاس نے قبضہ کرنا شروع کیا۔

مگر وہ برابر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور آخر ایک گھنے جنگل کے نزدیک پہنچ گیا۔ اُس نے خُدا کا شکر ادا کیا اور جنگل کے کنارے کنارے گھوڑا ڈال دیا۔ کیونکہ جڈربنو جنگل کے

اُس کنارے پر واقع تھا۔ ولیڈ میر کے خوف و پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس کو معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک غیر معروف جنگل میں سفر کر رہا ہے۔ اُس کا دل بیٹھ گیا۔ دماغ پریشان ہو گیا۔ لیکن اُس نے ہمت مردانہ سے کام لیکر گھوڑے کو مہمیز کیا۔ اور غریب جانور باوجود تھک جانے کے راکب کے اشارہ پر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ جنگل کے ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔ مگر جب ولیڈ میر اُس کی آخری حد پر پہنچا تو اُس نے اپنے آپ برف سے ڈھکے ہوئے ایک وسیع میدان میں پایا۔ اُس کے دل سے بے اختیار آہ نکلی۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ پھر کمر ہمت باندھ کر روانہ ہوا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ طوفان کا زور کم ہو گیا تھا۔ اور آسمان پر کہیں کہیں کوئی تارا نکل آیا تھا۔ اب ولیڈ میر ارد گرد کی چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔ کچھ فاصلہ پر اس کو ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا اور وہ بیتابانہ اس کی طرف لپکا۔ پہلے ہی مکان کے نزدیک پہنچکر وہ گھوڑے سے اُترا اور دیوانہ وار دروازہ پر دستک دینی شروع کی۔ چند لمحوں کے بعد بالائی منزل کی کھڑکی کھلی اور ایک ضعیف العمر شخص نے سر نکال کر پوچھا۔

ضعیف۔ تم کیا چاہتے ہو؟

ولیڈی میر۔ جڈریپو یہاں سے کتنی دور ہے؟ کیا بہت دور ہے؟

ضعیف۔ جی نہیں کچھ زیادہ دور نہیں صرف دس میل۔

یہ جواب سُنکر ولیڈ میر کی جان نکل گئی۔ وہ بالکل ساکت وصامت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اور جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو کہنے لگا۔

ولیڈی میر۔ مہربان من! میرا گھوڑا بہت تھک گیا ہے اور مجھے صبح ہونے سے پہلے جڈریپو پہنچنا ضروری ہے۔ کیا تم میرے لئے ایک گھوڑے کا انتظام کر سکتے ہو؟

ضعیف۔ افسوس! ہم غریبوں کے یہاں گھوڑا جیسی بیش قیمت چیز کہاں ہو سکتی ہے۔

ولیڈ میر۔ تو کیا ایک رہنما مل سکتا ہے؟

ضعیف۔ ہاں یہ ممکن ہے، ٹھہرو میں اپنے لڑکے کو بھیجتا ہوں۔ جو تم کو منزل مقصود تک پہنچا دیگا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہوئے برآمد ہوا اور ولیڈی میر کے آگے آگے چلنے لگا۔

سپیدۂ سحر کی روشنی میں سحر خیز پرندوں کے چہچہوں کے ساتھ ولیڈی میر جڈریپو پہنچا۔ رہنما کو اسکا حق الخدمت ادا کر کے رخصت کیا۔ اور خود گرجے کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح ہوئی۔ اگاسل اور اُس کی رفیق زندگی پیٹرونا خوابگاہ سے برآمد ہوتے۔ اور نشستگاہ میں بیٹھ کر چائے کے تیار

ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ گارل نے ایک ملازم کو میریا کے پاس اس کی خیریت دریافت کرنے کو بھیجا۔ جسکے جواب میں خود میریا حاضر ہوئی اور والدین کو سلام کیا۔

گارل۔ کہو میریا! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

میریا۔ ابّا جان! اچھی ہوں۔

پٹرونا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل تم آتشدان کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھی رہیں۔ اور کوئلے کے دھوئیں کے اثر سے تمہاری طبیعت خراب ہوگئی۔

میریا۔ غالباً ایسا ہی ہے۔

دن تو حسب معمول ہنسی خوشی گزر گیا۔ مگر رات میں میریا کی طبیعت یکایک خراب ہوگئی۔ اور وہ دو ہفتہ تک بستر علالت پر پڑی رہی۔ گزشتہ شب کے واقعات کا علم گھر کے لوگوں میں سے کسی کو نہ تھا۔ میریا نے وہ دونوں خطوط جلا ڈالے تھے۔ خادمہ نے میریا کی ناراضی اور بدنامی کے خیال سے کسی سے کچھ ذکر نہیں کیا تھا۔ پادری، رسالدار اور دوسرے واقف حال لوگ مصلحتاً خاموش تھے۔ الغرض اس راز سے بجز رازداروں کے اور کوئی واقف نہ تھا۔ لیکن دوران علالت میں ایک روز حالت بیہوشی میں میریا نے اس راز کو خود ہی طشت ازبام کر دیا۔ اور من وعن پورا افسانہ کہہ سنایا۔ مگر اُس کی گفتگو ایسی غیر مربوط اور مہمل تھی۔ کہ اس کی ماں بھی، جو ہر وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ صرف اسقدر سمجھ سکی کہ اس کو ولیڈیمیر سے بے حد محبت ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئی ہے۔ اُس نے اپنے شوہر و نیز ہمسایوں سے مشورہ کیا۔ اور آخر کار متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ جبکہ فطرتاً ایک عورت ایک شخص سے عہد محبت باندھنے کے بعد اُس سے جُدا ہونا پسند نہیں کر سکتی تو میریا کو جس کے دل میں ولیڈیمیر کی محبت جاگزیں ہو چکی ہے، کیوں اس کے جائز حق سے محروم رکھا جائے؟ علاوہ ازیں اصول اخلاق کی رو سے مفلس ہونا کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی تلافی ناممکن ہو۔ کیونکہ عورت کی شادی مرد کے ساتھ ہوتی ہے نہ کہ دولت کے۔

میریا کی حالت اب رو بصحت تھی۔ ولیڈیمیر نے ایک مدت سے میریا کے گھر کا آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اس طوفانی رات کے خوفناک اور حیرت انگیز واقعات نے اس کو ایک پیکر یاس وغم بنا دیا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا تھا۔ میریا کے عزیزوں نے باہم مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ولیڈیمیر کو اس کی رسائی قسمت یعنی میریا کے والدین کی رضامندی کی اطلاع دیدی جائے۔ اطلاع دی گئی۔ لیکن جواب بالکل خلاف امید ملا۔ جس کو سُنکر ہر شخص متحیر رہ گیا۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ شاید اپنے افلاس اور میریا کی مفارقت کے صدمات پیہم سے اس کا

دماغ خراب ہوگیا ہے۔ خط کا مطلب صرف اس قدر تھا۔

"میری برگشتہ قسمت نے مجھے اس قابل نہیں رکھا! کہ اپنی صورت آپ لوگوں کو دکھاؤں۔ خدا کے لئے میرے حالِ زار پر رحم کرو۔ اور ایک ایسی بدنصیب ہستی کو جس کی زندگی صرف موت پر منحصر ہے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔"

چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ ولیڈیمیر اپنا نام دوبارہ فوج میں لکھا کر کہیں چلا گیا۔

ایک مدت تک میریا کو اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی گئی۔ اب وہ بالکل تندرست ہوگئی تھی۔ چند ماہ گزر گئے اور ولیڈیمیر کا نام کبھی بھولے سے بھی میریا کی زبان پر نہ آیا لیکن ایک روز جب اُس نے ولیڈی میر کا نام اُن لوگوں کی فہرست میں دیکھا۔ جنھوں نے بارو ڈینو کے میدان جنگ میں (جو روسیوں اور فرانسیسیوں کے درمیان واقع ہوا تھا) کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔ اور جو زخمی ہو کر ماسکو کے کے شفاخانہ میں داخل ہوتے تھے۔ تو وہ یکایک غش کھا کر گر پڑی۔ اور لوگوں کو یہ خوف ہوا۔ کہ شاید وہ دوبارہ بیمار ہو جائیگی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کو جلد ہوش آگیا۔

اسی عرصہ میں گارل کا انتقال ہوگیا۔ اور میریا اُس کی تمام جائداد کی تنہا مالک بن گئی۔ کیونکہ گارل کے اور کوئی اولاد نہ تھی۔ لیکن اس جائداد اور دولت کے حاصل ہونے سے اس کی دلی افسردگی بجائے کم ہونے کے اور بڑھ گئی۔

اور اس کا دل ایسا گھبرایا کہ وہ فوراً نسرا ڈا کی سکونت ترک کر کے اپنی ماں کے ہمراہ ایک دوسرے موضع میں چلی گئی۔

نسرا ڈا کی طرح یہاں بھی اس کے خواستگاروں کی کافی تعداد پیدا ہوگئی۔ اوّل تو میریا کا حسن و جمال خود ہی قیامت خیز تھا۔ دوئم وہ ایک بڑی جائداد اور دولت کی مالک تھی۔ اس لئے ہر شخص کی یہی آرزو اور کوشش تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے میریا کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرلے۔ مگر فریب خوردہ محبت میریا نے کسی کو کوئی اُمید نہیں دلائی۔ اکثر اُس کی ماں نے اس کو ترغیب دی کہ وہ ان نوجوانوں میں سے، جو صبح و شام اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اور شمعِ حسن پر پروانہ وار نثار ہونے کو آمادہ ہیں۔ کسی ایک کو اپنے لئے انتخاب کرلے۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوئی۔ بلکہ جب کبھی پڑونا اس قسم کی گفتگو کرتی تو میریا اور زیادہ افسردہ اور دل گرفتہ ہو جاتی۔ ولیڈیمیر اب اس دنیا میں موجود نہ تھا۔ اور میریا کو اُس کی وفات کا علم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اُس کے دل میں نامراد مرنے والے کی یاد تازہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے ولیڈی میر کی لائی ہوئی کتابیں، قطعات، طغرے اور اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار، غرض اس قسم کی بہت سی چیزیں باحتیاط اپنے کمرہ میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اور اکثر عالم تنہائی میں کسی نہ کسی یادگار کے مطالعہ یا نظارہ میں محو رہتی تھی۔ میریا کے عزیز اور ہمسایہ زن و مرد اکی اس خودرفتگی

اور وفاداری پر متعجب تھے۔ اور بے صبری کے ساتھ اس خوش نصیب جوانمرد کو دیکھنے کے منتظر تھے۔ جو اُس کی ثابت قدمی کو شکست دے سکے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ میریا کی بے اعتنائی اور سرد مہری کے باوجود اس کے خواستگاروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جس وقت کرنیل بورمن اس کے جان بازوں کے حلقہ میں داخل ہُوا تو دوسرے تمام دعویداران محبت کو ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا پڑا۔ بورمن کی عمر تقریباً چھبیس سال تھی۔ وہ ایک خوش رو نوجوان تھا۔ پہلے ہی دن اس کو دیکھ میریا کے دل میں خود بخود ایک اُمنگ سی پیدا ہُوئی۔ اور رفتہ رفتہ وُہ اس سے محبت کرنے لگی۔ اب اس کی وہ اگلی افسردگی اور بے حسی یکسر موقوف ہو گئی تھی۔ اور اگرچہ وہ اُس سے بہت ہی بے تعلق اور بیگانہ بنی رہتی تھی۔ لیکن اہل نظر کی نگاہوں سے اسکی دزدیدہ محبت آمیز نظریں کس طرح پوشیدہ رہ سکتی تھیں۔

بورمن دراصل حسین تھا۔ اس کے اطوار و عادات دلاویز اور پسندیدہ تھے۔ میریا کے ساتھ اس کا برتاؤ بالکل سادہ اور راستبازانہ تھا۔ جس میں خودنمائی اور ریا کا شائبہ نہ تھا۔ وہ بظاہر حیادار، پاک باطن اور خاموش معلوم ہوتا تھا لیکن ان تمام اوصاف میں سے جس صفت نے میریا کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ وہ محض اس کی خاموشی تھی۔ وہ ہمیشہ ساکت و صامت رہنے کا عادی تھا۔ اور حسب ضرورت بہت ہی آہستگی اور نرمی سے مختصر گفتگو کرتا تھا۔ الغرض اب میریا کو بورمن کے ساتھ ایک تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اسکی موجودگی میں راحت قلب محسوس کرنے لگی تھی۔ اور غالباً بورمن کو بھی اس کیفیت قلبی کا احساس تھا۔ لیکن ہنوز بورمن کی زبان سے اظہار محبت نہ ہُوا تھا۔ اور اس لئے میریا کو ایک گونہ تعجب اور فکر تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی وجہ معلوم کرنیکی کوشش کرتی۔ کبھی اس کو بُزدل سمجھتی۔ کبھی مغرور یا مکّار خیال کرتی۔ مگر اس کی خاموشی کا راز ظاہر نہ ہوتا۔ بہت کچھ غور و خوض کے بعد آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ بورمن کو اس کے ساتھ انتہائی محبت ہے۔ لیکن اس کی قلبی کمزوری اس کو اظہارِ محبت کی اجازت نہیں دیتی۔ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد میریا نے بورمن کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی میں طرح طرح سے کوشش کرنی شروع کی۔ اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

ایک دن شام کے وقت پٹرونا برآمدہ میں تنہا بیٹھی ہُوئی تاش سے دل بہلا رہی تھی۔ کہ بورمن بیتابانہ در آیا۔ اور آتے ہی میریا کو پُوچھا۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ باغ میں ہے۔ بلا انتظار و اجازت باغ کی طرف چلا گیا۔ تجربہ کار سن رسیدہ پٹرونا بورمن کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی کہ

میریا کی محبت کا جادو کارگر ہو چکا ہے۔ اور اس خیال سے اس کو روحانی مسرت حاصل ہوئی۔ کہ آخر ایک مدت کے بعد میریا کو اس کے حسب منشاء شوہر مل گیا۔

میریا لب حوض ایک بید کے درخت کے سایہ میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کتاب تھی اور نگاہ سطح آب پر۔ وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بورمن کے قدموں کی آہٹ سنکر وہ یکایک چونک پڑی۔ اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پھر ہاتھ اور مزاج پرسی کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔

بورمن اس موقع کو اظہار مقصد کے لئے مناسب سمجھ کر میریا کی طرف مخاطب ہوا اور سراپا آرزو بنکر کہنے لگا۔ "کیا تم کو معلوم ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے؟ اور کس قدر محبت ہے؟"

محبت کا نام سنکر میریا کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے مسکرا کر شرم آلود نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور گردن جھکا لی۔ چند لمحے تک بورمن دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے سراپا کو دیکھتا رہا۔ اور پھر یکایک چونک کر کہنے لگا۔

بورمن - میریا! مجھے اپنی غلطی کا اب احساس ہوا ہے جبکہ میں تم سے روزانہ ملنے اور ہمکلام ہونے کا عادی بن گیا ہوں۔ تمہارا خیال ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ اور تمہارے بغیر دنیا میں میرا زندہ رہنا دشوار ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ میرے ضمیر کا تقاضا ہے کہ میں تم کو اس خوفناک راز سے آگاہ کروں جس کے معلوم ہونے پر ممکن ہے۔ کہ ہمارے تعلقات خوشگوار نہ رہیں۔ اور ہمارے درمیان ایک حد فاصل قائم ہو جائے۔

میریا - وہ حد فاصل تو پہلے ہی موجود ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ تم میرے رنج و راحت کے شریک نہیں ہو سکتے۔

بورمن - ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم فریب خوردۂ محبت ہو۔ لیکن اب جبکہ وہ ہستی جو تمہاری محبت کا مرکز تھی۔ دنیا میں موجود نہیں ہے اور تین سال تک تم اس کا سوگ منا چکی ہو۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ تم میری حالت زار پر رحم کرو اور مجھے مایوس نہ بناؤ۔

میریا - بس بس خاموش ہو جاؤ خدا کے لئے۔ کیوں میرے زخم جگر پر نمک پاشی کرتے ہو۔

بورمن - خیر، مجھے امید تھی۔ کہ تم ضرور میری ہو جاتیں مگر آہ! دنیا میں مجھ جیسا نامراد بھی شاید کوئی نہ ہوگا۔ افسوس! میری شادی ہو گئی ہے۔

میریا - ایں! تمہاری شادی ہو گئی ہے۔

بورمن - تقریباً چار سال گزرے کہ اتفاقیہ میری شادی ایک اجنبی لڑکی سے ہوئی تھی۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ اب

وہ کہاں ہے۔ اور نہ اس سے ملنے کی کوئی امید ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ ہماری شادی کس جگہ ہوئی تھی۔

میر یا۔ تعجب ہے۔ اچھا پورا واقعہ بیان کرو۔ تو کچھ پتہ چلے۔

بورمن۔ ۱۸۱۲ء کے شروع میں، میں ولنا جا رہا تھا جہاں میری رجمنٹ مقیم تھی۔ ایک دن شام کو میں نے ایک جگہ قیام کیا۔ لیکن مجھے جلد از جلد ولنا پہنچنا تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں نے روانگی کا قصد کیا۔ مگر فوراً ہی ایک خوفناک برف کا طوفان آگیا۔ اور مجھے مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔ لیکن جتنی دیر میں وہاں مقیم رہا۔ مجھے برابر محسوس ہوتا رہا کہ کوئی شخص مجھے آگے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ میرا دل خود بخود بیقرار تھا اور ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ سے زیادہ گزر رہا تھا۔ آخر میں نے اپنا گھوڑا منگایا۔ اور سوار ہو کر اُسی طوفان میں چل دیا۔ میں نے دریا کے کنارے کنارے سفر کرنا شروع کیا۔ کیونکہ عام راستہ کی بہ نسبت اس راستہ سے سفر میں چند میل کی کمی ہو جاتی تھی۔ راستہ بالکل برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور مطلع ابر آلود تھا۔ میں راستہ بھول کر ایک نامعلوم مقام پر پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کے اندر داخل ہونے کی جو راہ تھی اس پر سب سے پہلے ایک گرجا واقع تھا۔ جس کا دروازہ کافی رات گزر جانے کے باوجود اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اور دھیمی دھیمی روشنی کھڑکیوں اور روشندانوں سے باہر آرہی تھی۔ اور صحن میں متعدد گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ چونکہ اس طوفانی رات میں اس وقت گرجے کا کھلنا غیر معمولی بات تھی۔ اس لئے میرے دل میں فطرتاً واقعات معلوم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور میں گرجے کے احاطہ میں داخل ہو گیا۔

احاطہ کے اندر قدم رکھتے ہی " اِدھر آؤ، جلد آؤ" کی آوازیں آنے لگیں۔ اور جب میں گرجے کے دروازہ پر پہنچا تو کسی شخص نے کہا۔ " خدا کی پناہ! تم نے اس قدر دیر کہاں لگائی؟ تمہارا انتظار کرتے کرتے غریب دلہن مایوس ہوگئی۔ اور وہ اس وقت بالکل بیہوش ہے۔"

میں اپنے دل میں تو بہت حیران ہوا مگر بغیر کچھ کہے سنے گھوڑے سے اُتر کر گرجے کے اندر داخل ہو گیا۔ ہال میں دو تین شمعیں روشن تھیں۔ جن کی دھندلی روشنی میں کسی شخص کا چہرہ صاف نظر نہ آتا تھا۔ ایک طرف ایک نوعمر لڑکی بنچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور ایک دوسری لڑکی اس کے پاس بیٹھی ہوئی اس کا سر دبا رہی تھی۔ اس لڑکی نے مجھے دیکھ کر کہا۔ " خدا کا شکر ہے۔ کہ تم آگئے۔ تم نے اتنی دیر لگائی۔ کہ ہماری ملکہ پریشان ہوگئی۔"

پھر پادری نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ " اچھا اب آپ جلد اجازت دیجئے۔ تاکہ میں شروع کروں۔"

میں نے سر کے اشارے سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اور نوعمر لڑکی اپنی سہیلی کا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔

اگرچہ میں اس کا چہرہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکا لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے لڑکی حسین اور محبت کئے جانے کے قابل تھی۔ پادری نے خطبہ نکاح پڑھا۔ اور ہمارا عقد ہو گیا۔ حاضرین نے ہم دونوں کو مبارکباد دی۔ اور ایک دوسرے سے گلے ملنے کو کہا۔ حسین لڑکی نے اپنا زرد چہرہ میری طرف کر دیا۔ اور جیسے ہی میں آگے کو بڑھا۔ حسین لڑکی نے اپنا زرد چہرہ میری طرف کر دیا۔ اور جیسے ہی میں نے ہاتھ پھیلائے اور اس کی طرف جھکا۔ وہ خوفزدہ ہو کر چلا اُٹھی۔ "اوہو! دھوکا۔ دھوکا!! یہ تو وہ شخص نہیں ہے۔ یہ تو وہ ——" اتنا کہکر وہ بیہوش ہو گئی۔ حاضرین حیرت زدہ ہو کر میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے وہاں ٹھہرنا خطرناک سمجھا اور فوراً گرجے سے باہر آ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور ایک طرف کو چل دیا۔

میبریا۔ پناہ بخدا! لیکن پھر بھی تم کو یہ معلوم نہیں کہ وہ غریب لڑکی کہاں ہے؟

بورمن۔ مجھے کچھ بھی خبر نہیں۔ اُس زمانہ میں مجھے اس قسم کے معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ تاہم ایک مدت تک یہ افسانہ میری اور میرے دوستوں کی دلبستگی اور تفریح طبع کا سبب بنا رہا۔ اس وقت تو میں اس کو محض ایک مذاق سمجھتا تھا لیکن اب جب کبھی اس کا خیال آ جاتا ہے۔ تو مجھے ایک قسم کا افسوس ہوتا ہے۔ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ کہ میں نے کیوں اُس بیچاری کی راہ ماری۔ اور کیوں اس معصوم پیکر حسن پر ایک ناقابل معافی ظلم کیا؟

میبریا۔ اوہو! وہ تم ہو!! مگر تم اُس مظلوم لڑکی کو نہیں پہچانتے جو اس وقت بھی ایک پیکر مظلومیت بنی ہوئی تمہارے سامنے موجود ہے

یہ الفاظ سُنکر بورمن حیرت زدہ ہو گیا اور فوراً اپنا سر میبریا کے قدموں پر رکھ دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس طوفانی رات میں ولیڈی میر نوراستہ بھولکر شب بھر ادھر اُدھر مارا مارا پھرا۔ مگر میبریا اور دوسرے لوگ حسب وعدہ گرجے میں پہنچ گئے اور ولیڈمیر کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن وہ مقررہ وقت پر وہاں نہ پہنچ سکا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور میبریا کے دل پر ولیڈی میر کی وعدہ خلافی اور بیوفائی کا ایسا اثر ہوا کہ وہ بیہوش ہو گئی۔ اور حاضرین پریشان۔ ٹھیک اسی وقت اتفاقیہ بورمن وہاں جا پہنچا۔ لوگوں نے اسکو ولیڈمیر سمجھا۔ اور میبریا کے ساتھ اس کا عقد کر دیا گیا۔ لیکن فریب کُھل جانے پر بورمن وہاں سے چلتا بنا۔ اور میبریا بادل نخواستہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ صبح کو پادری کی زبانی ولیڈی میر کو رات کے واقعہ کا علم ہوا۔ اور وہ اپنی ناکامیِ تقدیر پر اشک حسرت بہاتا اُلٹے پاؤں

وہاں سے واپس ہوا۔ اور برداشتہ خاطر ہو کر دوبارہ اپنا نام فوج میں لکھا لیا۔ اور آخر بارو ڈینو کے معرکہ میں زخمی ہو کر ہمیشہ کے لئے دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ لازماً میریا اس واقعہ کے بعد افسردہ و غمگین رہنے لگی۔ اور اُس نے دوبارہ شادی کرنے کے خیال کو اپنے دِل میں جگہ نہ دی۔

اب اس کو صرف حسن اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ کہ میریا کو بورمن کے ساتھ خود بخود محبت ہو گئی۔ اور حقیقت حال ظاہر ہونے کے بعد دونوں ایکدوسرے کے رفیق زندگی بن گئے۔

(ماخوذ)

راز چاندپوری

بہاریہ

پھر صحنِ گلستاں میں شاید کہ بہار آئی
ہر غُنچۂ افسردہ ہے محوِ خود آرائی

پھر جوشِ مسرت سے ہے رقص رگِ جاں میں
اِک مژدۂ روحانی پھر بادِ صبا لائی

غُنچوں پہ تبسم ہے نغموں میں ترنم ہے
پھر محفلِ برہم میں اک جان نئی آئی

معمور فضائیں ہیں مسرور دعائیں ہیں
اِک نورِ تبسّم میں ڈوبے ہیں تمنّائی

ارباب محبت کو پیغام مسرت ہے
مخمورِ تماشا ہے ہر چشمِ تماشائی

سرشار ہیں دل سب کے مینائے محبت سے
ہے چار طرف چھایا اِک نشۂ صہبائی

پھر آہ نکلتی ہے شاداب اثر ہو کر
پھر جامِ تمنّا میں اِک لہر نئی آئی

کچھ ذہن میں ندرت ہے کچھ جوشِ طبیعت ہے
ہے وجد میں شاعر کی خود طاقتِ گویائی

جلیل قدوائی

مغلیہ فنونِ لطیفہ

سلطنتِ مغلیہ کی تباہی کے ساتھ جہاں ہزاروں فنون اور لاکھوں خوبیوں پر پردہ پڑگیا۔ اُن میں مغلیہ فنونِ لطیفہ بھی ہے۔ جس کی کھاد مُغل اپنے ساتھ ایران سے لاتے تھے۔ اور جس نے مدت تک مغلوں کے زیرِ سایہ نشو و نما حاصل کی۔ آج ہندوستان اور یُورپ کے عجائب خانوں کے مرقع جات سلطنت مغلیہ کی اس علمی قدردانی اور کمال پروری کو دُنیا کی نظر میں بے عدیل ثابت کرتے ہیں۔

جس سرزمین پر اسلام کا مبارک قدم پہنچا ہے وہاں کا ذرّہ ذرّہ علم کی روشنی سے منوّر ہوگیا ہے شاہان سامانیہ سلجوقیہ اور شاہانِ غزنویہ کی علمی قدردانی اور کمال پروری اور کتبخانوں کے بیان کے واسطے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

مغلوں کے علاوہ ہندوستان کا کوئی خاندان ایسا نہیں گزرا جس کا ایک عظیم الشان کتب خانہ نہ ہو امرا اور وزرا نے حسب حیثیت اپنے اپنے کتب خانے الگ قائم کر رکھے تھے۔ ان میں کتبخانہ فیروز شاہ تغلق۔ کتب خانہ اعتماد خاں گجراتی۔ کتب خانہ میرزا عبدالرحیم خان خاناں۔ کتب خانہ فیضی۔ کتب خانہ زیب النسا بیگم کتب خانہ شہزادہ دارا شکوہ خاص طور سے ممتاز تھے۔ کتب خانہ خان خاناں کا تفصیلی حال مُلّا عبدالباقی نے کتاب مآثر رحیمی میں قلمبند کیا ہے۔ اس کتب خانہ میں نہایت نادر اور نایاب علمی ذخیرے مہیا کئے گئے تھے۔ عرفی۔ نظیری۔ شکیبی وغیرہ اکثر شعراء عہد نے اپنے اپنے دیوان خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر کتبخانہ میں داخل کئے تھے۔ ان کتب خانوں میں بہت سے شعراء مصوّر نقاش اور خطاط کام کرتے تھے۔ فیضی کے مرنے کے بعد چار ہزار چھ سو جلدیں نفیس مصوّر اور مذہب اسکے کتبخانہ سے برآمد ہوئی تھیں۔ جن میں سے اکثر اکبری عہد کے مصوّروں کے ہاتھ کی بہترین مصوری کا نمونہ تھیں۔ سلاطین مغلیہ کا کتب خانہ جو غدر ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگیا تھا ایسی بیش بہا اور نادر کتابوں اور قدیم مرقعوں سے مالامال تھا۔ جو روئے زمین پر اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ تمام کتبخانہ قدیم مصوری اور نایاب کتابوں کا مجموعہ اور ہندوستان کے باکمال صنّاعوں۔ مصوّروں۔ اور خوشنویسوں کے کمالات کا بہترین نمونہ کمال تھا۔ اگرچہ ہندوستان کی

آخری طوائف الملوکی اور آخری سواسو برس کے ملکی انقلاب نے ہزاروں لاکھوں کتابوں کو ان کی اصلی جگہ سے ہٹا کر اہل یورپ اور دور دراز ملکوں کے کتب خانوں میں پہنچا دیا ہے۔ مگر پھر بھی ہندوستان کے مشہور کتبخانے۔ بانکی پور۔ رام پور۔ حیدرآباد دکن۔ کلکتہ۔ ٹونک۔ لاہور۔ جے پور میں ہیں۔ ان میں اب بھی ہزاروں کتب اور قدیم مرقعجات موجود ہیں۔ جو مغلوں کی مٹی ہوئی سلطنت کی ایک بینظیر یادگار ہیں۔

مغلوں کی علمی قدردانی اور کمال پروری نے لوگوں میں ایجاد اور اختراع کی روح پھونک دی تھی۔ اس لئے ان کے عہد میں مصوّر۔ نقاش اور خوشنویس لوگوں نے اپنے اپنے فن میں وہ کمال دکھایا تھا جو کسی اور سلطنت کے عہد میں ان فنون کو میسر نہیں ہوا۔ مغلوں نے ان لوگوں کی قدردانی صرف دولت ہی سے نہیں کی۔ بلکہ ان میں سے کئی مناصب جلیلہ پر بھی ممتاز تھے۔ جہانگیر کے زمانہ میں اس کے دربار کا ایک مشہور مصوّر ابوالحسن منصور تھا۔ جس سے جہانگیر نے توزک کے شاہی نسخہ میں اپنے جلوس کا مرقع تیار کرایا تھا۔ اور جس پر اس کو جہانگیر نے سنہ ۱۳ جلوس میں نادر الزمان کا خطاب عطا کیا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں ایک دوسرا مصوّر منوہر تھا۔ جو درباری مصوّروں میں دوسرے درجہ پر شمار ہوتا ہے۔ جس نے اکبرنامہ میں بہت سی تصاویر بنائی ہیں۔ اکبرنامہ کا نسخہ آجکل برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ جس میں منوہر کے علاوہ اور بہت سے درباری مصوّروں نے مثلاً عالم۔ بال چند۔ بشن داس۔ دولت خورد۔ مرزا فرخ بیگ۔ عنایت خاں منصور۔ میر ہاشم۔ مکند۔ کلیان داس۔ آقا رضا خاں والد ابوالحسن منصور۔ محمد عبد برادر ابوالحسن منصور۔ فقیر اللہ خاں محمد شریف امیرالامرا۔ ننھی بیگم۔ صفیحہ بیگم وغیرہ وغیرہ نے کام کیا ہے۔ تصویروں کے علاوہ اکبرنامہ کی تصویروں کے حاشیہ پر نستعلیق خط میں فارسی رباعیاں اور شعر لکھ کر تصویروں اور کتاب کی حاشیہ بندی کی ہے۔ جن میں ملا میر علی ہرات والے۔ عبدالرحمن۔ سلطان علی مشہدی محمد حسین کشمیری۔ ہدایت اللہ۔ عبدالرحیم۔ میر عبداللہ ترمزی خواجہ محمد حسین مشہور ہیں۔ مصوروں میں منوہر کو جہانگیر نے اپنے عہد حکومت میں راجہ منوہر داس کا خطاب عطا کیا تھا محمد شریف کو اکبری عہد میں امیرالامرا کا خطاب حاصل تھا۔ خوشنویسوں میں محمد حسین کشمیری کو اکبر نے زریں قلم کے خطاب اور ایک بیش بہا خلعت مع ہاتھی سجے ہوئے کے عطا کیا تھا۔ شاہجہان کے عہد میں امانت خاں خوشنویس جنہوں نے روضۂ تاج محل پر کتبہ نویسی کی تھی۔ شاہجہان نے ان کو منصب ہزاری پر سرفراز کیا تھا۔ میر محمد صالح منصب پانصدی پر اور آقا عبدالرشید جو مشہور ایرانی خوشنویس

میر امان خاں قزوینی کے بھتیجے ہیں۔ شاہجہان نے ان کو شہزادہ دارا شکوہ کو خوشنویسی سکھانے کے لئے ملازم رکھا تھا۔ ان کا منصب ہفت صدی تھا۔ محمد صالح اور آقا عبدالرشید دونوں بالترتیب دوہزار سات سو روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔ انہیں علمی قدردانیوں کی بدولت لوگ دور دراز سے ہندوستان کو کھنچے آتے تھے۔ اور اسی کمال پروری نے ہر ایک کو اپنے اپنے فن میں وہ باریکیاں اور صنعتیں پیدا کرنے کی جرأت پیدا کر دی تھی۔ جن سے آج وہ اہل دنیا میں ایک یکتائے فن مشہور ہیں۔ آج اہل یورپ ان کی مصوری نقاشی اور خطاطی کو دیکھکر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اور اسی لئے اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان کا عہد سلطنت ہندوستان کی تاریخ میں زریں عہد کے نام سے مشہور ہے۔ اکبر کے دوران عہد میں شاہنامہ فردوسی اور داستان امیر حمزہ سترہ جلدوں میں پندرہ برس کی مدت میں ہمایوں کے وقت کے مصوروں نے باتصویر تیار کی۔ حیدر آباد دکن کے کتبخانہ میں ایک کتاب بنام سیرت مسیح بزبان فارسی مصنفہ زیر شویر پادری رومن کیتھلک باتصویر موجود ہے۔ یہ کتاب اکبر کے حکم سے تصنیف ہوئی تھی۔ جہانگیر کے عہد میں توزک جہانگیری اور جہانگیر البم اور کئی دوسری کتابیں باتصویر تیار کی گئیں تھیں۔ عہد شاہجہان میں مہابھارت فارسی میں ترجمہ ہوکر باتصویر ہوئی۔ جس میں مختلف مصوروں کے ہاتھ کی تیرہ تصاویر ہیں۔ جن میں گوبند۔ نابر۔ ہاشم۔ باہو۔ صادق۔ داؤد۔ ابراہیم۔ پارس۔ غلام علی وغیرہ وغیرہ نے کام کیا ہے۔ کتاب ایک عجیب فارسی خط میں لکھی گئی ہے۔ اس کا نسخہ آجکل مگس برادر اینڈ کو لندن کے پاس ہے۔ ایک اور کتاب مگس برادر کی ملکیت ہے۔ جس میں چھیالیس ایران اور ہندوستان کے مختلف بادشاہوں اور شہزادوں کی تصاویر ہیں۔ جو عہد شاہجہان میں ہندوستان میں تیار ہوئی ہیں۔ کتاب نہایت بیش بہا چیز ہے جس کو دیکھکر انسان محو حیرت رہ جاتا ہے۔ کہ اُس وقت کے مصور صحیح شبیہ کھینچنے میں کسقدر اُستاد تھے۔ کتب خانہ بانکی پور میں خاندان تیموریہ کی ایک تاریخ ہے۔ کتاب تاریخی حیثیت سے بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے اور فن مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔ تیمور سے لیکر اس کے جانشین بابر۔ ہمایوں۔ اکبر کے ۲۲ سنہ جلوس تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب شاہی حکم سے اکبر کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ اس میں شاہجہان کے ہاتھ کی چند سطریں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں ۱۱۲ تصاویر ہیں۔ جو ۵۱ مختلف مصوروں کی صناعی کا نتیجہ ہیں ان مصوروں میں ۱۳ کا ابوالفضل نے آئین اکبری میں ذکر کیا ہے۔ اور ان تیرہ کے علاوہ تین کا مسٹر سمتھ نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون میں ذکر کیا ہے۔

کتب خانہ بانکی پور میں ایک اور کتاب بنام بادشاہ نامہ ہے جو شاہجہان کے حالات پر مشتمل ہے۔ کتاب ابتدا سے لیکر اخیر تک مصوری نقاشی اور خطاطی کے فن سے مالامال ہے۔ اس میں ۱۹ تصاویر ہیں۔ کتاب دو حصوں میں ہے۔ اسی کتب خانہ میں ایک اور کتاب فردوسی کا شاہنامہ ہے۔ یہ نسخہ کابل اور کشمیر کے گورنر علی مردان خاں نے شاہجہان کے لئے لکھوایا تھا۔ یہ نسخہ مصوّر ہے مگر ناکمل ہے۔

قدیم زمانہ میں فن مصوّری اور خطاطی ایک شریف فن سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے ہر ایک شخص کم و بیش ان میں مہارت رکھتا تھا۔ اور اسی وجہ سے تمام ملک میں نہایت کثرت سے خوشنویس اور مصوّر ہر عہد میں ہو گذرے ہیں غدر سے قبل بھی بڑے بڑے باکمال مصوّر نقاش، اور خطاط موجود تھے۔ لیکن فن کی ناقدردانی نے غدر کے بعد روز بروز اس میں ایک انحطاط پیدا کر دیا۔ حتےٰ کہ اب یہانتک نوبت پہنچ گئی ہے کہ قدیم مصوری اور خطاطی کے کرنے والا ہزاروں میں ایک ہی مل سکتا ہے اب صرف قدیم فنون لطیفہ کی یاد ہی یاد رہ گئی ہے۔

مغلوں کے زمانہ میں جس کثرت سے مصوّر نقاش اور خطاط ہو گذرے ہیں۔ ان کا عالمِ خیال میں بھی اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مردوں کو چھوڑ کر مصورہ اور خوشنویس عورتوں کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ مگر افسوس کہ اب وہ لوگ اپنے کمال کے ساتھ اپنے حالات زندگی بھی قبروں میں لے گئے ہیں۔

جب کسی ملک کا قدم ترقی کی جانب اٹھتا ہے تو اس وقت جو علوم و فنون موجودہ زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے آثار گذشتہ قوموں کی تاریخ میں بھی کہیں نہ کہیں ضرور ملتے ہیں۔ اور وہی آثار موجودہ دور تمدن میں ایک مکمل اور موزوں قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بعد میں پھر ایک خاص نام اور لقب سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ موجودہ ہندوستانی فن کوئی نیا فن نہیں ہے۔ بلکہ ہماری قوت خیال اور آنکھیں اس سے آشنا ہیں۔ یہ وہی بچّہ ہے جو مانی اور اور ایرانی مصوّروں کے گھر میں پیدا ہوا اور جس نے ایران کے شاہی محلوں میں پرورش پائی اور ہندوستان میں مغلوں کے گلشن تہذیب میں ارتقا پا کر بڑا ہوا۔ اور جس پر مغلوں کے آخری عہد میں بڑھاپا چھا گیا۔ ایران والوں کے عروج کا پروردہ اور مغلوں کے عہد کا زخم خوردہ بوڑھا پھر جوان ہوا ہے۔ گویا موجودہ روش فن ایک نئی شراب ہے جو پھر نئے طریقے سے نئے ہاتھوں سے پرانے کنستروں میں بھری گئی ہے۔ جس نے کبھی ایرانیوں اور مغلوں کو اپنی دلفریبیوں سے مست کر دیا تھا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ فن شعر کے مقابلہ میں

موجودہ فن تصویر کی اشاعت اور فروغ زیادہ عرصے میں
ہو گی۔ مگر پھر بھی شکر ہے۔ کہ تھوڑے سے
ہی عرصہ میں اس فن کی قدر دانی کا احساس ہندوستانی
دلوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ جو کہ وقتاً فوقتاً یہاں کی نمائشوں
سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں بنگال کے مسٹر ٹیگور اور لاہور
کے مسٹر عبدالرحمٰن چغتائی کا مشکور ہونا چاہیئے۔ جنہوں نے
اس فن کو دوبارہ زندگی بخشی ہے۔ اور ان نوجوانوں کو جنکے
دلوں میں ایشیائی آرٹ سیکھنے کی اُلفت ہے۔ کسی اور
مُلک کے فن کی نقالی سے بچا لیا ہے۔

مسٹر ٹیگور خاص طور پر ہندو تاریخ اور ہندو
مضامین کو تصاویر کا جامہ پہناتے ہیں۔ انہوں نے اس
فن میں انتہا سے کمال حاصل کیا ہے۔ مسٹر چغتائی
ایک پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے پُرانی مغل تہذیب کو
فن مصوری میں منتقل کیا ہے۔ اور جنہوں نے تصاویر میں
ایک مدبر اور ایک عالم تاریخ کی طرح نہایت تحقیق سے
ان یورپین اور ہندوستانی مخالف لوگوں کی تصاویر کا جواب
دیا ہے۔ جن سے مغلیہ تہذیب کا انحطاط مترشح ہوتا تھا
مسٹر چغتائی نے اپنے آرٹ میں مغلوں کی اس شان و شوکت
کو محفوظ رکھا ہے۔ جو مغلوں کی امتیازی خصوصیت تھی۔
اگر ٹیگور کی تصاویر کو دیکھ کر جاپانی مصوری کا نقشہ آنکھوں
میں پھر جاتا ہے جو دراصل جاپانی مصوری کا چربہ ہے تو
مسٹر چغتائی کی تصاویر دیکھ کر مغلوں کی وہ شان و شوکت
آنکھوں کے آگے آ جاتی ہے۔ جس کو یورپین مورخ مغلوں
کے عہد زرّیں سے خطاب کرتے ہیں۔ ان کی ایک تصویر
"شاہ جہان کی آخری ساعتیں" جس کو مَیں نے شملہ
نمائش میں ۲۱-۱۹۲۰ء میں دیکھا تھا۔ اور جس پر آپکو اوّل درجہ
کا انعام بھی ملا تھا۔ ٹیگور کی اس تصویر کے جواب میں
بنائی گئی ہے۔ جو ٹیگور نے "شاہجہان کی موت" کے
نام سے بنائی تھی۔ اور جو کلکتہ کے موڈرن ریویو کی کسی
گذشتہ اشاعت میں چھپ چکی ہے۔ ٹیگور نے اسی
پُرانی بات کو مدِ نظر رکھا ہے کہ اورنگ زیب نے
شاہجہان کو قید کر کے نہایت بیکسی اور مفلسی کی حالت
میں مرنے پر مجبور کیا۔ اور اس کے ساتھ شاہجہان کی
لاڈلی جہاں آرا کو دکھلایا ہے۔ ٹیگور کی تصویر سے ظاہر
ہوتا ہے۔ کہ ایک گھوسن اور ایک گھوسی سمن برج آگرہ
میں دم توڑ رہا ہے۔ برعکس اس کے مسٹر چغتائی نے اسی
مضمون کو ایک عالم تاریخ کی طرح نہایت تحقیق سے
دریافت کر کے تصویر تیار کی ہے۔ مسٹر چغتائی نے تصویر
میں دکھایا ہے کہ شہنشاہ وقت کی موت بھی کس قدر
شاندار ہوا کرتی ہے۔ ٹیگور کی تصویر میں ایک نقص یہ بھی
بہت بڑا ہے کہ مرتے وقت شاہجہان کی ٹانگیں قبلہ
کی طرف ہیں۔ حالانکہ اس فعل کا مرتکب ہونا ایک

معمولی سے معمولی مسلمان کی حالت سے بعید ہے اور پھر
ایک شہنشاہ وقت کی ذات سے اس غلطی کا سرزد
ہونا توکس قدر سوہانِ رُوح ہے۔

چغتائی کی تصویر میں شاہجہان کے پاس اس کی
لڑکی جہاں آرا کھڑی ہے۔ جس نے مرنے والے باپ
کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ جس کے بشرے
سے شہزادگی کے ساتھ اس وقت کا دلی رنج بھی ظاہر
ہے۔ جو کہ باپ کی موت سے اس کو برداشت کرنا پڑا ہے
پاس ہی دو لڑکیاں تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں۔ تصویر
میں رات کا پچھلا حصّہ ظاہر کیا گیا ہے۔ جو تاریخ سے
ثابت ہے۔ اور مصوّر نے آسمان پر ایک ستارہ بھی ٹوٹتا
ہُوا دکھایا ہے۔ گویا مصوّر نے مصوری کی دُنیا میں ایک
استعارہ استعمال کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہو کہ ایک
بادشاہ وقت یا ایک بڑی شخصیت دُنیا سے سفر کر رہی
ہے۔ اصل تصویر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح بیان
کرنے سے اس کی ہزاروں خوبیوں کا عقدہ حل نہیں ہوتا
یہ تصویر مغلوں کی ایک تاریخ ہے اور مصوّر نے ایک تختۂ کاغذ
میں رنگ اور برش کے ذریعے سمندر کوزہ میں بند کیا ہے
کلکتہ کے بنگالی اور انگریزی رسائل ہمیشہ مسٹر چغتائی
کی تصاویر کو عزت کی نگاہ سے شائع کرتے رہتے ہیں اب
کچھ دنوں سے لاہور کے مختلف اُردو رسائل نے بھی آپ
کی تصاویر کو شائع کرنا شروع کیا ہے جس میں ہزاروداستان اور
نیرنگ خیال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مسٹر چغتائی نے ڈاکٹر اقبال کے جانگداز اور
احساسِ قومی میں ڈُوبے ہُوئے اشعار کو بھی تصویر کا جامہ
پہنایا ہے۔ جس کو میں نے مختلف نمائشوں میں دیکھا
ہے۔ مثلاً شملہ کی نمائش میں آپ کی ایک تصویر جو ڈاکٹر
اقبال کی مشہور نظم شکوہ کے اس شعر پر بنائی گئی تھی۔

ع مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

تصویر نہایت اچھی تھی اس میں واقعی نمازی نہ ہونے
سے مسجدوں میں حسرت برس رہی تھی۔ اس تصویر کو
لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے خرید کیا تھا۔ ایک
اور دوسری تصویر ہے۔ جو لاہور کے ادبی حلقہ میں بہت
مشہور ہے۔ اسے دیکھ کر آدمی اپنی حالت کو بھول جاتا
ہے۔ مصوّر نے ڈاکٹر اقبال کی طرح قوم کی اصلی حالت کو
کھینچکر دکھایا ہے۔ یہ تصویر ڈاکٹر اقبال کی نظم شمع و شاعر
کے اس شعر کی آئینہ دار ہے۔ ؎

بُجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائے سوزِ تمام آیا تو کیا

اس تصویر کو اتفاقاً میں نے کلکتہ کی نمائش میں دیکھ
لیا تھا۔ تصویر کو راجہ بردوان نے ایک گراں رقم پر
خرید کیا تھا۔

حال ہی میں مجھے ایک دوست کی زبانی جو چند دن ہوئے لاہور گیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ مسٹر چغتائی آجکل مرزا غالب کے اشعار کو تصاویر کا رنگین جامہ پہنا رہے ہیں۔ اور عنقریب غالب کا مصوّر ایڈیشن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ خدا وہ دن جلد دکھائے۔ کہ مسٹر چغتائی مرزا غالب کے کلام معجز بیان کو شائع فرمائیں تاکہ ہماری اُردو دان پبلک کی پیاس ان کے اس پہلے مجموعہ سے بجھ سکے۔ مُلک کو بھی چاہیئے کہ ان کی اس محنت کی داد نہایت فراخ دلی سے دے۔

مانی دہلوی

وقت

اے وقت تو وہ بحر ہے ناقابلِ عبور　موجوں کا جس کی نام سنین و شہور[51] ہے
آبِ عمیق کو ترے کہتے ہیں حادثات　جو اشکِ چشمِ اہلِ زمانہ سے شور ہے
وہ بحرِ بے کنار ہے تو جس کا مد و جزر　پیمانۂ بقا و فنائے دہور[52] ہے
لاکھوں کئے شکار پر اب تک بھرا نہ پیٹ　ہر روز تیرے جوعِ بقر کا وفور ہے
کھا کر انہیں اگلتا ہے ساحل پہ واں کے تو　تا میہماں نواز ہے جو اور دُور ہے

طوفاں میں ہولناک سکونوں میں پروری
غافل جو تجھ سے ہو اُسے خطرہ ضرور ہے

شبلی

ضامن کنتوری

---

[51] جمع شہر ـ مہینہ
[52] جمع دہر ـ زمانہ

جذبات اثر

(۱)

بوسۂ گیسو جو کبھی حسن کی غمّاز نہ ہو
عشق کے دشت میں یوں لطفِ تگ و تاز نہ ہو

خاک ہوجاؤنگا جل جاؤنگا مٹ جاؤں گا
دیکھ اے پردہ نشیں پردہ بر انداز نہ ہو

حسن اعجاز سراپا ہے تو اعجاز ہے حُسن
غیر ممکن ہے جہاں حُسن ہو اعجاز نہ ہو

آشیاں دیکھ کے ہوتے ہیں کشادہ بازو
دام کہتا ہے مگر مائل پرواز نہ ہو

ساقیا! جام عطا ہو کوئی ایسا مجھ کو
گردشِ شام و سحر پھر خلل انداز نہ ہو

روح کیوں مائل پرواز ہے ہنگام سماع
سازِ مطرب میں کہیں تیری ہی آواز نہ ہو

زندگی ایک فسانہ ہے سووہ بھی ایسا
جس کا انجام نہ ہو جس کا آغاز نہ ہو

شیوۂ اہلِ وفا جور پرستی ہے اثر
ٹوٹ جاتے جو کبھی دل بھی تو آواز نہ ہو

(۲)

مجھ کو منظور نہیں آپ ہی جینا اپنا
تیر کھانے کو جو بیتاب ہے سینا اپنا

ڈوب جاتے کہ نکل آئے یہ قیمت اسکی
ورطۂ عشق میں پھینکا ہے سفینا اپنا

ہاں ذرا ایک جھلک اور بھی اے برقِ جمال
دیکھ ٹھنڈا ہُوا جاتا ہے پسینا اپنا

عشق کے داغ بھی اب دل سے مٹے جاتے ہیں
بس یہی کھالے دے کے دفینا اپنا

جس کو معبود بنالوں کوئی ایسا نہ ملا
جستجو ہی میں رہا دیدۂ بینا اپنا

بادۂ حسن سے تو ہو جاتے اثر
دل بھی ہو صاف مگر صورتِ مینا اپنا

اثر صہبائی

حیاتِ انسانی

(عہدِ قدیم میں جنوبی امریکہ کے باشندوں کی مقدس کتابوں میں تخلیق عالم کے متعلق مندرجہ ذیل روایت درج تھی)

ابتدائے آفرینش کے وقت جب خالقِ کائنات نے انسان کو پیدا کیا۔ تو اُسے رنج و غم، محنت و مشقت اور تلاش معاش کی تکلیفوں سے آزاد پیدا کیا۔ ہر انسان جو اس سرزمین پر آباد کیا جاتا تھا۔ اُس کی میعادِ حیات پُورے سو سال کی ہوتی تھی۔ اور وہ ان لاتعداد بیماریوں کے خوف سے مامون رہتا تھا۔ جن سے آج زمانہ مصیبتوں کا گھر بنا ہُوا ہے۔

زمانہ گزرتا گیا۔ اور جب خالق نے اپنے بندوں کی خوشی کو دیکھ کر خوش ہونا چاہا۔ تو نیچے نگاہ ڈالی۔

آدمی دُنیا کی فضا کو نیکیوں سے معمور کرنے کی بجائے جو کہ اُن کا مقدم فرض تھا۔ برائیوں کی جانب ایک ناقابلِ انسداد سرعت سے قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا کی سب چیزوں پر قادر پاکر مغرور ہو گئے تھے غیر جنس تو غیر جنس انہیں اپنی جنس کی بھی پروا نہ تھی۔ نہ خدا ہی یاد تھا۔ نہ اپنے پرائے کی چاہ تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر لڑنا اور کٹ مرنا اُن کا اوّلیں شعار تھا۔ اپنی دانست میں انہیں یہ گمان ہونے لگا تھا۔ کہ ہم خود ہی خالق اور خود ہی مخلوق ہیں۔

زندگی کا یہ آسمانی عطیہ ان کے لئے لعنت کا طوق بن چکا تھا۔

خالق نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے جی میں سوچا۔ "زندگی کا مقصد یہ نہیں سمجھے۔ ورنہ نفاق کی نافہمی ان کا شیرازہ نہ بکھیر سکتی۔ اور اس دھوکے میں مبتلا نہ ہوتے کہ ہر شخص صرف اپنے ہی لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ دُنیاوی لذّتوں سے خوب لطف اندوز ہونے۔ خدا نے ان کے لئے کام کاج کے بغیر جینا ناممکن کر دیا ضروریاتِ زندگی جو پہلے ہاتھ ہلائے بغیر مہیّا ہو جایا کرتی تھیں۔ اب انہیں محنت مزدوری کے ذریعہ خود مہیّا کرنی پڑتیں۔ جب جاڑے آتے سردی لگتی اور دانت سے دانت بجنے شروع ہوتے تو تن ڈھانکنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ بھُوک کی سختی جب ناقابلِ برداشت ہو جاتی، تو اس کی جستجو میں مجبوراً ہل چلا کے زمین جوتنی پڑتی۔ بھیڑوں بکریوں کی رکھوالی کرنی پڑتی۔ اور جب خدا کی رحمت بارش کی صورت میں قہر بن کر نازل ہوتی تو لاچار مکان بنانے پڑتے۔

خدا نے اپنے جی میں سوچا۔ اب شرکت کی ضرورت ان بچھڑوں کو ملا کر ہی چھوڑے گی۔ ایک اکیلا آدمی کیا کچھ

کر سکیگا۔ لکڑیاں چیریگا یا درخت گرائیگا۔ مکان بناتے گا یا اوزار تیار کریگا۔ نہیں ایک اکیلا انسان نہ بیج بو سکتا ہے نہ کھیتی کاٹ سکتا ہے۔ نہ رُوئی کات سکتا ہے نہ کپڑے بن سکتا ہے۔ اس کے لئے بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت انہیں مل جُل کر کام کرنے پر مجبور کریگی۔ اتفاق کی برکت سے پیداوار میں ترقی ہوگی۔ اور جتنی کھانے پینے کی چیزیں بافراط ہونگی اسی قدر انسان آرام و آسائش کی زندگی گزار ینگے۔ اور پھر مل جل کر رہنے کا سبق کبھی انکے دل سے محو نہ ہو سکیگا۔

وقت گزرتا گیا اور خدا نے اپنے بندوں کی طرف پھر دیکھا۔ کہ کس حال میں ہیں۔ اور اپنی قسمت پر کسقدر شاداں ہیں لیکن اُس نے دیکھا۔ کہ انسان پہلے سے بھی زیادہ برائیوں کی گہرائیوں میں غرق ہوتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ وہ مل جُلکر کام کرنا سیکھ گئے تھے (اور اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے) لیکن اس حالت میں وہ اتفاق سے کوسوں دُور تھے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ اور ہر طاقتور جماعت اپنے سے کم طاقت جماعت سے بہ زور اپنے حصّے کا کام کرواتی تھی۔ اور ان کے افراد کو ذلیل سمجھ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ وہ اپنے قیمتی وقت اور طاقت کو فضول جنگ و جدل میں ضائع کر رہے تھے اور یہ ان کی تباہی اور بربادی کی نشانیاں تھیں۔

یہ دیکھ کر خُدا نے ان کی موت کے معین وقت کا قدیم دستور منسوخ کر دیا۔ اور فیصلہ کر دیا۔ کہ وہ ہر لحظہ موت کے زبردست پنجہ میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ سو سال کی عمر تک ضرور پُہنچنا ایک بے معنی التزام قرار دیدیا گیا۔ یہ حکم ناطق دیکر خالق نے اپنے دل کو اس طرح دلاسا دیا۔

جب انسان اپنی چھوٹی عمر میں مرنا شروع کر دینگے اور انہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ ہم ہر وقت موت کے گھاٹ اُتر سکتے ہیں۔ تو وہ اپنی قیمتی زندگیوں کی قدر کرنا سیکھ جائینگے۔ جب وہ یہ دریافت کر لینگے کہ ان کی حیات و ممات ان کی پُہنچ سے بالا ہے۔ اور ان کی ہستی ایک ایسے باریک تار سے آویزاں ہے۔ جو بیک جنبش ٹوٹ سکتا ہے۔ تو وہ ان لمحوں کو زیادہ تر کار آمد اور مفید بنانے کی کوشش میں مصروف ہو جائینگے۔

انسان شادی و کامرانی سے دُور تر ہوتے گئے جب خدا نے ایک بار پھر دُنیا کی طرف نگاہ دوڑائی تو انسانوں کو سیاہ کاری کی مضبوط زنجیروں میں اسیر پایا۔ کچھ آدمی دوسروں سے زیادہ طاقتور تھے۔ اور اسی زور کے بل اُنھوں نے کمزوروں کو موت کی حقیقت سے خبردار کر رکھا تھا۔ ہاں اُنھوں نے موت کی اچانک آمد کو غریبوں اور ناداروں پر واضح طور سے ثابت کر دیا تھا۔ جب وہ ان کا حکم ماننے سے ہچکچاتے تو طاقتور انہیں

بید ریغ تہ تیغ کر دیتے۔ ان کے ساتھیوں کو قسم قسم کی خوفناک سزاؤں سے ڈراتے دھمکاتے۔ اور اس طرح کمزور جماعت پر اپنی مطلق العنانیوں کا سکہ جماتے۔ یوں زندگی کا ایک معیار قایم ہو گیا تھا۔ امرا اور ان کے چیلے چانٹے کام کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔ بیکسوں کا طبقہ اپنی طاقت سے زیادہ محنت مزدوری پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اور وہ آرام کے نام سے ناآشنا ہو کر اپنی صورتوں کو مسخ کر چکے تھے ان دونوں جماعتوں کا آپس میں خدا واسطے کا بیر تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے خوف کھاتے تھے۔ غریب اس لئے کہ اگر کام نہ کرینگے تو سزا موت ہوگی۔ امیر اس لئے کہ اگر غریبوں نے موت کی سزا کے باوجود کام سے انکار کر دیا۔ تو بھوک سے کتّے کی موت مرنا ہوگا۔ اس طرح شادمانی کا پودا دنیا سے یکقلم محو کرنے کی کوشش میں دنیا ہمہ تن مصروف تھی۔

خالق نے آدمیوں کی ناشکری کو دلی رنج سے دیکھا۔ اور آخری حربہ کے استعمال کا تہیّہ کر لیا۔ اس نے ہزاروں وبائیں زمین پر بھیج دیں۔ تاکہ انہیں اپنا بھولا ہوا سبق از سرِ نو یاد کرائیں۔ اس نے سوچا۔ جب کوئی بیمار ہو جائیگا تو اسے صحت کی قدر پہچان ہوگی جب بیماری میں اسے کوئی مدد نہ دیگا تو وہ سمجھ جائیگا کہ تندرست انسان کو مریض انسان کے رنج میں شریک ہونا چاہیے۔ اور اس طرح۔ جب کوئی اور کسی وبا کا شکار ہوگا تو ضرور اس سے ہمدردی سے پیش آئیگا۔

ایک عرصہ کے لئے خدا نے انسانی آبادی کو انکے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن پھر جب زمین کی طرف نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ جس دن سے وبائیں دنیا میں نازل کی گئی تھیں اسی دن سے انسانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ہے۔ خدا نے سوچا تھا۔ بیماریوں اور تکلیفوں سے انسانوں کی حالت سدھر جائیگی۔ لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ اور انسان قعرِ ذلت میں گرتے چلے گئے۔ وہ آدمی جو دوسروں سے بزور اپنے حصّہ کا کام لیتے تھے۔ اب انہیں سے تیمارداروں کا کام بھی لینے لگے۔ جب وہ بیماری میں مبتلا ہو جاتے غریبوں کی خدمتیں حاصل کرتے۔ اور وہ پیٹ کی خاطر ان کی نوکری میں حاضر رہتے۔ لیکن جب کوئی غریب مبتلائے الم ہو جاتا۔ تو امیر بھول کر بھی ان کا خیال نہ لاتے۔ اس طرح وہ لوگ جو امیروں کو روزی حاصل کر کے دیتے تھے۔ انکے غلام بن گئے۔ اور محنت و مشقت کے پہاڑوں تلے اس طرح دب گئے کہ وہ اپنے مریضوں کی خاطر ایک لمحہ بھی نہ نکال سکتے تھے۔ یوں غریبوں کی مشکلات میں اور امیروں کے عیش میں اضافہ پہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے علاوہ چند بیماریاں اسقدر مہلک ہوتی تھیں کہ مریض سے تیمارداروں کو ہو جایا کرتی تھیں۔ جب ایسی بیماریوں کا

کسی پر حملہ ہو جاتا۔ تو لوگ اس کے نزدیک نہ آتے تھے۔
ان حالات کے ماتحت بنی نوع انسان میں علیحدگی کی خلیج
وسیع اور وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

خدا نے اپنے جی میں سوچا۔ میں نے ان وسائل
سے بنی نوع انسان کو ایک صداقت سے خبردار کرنا چاہا
تھا۔ میں نے انہیں وہ چیز عطا کرنا چاہی تھی۔ جس میں ان
کے لئے حقیقی خوشی کا راز مضمر تھا۔ لیکن میں کامیاب نہیں
ہوا۔ اس لئے میں ان خودسر بندوں کو چھوڑے دیتا ہوں
دُنیا کی اونچ نیچ انہیں خود اتفاق کا سبق پڑھائیگی۔ وہ
اپنی بہتری خود تلاش کرینگے۔

اُس وقت سے خدا نے بنی نوع انسان کو اکیلا
چھوڑ دیا

انسانوں نے خُدائی نگرانی سے آزاد ہو کر بھی ایک
عرصہ وہ یہ زرّیں راز نہ پایا۔ جس سے وہ رنج و غم سے
چھٹکارا حاصل کر کے سچی خوشی کی زندگی گزار سکتے تھے۔ مگر
آخر ان میں سے چند دانا شخصوں کی سمجھ میں آگیا کہ

انسان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ مزدوری کرتا
رہے۔ کسی کا یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں پر حکومت کرے
اور کوئی اس بات کا پابند نہیں کہ کسی کا غلام بنا رہے۔
بلکہ انسانی زندگی کا مقصد یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ آرام و
آسائش کی زندگی گزارے۔ آخر انہیں یہ بھی سمجھ آگیا۔
کہ موت جو ہر لحظہ اور ہر گھڑی ان کی زندگی کا رشتہ منقطع کرنے
پر تُلی رہتی ہے۔ وہ یہ سکھاتی ہے کہ تمام منٹ۔ گھنٹے۔ دن
اور سال جو خدا ہمیں عنایت کرتا ہے۔ وہ اس لئے ہوتے
ہیں کہ ہم اس کی اطاعت اور آپس میں محبت کا برتاؤ
کرتے رہیں۔

انہیں یہ بھی سمجھ آگیا کہ امراض ان کو الگ
الگ کرنے کی خاطر نہیں بنائے گئے۔ بلکہ اس لئے
بنائے گئے ہیں۔ کہ غریب و امیر، کالے اور گورے،
اُونچے اور نیچے کا فرق مٹا دیں۔

(ٹالسٹائی)

محمد یوسف

سیکھو وفا جو دلبر بننے کا حوصلہ ہے — انسان کی کسوٹی اس کا معاملہ ہے
پہچان کیا بتاؤں وہ پوچھتے ہیں مجھ سے — دونوں میں کون دل ہے اور کون آبلہ ہے
دل میں امنگ آتی تو عشق کیوں نہ آتا — آخر شباب ہی کا اک یہ بھی ولولہ ہے

شوق قدوائی

چاند کو دیکھ کر

کیسا اندھیری رات میں، جلوہ فروز چاند ہے
چاند وہ جس کے روبرو، مہرِ منیر ماند ہے

مہرِ منیر ماند ہے جلوۂ طور دیکھنا
جلوۂ طور دیکھنا، تابشِ نور دیکھنا

جلوہ فگن ہے انجمن تاروں کی آسمان پر
گویا بہار کا سماں، ہے کسی بوستان پر

آہ! فضا میں چاندنی، پھیلی ہوئی ہے چارسو
اس پہ یہ گلفشانیٔ موجِ نسیمِ مشکبو

سبزۂ جوئبار پر، صفحۂ کوہسار پر
پھولوں پہ خار خار پر، عرصۂ سبزہ زار پر

جلوہ فگن ہر اک جگہ نور شعاعِ ماہ کا
دل کو لبھا رہا ہے کیا سین شبِ سیاہ کا

خوش

تخیّلات

شراب ناب کی سرمستیاں کہاں جاتیں
اٹھینگے حشر میں میکش سبو سبو کرتے

مریضِ عشق گھڑی دو گھڑی کا مہماں ہے
تم اس حزیں سے نہ یوں تلخ گفتگو کرتے

گلوں کو داغ تمنّائے عیش کافی تھا
چمن میں کیا وہ تمنائے رنگ و بو کرتے

نہ گھر کو جائیں نہ سوئیں یہ رند جام بدوش
تمام رات گزرتی ہے ہاؤ ہو کرتے

تیری نگاہ اگر دلنوازیاں کرتی
تو ہوشیار بھی مستی کی آرزو کرتے

بقولِ حضرتِ آتش یہ حال ہے شامیؔ
"برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے"

شامی

مہربان

ہم دونوں کو جدا ہوتے ایک سال ہوا تھا۔ اور شاید ایک دوسرے کو کسی حد تک محو بھی کر چکے تھے۔ کہ اس مرتبہ دہلی کے سفر میں قدرت نے مجھے اور مہربان کو پھر ملا دیا۔

مہربان دُبلا پتلا، نحیف و کمزور، بیس برس کا ایک نوجوان طالب علم تھا۔ قد میں لمبا، چہرہ پر مردنی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، گال اندر کی طرف بیٹھ گئے تھے۔ اور دونوں طرف ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ گھنی بھوئیں جن کے درمیان شدّتِ کمزوری سے ایک نیلی رگ دکھائی دیتی، آنکھوں میں شباب کی چمک کے بجائے زردی چھا گئی تھی۔ شروع سے وہ کمزور و مضمحل تھا۔ اور اس کی صحت خراب تھی۔ مگر اب کتاب کا کیڑا بن جانے کی وجہ سے وہ دن بدن زیادہ نحیف و زار ہوتا جاتا تھا۔

مہربان ہر چیز کو، دُنیا کے بڑے سے بڑے تجربہ کو کتاب اور صرف کتاب میں ڈھونڈھتا تھا۔ ہر چیز کو ایک شاعرانہ زاویہ نگاہ سے ایک جنچے تُلے اصول کے ماتحت دیکھتا، دیکھتا کیا دیکھنے کے لئے مجبور تھا۔ ابتدا سے اُس کے دماغ کی پرورش کچھ اس طرح ہوئی تھی۔ کہ وہ عملی دُنیا سے بیزار نظر آتا تھا۔ مکمل شعر اپنے جذبات وحسیات میں ہر بندِ رسوم سے آزاد، سوسائٹی سے گریزاں وہ دُنیا کو صرف اُس معصوم بچّہ کی نظر سے دیکھنا چاہتا، جو عالمِ ہوش میں آیا بھی نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے خیالات معتقدات اس قدر لطیف و نازک، عوام کے معتقدات سے اسقدر علیحٰدہ اور دُور تھے۔ کہ اُس کا بڑے سے بڑا دوست اکثر اُسے پاگل سمجھنے پر مجبور ہو جاتا، وُہ گفتگو بہت آہستہ اور کم کرتا، بہت ہی مختصر، یہ اُس کی فطرت تھی عجلت میں دو چار ٹُوٹے پھُوٹے نامکمل جملوں میں بڑے سے بڑے واقعہ کو ختم کر دیتا۔ اپنی اس کمزوری کا اُسے اعتراف تھا۔ اکثر کہتا بھی تھا کہ میں خود سمجھنے کے لئے پڑھتا ہوں دوسروں کے سمجھانے کے لئے نہیں، لیکن کبھی جب تم اُسے زیادہ چھیڑ دیتے یا اُس کے موضوع خصوصی حُسن و عشق یا اُس کی زندگی کے کسی دلچسپ ترین سوانح پر اُسے زیادہ اُکسا دیتے تو وہ اپنے مخصوص انداز میں زیادہ گفتگو کرنے پر بھی اُتر آتا۔ اور اکثر گھنٹوں ایک ایک بات کو، بات کی تہ بہ تہ جزئیات کو انتہائی لسّانی کے ساتھ بیان کرنے لگتا۔ پھر یکایک گویا یہ محسوس کر کے کہ وہ بہت زیادہ کہہ گیا اپنے مفہوم کو ادھورا اور نامکمل چھوڑ کر ایک گہرا ٹھنڈا سانس

بھر کر اپنی گفتگو ختم کر دیتا، تم اُس سے مصر ہوتے بھی کہ "اس کے بعد؟" "مگر وہ ہاں، ہوں، ہیں سے ٹال کر یا زیادہ چھیڑتے تو "مَیں گونگا ہوں، مان لیا" کہکر اپنے خیالات کو ہضم کر جاتا۔

وہ ہر وقت کسی دھن میں کسی گہرے خیال میں غرق نظر آتا۔ اس حالت میں وہ کئی کئی دن مغموم و ساکت رہتا، اس قدر سنجیدہ اسقدر متین رہتا کہ اُس کے دوست اُس کی محبت سے بیزار ہو جاتے، باقی کچھ دن وہ بشاش نظر آتا بشاشت کا صرف اس بات سے پتہ چلتا کہ وُہ ہر وقت اُسی غیر تسکین دہ، اُکھڑے اُکھڑے ادھورے فقروں میں رائے زنی کرتا رہتا تھا۔ ورنہ بظاہر تو وہ مُردہ سے بدتر تھا۔ ہر وقت بیتابانہ وہ کسی نہ کسی موضوع پر اپنے مخصوص طرز ادا میں اظہار رائے کرتا۔ گویا زبردستی، اپنی فطرت کے خلاف جنگ کر کے اپنے کو ہنس مکھ بنانا چاہتا ہے۔ تاکہ اُن ایام ماضیہ کا جن میں اس قدر تکلیف دہ طریقہ پر وہ سنجیدہ اور ساکت رہا ہے ہنس ہنس کر، مجنونانہ بے تکان بک بک کر یا دوسرے الفاظ میں بشاش رہ کر کفارہ ادا کرے۔

کتابوں کا عاشق تھا، اُٹھتے بیٹھتے، ہر وقت اُس کے ہاتھ میں کتاب ہوتی۔ صبح، شام، دوپہر رات، اگر اُس کا بس چلتا تو وہ سونے کے اوقات میں بھی کتاب ہی پیش نظر رکھتا، اُس سے ملنے کی صرف دو جگہیں تھیں۔ اُس کا کمرہ یا پھر لائبریری کمرے پر کسی کام سے اُس کے پاس جاؤ تو وہ کتابوں کا ذکر چھیڑ دیتا" ورلڈس کلاسکس" کا پورا سٹ اس ماہ کے آخر تک آ جائیگا۔" ولسیکس ناولس" کا تازہ ترین ایڈیشن تیار ہے، پبلک آرٹ کی طرف سے کس قدر بے پروا ہے۔ چیکوف کے رنگ کی ہمارے افسانوں میں کسقدر ضرورت ہے وغیرہ" مگر اُسی اپنے طرز میں ٹوٹے ٹوٹے جملوں میں، اپنے مفہوم کو صاف نہ ادا کرتا۔ صاف ادا ہی نہ کر سکتا تھا۔ مختلف خیالات ہر رنگ کے طرح طرح کے متضاد و مختلف خیالات کے کثیر اور بے تھاہ مجموعہ کو ذہن میں اس بے ترتیبی کیساتھ اکٹھا کر لیا تھا۔ ٹھونس لیا تھا کہ اکثر دو مختلف موضوع میں تفریق نہ کر پاتا۔ کچھ بیان کرتا ہوتا ذرا سی دیر میں اپنے بے امان خیالات کی رو میں بہک کر کوئی اور ذکر چھیڑ دیتا۔ نگاہ کتاب پر یا زمین میں گڑی ہوئی کبھی آنکھ اُٹھاتا بھی تو فوراً اس طرح نیچی کر لیتا، گویا خود اپنے وجود سے حیا کرتا ہے۔

لائبریری میں دیکھو تو کسی میز سے لگا ہوا کھڑا اخبار کتاب انسائیکلوپیڈیا، ولایتی ڈاک کے سرسری مطالعہ میں مصروف، ایک پریشان کھوئے ہوئے متوحش سے انداز میں ایک کتاب چھوڑ کر دوسری کتاب اُٹھا لیتا۔

ایک اخبار کی ورق گردانی کرنے کے بعد دوسرا اخبار لے لیتا متجسس و ہوسناک نظریں وسیع ہال کے ہر گوشہ میں دوڑتیں گویا چاہتا ہے کہ ایک ہی دفعہ میں ہر کتاب، کتاب کا ہر مضمون، پوری لائبریری مکمل طور پر لی جائے۔ اکثر گھبرا کر کہا کرتا "لائبریری میں بیٹھ کر مجھ سے کبھی پڑھا نہیں جاتا"۔

کتاب پر مرتا تھا۔ دُور دُور کتب خانوں سے مطبوعات، باہر کے مُلکوں سے کتابوں کی فہرستیں اُس کے پاس آتی رہتیں۔ جن کا باقاعدہ قائل رہتا۔ پریس میں سب سے بڑی اختیاری خوشی کا منظر ہے۔

نفاست اس کے ہر انداز سے ٹپکتی اور سب سے زیادہ اُس کے کتب خانہ میں دیکھی جاتی۔ روز صبح وُہ اپنے ہاتھ سے کتابوں کی ورق گردانی کرتا۔ گویا ایک حریص کی طرح اپنی بے شمار دولت کا شمار کرتا ہے۔ بر کیٹوں الماریوں اور میزوں پر جس سلسلہ و ترتیب سے کتابیں رہتیں اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا، اُس کی عدم موجودگی میں کوئی کتاب کہیں سے نکال لو۔ اور پھر ہزار اُسی نفاست ترتیب سے اُسی جگہ رکھدو۔ ناممکن تھا کہ وہ نہ بتادے۔ کہ فلاں کتاب نکالی گئی ہے۔ اُس کی کتابیں معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی پریس سے نکل کر آئی ہیں وہ چاہتا تھا کہ کتاب کھولی بھی نہ جائے اور پڑھ لیجائے سب سے زیادہ اور بدترین روحی تکلیف اُسے اسوقت ہوتی، جب کوئی اُس کی کتابوں کو صدمہ پہنچاتا، ایسے موقعوں پر اُس کا چہرہ جوشِ غضب سے سُرخ ہو جاتا۔ ہونٹ کانپنے لگتے اور وہ اس طرح دانت پیس کر رہ جاتا گویا اپنے دل کے اعماق سے نکلے ہُوئے سرد تھرّاتے ہُوئے شعلوں کو اندر ہی اندر بُجھا کر خود اپنی ہستی انتہائی اخلاص و نیاز مندی کے ساتھ زندگی کی صرف اس ایک دلچسپ قربانگاہ پر نثار کر دیگا۔

حُسن و عشق اُس کے خاص اور اہم موضوع تھے۔ اور اُن کے متعلق اُس کے خیالات عجیب تھے۔ اُس کی تمام زندگی محبت کا کٹا پٹا، ہر طرف سے چاک کیا ہُوا داغدار ایک ورق تھی جسے وہ متواتر و پیہم کاٹ کاٹ کر ہر طرف سے چاک کر کر کے، داغ دے دے کر اور زیادہ مجروح اور زیادہ ضعیف و زار بنانا چاہتا تھا، وہ مجسم محبت تھا اور اپنے ہوش سے آجتک محبت کی زد میں آجانا اُس کا ایک دلچسپ مشغلہ، دُنیا کے گوشہ گوشہ سے، کہیں ہو، کسی کے لئے ہو، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر، کرید کرید کر حسن کی شعاعیں اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتا تھا۔ اب تک وہ نہ معلوم کتنے جالبِ نظر، خوش پوش مناظر پر اپنا اطمینانِ قلب نثار کر کے اطمینان حاصل کر چکا تھا۔ خدا معلوم کتنے دلکش اور حُسن کے ایک سخت دل مہیب پہاڑ میں سے تراشے ہُوئے مجسموں پر بغیر

اُن پر کوئی اثر ڈالے، بلکہ اُن میں کوئی احساس پیدا کئے
اُن پر سٹ چکا تھا مایوسی و حرماں گویا اس کا ازلی حصّہ تھا
تباہی و بربادی گویا اس کا قسمت کردہ انعام تھیں حیرت
ہوتی تھی کہ کس طرح یہ کمزور و بیمار ہستی ان اٹھکھیلیوں
کی تاب لاتی ہے۔ حسن و عشق پر تم اُسے ذرا چھیڑ دیتے۔
پھر دیکھتے کس طرح وہ اپنے مخصوص طرزِ ادا میں اپنے مبہم
اظہارِ رائے پر قدرت حاصل کر کے اپنے خیالات کی
ایک نہر بہا دیتا۔ وہ کہتا

"حسن ..... ! آہ! مَیں تو دُنیا کی بدترین شے
سے حسن نکال لیا کرتا ہوں ....."

"حسن کی تعریف کیا ہے؟" اُس کی بات کاٹ
کر تم کہتے۔

"حُسن کی تعریف؟" وہ بغیر تم سے نظر ہلاتے
کانپتے ہُوئے ہونٹوں سے تم پر جُھنجھلا کر، تمہاری سادہ مزاجی
پر گویا تمسخر اُڑا کر کہتا

"حسن کی تعریف! ..... حسن کی تعریف یہ ہے
کہ ..... حُسن کوئی چیز نہیں، حُسن کا کوئی وجود نہیں۔"
پھر گویا یہ دیکھنے کے لئے کہ تم اُس پر ہنس تو نہیں رہے
ہو، وہ خاموشی سے تم پر تھوڑی دیر مجرمانہ نگاہیں گاڑ کر کہتا
"مَیں حُسن ہوں۔ مَیں ہر چیز کو حسن بخشتا ہوں۔ ہر چیز
اس قدر دلفریب و مسحور کن طور پر دیکھتا ہوں کہ وہ چیز
خود دلفریب و مسحور کن بن جاتی ہے۔ تم مجھے دلکش سے
دلکش منظر دکھاؤ۔ کوئی کافر سے کافر دوشیزہ دکھاؤ۔ میری
نگاہ اُس میں عیب معلوم کر کے اُسے بدصورت ٹھہرا
دے گی ....."

اُس کی اس مبہم گفتگو کو نہ سمجھ کر تم ہنس کر کچھ کہنا
چاہتے تو وہ ہمت کر کے تمہارے مُنہ پر اپنا سرد ہاتھ
رکھ کر سلسلۂ کلام جاری رکھتا۔ "یہ ہے حسن کی تعریف!
آہ، حسن کی آگ ہی نے تو مجھے جلا ڈالا ہے۔ جلا جلا کر
اپنی دبی ہُوئی چنگاریوں سے اندر ہی اندر سلگا سلگا کر
خاک سیاہ کر ڈالا ہے۔" اتنا کہہ کر انتہائی مرعوبیت کے
ساتھ عورت کا ذکر چھیڑ دیتا۔ تمہارے لبوں کو آواز
نکالنے کے لئے ہلتا دیکھ کر بغیر تمہیں کچھ کہنے کا موقع دیئے
وہ کہنے لگتا۔

"مجھے بوالہوس نہ کہنا، میرے جثہ پر نظر کرو۔ میں
ہوس کا بندہ ہونے کے قابل ہی کب ہوں۔ مَیں تو دُنیا پر
دُنیا کے ہر منظر پر، عورت اور عورت کی تمام جلوہ فروشیوں
پر صرف ایک اُچٹتی ہُوئی، ایک اوپری اوپری نظر ڈالنا
چاہتا ہوں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں صرف جائزہ لینا
چاہتا ہوں۔ آہ، تمہیں کس طرح بتاؤں۔ کیا کہنا چاہتا
ہوں، کس طرح بتاؤں ....." اب تم پر ایک ہلکی
معنی خیز نظر ڈال کر گویا جو کہنا چاہتا ہے اُسے کہتے

ہُوتے ڈرتا ہے۔ تمہارا اشارہ پاکر کہتا۔" آہ، تو عورت،
عورت کی وہ، وہ کیا چیز بتاؤں۔ جس پر میں مٹتا ہوں، وہ
وہ عورت کی نسائیت، عورت کی وہ، وہ ایک طرح کی
ناقابلِ بیان لطیف کیفیت جو اُسے دیکھ کر تم اپنے اوپر
طاری کر لینے کے لئے خوشی سے نہیں مگر آہ مجبوری سے
بھی نہیں مستعد ہو جاتے ہو، آہ، وہ چیز جان دیدینے
کے لائق ہے ..... ہنسومت" تمہیں مُسکراتے دیکھکر
وہ سنجیدہ بن کر کہتا۔" ..... ہنسومت، جانتے ہو؟
عورت کیوں اسقدر دلفریب، کیوں کائنات کے ہر منظر،
ہر مخلوق سے بلند و بالا لطافتوں کی حامل ہو جاتی ہے؟
...... آہ! کیوں؟ کون بتا سکتا ہے کہ کیوں! ...
اس میں کسی کی تخصیص نہیں، عورت صرف عورت ہو، عمر
کیا چیز ہے؟ رشتہ کس کا نام ہے؟ سوسائٹی نے یہ
قیدیں لگا دی ہیں۔ آہ عورت کوئی ہو کسی کے لئے ہو،
ماں، بہن، بیوی، لڑکی کوئی ہو میرے لئے یا تمہارے
لئے وہ عورت ہے ..... جانتے ہو؟ کبھی دیکھا
ہے؟ ..... ماں کو دیکھ کر بھی، اکثر اپنی بہن میں بھی، ---
شبہ مت کرنا۔ اپنی لڑکی میں بھی تمہیں کبھی کبھی کوئی اضطراری
کوئی نسائیت اور حیات سے لبریز ادا' کوئی بیساختہ پن
جس میں لطافت و رعنائی کوٹ کوٹ کر بھری ہو، تم دیکھ
لیتے ہو، دیکھ لیتے ہو اور اُس سے تنہائی میں، سوسائٹی
کے جکڑبند رسوم کی قید سے آزاد ہو لطف اُٹھاتے ہو!
...... دیکھو، تم سے ایک بات کہوں، اب تک کسی سے
نہیں بتائی" وہ کچھ سوچتے ہُوتے اور پھر تھوڑی دیر تک
گویا تصفیہ کرتے کہ کہے یا نہ کہے خاموش رہکر سلسلۂ کلام
شروع کر دیتا۔" وہ .... نہیں یاد ہے پروفیسر س
کی وہ جوان لڑکی مجھے کس قدر پسند تھی، آہ، ایک دن کا
قصّہ سُناؤں، فیروز، فیروز کو جانتے ہو نا؟ میرا تھیٹر والا
دوست، وہ تعطیل کے بعد گھر سے کچھ مٹھائیاں لایا، اور
دوستوں کو تقسیم کیں، پروفیسر س --- کے یہاں بھی
بھی بھیجی گئیں۔ دیکھو، میں نے اُسے بتائے ہُوتے اپنا
حصّہ بھی اُس کشتی میں رکھدیا جو پروفیسر س --- کے یہاں
جا رہی تھی۔ اب غور کرو، میرا قلب کسقدر مطمئن و مسرور
ہے۔ آہ، بتا نہیں سکتا، مجھے کسقدر تسکین ہے کہ میں
نے اُس لڑکی پر فتح پائی ..... "تم کچھ کہنے کو ہوتے
مگر وہ تو تمہیں بولنے ہی نہ دیتا۔ فوراً تمہیں روک کر
کہتا۔" آہ تمہیں تعجب ہے کہ فتح کیسے پائی؟ ....
دیکھو فتح میں میں کیا چاہتا ہوں، یہی نا کہ اُس سے
قریب تر ہو جاؤں۔ اس کی رُوح کو چھو لوں۔ سمجھو دیکھتے
ہو، میں اُس سے قریب تر ہو گیا۔ میں نے اسکی رُوح
کو چھو لیا۔ جب وہ اُن مٹھائیوں کو کھائیگی تو گویا میں
میری روح، میری رُوح کی تمام کیف آور و مخمور رنگینی اُس

کے ہاتھوں میں، اُس کے لبوں پر، اُس کے قلب کے ہر پوشیدہ گوشہ میں کس نیاز مندی وخلوص سے سما جائیگی، اُسے خبر بھی نہ ہو گی۔ لیکن میں اس کے پاس ہونگا۔ اُس کے دِل میں، اس کی رُوح میں ایک غیر محسوس طریقہ پر، بغیر اس کے علم کے پڑا سسکتا ہونگا۔ آہ! بڈھا پروفیسر..."

اتنا کہکر رُک جاتا گویا وہ بہت کہہ گیا۔ اسقدر بہت کہہ گیا کہ اب کہنے کو کوئی چیز نہیں رہی، اپنے طولِ کلام کو اُسی جگہ ختم کر کے اپنے دُبلے ہاتھوں سے مُنہ کو چھپا کر ایک تھرتھراتا ہُوا ٹھنڈا سانس بھرتا، ایسا معلوم ہوتا گویا وہ اب روکر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا ہے۔

غرض اس قدر نازک ولطیف حسیات کا حامل تھا۔ اور اس کچھ منطقی کچھ غیر منطقی، کچھ صاف کچھ مبہم طور پر اپنے حسیات کا اظہار کرتا تھا۔ جب میں نے اسے چھوڑا تھا، میری اُس کی دوستی بہت پُرانی تھی۔ لیکن میں نے اُسے کبھی اسقدر مضمحل ولاغر نہ دیکھا تھا جتنا کہ قضا وقدر نے آج دس بجے والے میل کے دوسرے درجہ میں اُسے میری نظروں کے سامنے لا ڈالا۔

دہلی اسٹیشن پر اُتر کر کارونیشن ہوٹل میں اپنے کو اچھی طرح مطمئن کر کے سب سے پہلا سوال جو میں نے اُس سے کیا وہ اس کی غیر معمولی تبدیلیِ صورت پر تھا۔

"آخر یہ تمہاری حالت کیا ہے؟"

"حالت!" اُس نے بغیر نظر اُٹھاتے بھرائے ہُوئے لہجہ میں دُہرایا۔ پھر گویا میرے سوال کو پی جانا چاہتا تھا یا اُس کی اہمیت کا اندازہ کر کے کسی معقول جواب کی فکر میں تھا۔ کچھ دیر تک خاموش رہا۔

سال بھر ہُوا جب شالامار میں میں نے آخری مرتبہ چھوڑا تھا۔ اُس وقت کی حالت سے آج کی حالت میں کسقدر اندیشہ ناک فرق ہے۔ آخر کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو؟" میں نے کہا۔

اُس کی عادت تھی کہ جب صحت کے متعلق ذکر چھیڑ دیا جاتا تو وہ اُداس ہو جاتا اور موت کا نام تو اُس کے لیے عجیب اثر رکھتا تھا۔ میری تقریر نے گویا اُس کی دہکتی ہُوئی آگ پر پانی کا کام کیا۔ اُس میں سے دھواں نکلنے لگا۔ اور وہ آگ سرد پڑکر گویا اور زیادہ سُلگنے لگی۔ چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ سارے جسم میں رعشہ پڑ گیا۔ آنکھوں کے گرد حلقوں میں سیاہی اور زیادہ آگئی۔ ہونٹ نیلے ہو گئے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرہ کو چھپالیا۔ اور کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر اپنے کو ڈالکر ایک جسم بے جان کی طرح دراز ہو گیا۔

"موت میرا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن بتاؤ تو کوئی بھی
اُس کی زد سے محفوظ ہے؟" اس نے ہمت کر کے کہا۔
"صحت کی طرف سے میری لاپروائی ظاہر ہے۔ مگر صحت کو
لیکر کروں کیا؟ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کے لئے؟ سو
صحت ور سے صحت ور شخص اس کی امید نہیں کر سکتا کہ وہ
دو دن بھی زندہ رہیگا۔ ایک دن ہر شخص کو مرنا ہے۔ کوئی آج
کوئی کل ..... "

"سنجیدہ ہو کر گفتگو کرو" میں نے اس کی بات
کاٹ کر کہا۔ "تمہاری یہ بے پروائی سخت مہلک ہے
مانا کہ دُنیا میں زندہ رہنے کی توقع حماقت ہے۔ پھر بھی صحت
ایک سب سے زیادہ اہم و بیش قیمت ..... "

" سب سے زیادہ اہم ..... " مجھے روکتے
ہوئے اُس نے شروع کر دیا۔ " خوب! مجھے دیکھو، میرے
نحیف و زار جثہ کو دیکھو، پھر بھی تم اس کلیہ سے انحراف
نہیں کرتے، کونسی مصیبت ہے جو میرے ضعیف جسم نے
نہیں اُٹھائی۔ اس کمزور جسم کے اندر ایک طاقتور اور
حرارت سے لبریز دل موجود ہے۔ جو میری تمام زندگی کو
بحال رکھنے کے لئے جو زندگی کے تمام اٹکھیلیاں سہنے
کو کافی ہے۔ کسی سے برسرِ پیکار ہونا نہیں کہ طاقت کی
فکر ہو۔ لڑائی پر جانا نہیں چاہتا۔ دُنیا پر حکمرانی کرنے کا
سودا نہیں، اصل طاقت و بہادری تو دل کی ہے، اپنے دل
کی طاقت، اُس کی حرارت، اُس کی روشنی لیکر میں دنیا میں
رہکر دُنیا کے مکر و فریب سے علیحدہ شعریت و موسیقی کے
عالم میں زندگی ختم کر دینا چاہتا ہوں، دل کی طاقت،
حرارت اور روشنی لیکر میں ہمیشہ دُنیا کی ہر چیز کو ایک خاص
جامہ پہنا کر، ہر چیز کو ایک خاص رنگ و بو بخش کر اسکا تاریک
پہلو نظر انداز کر کے اُس سے لطف اُٹھا لیتا ہوں یا یوں سمجھو
کہ دُنیا کی ہر چیز اپنے ایک اور صرف ایک روشن پہلو سے
میرے ذوقِ شعر سے لبریز دل کو شعریت، حرارت، روشنی،
رنگ بخش کر میری زندگی کو پُرلطف و دراز بناتی ہے۔"

اسی قسم کے استدلال سے ادھورے اور غیر مانوس
فقروں میں اُس نے اپنا مفہوم ادا کیا اور پھر میری خاموشی کو
دیکھ کر جو میں نے اس کے اس طرزِ تقریر پر تھوڑی دیر کے
لئے خود طاری کر لی تھی۔ گویا فاتحانہ جھنجھلا کر بولا۔

" پھر کہو گے کہ صحت سب سے زیادہ اہم ..... "

" ہرگز نہیں، ہرگز نہیں " اور کیا کہتا۔ سوائے
اس کے کہ اپنی شکست کا اعتراف کر لوں۔ ظاہر ہے، کہ
اس کے افعال اس کی گفتگو کو سنجیدگی سے تولنا ہی ایک
جرم تھا۔ وہ جس لطیف کیفیت کا اظہار کر رہا تھا یا کرنا چاہتا
تھا اور نہیں کر پاتا تھا میں سمجھ رہا تھا اور بہت پہلے سے
جانتا تھا۔ اس سے بہت پہلے ہی میری اس قسم کی اس کے
لئے مصلحانہ کوششیں ناکام ثابت ہو چکی تھیں۔ اس لئے

خاموش رہ گیا۔

دوسرے دن سہ پہر کو جب ہم دونوں قلعہ کی سیر کو نکلے تو اُس کے چہرہ پر ایک طرح کا اضمحلال تھا گویا رات کی بے تکان گفتگو کی تھکن ہے جو اُس کے چہرہ پر اب تک برس رہی ہے، قلعہ میں چپہ چپہ گھوم کر، دیوانِ خاص، دیوانِ عام جھروکا، محلات اور میوزیم کی سیر کر کے اپنے تاثرات کو بیان کرنا چاہتا تھا۔ مگر شاید اپنی اس کمزوری سے کہ وہ بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا خود ہی واقف ہو کر زبردستی اپنی قوتِ بیانیہ کو روک رہا تھا۔ دو قدم چلنا پھر رُک جانا ایک طرف نظر جمانا اور میرا ہاتھ زور سے دبانے لگتا، مجھے اس کے ہاتھوں کی برف کی سی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ اور میں نے اس کے حسّیات کو پڑھ لیا۔ اب مجھے ایک خشک نہر کے کنارے ایک پتّھر سے لگ کر بیٹھ جانے کو اشارہ کیا اور خود کو سبزہ پر ڈال کر ایک کہنی زمین پر ٹیک دی، میری طرف نظریں گاڑ دیں۔ ٹھنڈی سانس بھری اور پھر نظریں ہٹا کر آہستہ آہستہ تمام قلعہ کا سرسری جائزہ نظری لیا۔ ٹھنڈی سانس بھرنا تو گویا اُس کی عادت ہو گئی تھی۔ غم واندوہ کے مناظر کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ وہ مسرت وانبساط کی محفلوں میں بھی جہاں وہ اکثر دوستوں کے اصرار سے پہنچنے پر مجبور ہوتا۔ خدا معلوم کس اثر میں ڈوب کر، کس جذبہ کے ماتحت گہری ٹھنڈی سانس بھرتا یا آپ ہی آپ لب پر ایک خفیف تبسم لا کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ دانتوں سے لب اسقدر زور سے دبا لیتا کہ اُن کے زخمی ہو جانے میں کوئی اندیشہ نہ رہتا۔ گویا کسی نامعلوم جذبہ کی آگ کو آنسوؤں کے پانی سے بُجھا کر اُس کے غبار کو اندر ہی اندر دفن کر دینا چاہتا ہے

گھاس پر ایک کہنی ٹیک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے خوف نمایاں تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے تاثرات کی لاتعداد اور بے انتہا کیفیتوں کے وزن سے اس کا دل پھٹ جائیگا۔ میں سمجھا وہ گفتگو چھیڑتے ہوئے ڈر رہا تھا اور کوئی بہانہ ڈھونڈھتا تھا۔

"مہربان! . . . . ." میں نے کہا

"آہ، نہ پوچھو" بہانہ پاکر میرے فقرہ کو کاٹ کر کانپتے ہوئے اُس نے کہنا شروع کیا۔ "جانتے ہو، دِل کسقدر سخت چیز ہے؟ پتھر سے زیادہ سخت چیز ہے۔ لوہا بھی اکثر آگ کی تپش سے نرم پڑ جاتا ہے۔ آہ، اس سے بھی سخت، منحوست، کہ دِل کو سخت کہتا ہوں، ہاں میں کہ شعریت کا اسقدر دلدادہ ہوں اور ہر چیز میں اس کا متلاشی رہتا ہوں، میں کہ ذوق شعریت کے باوجود ہر شے میں مایوسی حرماں کا جویا رہتا ہوں۔ میں جو قدرت کے ہر دلفریب یا دلشکن منظر سے اسقدر جلد مسحور ہو جاتا ہوں۔ میں دل کو سخت کہتا ہوں، دیکھو، ایک وقت تھا کہ میں خوف سے لرز اُٹھتا تھا۔

(باقی پھر)

جلیل احمد قدوائی

روحی فداک

گزشتہ سے پیوستہ

فواد بے ایک نوجوان ترک ہے۔ وہ مدت سے پیرس میں رہتا تھا۔ شرافت و ریاست کے لحاظ سے ایک اعلےٰ خاندان کا رکن ہے۔ یہ شرافت و اعزاز اس نے اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا ہے۔ جس وقت وہ سن بلوغ کو پہنچا ہے۔ اُس کی دولت پچیس ہزار فرنک تھی۔ ایک عالیشان اور خوبصورت محل بھی تھا۔ مگر وہ سب کو چھوڑ کر پیرس چلا آیا۔ یہاں اُس نے تین سال گزارے دُنیا کی کوئی اور ایسی دلچسپی نہ تھی۔ جس سے لذت اندوز نہ ہوا ہو۔ یہانتک کہ اس عرصہ میں اپنی نصف دولت صرف کر ڈالی۔ پھر وہ اپنے وطن چلا آیا۔ اب اُس کا مصمم ارادہ یہ تھا کہ جزرسی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کریگا۔ تاکہ جسقدر نقصان مالی ہوا ہے اُس کی تلافی ہو جائے۔ مگر اسکے داعیات نفس اور حسیات شباب نے اس ارادۂ نیک میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ چنانچہ باقی دولت بھی سیر و شکار، حسن پرستی، سواریوں اور عمدہ گھوڑوں کے خریدنے میں ٹھکانے لگادی آخر ایک دن اُس کی تمام جائداد رہن ہوگئی۔ یہانتک کہ خزانہ جس میں اُس کی زمین کی مالگذاری کی آمدنی جمع ہوتی تھی

وہ بھی مرہون ہے۔ اب اُس نے بڑے بڑے سود پر قرض لینا شروع کیا۔ اُس کے بعد وہ خط ہماری معلومات کے لئے کافی ہے جس کا خلاصہ اُوپر دیکھ آئے ہیں۔

غرض خط پڑھ کر فواد کی پریشانی و رنج کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس وجہ سے اور بھی کہ اب اس کے لئے بھاگنے یا اس پر زندان ہونے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ بھاگتا ہے تو اب کچھ روپیہ پیسہ پاس نہیں جو عالم غربت میں ضروریات زندگی کا کفیل ہو سکے۔ جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ اپنا خط ریحانہ کو پہنچانے کے صلہ یا رشوت میں اُس کی خادمہ فلورا کے نذر کر چکا تھا اور خود فواد اب بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اب اس دریا دل مگر ناعاقبت اندیش نوجوان کی حالتِ زار کو کیا پوچھتے ہو۔ دُنیا اُس کی آنکھوں میں تاریک اور زندگی ایک عذاب نظر آتی تھی۔ اب وہ موت کے سوا کسی نعمتِ دُنیا کا آرزومند نہ تھا۔ گویا وہ ایک قلعہ تھا اور موت اس کی مضبوط کمین گاہ، اب فواد سفر کے لئے بھی کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ کیونکہ اُسے اپنے وطن عزیز کی مفارقت شاق تھی۔

وہ قرض کی بدولت جیل خانہ جانے کو اپنے پیارے وطن کی جانگداز جدائی پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ وطنِ عزیز جہاں اُس نے اپنی حیات کا بہترین دورِ شباب و عہدِ لذّت گزارا تھا۔ اس سے بھی قطع نظر کرکے اب تو وہ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ ریحانہ کو اس سے محبت ہوگئی ہے۔ وہ جس وقت محل میں آتا تھا۔ ریحانہ کی بے زبان مگر سخن طراز نگاہیں سب کچھ رازِ دل بتا دیتی تھیں۔ اس کا اندازِ سکوت و جنبشِ لب بھی کہے دیتے تھے کہ فواد کے لئے اس کے دل کے اندر خدا جانے کیا کیا جذبات موجزن ہیں۔ فواد کو کیونکر گوارا ہو کہ اس پیکرِ جمیل اس حسین و معصوم ریحانہ کا زریں مستقبل برباد اور اس کی قابلِ رشک و مایۂ نازش زندگی کو تباہ کردے۔ یعنی ریحانہ کو چھوڑ کر چلا جائے جبکہ وہ اُسے دل سے چاہتی ہے گو فواد کے لئے کوئی دشوار کام نہ تھا اُس کی رعنائی شباب اور دلربائی جمال خدا جانے کتنی بیگناہ بھولی بھالی ہستیوں کو اپنے طلسم حسن کا شکار بنا چکی ہیں۔ فواد وہ شخص ہے جس نے اپنی رنگینیوں کی بدولت اپنا شباب دوشیزگان پیرس کی محبت و عشق اور نازنینان طلسم کدۂ مغرب کی تسخیر قلوب میں، حُسن و جمال کی غرور شکنی آبروئے عصمت کو پائے حقارت سے پامال کرنے میں گزارا ہے۔ مگر آج وہ مجبور و بیکس ہے۔ غرض وہ دُنیا سے مایوس ہوکر خط لپیٹنے لگا۔ اور محوِ تفکر تھا کہ ایک شعاعِ امید

اس کے دل میں دوڑ گئی۔ ایک برقِ مسرت اُس کے تمام افسردہ و نیم مردہ جسم میں پھیل گئی۔ تقدیر پر بھروسہ کرکے اپنے جی میں کہنے لگا۔ میری طرح بہت سے لوگ ہلاک ہوکر حوادثِ زمانہ سے نجات پاگئے۔ اور میری ایسی بکثرت نامراد ہستیاں فنا ہوگئیں۔ انتظار وقت زندگی کو رائگاں کرتا ہے۔ محبت و عشق کے بہت سے داؤ گھات ہیں۔ جو جُوئے اور قمار کے داؤ گھات سے مشابہ ہیں۔ اور زمانہ کی عجیب و غریب نیرنگیوں سے بہت کچھ مماثل ہیں۔ آج جو کچھ کرنا ہو کرلینا چاہئے۔ کل کا دن غفلت و مدہوشی کا دن ہے۔ آج مجھے ریحانہ کی فکر کے سوا اور کوئی فکر نہ ہونا چاہئے۔ میرا خط یقیناً اُس کے ہاتھ میں پہنچگیا ہوگا۔ اگر اُس نے میری استدعا قبول کرلی، تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب و کامگار کوئی نہیں ہوسکتا۔ چاہے پھر کل میں زندانِ مصیبت میں ہوں یا عذابِ غربت میں۔

یہ طے کرکے خط جیب میں رکھا اور اپنے دوستوں کے پاس آکر کہا۔ "تھوڑی دیر کے لئے رفعت کاظم کو اجازت دیجئے کہ میں ان سے کچھ باتیں کرلوں"۔ رفعت ایک خوش مزاج جوان ہے۔ جس کی عمر تقریباً چالیس سال سے زیادہ نہیں۔ اُس کی دولت و ثروت کا اندازہ نہیں۔ امیرانہ و رئیسانہ زندگی گزارتا ہے۔ مگر کفایت شعاری

اُس کا شعار ہے۔ فؔواد نے الگ لیجا کر پہلے تو دوستوں کے ساتھ جو کچھ اُس کے شریفانہ اخلاق تھے۔ اُن کی تعریف کی۔ پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ رفعؔت نے پچیس گنیاں فؔواد کے سامنے پیش کیں اور کہا۔

رفعت۔ اس وقت میرے پاس اس رقم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

فواد۔ نہیں مجھے تو پچیس ہزار فرنک کی ضرورت ہے۔

رفعت ایکدم اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے سانپ نے حملہ کیا ہو۔ اتنی بڑی رقم سُنکر اُس کے حواس گم ہو گئے۔

فواد نے بہت کچھ منت سماجت کی اُس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ مطلوبہ رقم مَیں بطور قرض مانگتا ہوں۔ اور اپنی جایداد کا کچھ حصّہ رہن رکھتا ہوں، پھر فواد نے مذکورہ بالا واقعات بھی اُس سے بیان کئے اور امداد چاہی۔ لیکن قطعی انکار پر گفتگو کا خاتمہ ہو گیا۔ اتنے میں ریحانہ لبوں سے پھول برساتی، اور نگاہوں سے بجلیاں گراتی ہوئی اپنے دلدادہ پرستار شوہر کے ساتھ ساتھ کمرہ میں داخل ہوئی۔ یکدم ہر ایک شخص خاموش ہو گیا۔ اور اپنی باتیں ادھوری چھوڑ کر سب کے سب ریحانہ کی تعظیم کیلئے بڑھے۔ جس وقت فؔواد اس کی مزاج پُرسی کو آگے بڑھتا ہے۔ ریحانہ کے چہرۂ زیبا پر ایک عجیب قسم کی سُرخی دوڑ گئی۔ جسے سوائے اُس شخص کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ جو اس شگفتگی و رنگینی کا باعث تھا۔ اور خُدا ہی جانے کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے کیا کہدیا۔ اِسکے بعد ڈاکٹر عباس حلمی فؔواد بے کے پاس آئے اور تھوڑی ابتدائی گفتگو کے بعد کہا۔

"مجھے معلوم ہُوا ہے کہ آپ کو بیس ہزار فرنک کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ مَیں کوئی دولتمند آدمی تو نہیں ہوں لیکن مَیں نے اپنے کاروبار میں جسقدر روپیہ پیدا کیا ہے وہ بالکل آپ کا ہے۔ آپ اسے لے لیجئے اور جس طرح جی چاہے اپنے کام میں لائیے۔ جب آپ چاہیں یا جب آپ سے ہو سکے دیدیجئے گا۔"

فؔواد سمجھ گیا۔ کہ رفعت نے سارا راز احباب پر فاش کر دیا۔ فؔواد نے ڈاکٹر کی اس مردانہ حمیت اور بے نظیر ایثار و اخلاق کا جسقدر بھی ہو سکا شکریہ ادا کیا۔ اور اُسے اب معلوم ہُوا۔ کہ پیمانۂ دوستی اور معیار خلوص میں بہت اختلاف ہوتا ہے۔

ایک دولتمند دوست ہے اُس کے نزدیک دس لاکھ بھی کچھ نہیں۔ لیکن وہ اپنے ایک آفت رسیدہ رفیق کی امداد سے قاصر ہے۔ اور صاف انکار کر دیتا ہے دوسرا صرف اسی قدر دولت کا مالک ہے۔ جسقدر کہ فواد کو ضرورت ہے۔ وہ فواد کی فضولخرچیوں اور جایداد کی تباہی غرض تمام اندرونی حالات سے بھی واقف ہے۔ مگر پھر بھی اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیتا ہے۔ بغیر کسی خوف اور

بغیر کسی شرط کے، غرض دونوں میں یہ طے پایا کہ کل صبح یہ
روپیہ حوالہ کرنے کے لئے بروصہ چلیں گے، نہ پوچھئے،
کہ فواد کی مسرت کا کیا عالم تھا۔ اتنی بڑی مشکل آسان ہونے
سے جو کچھ سکون خاطر و تشفی حاصل ہوئی وہ حدِ بیان سے
باہر ہے۔ نہایت گرمجوشی و مسرت سے اُس نے دوستوں
کے ساتھ کھانا کھایا۔ وہ اسقدر مسرور و شادمان تھا۔ کہ
گویا اُس کے آفتابِ طالع کو کبھی گرہن ہی نہیں لگا تھا۔
فواد کے دل نے یقین کر لیا تھا کہ اُس کا مطلع تقدیر گرد آلود
ہونے کے بعد پھر صاف ہو گیا ہے۔ تکدر اور خموشی کے
بعد وہ مُسکرایا۔ گویا اپنے اس نئے عشق میں وہ یقیناً
کامیاب ہوگا۔ اور اُس کی آرزو ضرور پوری ہو کر
رہے گی۔

(۶)

بروصہ میں اس وقت صرف ایک بڑی عدالت
تھی۔ جیسی مصر قاہرہ میں ہے۔ جس کا رئیس عمر جاویش تھا
جو آج اس محل کے مہمانوں میں شریک ہے۔ اور یہ عجب
اتفاق ہے کہ کل صبح کو عدالت میں اس کے اجلاس کا
دن ہے۔ مقررہ وقت تک عدالت میں پہنچنا اُس کیلئے
ضروری ہے۔ اور رشدی بے بھی فیصلہ مقدمات کی
جوری کا رکن تھا۔ لہٰذا دونوں کو یہاں سے رات ہی کو
بروصہ جانا ضروری تھا۔ عمر جاویش نے بیگم رشدی اور
معزز مہمانوں کو اپنے اور رشدی کے عزم سفر کی اطلاع
دیدی تھی۔ ریحانہ نے اس خیال سے اُنہیں روکنا مناسب
نہ سمجھا کہ مبادا حاضرِ عدالت نہ ہونے سے کوئی افتاد پیش
آئے۔ کھانے کے بعد سب احباب محل کے ایک ایک
خوشنما کمرہ میں فریضۂ خواب ادا کرنے چلے گئے، کیونکہ رشدی
نے اکثر مہمانوں سے استدعا کی تھی۔ کہ یہیں قیام فرمائیں
اور جبتک وہ اپنے فرض کو ادا کر کے واپس نہ آئے، وُہ
سیر و شکار اور لطف دعوت میں اپنے اوقاتِ عزیز بسر
کریں۔ پھر وہ چلا گیا۔ کپڑے بدلے اور ابتک جاگنے
والے دوستوں سے روانگی کی اجازت لے ہی رہا تھا کہ
ایک خدمتگار حاضر ہوا۔ اُس نے اطلاع دی کہ مختارِ عام
صاحب تشریف لائے ہیں۔ اور آپ سے ملنا چاہتے
ہیں۔ رشدی بے اس سے ملنے گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر
میں واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چرمی بٹوا تھا۔
جس میں بیس ہزار کے نوٹ تھے۔ رشدی نے یہ بٹوا
لاکر اپنی بیگم کو دیا۔ اور کہا کہ

رشدی۔ یہ لو اسے میرے صندوقچے میں کسی مناسب
جگہ پر حفاظت سے رکھ دینا۔ یہ اُن درختوں کی قیمت
کا روپیہ ہے۔ جو مختار صاحب نے آج فروخت
کئے ہیں۔

ریحانہ۔ یہ روپیہ لیتے ہوئے میرا جی ڈرتا ہے۔ مال

ایسی چیز ہے کہ جس کے پاس ہو، وہ زمانہ کی دستبرد سے بچا رہے۔ مگر کبھی گھر میں اس کے دشمن پیدا ہو جاتے ہیں۔

رشدی (ہنسکر) یاد رکھو چور کتنے ہی بہادر ہوں، مگر جس گھر میں لوگوں کا اکثر ہجوم رہتا ہو، وہاں داخل ہونے کی جسارت نہیں کرسکتے۔ جیسے یہ ہمارا محل ہے۔ آج رات ہمارے یہاں کئی مہمان اور کثرت سے ہتھیار بھی موجود ہیں۔ کتوں کی بھی ایک خاص تعداد ہے۔ لہٰذا اس رقم کو ساتھ لیجانا بالکل غیر مناسب اور فعل عبث معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ جہاں قیام ہو، وہیں کوئی لوٹ لے اور ہم چوروں، ڈاکوؤں کا نشانہ بن جائیں۔

نازنین ریحانہ نے مسکرا کر بٹوا لے لیا۔ اور جس کمرہ میں احباب مہمان تھے۔ اُس کی ایک تجوری میں رکھ دیا۔ رشدی اپنے دوست کے ساتھ ساتھ محل کے پھاٹک پر آیا۔ دونوں گاڑی پر سوار ہوکر ابروصہ کے راستہ پر روانہ ہوئے۔ گاڑی میں نہایت اعلیٰ درجہ کے دو انگریزی گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ اور چاندی کی تاباں لالٹینیں راستہ کو نورانی بنا رہی تھیں۔ گاڑی کو چلے ہوئے پاؤ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ دروازہ باغ کے دونوں جانب جو دو مکان تھے۔ اُن میں سے ایک کا دربان نکل کر گاڑی کے قریب آیا۔ گھوڑے ہنہنائے تھے۔ دربان نے رشدی کو ایک خط دیا اور کہا۔ کہ ایک کاشتکار نے یہ لفافہ مجھے دیا ہے۔ جسے میں نہیں جانتا اور یہ تاکید کی ہے کہ رات ہی کو اپنے مالک کی خدمت میں پہنچا دینا ایک نہایت اہم معاملہ کے متعلق ایک ضروری خط ہے۔

رشدی بے کو تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ تمام خطوط حسب قاعدہ محل میں پہنچاتے جاتے ہیں۔ اس نے دربان سے کہا۔

"ایک لالٹین کھولکر ہمارے پاس لاؤ۔" دربان نے اسی وقت حکم کی تعمیل کی۔ رشدی بہت غور سے خط کا لفافہ دیکھنے لگا۔ تعجب و حیرت کے آثار اس کے چہرہ سے نمایاں تھے۔ خط پر سُرخ لاکھ کی مہر لگی تھی۔ اور مہر پر فرنچ اشرفی کا ٹھپا بھی تھا۔ سوادِ خط سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی ایسی عورت کا لکھا ہوا ہے۔ جو لکھنا کم جانتی ہے۔ پھر اُس نے لفافہ چاک کیا تو دیکھا کہ پتہ بھی نہیں لکھا ہے۔ غرض خط پڑھنا شروع کیا۔ ابھی چند سطریں بھی پوری نکی تھیں۔ کہ اکدم چہرہ کا رنگ متغیر ہوکر زعفران کی طرح زرد ہوگیا۔ بڑی مشکل سے پورا خط پڑھ سکا۔ ہاتھ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اضطراب دل بڑھتا جاتا تھا۔ خط پر پھر ایک نظر ڈالی۔ پھر ایک اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور سانس چڑھ رہی تھی جس طرح

آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ پھر خط کو تہ کر کے اپنی جیب میں
رکھ لیا۔ اور دربان سے کہا۔ (مگر ایسے لہجہ میں کہ گویا یہ
اس کی آواز ہی نہیں ہے) لالٹین لے جاؤ۔ اور کوچبان
سے کہا کہ گاڑی بڑھائیے۔ عمر جاویش اپنے دوست کی
حرکات کو بھانپ رہا تھا۔ اس کی آواز کی تبدیلی اور حالت
کے یکدم تغیر کو تاڑ گیا تھا۔ جب کسی قدر اُسے سکون ہوا
تو عمر جاویش نے کہا۔ میرے عزیز دوست مجھے معاف
فرمائیے۔ اگر میں یہ دریافت کروں۔ کہ اسقدر قلق و اضطراب
کا کیا سبب ہے جو آپ پر اکدم چھا گیا۔ اور آپ کے
رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ میرا یہ سوال محض نمائش
کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ میری محبت و خلوص مجبور کرتی
ہے۔ اور آپ کے ساتھ جو اتحاد ہے وہ میری اس جرأت
کے لئے معافی خواہ ہے۔ رشدی نے مصنوعی سکونِ خاطر
اور کچھ خود ساختہ اطمینان کے ساتھ کہا۔ اس میں کچھ ایسی
ہی بیہودہ اور بے معنی خبریں ہیں۔ میں بھی پہلے پہل گھبرایا
تھا۔ کہ شاید کوئی غیر معمولی وحشت خیز خبر ہو۔ جو میرے
سفر میں سدِّ راہ ہو۔ مگر یہ بات نہیں۔ پھر گاڑی کے
تکیہ سے ٹک گیا۔ اور ایسے سناٹے میں تھا۔ کہ اسے جنبش
تک نہ ہوئی۔ گاڑی تھوڑی ہی دیر چلنے پائی تھی کہ کوچبان
سے چلا کر کہا۔ ٹھہر جاؤ۔ کوچبان نے گاڑی روک لی۔
رشدی گاڑی کا پٹ کھول کر سڑک پر اُتر آیا۔ اور عمر جاویش
سے کہا کہ خدا حافظ۔ کل صبح تک کے لئے میں جناب کو
خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ اور اس وقت تنہا چھوڑتا ہوں
خدا آپ کی حفاظت کرے۔ جاویش پر بیحد حیرت و پریشانی
چھا گئی وہ کہنے لگا۔

جاویش۔ کیا آپ محل کو واپس جاتے ہیں۔

رشدی۔ نہیں۔ نہیں۔

جاویش۔ تو پھر کہاں؟ رات نہایت تاریک اور راستہ
بالکل غیر محفوظ ہے۔ میں آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں۔ کہ
سچ سچ بتلائیے۔ معاملہ کیا ہے۔ اور اس منحوس خط کے
راز سے مجھے بھی آگاہ کیجئے۔ جس نے آپ کی حالت میں
یہ انقلاب پیدا کر کے آگے چلنے کی بجائے واپسی پر
آمادہ کر دیا۔ آپ نہ بتائیں گے تو میرے قلق و اضطراب
کی کوئی حد نہ رہے گی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ضرور کوئی
مصیبتِ عظیم آپ پر آ پڑی ہے۔ آپ کی موجودہ حالت
نے مجھے آپ کی رفاقت اور اپنے کام چھوڑ دینے پر مجبور
کر دیا ہے۔ یہ کہکر عمر بھی گاڑی سے نیچے کود پڑا، اور
رشدی بے کا ہاتھ پکڑ کر بہت اصرار شروع کیا کہ مجھے
بھی حقیقت حال سے اطلاع دیجئے۔

رشدی بے۔ افسوس ہے کہ آپ جو بات معلوم کرنا
چاہتے ہیں وہ نہیں بتا سکتا۔ بتانے پر ضرور آپکی نظروں
سے گر جاؤنگا۔ میری عزت، وقعت آپکے نزدیک کچھ بھی

نہ رہیگی مگر چونکہ آپ بہت زیادہ اصرار کر رہے ہیں اور آپ کا اصرار محض جذبۂ خلوص و محبت پر مبنی ہے۔ لہٰذا یہ راز آپ پر ظاہر کئے دیتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ انگورہ کی بہت سی معزز خواتین میری دوست ہیں۔ اس وقت جو خط مجھے ملا ہے۔ یہ ایک عورت کا خط ہے جس میں خواہش کی گئی ہے کہ میں آج ہی رات کو اس سے ملوں۔ میرا اُن کے پاس پہنچنا لازمی ہے۔ یہ ہے راز اور یہ ہے اس معاملہ کی اصل حقیقت۔ میرے پیارے دوست میں آپ کو سپردِ خدا کرتا ہوں اور امید ہے کہ صبح سویرے آپ سے ملاقات ہوگی۔

(نہایت درد و یاس کے لہجہ میں) عمر جاوید نے کہا کہ میں اس وقت آپ کو اس ارادہ پر ملامت اور کوئی نصیحت تو کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ اُس نے میری بہترین اور عزیز ترین امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تک میں یہ سمجھتا رہا تھا کہ آپ ہر حیثیت سے تمام دُنیا سے زیادہ خوش نصیب، کامیاب و فارغ البال ہیں۔ یہ خوش نصیبی اور قابل رشک حالت آپ ایسے دانا اور شریف جذبات رکھنے والے دوست سے، اور آپ کی عفیفہ و نیکدل حسین و نازنین بیوی سے کبھی جُدا نہیں ہو سکتی۔ وہ نازنین جس کے فریفتہ، عشق زمین و آسمان کے فرشتے بھی ہوں تو بجا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اب مجھے اپنے حسن ظن میں کچھ شک پیدا ہو گیا ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ دل اور دانائی دونوں جسمانی شہوات اور نفسانی خواہشات پر غالب آنے سے عاجز ہیں۔ اور بڑے بڑے فلاسفر، زبردست سے زبردست معقول لوگ بڑی بے پروائی کے ساتھ شرافت و سعادت زندگی کو پامال کر دیتے ہیں۔ ضمیر انسانی کو گرم سرخ آنسو فتنہ انگیز خواہشات، بدترین جذبات کی آگ نہیں بجھا سکتے۔ خیر میں تحقیر کرنا نہیں چاہتا۔ مگر آپ کی حالتِ زار پر اظہارِ ہمدردی و افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور خدا تعالےٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو راہ راست پر لائے۔

رشدی بے۔ آپ کو حق ہے کہ میری حالتِ زار پر آنسو بہائیں۔ افسوس و ہمدردی کا اظہار کریں۔ میری دل گرفتگی دیکھ کر متاثر و ملول ہوں۔ بیشک مجھے بھی یہی امید تھی۔ کہ میری زندگی فراغت و عیش کے لحاظ سے قابل رشک زندگی ہوگی۔ لیکن زمانہ کی ہوائے تند نے میری امیدِ جمیل کی روشنی کو بجھا دیا۔ اور اس خوابِ لطیف کے نیرنگ لطف کو مٹا دیا۔ پس اب میں خوش نصیب انسان نہیں ہوں۔

اُس کے بعد رشدی نے اپنے دوست کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور سلام کر کے جھٹ رخصت ہو گیا۔ گو عمر جاوید اُسے پکارتا رہا۔ مگر وہ دم بھر میں نگاہوں سے اوجھل

مجبوراً عمر بصد افسردگی و تاثر گاڑی پر آکر بیٹھا۔ گاڑی نہایت تیزی سے قطع مسافت کر رہی تھی۔ لیکن وہ دریائے حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ رشدی کے اس جدید و نازک ترین معاملہ پر غور کر رہا تھا۔ اور اُس کا دماغ نئے نئے فلسفیانہ خیالات کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ اُس کی چشم بصیرت نے محسوس کیا کہ انسان تاثرات کے عالم میں آکر پیکرِ حیوانی میں آجاتا ہے۔ اور جامۂ انسانیت بوجھ کی طرح اُتار پھینکتا ہے۔ اپنی لبریز لذائذ تشنگیٔ نفس بجھانے کے سوا اُسے کوئی چیز زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ اپنی ہلاکت اور تباہی کا اندیشہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور عورت جو پیدا ہے اُس کے لئے دنیا ہی میں بدنصیبی و بدبختی لکھ دی گئی ہے۔ چنانچہ آج سینکڑوں نازنین ہستیاں جولذائذ نفسانی کا ہدف بنا کر کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دی گئی ہیں۔ اور اُن کے عوض کسی دوسری عورت سے رشتۂ محبت جوڑ لیا گیا ہے۔ گو وہ دوسری عورت ہرگز اس کی اہل نہ تھی۔ کہ پہلی عورت کو چھوڑ کر اس سے رشتۂ محبت باندھا جائے

عمر جاوید جارہا تھا اور یہ خیالات اس کے رفیقِ سفر تھے۔ اور ابوطیب کا شعر زبانِ حال سے پڑھ رہا تھا۔ ؎

ابوکم آدمُ سَنَّ المعاصی
وعلّمکُم من رقۃ الجنان

(یعنے) تمہارا باپ آدم وہی تو ہے جس نے معاصی کو رائج کیا۔ اور تم کو رقّتِ قلب کی تعلیم دی۔

(باقی آئندہ)　　محوی صدیقی

غزل

کوئی بجلی گرے اس پر لگے آگ ایسے گلشن میں
کہ چھپ کر بیٹھ رہنا بھی نہیں ملتا نشیمن میں

یہ شوخی ہے کہ اندازِ جنوں ہے اے صبا کیا ہے
ابھی آغوش گلشن میں ابھی صحرا کے دامن میں

میں ان کی دلکشی پر لوٹ تھا لیکن خبر کیا تھی
کہ حسرت بھی چھپی بیٹھی ہے امیدوں کے دامن میں

مری محرومیٔ قسمت پہ کیوں احباب روتے ہیں
کہ حسرتہائے بے پایاں لئے جاتا ہوں مدفن میں

سکون یاس اک نعمت ہے لیکن کیا کروں اس کو
تمنائیں اُلجھتی ہیں پڑی ہے جان اُلجھن میں

رشد لئے دنیا و ما فیہا سے ایسے بے خبر احسنؔ
نہیں معلوم کیا راحت ملی آغوشِ مدفن میں

رضا جوئی محبوب

تیری مرضی ہے اگر یہ میں رہوں پابندِ زیست
خیر میں زندہ رہوں گا دہر میں تیرے لئے

منہمک تیری پرستش میں رہوں گا میں مدام
اس سے بڑھکر اور ہو سکتا ہے کیا میرے لئے

ہو اگر مطلوب تجھ کو میرا قلبِ ناتواں
چاک کر کے اپنا پہلو نذر تجھ کو دل کروں

جان جاتے تو بلا سے مجھ کو اس کا غم نہیں
جان دیکر میں حیاتِ جاوداں حاصل کروں

تو اگر چاہے رہوں تا زیست آتش زیر پا
رات دن تڑپا کروں میں مرغِ بسمل کی طرح

عمر بھر شکوہ ترا لب پر نہ میرے آئیگا
یعنی میں جلتا رہونگا شمع محفل کی طرح

ہو اگر منظور تجھ کو امتحانِ چشم نم
تیرے منشا کے مطابق ہر گھڑی رویا کروں

روتے روتے جبکہ ہو جائیں مری آنکھیں سپید
پھر میں اپنے دل میں اک طوفانِ غم برپا کروں

تو اگر چاہے رہوں میں بے نیازِ آرزو
میں ابھی تیار ہوں مایوس ہونے کے لئے

تیری خواہش ہے یہی ظالم! تو میں موجود ہوں
ہر تمنا سے دِلی سے ہاتھ دھونے کے لئے

حکم ہو تیرا اگر میں ختم کردوں زندگی
جان دینے کے لئے بھی میں ابھی آمادہ ہوں

دین و ایماں دے چکا ہوں تیرے نازِ حسن کو
جان ہے کیا چیز جبکہ میں ترا دلدادہ ہوں

الغرض کیا آنکھ، کیا دل اور کیا روحِ رواں
میں ہوں جب تیرا تو ہر اک چیز ہے میری تری

امتحاں کر لے اگر شک ہو تجھے اے دلنواز — تا کہ کھل جائے حقیقت میرے قول و فعل کی

میری مرگ و زیست ہے تیری خوشی پر منحصر — تو ہے شمع حسن اور پروانۂ الفت ہوں میں

جان لے یا بخش دے حاصل ہے تجھ کو اختیار — خم سر تسلیم ہے، دیوانۂ الفت ہوں میں

رازؔ

قندِ پارسی

(۱)

نالہ ہم در دل فسرد از حسرت تاثیرہا — رہزنِ تقدیر شد جولانیٔ تدبیرہا

ہمنشیں دیر و حرم آئینۂ اوہامِ ما — خوابِ ہستی برنتابد کلفتِ تعبیرہا

(۲)

رہزنِ انجام اے دل شوقِ بے پرواز بود — تا قیامت کارِ من حسرت کش آغاز بود

می چکید از ہر نگاہِ نارسا خونِ دلم — چوں کنم گر خامشی ہم ترجمانِ راز بود

(۳)

گرچہ از بستاں گلے ناچیدہ ام — جیبہا در رنگ و بو بدریدہ ام

حسرتِ تعمیر دامنگیر بود — تا بکنجِ گور آرامیدہ ام

(۴)

من نمی گویمت اے گل نہ دمیدن آموز — تا بدامانِ کسے نیز رسیدن آموز

گر ترا روزِ ازل قسمتِ شبنم دادند — تو بہر خارِ بیاباں بچکیدن آموز

نکہتِ غنچہ بہر موج پراگندہ شود — اے صبا در چمن آدابِ وزیدن آموز

کارزار است ہمہ دہر تماشا چہ کنی؟ — گر نداری سرِ پیکار رمیدن آموز

مجنوںؔ

نقد و نظر

پیغمبر عالم - یعنی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدس کے متبرک حالات - اس مختصر مگر جامع سوانحعمری میں قابل مصنفین نے آپ کی زندگی کا ہر ایک واقعہ مفصل بیان کیا ہے۔ اگرچہ اُردو زبان میں بہت سی تصنیفات اسی مقدس ہستی کے متعلق ہیں۔ لیکن لقمانی کتب خانہ کی یہ کتاب مقابلتاً عمدہ اور مفید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تورات اور انجیل کے اشارات اور غیر مسلم لوگوں کے خیالات بہ شرح وبسط لکھے ہیں۔ آخر میں تاریخ مکہ معظمہ بڑھا دی گئی ہے اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ ہے۔ کہ ہر خاص و عام سرورِ کائنات کے مقدس حالاتِ زندگی پڑھ کر اپنی زندگی کو سنوارے اور خود صحیح راستے پر چلکر دوسروں کو سیدھا راستہ بتائے۔ ہمیں یقین ہے۔ کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہر ہندوستانی فایدہ اُٹھائیگا۔ اور آنحضرت صلعم کے حالاتِ حمیدہ ہر اک کو چراغ ہدایت کا کام دیں گے۔

طرزِ بیان صاف اور لکھائی عمدہ۔ چھپائی خوب۔ کاغذ ولایتی۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات قیمت صرف عہ جو مقابلتاً بہت کم ہے۔ ملنے کا پتہ: مینیجر لقمانی کتبخانہ حلقہ نمبر ۲۴ اکبری منڈی لاہور

خالدہ ادیب خانم - ترکی کی سابق وزیر تعلیم جسنے جنگ طرابلس میں کارہائے نمایاں دکھائے تھے۔ اس کے سوانح زندگی اس کتاب میں مندرج ہیں۔ کتاب بہت اچھی ہے۔ خاصکر عورتوں اور بچوں کے لئے ممدوحہ کی تصویر بھی شریکِ اشاعت ہے۔

کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی صاف۔ قیمت ۱۰ ار دس آنے فی جلد۔ ملنے کا پتہ:- مینیجر کامل بک ڈپو۔ رنگ محل لاہور سے منگوایئے۔

قاعدہ یسرنا القرآن - جناب ملک محمد عنایت اللہ صاحب ایچ پی منشی فاضل لاہور نے بچوں اور عربی پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر یہ قاعدہ لکھا ہے۔ جو نہایت سہل اور مفید ہے۔ ضروری ضروری مقامات پر ہدایت سے اُستادوں اور معلموں کی ہدایت کیلئے نوٹ بھی لکھ دئے ہیں۔ تاکہ انہیں پڑھانے میں سہولت ہو جائے۔ قاعدے کے آخر میں شش کلمہ اذان۔ نماز وغیرہ مفصل درج کر دئے ہیں مسلمان بچوں کے والدین اور عربی کی ترقی چاہنے والوں کو اس کی اشاعت میں ضرور مدد کرنی چاہئے۔ لکھائی چھپائی صاف کاغذ عمدہ ولایتی۔ قیمت ۵ پیسہ ملنے کا پتہ ملک دل محمد ملک سراج الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

دل آرا بیگم کی جلد بازی

(دانی نظارہ بین)

منظر چشم ہے بازیچہ دُنیا ہمکو ۔ پتلیاں روز دکھاتی ہیں تماشہ ہمکو

"الٰہی خیر! آج تو بیڈ صب تیوری چڑھی ہے۔ پیشانی پر چین پڑی ہے۔"

عدالت سے واپس آکر زنانخانہ کے خاص کمرہ میں قدم رکھتے ہی یہ الفاظ خورشید مرزا مجسٹریٹ درجہ اوّل کی زبان سے بے ساختہ نکل گئے۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا۔ کہ ان کی محبوبہ دلنواز بعیقوی ہتلناز دل آرا بیگم آج خلاف معمول اپنی آرام کرسی پر۔ ایک عجیب انداز سے اکڑی تنی بیٹھی ہیں۔ چہرہ پر غم و غصہ جھلک رہا ہے۔ روز وہ جس خندہ پیشانی و فرخندہ دلی سے ہزار کام چھوڑ کر بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھی ان کا خیر مقدم کیا کرتی تھی۔ آج وہ کوسوں دُور ہے۔ کہیں ڈھونڈے بھی نہیں ملتی۔

اپنی جان و دل کی مالکہ دل آرا بیگم کی اس پر غضب تصویر کو دیکھتے ہی مجسٹریٹ صاحب تمام مجسٹریٹی رعب و داب بھول گئے۔ ہاتھ پیر بھول گئے اور یکایک مندرجہ بالا الفاظ آپ کی زبان پر آگئے۔ لیکن پھر سنبھلے اور اپنے دل بیتاب کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی بیوی (کی کرسی کے قریب پہنچکر بولے

"کیوں پیاری! آج نصیب دُشمناں طبیعت کیسی ہے؟ کچھ اُداس اور پریشان دکھائی دیتی ہو"

مجسٹریٹ صاحب کا یہ سوال بہرے کانوں پر پڑا۔ دل آرا نے جواب دینا تو درکنار۔ آنکھ اُٹھا کر بھی ان کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔ اور بُت کے مانند صمٌ بکمٌ بیٹھی رہی۔

مجسٹریٹ صاحب نے پھر بہ لجاجت تمام پوچھا "کیوں؟ آج کیا بات ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟ کچھ معلوم تو ہو۔ کہ آپکی خفگی کا باعث کیا ہے؟"

جب اس سوال کا بھی کچھ جواب نہ ملا۔ تو مرزا صاحب نے اس مہر خاموشی کو دوسری طرح توڑنا چاہا۔ دست گستاخ گستاخی کے لیئے آمادہ ہوئے۔ لیکن دل آرا بیگم ایسی بھولی نہ تھی جو اس درازدستی کی اجازت دیتی۔ مرزا صاحب کے بڑھے اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک کر۔ جھڑکی آمیز لہجہ میں بولی

"ہٹو جی۔ مجھے یہ چوچلے نہیں بھاتے۔ بس دیکھ لیئے آپ کے دورے۔ جو گئے شام ہے گئے صبح ہے گئے صبح ہے گئے شام ہے۔"

"کیسے وعدے۔ بخدا مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔"

"ماشا اللہ! ایسے تو ابھی بوڑھے بھی نہیں ہوئے۔ جو یوں مرض نسیان نے آگھیرا۔ حضرت! کچھ یاد تو کرو۔ صبح کیا وعدہ کرکے گئے تھے۔ کل شام کو کیا اقرار کیا تھا۔ کل صبح کیا بات بنائی تھی۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ کہ سامنے مُنہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنا جاتے ہو۔ اور جونہی گھر سے باہر نکلے۔ سب کچھ بھول گئے۔"

"اُوہو! اب یاد آیا۔ حضور کی پاپوش مبارک کے نہ آنے کے باعث یہ سب غیظ و غضب ہے۔"

"جی نہیں مجھے نگوڑی جوتیوں کی اتنی پرواہ نہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے۔ کہ اب آپ کی طبیعت مجھ سے کچھ پھری نظر آتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ابھی تو آپ میری معمولی معمولی ضروریات بھول جاتے ہیں۔ کہیں چند روز بعد مجھے بھی نہ بھول جائیں۔ اور میں غریب آپ کی یاد میں ویسے ہی تڑپتی رہوں جیسی کہ اب تڑپتی ہوں۔ اس لیئے میں نے بھی یہ سوچ لیا ہے۔ کہ اب میں بھی آہستہ آہستہ آپ کی محبت کو بھولنے کی کوشش کروں گی۔"

"بخدا"

"حضور کے قدموں کی قسم"

"لیکن اگر آپ کے پاپوش شریف ابھی آجائیں۔ تب تو کچھ شکایت نہ رہے گی۔ میرا سب قصور معاف ہوجائے گا"

دل آرا بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دراں چہ شک"

اس ادا پر خورشید مرزا کا دل لوٹ پوٹ ہوگیا۔ اور انہوں نے بے قابو ہوکر دل آرا کو چھاتی سے لپٹا لیا۔ اور محبت بھرے لہجے میں بولے۔

"میری جان۔ چلو۔ ابھی انارکلی میں بھلّے کی ہٹی سے اپنے حسب پسند پاپوش لے آؤ۔ اس مرتبہ ایسا نیا سٹاک آیا ہے۔ کہ میری تو عقل حیران رہ گئی۔ کہ کیا لوں اور کیا نہ لوں؟ اسی لئے میں موٹر طیار رکھنے کا حکم دے کر تمہیں ساتھ لے چلنے کے لیئے اُوپر آیا تھا۔ مگر یہاں تمہارے مزاج کا تھرمامیٹر اتنا چڑھا ہوا تھا۔ کہ اسے اُتارنا مشکل ہوگیا۔"

یہ سنکر دل آرا بیگم نے ندامت سے گردن جھکالی۔ اور زبان حال سے معافی کی خواستگار ہوئی۔ خورشید مرزا نے خوش ہوکر بہیچ داکرا دیا۔ اور بیوی کو بھیج کے آئے .... اور چند منٹ میں ہی دو نو اپنی شاندار موٹر میں سوار ہو کر "بھلّہ کی ہٹی" کے زنانہ حصہ میں داخل ہوئے۔ جہاں عالیخاندان خواتین کے حسب منشاء مال پسند کرکے لے جانے کے لیئے ہر طرح کی سہولیت مہیا ہے۔

روحانی میگزین ماہوار

اسپرچولزم اسمریزم ہپنوٹزم ٹیلی پیتھی تھیوسوفی نیو تھاٹ اور جملہ جادو روحانی علوم کا ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا واحد رسالہ جو دنیائے لطیف کا ایک بیدل

آرگن ہے۔ اسکا مطالعہ مردہ روحوں میں نئی زندگی پھونکیگا۔ بدنصیب لوگ چرخ ستمگار کی شاکی، دنیا کی تاریکیوں سے گھبرا کر خودکشی کو ہی وسیلۂ نجات قرار دینے والے اپاہجوں اور اپنی سبھی تبہی قسمت کو آٹھوں پہر کوسنے والے ستم رسیدہ انسانوں کیلئے روحانی میگزین مسیحا ثابت ہوگا۔ شکستہ دلوں کو ڈھارس بندھانا اور تھکے ماندے ہیران ہستی کو زندگی کی دوڑ کیلئے از سر نو بیٹھ ٹھونک کر کھڑا کر دینا روحانی میگزین کا کام ہوگا۔ روحانی میگزین بتلائیگا کہ موت دراصل تبدیل ہیئت کا نام ہے اور کائنات عالم کا ایک ذرہ بھی کبھی فنا ہو جائیگا۔ یہ ممکن نہیں روحانی میگزین اس بات کا ثبوت دیگا کہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا بھی ہے جو ہماری دنیا سے کہیں زیادہ وسیع اور خوشگوار ہے۔ کہ ہمارے مرحوم عزیزوں کی روحیں اس دنیائے لطیف میں مقیم ہیں اور ہمسے ملاقی ہونیکے لئے بیتاب ہیں۔ بلکہ اگر ہم چاہیں تو اُن سے سلسلۂ نامہ و پیام بھی جاری کر سکتے ہیں۔ روحانی میگزین ظاہر کریگا کہ اپنی قسمت کی باگ ڈور انسان کے ہاتھ میں ہے۔ اور اُسکا رُخ وہ جدھر چاہے پلٹ سکتا ہے۔ امیر یا غریب تندرست یا بیمار اور متفکر یا الست میں ہونا انسان کے حیطۂ اختیار میں ہے۔ روحانی میگزین بیان کریگا کہ ایک پوشیدہ قوت یا خدائی نور کا ایک چھوٹا سا شرارہ ازل سے ہر انسان کے دل میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور اگر اس پوشیدہ قوت کو ترقی دی جائے تو اس سے بڑی بڑی سربفلک پہاڑوں کو کاٹا اور پر شور سمندروں کا پانی خشک کیا جا سکتا ہے۔ روحانی میگزین بتلائیگا۔ کہ پتھر دلوں کو موم بنانا اور شیر چیتے جیسے خونخوار درندوں کی بھاڑ ڈالنے والی جبلی خصلت کو گو سفند صفت بنا دینا ایک باخبر انسان کیلئے کچھ بھی مشکل نہیں نیز بیماروں کو اس مخصوص روحانی قوت کی برکت سے طاقوآنا فاقہ شفایاب کر دینا اور خیال کی برقی لہروں سے سمندر پار گئے ہوئے عزیزوں سے تبادلہ خیالات کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ الغرض روحانی میگزین اس عجیب و غریب سائنس کی عوام میں اشاعت کریگا۔ اور اس نئے ذرائع کے اسراروں سے اہل دنیا کو آگاہ کریگا جن سے روشناس ہو کر انسان نہ صرف خرق الفطرت کام کر سکیگا بلکہ اس زندگی میں ہی موت پر قابو حاصل کر کے بہشت کی تمام نعمتوں اور مسرتوں سے بہرہ اندوز ہو سکیگا۔ قطع نظر ان سب باتوں کے روحانی میگزین میں اُن باکمال نفوس کی زندگیوں کے حالات درج ہوا کرینگے۔ جنہوں نے اصل حقیقت سے آگاہ ہو کر دنیا میں شہرت عام اور عقبیٰ میں بقائے دوام حاصل کیا۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے سالانہ چندہ صرف دو روپیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ع

مینجر رسالہ روحانی میگزین پوسٹ بکس ۹۰ دہلی

تمام جہان کی خوبصورتی

تمام جہان کی دلا ویزی اور تمام جہان کی شیرینی کو اگر یک جائی طور پر دیکھنا ہو۔ تو آج ہی دو پیسہ کا کارڈ لکھکر ہمارے ناول سلسلہ کے مستقل خریدار بن جائیے جو بہترین لکھائی چھپائی اچھوت پلاٹ ولایتی کاغذ اور ہاف ٹون بلاکس کی دلگداز تصویروں سے مزین ہو کر دنیائے ادب میں ہی غیر معمولی شہرت حاصل کر چکے اور کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بلحاظ قیمت کی ارزانی کے ہندوستان بھر کا کوئی بڑے سے بڑا تاجر بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لاجواب ناول سیریز میں اب تک حسب ذیل ناول شائع ہو چکے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔

جادو بھرے نین بالتصویر

ایک بیدل تڑپا دینے والا ناول حسن و عشق کے حقیقی جذبات۔ پاک محبت کی لطافتوں سے لبریز درد و ہجر کی دلچسپ اور درد انگیز داستان جسکو پڑھتے پڑھتے ایک خاص کیفیت طاری ہوگی ضخامت ۔۔۔ صفحات قیمت ۔۔۔

سلیمہ بیگم بالتصویر تاریخی ناول

شاہجہان بادشاہ کی چہیتی بیگم جانباز بیگم کی بھتیجی کی داستان حرم سرا کی اندرونی حالات کا صحیح خاکہ قیمت ۔۔۔

گلبدن لتا بالتصویر تاریخی ناول

پری جمال گلبدن لتا کی داستان کم زادیہ مان سنگھ کا کنارہ اکبر کے مشیر ابوالفضل فیضی کی پرائیویٹ زندگی کے عجیب و غریب مگر سبق آموز حالات ۔۔۔۔ ۳

زلفوں کا جال بالتصویر

بنگال کی ایک بہترین ناول کا اردو ترجمہ ایک بیوہ عورت کا عالی جس نے اپنے جادو کے حسن سے ایک ایماندار اور شادی شدہ مرد کو اپنے زلفوں کے جال میں پھانس لیا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ وہ طلسمی جال توڑ ڈالا گیا یا اُس مرد نے اپنی زندگی کا سب کچھ اس حسینہ کے قدموں پر رکھ دیا۔ یہ سب کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تقریباً ۱۵۰ صفحات قیمت صرف ۔۔۔ ۲

گوتم بدھ بالتصویر

ناول کے پیرایہ میں اس شخص کی زندگی کے حالات جس نے دنیا کے حقیقہ کو اپنا پیرو کار بنا لیا صفحہ ۱۲۵ قیمت صرف ۔ ۳

پتہ:- لاجواب ناول ہاؤس پوسٹ بکس ۹۰ دہلی

کالا جادو

وہ جادو جس کا راز مصر کے کل داینوں میں سینہ بسینہ چلا آتا رہا۔ وہ جادو جس کی بدولت وہاں کے ساحر لوگ بیجان ہڈیوں کے پنجر میں روح پھونک کر اس سے بات چیت کر لیتے تھے۔ اس عجیب و غریب سحر کے اصولوں پر ہمنے ایک طلسمی آلہ ایجاد کیا ہے جسکی مدد سے آپ نہ صرف معمول کو بلکہ بطور خود بذریعہ جسم لطیف دور دراز مقامات میں پہنچکر وہاں کے حالات دریافت کر سکتے ہیں۔ اور پھر چشم زدن میں جسم کثیف میں واپس آ سکتے ہیں۔ بزرگان دین کے دیدار۔ متبرک مقامات مثلاً مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کی زیارت۔ گمشدہ کا پتہ لگانا اس دنیا اور دوسری دنیا کے عجائبات دیکھنا تقدیر۔ روزگار اور حیات و ممات کے متعلق سوالات پوچھنا۔ کیا ہمارا بیمار اچھا ہو جائیگا؟ میری آئندہ زندگی کیسے بسر ہوگی؟ مجھے کس قسم کی عورت ملیگی؟ روزگار میں کیسے ترقی ہو سکتی ہے۔؟ فلاں آدمی کیسا ہے۔؟ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ فلاں افسر یا حاکم مجھ پر کیسے مہربان ہو سکتا ہے۔ میں اپنے محبوب کو کیسے تسخیر کر سکتا ہوں وغیرہ وغیرہ یہ اور اس قسم کے سینکڑوں سوالات بغیر کسی زحمت طلب محنت کے اور بلا مدد غیرے گھر میں بیٹھکر اس طلسمی آلہ سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ عورت مرد یکساں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بموجب اشتہار نہ ہونے کے دام واپس کرنیکی شرط قیمت معہ محصولڈاک تین روپے

ملنے کا پتہ

دی آل انڈیا آکلٹ ہاؤس

پوسٹ بکس ۹۰ دہلی

ڈاکٹر ایس کے برمن کی بنائی ہوئی دوائیں

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کی دوا کیلئے یہ ایک ہی دوا ہے۔ آج کل سینکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہونگے۔ مگر ان میں عموماً کونین جز رہتی ہے۔ اسلئے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہیں۔ مگر جڑ سے آرام نہیں کر سکتی ہیں۔ ایسے بند کیلئے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند ہی روز میں ایکدم آرام کر دینے کا خاص دعویٰ رکھتی ہے۔ اور عوام کے فایدہ کو مد نظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اسمیں تین خاص صفتیں ہیں۔ (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے۔ اس لئے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے۔ اور اس کی خرابیوں کو مٹاتی ہے۔ (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں عہ خورد ۱؎ محصولڈاک شیشی کلاں ۸؎ خورد ۷؎۔

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں۔

لرزہ بخار پرانے ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھا رہتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے۔ اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پاؤں پر ورم آجاتا ہے۔ اور زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فایدہ کرتی ہیں۔ اور چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ کی ۱؎ محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۱؎۔

کونین کی گولیاں

یہ چاندگرین کی خوبصورت چھوٹی چھوٹی ٹکیاں کل میں بنتی ہیں۔ اور سنہرے پیزٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو۔ تو یہ گولیاں پاس رکھئے اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے۔ نہ کھانے میں تلخ ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ عہ محصولڈاک ۱؎۔

ایجنٹ:۔ منیجر صاحب پیسہ اخبار لاہور۔

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

قیمت سالانہ چھ روپے — رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ — قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ ۱۰؍

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔ اے علیگ

ایڈیٹرز:-

سیّد عابد علی عابد بی اے — محمد اسمٰعیل — محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۶ — اشاعت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۵ء — نمبر ۵

فہرست مضامین

تصویر:- امیر مینائی

[illegible]

دریا بہ حباب اندر

"گمشدہ خط" ایڈگرایلن پو کے ایک سراغرسانی کے افسانے کا ترجمہ ہے۔مختصر افسانہ نگاری میں اِس مُصنّف کو جو مہتم بالشان درجہ حاصل ہے۔ اس کا ذکر ہم پہلے بھی کئی بار کرچکے ہیں۔ادب کی اس صنف کو سب سے پہلے اسی نے ایک مستقل فن قرار دیا۔اوراگرچہ آج یہ فن ترقی کرتے کرتے تکمیل کے درجے کو پُہنچ چکا ہے۔ تاہم اس کے بُنیادی اصول وہی ہیں جو ایلن پو نے قائم کئے۔ بالخصوص سراغرسانی کے جتنے افسانے اس کے بعد لکھے گئے ان میں اس کا اثر نمایاں ہے۔یہانتک کہ اُسے افسانہ نگاری کی اس صنف کا موجد کہنا چاہیئے۔اس دعوے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی۔کہ شرلاک ہومز نے اس کے سراغرساں ڈوپن کو اپنا اُستاد تسلیم کیا ہے۔ڈوپن ایک غیر معمولی فہم و فراست کا انسان ہے۔جس کی قوتِ استدلال ایسی زبردست ہے کہ وہ کبھی مغالطہ میں مبتلا نہیں ہُوا۔اس استدلال کے اصول اُس نے منطق کی کسی کتاب سے اکتساب نہیں کئے۔بلکہ اپنی خداداد جودتِ طبع اور اپنے عملی تجربے کی بناء پر وضع کئے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو عملی زندگی میں بہت کام دیتے ہیں۔ گمشدہ خط کے مطالعے سے آپ پر ظاہر ہو جائیگا کہ ڈوپن نے کیسی صحیح اور سلیم طبیعت پائی ہے۔جو مسلّمات عامہ کے اثر کو اُس وقت تک قبول نہیں کرتی۔جب تک وہ عملی تجربے کے معیار پر ان کی قدر و قیمت اور صحت کو نہ جانچ لے۔ اس معمے کو اس نے جس طرح حل کیا ہے اور جس صراحت اور وضاحت سے اس نے اپنے طریق تحلیل کو بیان کیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خط کا ملجانا ایک اتفاقی امر نہ تھا یعنی وہ واقعات کی مساعدت کا مرہونِ منت نہیں۔بلکہ غور و فکر سے بات کی تہ تک پُہنچا ہے۔تمام امکانات کا اندازہ کرکے اس نے اپنے آپ کو ہر سوءِ اتفاق کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

ایلن پو نے جس طریق سے اس افسانے کو بیان کیا ہے وہ کچھ اسی کا حصّہ ہے۔ اُس نے عام دستور کے مطابق حل کو اخیر وقت تک ملتوی نہیں رکھا۔بلکہ آغاز ہی میں ظاہر کر دیا ہے۔اس طرح افسانے نے ایک علمی مضمون کی صورت اختیار کر لی ہے۔علمی مضمون کا قاعدہ یہ ہے کہ ہم پہلے ایک دعوے پیش کرتے ہیں پھر دلائل و براہین یا مثالوں سے اس کو ثابت کرتے ہیں۔ یہی بات اس افسانے میں پائی جاتی ہے۔لیکن وہ مابہ الامتیاز جو اِسے

علمی مضمون سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ ہے کہ جزئیات کی تفصیل ایسے طور پر کی گئی ہے کہ راز بھی نہ کھلنے پاتے۔ اور پڑھنے والا اکتا بھی نہ جاتے۔ ورنہ ریاضی اور منطق وغیرہ سے جو طول طویل بحث کی گئی ہے۔ وہ پڑھنے والے کیلئے بیحد صبر آزما ثابت ہوتی (جیسی کہ بعض جگہ میرے لئے ثابت ہوئی ہے)

"پس پردہ" میں ایک اور مشہور سراغرساں گینمارڈ اور اُس کے حریف لوپن کا ایک معرکہ بیان کیا گیا ہے۔ افسوس یہ افسانہ عدم گنجائش کی وجہ سے اس اشاعت میں ادھورا رہ گیا۔ ورنہ "گمشدہ خط" سے اس کا موازنہ ایک دلچسپ مبحث ہوتا۔ تاہم اس حالت میں بھی آپ کو اُس میں ایک دو باتیں ایسی نظر آئینگی۔ جن کا "گمشدہ خط" کی خصوصیات سے مقابلہ کیا جاتے۔ تو ان دونوں افسانوں کا باہمی فرق واضح ہوجائیگا۔ مثلاً اس میں ابتک حل نہیں بتایا گیا۔ کیونکہ اگر وہ انجام سے پیشتر بتا دیا جائے تو واقعات کی وہ پیچیدگی نہ رہیگی جس میں افسانے کی تمام دلچسپی مرکوز ہے۔ اس کے برعکس گمشدہ خط کا حل پہلے ہی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ لیکن وہ بذاتِ خود ایک معما ہے، جو ہمیں اُسی طرح عقدہ کشائی کی دعوت دیتا ہے۔ جس طرح ایک عقلی مسئلہ۔ اس فرق کو ہم ایک اور طریقے سے نمایاں کر سکتے ہیں۔ گمشدہ خط میں انجام کار معلوم ہے۔ اور ہم اس کے اسباب و علل کے متلاشی ہیں۔ لیکن پس پردہ میں ہم نتیجے کے منتظر ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ اب یہ پڑھنے والے کی افتادِ طبیعت پر منحصر ہے کہ اُسے کس میں زیادہ لطف آئے گا۔

"اقبالِ جہانگیری" ایک تاریخی مضمون ہے۔ اس میں جہانگیر کے عہد کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جو اس شہنشاہ کی زندگی کا پہلو نمایاں کرتا ہے۔ جس کو تاریخ کی کور چشمی نے نظر انداز کر دیا ہے۔ موضوع کی دلفریبی، اور طرزِ بیان کی گوناگوں خوبیاں اس مضمون کو ایک افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا رہی ہیں۔ ہم اس قابلِ فخر کامیابی پر ہدایت حسین صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ہزار داستان بابت ماہ فروری ۱۹۲۵ء میں ایک افسانہ "قلی" کے عنوان سے چھپا تھا۔ اُس کے اصل مصنف پنڈت پرتھوی ناتھ شرما بی۔ اے آنرز ہیں۔ جن کا حوالہ مترجم صاحب نے نہیں دیا۔

ایڈیٹر

گمشدہ خط

سنہ ۱۸۱۸ء میں خزاں کی ایک شام کو جب چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا اور آندھی چل رہی تھی۔ میں پیرس میں اپنے دوست سی آگسٹ ڈوپن کے ہاں بیٹھا اپنے خیالات کی عشرت کو ایک پائپ کے لطف مکرر سے دوبالا کر رہا تھا۔ زیادہ نہیں تو ایک گھنٹے سے ضرور ہم نے مطلق خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ دیکھنے والے کو بادی النظر میں شاید یہی معلوم ہوتا کہ ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھے دھوئیں کے اس نازک لرزتے ہوئے جال کے نظارے میں محو و مستغرق تھے۔ جو حلقہ بہ حلقہ کمرے کی فضا میں پھیل رہا تھا۔ لیکن میرے خیالات اس جال کے پھندوں ہی میں اُلجھ کر نہ رہ گئے تھے۔ بلکہ اور اور فضاؤں میں پرواز کر رہے تھے۔ میں رومورگ کے واقعے اور میری روجٹ کے قتل پر غور کرنے میں مصروف تھا جن کا ذکر کچھ دیر پہلے گفتگو کے دوران میں آیا تھا اس حال میں جب یکایک دروازہ کھلا، اور ہمارا پرانا دوست موسیوگ ...... جو پیرس کی پولیس کا عہدہ دار اعلےٰ ہے کمرے میں داخل ہوا۔ تو مجھے اس کی غیر متوقع آمد سے بہت حیرت ہوئی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اس وقت جو امور میرے زیر فکر تھے انہیں اس سے بہت قریب کا تعلق تھا۔

ہم نے بڑے تپاک اور گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ کیونکہ یہ شخص جہاں بعض باتوں کے لحاظ سے نہایت ناخوشگوار انسان ہے۔ وہاں اس میں چند پسندیدہ اوصاف بھی ہیں۔ اس کے علاوہ برسوں گزر گئے تھے کہ ہماری اس کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ہم اس وقت تک اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ ڈوپن اب لمپ جلانے کی غرض سے اُٹھا۔ لیکن گ .... سے یہ سُن کر کہ وہ اُس سے کسی عجیب و غریب معاملے کے متعلق مشورہ کرنے آیا تھا۔ جس نے اُسے مدت سے مخمصے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ اُٹھتے ہی اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

اُس نے کہا۔ "اگر یہ کوئی ایسا ہی غور طلب مسئلہ ہے تو میرا خیال ہے کہ ہم تاریکی میں عقل و فکر سے زیادہ کام لے سکیں گے۔"

پولیس کے عہدہ دار اعلےٰ نے جواب دیا۔ "یہ بھی تمہارا ایک انوکھا خیال ہے۔" اس کی عادت تھی کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ اُسے چھوٹتے ہی انوکھا کہدیتا

اور اس طرح دُنیا کی ہر چیز اس کے نزدیک انوکھی تھی۔
ڈوپن نے ایک پائپ اُس کے سامنے پیش کر کے اور ایک کُرسی آگے بڑھا کر جواب دیا۔
"آپ بجا فرماتے ہیں۔"
مَیں نے پُوچھا۔" اور آپ کا وہ لاینحل مسئلہ کیا ہے؟ امید ہے کوئی قتل کی واردات تو نہ ہوگی؟"
"نہیں، نہیں، کوئی ایسا معاملہ نہیں۔اصل میں بات بالکل معمولی ہے۔اور میرا خیال ہے اس کے سمجھنے میں مجھے کسی کی مدد درکار نہ تھی۔لیکن میں نے سوچا، یہ بات اس لائق ہے کہ ڈوپن کو سُنائی جائے۔کیونکہ کچھ عجب انوکھی سی ہے!"
ڈوپن نے استعجاب کے لہجے میں کہا۔"معمولی بھی اور انوکھی بھی! یہ تو ایک عجیب اجتماعِ ضدّین ہے۔"
اُس نے جواب دیا۔" ہاں ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔اور تعجب بھی تو اسی کا ہے۔"
اُس نے جواب دیا۔" ہاں ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔اور تعجب بھی تو اسی کا ہے۔سب حیران ہیں کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ ایسی سیدھی سادی بات، اور پھر کچھ پیش نہیں جاتی!"
میرے دوست نے کہا۔"شاید معاملے کی سادگی ہی آپ کے لئے پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے۔"

پولیس کے افسر نے بے اختیار ہنس کر جواب دیا
"تمہاری ہر بات دُنیا جہان سے انوکھی ہے!"
ڈوپن نے کہا۔"شاید یہ راز بہت کُھلا ہُوا ہے۔"
"واہ تم بھی عجیب بے معنی باتیں کہتے ہو۔"
"شاید یہ امر ضرورت سے زیادہ بدیہی ہے۔"
اب ہمارے ملاقاتی کی ہنسی ضبط کی حدود سے اس قدر متجاوز ہوگئی کہ وہ اچھل اچھل کر کُرسی سے باہر ہونے لگا۔اُس نے کہا۔"تم مجھے ہنسا ہنسا کر مار ہی ڈالو گے۔"
مَیں نے پُوچھا۔" آخر زیر بحث معاملہ کیا ہے؟ یہ تو معلوم ہو۔"
اُس نے یکایک ایک اندازِ تفکّر میں کرسی پر متمکّن ہو کر جواب دیا۔" مَیں آپ کو بتاتا ہوں۔" اور پھر ایک طویل اور پُر سکون کش کے بعد کہا۔" مَیں آپ کو مختصر طور پر بتاتا ہوں۔لیکن سب سے پہلے یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یہ معاملہ پوشیدہ رہنا چاہئے۔اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ مَیں نے اس کا ذکر آپ سے کیا ہے۔تو کیا جانے کیا ہو۔کچھ دُور نہیں کہ مَیں اپنی ملازمت سے برخاست ہو جاؤں۔"
مَیں نے کہا۔" آپ دلجمعی سے بیان کیجئے۔"
ڈوپن نے کہا۔" یا ایسی کیا ضرورت ہے بیشک نہ دیکھئے"
" خیر سُنئے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک معتبر ذریعے

سے یہ اطلاع ملی ہے۔ کہ شاہی محل سے ایک نہایت اہم دستاویز چرالی گئی ہے۔ اور چور معلوم ہے یقینی طور پر معلوم ہے۔ اُسے چوری کرتے دیکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ دستاویز اب تک خود اُس کے قبضے میں ہے۔"

"یہ کس بنا پر خیال کیا جاتا ہے؟"

"وہ دستاویز ایسی ہے کہ ممکن نہیں اُس کا چرانیوالا اُسے کسی غیر کے سپرد کرے۔ اس کے علاوہ اگر وہ دستاویز اُس کے قبضے سے نکل جاتی یعنی وہ اُسے اُس مقصد کے لئے استعمال میں لے آتا جس کے لئے اُس نے چرایا ہے تو بعض نتائج و آثار کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اور وہ پیدا نہیں ہوئے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ دستاویز ابتک اُسی کے پاس ہے۔"

"ذرا زیادہ توضیح سے بیان کیجئے۔"

"بہتر۔ مَیں آپ کو اتنا بتا دیتا ہوں۔ کہ جس شخص کے قبضے میں وہ دستاویز ہو۔ اُسے ایک خاص حلقے میں ایک خاص اقتدار حاصل ہوجاتا ہے جو خاص طور پر مفید بھی ہے اور مضر بھی۔"

ڈوپن نے کہا۔ "مَیں اب بھی آپ کا مطلب بخوبی نہیں سمجھا۔"

"آپ نہیں سمجھے؟ اچھا مَیں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ وہ دستاویز اگر ایک تیسرے شخص کو دکھا دی جائے، جو فرض کر لیجئے کہ زید، بکر، عمرو کوئی ہے تو اس سے ایک نہایت ذی رُتبہ شخص کی نیکنامی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ اور اس امر سے دستاویز کے قابض کو اُس شخص پر جس کی نیکنامی معرضِ خطر میں ہے ایک غیر واجب قدرت حاصل ہوجاتی ہے۔"

مَیں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ قدرت تو جب حاصل ہو کہ چور یہ جانتا ہو کہ جس کی دستاویز چرائی گئی ہے اُسے چور معلوم ہوگیا ہے۔ اور آپ جانتے اتنی جرأت کون کرسکتا ہے کہ اپنی چوری خود ثابت کردے؟"

موسیوگ نے جواب دیا۔ "آپ کو جاننا چاہیئے کہ چور۔ وزیر د ...... ہے۔ جو ایسا شخص ہے کہ ہر کام کر گزرتا ہے۔ خواہ وہ کام ایک انسان کے لئے زیبا ہو، یا نازیبا۔ جس طریقے سے دستاویز چرائی گئی ہے اُس سے جتنا اُس کی جسارت و دلیری کا پتہ چلتا ہے۔ اُتنا ہی اُس کی چالاکی اور پُرفنی کا ثبوت ملتا ہے۔ مذکورہ دستاویز، یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ خط، جس کے یہاں سے چُرایا گیا ہے۔ ابھی اُس کے پاس پہنچا ہی تھا۔ اور وہ اُسے پڑھ رہی تھی کہ اتنے میں وہ تیسرا شخص جس کا نام مَیں نے آپ کو نہیں بتایا۔ اور جس پر وہ اُس خط کو ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ کمرے میں داخل ہُوا۔ اُسنے بعجلت تمام

خط کو ایک دراز میں رکھ دینے کی بے سود کوشش کی۔ آخر اسے بامرِ مجبوری میز پر کھلا کا کھلا رہنے دیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ پتہ اُوپر تھا۔ اور اس طرح مضمون نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ ابھی اس تیسرے شخص کو آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وزیر د.... آ پہنچا۔ اس کی باریک بین نگاہ نے خط کو دیکھا۔ دیکھتے ہی سوادِ خط کو پہچان لیا اور جس لیڈی کے نام یہ خط آیا تھا۔ اس کے انداز کی پریشانی سے بات کی تہ کو پہنچ گئی۔ چند کاروباری معاملات کے متعلق اپنے معمولی انداز میں گفتگو کرنے کے بعد وزیر د.... نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا۔ جو بظاہر مذکورہ خط سے بہت مشابہ تھا۔ اُس کو کھولا اور یہ ظاہر کیا کہ گویا پڑھ رہا ہے پھر میز پر پہلے خط کے برابر رکھ دیا۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے اپنے خط کی بجائے پرائے خط کو جس پر اُس کا کوئی حق نہ تھا اُٹھا لیا۔ اسکی اصلی مالکہ نے اپنی ملکیت کو اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتے دیکھا۔ لیکن تیسرے شخص کی موجودگی میں وہ اس کا کچھ سدِّباب نہ کر سکتی تھی۔ وزیر د.... اپنے خط کو جو لیڈی کے کسی مصرف کا نہ تھا چھوڑ کر چلتا بنا"

ڈوپن نے میری طرف مخاطب کر کے کہا "لیجئے صاحب، آپ کی وہ شرط تو پوری ہوگئی۔ اب تو چور کے ایک غیر واجب قدرت حاصل کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ کیونکہ وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ جس کی چوری ہوئی ہے، اُس کو چور معلوم ہے۔"

موسیوگ نے جواب دیا۔ "ہاں وہ شرط پوری ہوگئی۔ اور وزیر د.... کو جو ناجائز اختیار اس طرح حاصل ہوگیا ہے۔ وہ اُسے چند مہینوں سے سیاسی مقاصد کے لئے نہایت خطرناک طور پر استعمال کر رہا ہے۔ اس وجہ سے لیڈی کو اپنے خط کی بازیافت کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ مگر یہ کھلم کھلا عمل میں نہیں آسکتا غرض اُس نے مایوس ہو کر اس کا تدارک میرے ذمے کر دیا ہے۔"

ڈوپن نے دھوئیں کا ایک بگولا اُڑا کر کہا۔ "اور آپ سے بہتر شخص کی نہ کسی کو جستجو ہو سکتی ہے اور نہ ملنا ممکن ہے۔"

اُس نے جواب دیا۔ "آپ تو مجھے خواہ مخواہ کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ میں کس لائق ہوں؟"

مَیں نے کہا۔ "آپ کے بیان کے مطابق خط اب تک وزیر کے قبضے میں ہے۔ اور جب تک یہ خط اسکے قبضے میں ہے۔ اُس وقت تک اُس کو لیڈی پر ناجائز قدرت حاصل ہے۔ جہاں اس نے خط کو استعمال کیا تو یہ قدرت بھی جاتی رہے گی۔"

موسیوگ نے کہا۔ "درست، بالکل درست۔ اور اسی بھروسے پر مَیں نے تحقیقات شروع کی سب سے

پہلا کام جس کی طرف میرا ذہن منتقل ہُوا یہ تھا کہ وزیر کے مکان کی تلاشی لوں۔ اس میں یہ احتیاط بیحد ضروری تھی کہ اُس کے کان میں اس کی بھنک نہ پڑ جائے۔ کیونکہ مجھے بتاکید خبردار کیا گیا تھا کہ اگر اُس پر ہمارا ارادہ ظاہر ہو گیا تو اس میں کئی قسم کے خطرے ہیں۔"

مَیں نے کہا۔ "مگر آپ کو اس میں کونسی مشکل پیش آسکتی تھی! پیرس کی پولیس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔"

"آپ نے بجا ارشاد کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں مایوس نہ ہُوا۔ اس کے علاوہ وزیر کی بعض عادتوں نے میری ہمت افزائی کی۔ وہ اکثر رات بھر گھر سے باہر رہتا ہے۔ اُس کے نوکر بھی تعداد میں کچھ ایسے زیادہ نہیں ہوتے بھی تو کیا تھا؟ اوّل تو وہ اپنے آقا کے کمرے سے بہت دُور سوتے ہیں۔ اور دوسرے شراب کی رشوت اُن کے لئے کافی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے پاس کنجیوں کا ایک ایسا گچھا ہے۔ جس سے میں، اور جگہ کا تو ذمہ نہیں لیتا، البتہ پیرس کا ہر قفل کھول سکتا ہوں۔ تین مہینے سے لگاتار مَیں کوشش میں مصروف ہوں۔ اور اس عرصے میں کوئی رات ایسی نہیں گُزری کہ مَیں نے ذاتی طور پر وزیر کے کمروں کی چھان بین نہ کی ہو، علاوہ اُس کے گھر کی ایک ایک چیز کو اُلٹ پلٹ کر نہ دیکھا ہو۔ صاحب آپ جانتے عزّت کا معاملہ ہے اور پھر بات تو راز کی ہے۔ تاہم میں آپ کو بتا ہی دُوں انعام بھی کچھ کم نہیں۔ مَیں نے جستجو میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ابھی مجھے وزیر د...... سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اُس کی چھپائی ہوئی چیزوں کا ڈھونڈ نکالنا میرے بس کا روگ نہیں۔ بلا مبالغہ میں نے اس کے گھر کا چپہ چپہ چھان مارا نتیجہ جو ہے وہ آپ پر ظاہر ہے۔"

مَیں نے اُسکو ایک بات سجھائی۔ "کیا یہ ممکن نہیں، کہ خط، جیسا کہ آپ علم الیقین سے کہتے ہیں۔ ہو تو وزیر ہی کے قبضے میں۔ لیکن گھر سے باہر کہیں ہو۔"

ڈوپن نے کہا۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ دربار کی موجودہ صورتِ حالات ایسی ہو رہی ہے اور خاصکر وزیر د...... جن ریشہ دوانیوں میں شریک ہے۔ اُن کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اگر وقت بیوقت اس خط کی ضرورت پڑ جائے۔ تو ایک لمحہ کی دیر کئے بغیر اُسے پوشیدگی کی جگہ سے برآمد کیا جا سکے۔"

"خط کی ضرورت پڑ جائے۔ کیا معنی؟"

"یعنی اُسے ضائع کر دینے کی ضرورت پڑ جائے۔"

مَیں نے کہا۔ "تو پھر قرار واقعی طور پر خط وزیر کے گھر میں ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا وہ اُسے اپنے پاس رکھتا

بھی ہے۔ تو یہ قیاس سے باہر ہے۔"

"قطعاً قیاس سے باہر ہے میں نے جو آدمی چھوڑ رکھے ہیں اُنہوں نے دو بار اُس پر راہ میں حملہ کیا ہے۔ اور میری آنکھوں کے سامنے اُس کے لباس کا ہر وہ حصّہ جس پر کسی چیز کے چھپانے کا گمان ہو سکتا ہے۔ اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔"

ڈوپن نے کہا۔ "یہ تکلیف آپ نے خواہ مخواہ برداشت کی۔ میرے عندیہ میں وزیر د..... اتنا احمق نہیں۔ اُس نے یقیناً تمام ممکنات کا تفرض کر کے اُن کی پیشبندی کر لی ہو گی۔"

"وہ احمق نہیں، تو شاعر ضرور ہے اور شاعری دوسرے درجے کی حماقت ہے۔"

ڈوپن نے ایک طویل اور متامّل کش کے بعد جواب دیا۔ "آپ کا کہنا صحیح ہے۔ اگرچہ میں خود کبھی کبھی تک بندی کے جرم کا مرتکب ہو چکا ہوں۔"

میں نے موسیو گ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ذرا آپ اپنی تلاشی کی جُزئی تفصیل بیان کریں گے؟"

"تفصیل زیادہ طولانی کیا ہے یہی کہ ہم اپنے وقت سے پُورا فایدہ اُٹھاتے تھے۔ گوشے گوشے کی تلاشی لیتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ان معاملات میں کافی تجربہ حاصل کر چکا ہوں۔ میں نے گھر کے سارے کمروں کو ایک ایک کر کے دیکھ ڈالا۔ کچھ کم نہیں ہفتہ بھر ایک ایک کمرے میں ہم نے شام سے صبح کر دی۔ سب سازو سامان کو متعدد بار اپنی جگہ سے ہٹا کر دیکھا کوئی ایسی دراز نہ ہو گی جسے ہم نے نہ کھولا ہو۔ اور آپ یہ تسلیم کرنے کو تیار ہونگے کہ ایک ایسے شخص کے لئے جس نے پولیس کی باقاعدہ تعلیم پائی ہو۔ ایک چور دراز کچھ معنی نہیں رکھتی۔ مجھے اُس شخص کی عقل پر شک ہے۔ جو اس طرح غور و پرداخت سے تلاشی لینے کے باوجود چور دراز کو نہ دیکھ سکے۔ وہ تو اندھوں کو بھی صاف نظر آتی ہے۔ اور پھر ہم نے ایسے باضابطہ اصول مرتّب کر رکھے ہیں کہ بال سے باریک چیز ہو تو وہ بھی ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ الماریوں کو دیکھ چکنے کے بعد ہم نے کرسیوں کی طرف توجہ کی۔ اُن کے گدیلوں کو ہم نے اُن سلائیوں سے ٹٹولا۔ جن کو استعمال کرتے آپ نے مجھے دیکھا ہے۔ لیکن خط کا کھوج نہ لگا۔ میزوں کے تختوں کو بھی ہم نے الگ کر کے دیکھا۔ لیکن سب سعی لاحاصل۔"

"آپ نے میزوں کے تختے کیوں الگ کئے؟"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ کوئی چیز چھپانے کے لئے میز کا تختہ ہٹا دیتے ہیں۔ اور پایے میں سوراخ کر کے وہ چیز اُس میں رکھ دیتے ہیں، اور

تختے بدستور اپنی جگہ قائم کر دیتے ہیں۔ کچھ میزوں ہی پر منحصر نہیں۔ چارپائیوں سے بھی اکثر اوقات یہ کام لیا جاتا ہے۔"

مَیں نے پُوچھا۔" تو تختے کو جُدا کر کے دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ٹھونک بجا کر سوراخ نہیں دریافت کیا جا سکتا؟"

" اگر چیز کے اردگرد روئی کی گدی رکھ دی جاتے تو آواز کیسے آتی؟ اس کے علاوہ ہمارا معاملہ ایسا نازک تھا کہ ہمارے لئے مطلق خاموشی لازمی تھی۔"

" لیکن یہ ناممکن تھا۔ کہ آپ ہر ایسی چیز کا جوڑ بند جُدا کر کے دیکھتے جس میں وہ آپ کے بیان کئے ہُوئے طریقے کے مطابق خط کو پوشیدہ کر سکتا ہے۔ خط کی ایک ایسی بتّی بنائی جا سکتی ہے، جو حجم اور شکل میں سُوئی سے بالکل مشابہ ہو۔ اور اس صورت میں اُسے کُرسی کے کسی شگاف میں چھپایا جا سکتا ہے۔ آپ نے سب کرسیاں تو نہ کھولی ہونگی؟ بھلا یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا؟"

" بیشک ناممکن تھا لیکن ہم اس سے بہتر تدبیر عمل میں لاتے ہیں۔ ہم نے ایک نہایت درجہ طاقت کی خوردبین سے ہر طرح کے سامان کے جوڑ بند کو دیکھا ہے۔ خط کا کہیں نام و نشان بھی ہوتا تو بیک نظر ہمیں معلوم ہو جاتا۔ خط تو خط، اگر ذرہ برابر لکڑی کا بُرادہ بھی کسی شگاف میں ہوتا تو ہماری نظروں سے نہ بچ سکتا۔ سریش میں اگر ذرا تبدیلی واقع ہُوئی ہوتی، یا کوئی جوڑ اگر ذرا اپنی جگہ سے ہلا ہوتا، تو ہمارا سُراغ چلا لینا یقینی تھا۔"

" مَیں سمجھتا ہوں آپ نے آئینوں کے تختے اور شیشے اور بستر چارپائیاں، فرش فروش، پردے چلمنیں وغیرہ کوئی چیز نظر انداز نہ کی ہوگی۔"

" یقیناً ہم نے کوئی چیز نظر انداز نہیں کی ہم نے صرف سامان پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ مکان کے درو دیوار تک کو دیکھ ڈالا۔ ہم نے اُس کے سارے رقبے کو حصّوں میں منقسم کیا۔ اور اُن کو اعداد کے حساب سے شمار کیا۔ تاکہ کوئی فروگذاشت نہ ہو جاتے۔ پھر ہم نے چپّہ چپّہ خوردبین سے دیکھا۔ اور یہ عمل صرف اُس کے مکان پر نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہمسایے کے دو مکان بھی اُس میں شریک ہُوتے۔"

مَیں نے تعجب سے کہا۔" ہمسایے کے دو مکان بھی! خوب! آپ کو بہت تکلیف اُٹھانا پڑی۔

" تکلیف سی تکلیف! لیکن اس کے بعد راحت کی امید بھی تھی۔"

" اس تلاشی میں آپ نے مکان کے آس پاس کی زمین کو بھی شامل کیا؟"

" زمین پر تمام اینٹوں کا فرش ہے۔ اس لئے

اس کے متعلق چنداں محنت نہیں اُٹھانا پڑی۔ ہم نے صرف جو کائی لگ رہی تھی اُسے ہٹا کر اپنی تسلی کر لی ہے۔"

"آپ نے د..... کے کاغذات اور اس کے کتب خانہ پر بھی ضرور نظرِ تجسس ڈالی ہوگی؟"

"کیوں نہیں؟ ہم نے ہر لفافے اور بستے کو کھول کر دیکھا۔ اور کتابوں کا تو ہم نے ایک ایک ورق اُلٹا، ہمارے بعض پولیس افسر صرف اسی کو کافی تصوّر کرتے ہیں۔ کہ کتاب کو پشت کی طرف سے پکڑ کر جھٹک لیا جاتے۔ لیکن ہم نے سب ورق ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے اس سے کہیں زیادہ دقّتِ نظر ہمیں اُس وقت صرف کرنا پڑی جب ہم نے خوردبین کی انتہائی قوت سے جلدوں کی موٹائی کا معائنہ کیا۔ اگر کسی جلد کی حالت میں کوئی جدید تغیّر پیدا ہُوا ہوتا تو یہ محال قطعی تھا کہ ہماری نگاہیں اُس کی ٹوہ نہ لگالیتیں۔ پانچ چھ کتابیں ابھی نئی نئی جلد ساز کے یہاں سے آئی تھیں۔ ہم نے سلائیوں سے اُن کے بھی پاتال کا پتہ لے لیا۔ مگر خط کہیں ہوتا تو ملتا۔"

"آپ نے فرش ہٹا کر بھی دیکھا؟"

"یقیناً دیکھا۔ کوئی دری ایسی نہ تھی جو ہم نے اپنی جگہ رہنے دی ہو۔"

"اور دیواروں پر کا کاغذ؟" "وہ بھی دیکھا۔"

"تہ خانوں میں بھی گئے آپ؟" "بیشک"

مَیں نے کہا۔"اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ آپ کا قیاس غلط ہے۔ خط ہرگز اُس کے مکان میں نہیں؟"

اُس نے جواب دیا۔"بیشک بیشک لیکن اب کہو، ڈوپن، تمہاری رائے میں مجھے کیا کرنا چاہتے؟"

"یہی کہ مکان کی دوبارہ تلاشی لیجئے۔"

موسیوگ نے جواب دیا۔"یہ قطعاً غیر ضروری ہے مجھے یقین ہے کہ خط مکان میں نہیں۔"

بہر حال مَیں اس سے بہتر مشورہ آپ کو نہیں دے سکتا۔ خط کے متعلق جو کچھ آپ کو بتایا گیا ہے، اُس سے آپ خط کی شناخت تو کر سکینگے؟"

"بلا شبہ"

اور یہ کہکر موسیوگ نے ایک یادداشت کی بیاض جیب سے نکالکر بآوازِ بلند گمشدہ خط کی ظاہری اور باطنی ہیئت کا ایک لفظی نقشہ جس میں انتہا درجے کی تفصیل بیانی سے کام لیا گیا تھا پڑھ کر سُنایا۔

اس کے اختتام پر وہ رخصت ہُوا۔ اور اُسوقت وہ اتنا افسردہ و ملول تھا، جتنا غالباً مَیں نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

تقریباً ایک مہینے کے بعد وہ دوبارہ ہماری

ملاقات کو آیا۔ ہم اُسی پُرانے مشغلۂ بیکاری میں مصروف تھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اور ایک پائپ سلگا کر پینے لگا۔ معمولی گفت و شنید کے بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔

"کیوں بھائی گ ...... آپ کے اُس گمشدہ خط کا کچھ پتہ چلا؟ میں خیال کرتا ہوں آپ تلخ تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ وزیرد ...... کو خود اُس کے دامِ فریب میں پھنسانا کارے دارد۔"

"میں نے ڈوپن کے مشورہ پر عمل کیا۔ اور گھر کی نئے سرے سے تلاشی لی۔ مگر وہی ہُوا جس کا مجھے خوف تھا۔ سب محنت رائگاں گئی۔"

ڈوپن نے کہا۔ "یہ تو کہئے کہ انعام کتنا ہے"

"بہت زیادہ، بیحد و حساب۔ یہ تو میں نہیں بتانا چاہتا کہ صحیح صحیح کتنی رقم ہے۔ البتہ میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص خط کو برآمد کر دے، تو میں تیار ہوں کہ اس ہاتھ وہ مجھے خط دے اور اُس ہاتھ پچاس ہزار فرانک کا چک لے لے۔ واقعہ یہ ہے کہ خط کی ضرورت روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے، اور پچھلے دنوں انعام دوگنا کر دیا گیا ہے۔ دُگنا چھوڑ کر، تگنا بھی کر دیں تو میرے کس کام کا؟ میں تو سب جتن کر کے ہار چکا۔"

ڈوپن نے وقفہ لے لے کر پائپ کے کش لگاتے ہُوئے کہا۔ "میرا خیال ہے — بھائی گ — آپ نے اس معاملے میں پُوری کوشش نہیں کی — کیا رائے ہے آپ کی اس بارے میں — کہ دوبارہ قسمت آزما دیکھیں۔"

"یعنی؟ — آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"یعنی یہ — کہ آپ — کسی سے مشورہ کریں — آپ نے ڈاکٹر ابرنیتھی کی کہانی سُنی ہو گی؟"

"ابرنیتھی جائے جہنم میں۔"

"جہنم میں گیا ہو بیچارا یا جنت میں مگر ذرا آپ اُس کی کہانی تو سُنئے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کہ ایک امیر آدمی جو اپنے کیسۂ زر کی حفاظت اپنا فرضِ اوّلیں سمجھتا تھا۔ اس شخص سے مفت ایک طبّی مشورہ لینے کی تدبیر سوچی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے دوستوں کے حلقے میں جہاں ابرنیتھی بھی موجود تھا۔ باتوں باتوں میں ایک فرضی شخص کی بیماری کا تذکرہ شروع کر دیا۔

"کہنے لگا۔" ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے علامات و آثار اس اس طرح کے ہیں، اس حالت میں ڈاکٹر صاحب آپ اسے کیا بتاتے۔"

ڈاکٹر ابرنیتھی نے جواب دیا۔ "میں اُسے کیا بتاتا؟

یہی کہ بھی کسی سیانے سے مشورہ کرو۔"

موسیوگ ...... نے اس ایمائے خفی کو سمجھ کر اور کسی قدر خفیف ہو کر کہا۔" میں مشورہ لینے کے لئے، اور اس کا معاوضہ دینے کے لئے پورے طور پر تیار ہوں میں فی الواقعہ اُس شخص کو پچاس ہزار فرانک دونگا جو اس بارے میں میری مدد کرے۔"

ڈوپن نے ایک دراز کھول کر اور ایک چک بک نکال کر کہا۔" اس صورت میں بہتر ہوگا کہ آپ رقم مذکورہ کا ایک چک ابھی پُر کر دیں۔ جب آپ اس پر دستخط کر چکیں گے میں خط آپ کے حوالے کر دونگا۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ موسیوگ کی یہ حالت تھی کہ جیسے اس پر آسمان سے کوئی بلائے ناگہانی نازل ہوگئی ہو۔ وہ سناٹے میں آگیا۔ چند لمحے تک خفیف تریں جنبش کے بغیر وہ منہ کھولے شک اور تذبذب کی نگاہوں سے میرے دوست کا مُنہ تکتا رہا۔ اُس کی آنکھیں فرط استعجاب سے . . گویا پھٹ گئی تھیں۔

آخرکار اس نے یکایک چونک کر اس سکتہ کے عالم سے ہوش میں آتے ہوئے اضطراری طور پر ایک قلم اُٹھا لیا۔ اور کئی منٹ تک وقفہ لے لیکر خلائے محض کی طرف دیکھنے کے بعد اُس نے پچاس ہزار فرانک کا ایک چک پُر کیا۔ اس پر دستخط کئے۔ اور ہاتھ بڑھا کر میز کی دوسری طرف ڈوپن کو دیدیا۔ ڈوپن نے غور سے اُس کا ملاحظہ کیا۔ اور اپنی یادداشت کی بیاض میں باحتیاطِ تمام رکھ لیا۔ پھر ایک دراز کھول کر اس نے ایک خط نکالا۔ اور موسیوگ — کے حوالے کر دیا۔

موخرالذکر نے ایک وجد کی حالت میں اس خط کو جھپٹ کر ڈوپن سے لے لیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے کھولا۔ اُس کے مضمون پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر افتاں و خیزاں دروازے کی طرف گیا۔ اور سلیک علیک کے بغیر بے تحاشا دوڑتا ہوا یہ جا وہ جا ہماری نظروں سے غائب ہوگیا۔ جس وقت ڈوپن نے اُس سے چک پُر کرنے کی ناگہانی فرمائش کی تھی اُسوقت سے لیکر اب تک ایک کلمہ اس کے مُنہ سے نہ نکلا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو میرے دوست نے حقیقتِ حال کی توضیح شروع کی۔

اس نے کہا۔" اپنی جگہ پولیس والے کافی سے زیادہ قابلیت رکھتے ہیں۔ اُن میں استقلال، ثابت قدمی، ہوشیاری اور چالاکی یہ سب خوبیاں بہت حد تک موجود ہیں۔ اس کے علاوہ جن باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ اُن سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ جب گ ..... نے اپنا خانہ تلاشی کا طریق بالتفصیل بیان کیا تو مجھے اس بات کا کامل اعتماد ہوگیا کہ جہانتک اسکی کوششوں

کی رسائی تھی۔ اُس نے تسلی بخش طور پر تلاشی لی ہوگی"

"جہانتک اُس کی کوششوں کی رسائی تھی!

کیا معنی!"

"جو طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے وہ صرف اپنی طرح کے بہترین طریقے ہی نہ تھے بلکہ کہنا چاہئے کہ کمال کی حد تک پُہنچے ہُوئے تھے۔ اس لئے اگر خط اُن کی جستجو کے دائرے میں ہوتا تو وہ یقیناً اُسے ڈھونڈ نکالتے۔"

مَیں ہنس دیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے یہ بات ازراہِ تمسخر نہ کہی تھی بلکہ سنجیدہ طور پر۔

"اس سے ثابت ہوا کہ طریقے بجائے خود بہت خوب تھے۔ اور اُن کا استعمال بھی خوب کیا گیا۔ مگر اُن میں نقص یہ تھا کہ وہ موجودہ حالات کے مطابق نہ تھے جس شخص سے پولیس والوں کو اس معاملے میں پالا پڑا۔ اُس پر چسپاں نہ ہوتے تھے۔ بات اصل میں یہ ہے۔ کہ چند لگے بندھے قوانین موسیو گ...... نے سنتِ عمل بنا رکھے ہیں۔ اور وہ ہر موقع پر واقعات کو توڑ موڑ کر اُن کے مطابق کرلینا چاہتا ہے نتیجہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ کہ یا تو وہ بہت زیادہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے یا بالکل سطحی پہلو پر نظر ڈالتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُس کا قیاس کبھی صحیح نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ کتنے طفلِ مکتب اُس سے بہتر استدلال کرسکتے ہیں۔ مَیں نے ایک لڑکا دیکھا ہے آٹھ سال کی اُس کی عمر تھی۔ لیکن بلا کا فہم رسا پایا تھا۔ ایک کھیل ہے جس میں جفت اور طاق اعداد کا کچھ حساب کتاب ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ایک لڑکا اپنی مٹھی میں چند گولیاں بند کرلیتا ہے۔ اور دوسرے لڑکے سے دریافت کرتا ہے کہ گولیوں کا عدد جفت ہے یا طاق اگر اُس نے بوجھ لیا تو ایک گولی جیت لی۔ اور نہ بُوجھا تو ایک گولی ہار دی۔ جس لڑکے کا مَیں ذکر کررہا ہوں وہ مدرسے بھر کی گولیاں جیت لیا کرتا تھا۔ اُسے یقیناً کوئی گُر معلوم تھا۔ اور وہ گُر یہ تھا۔ کہ وہ مقابل والوں کی حرکات وسکنات کا بغور مشاہدہ کرتا رہتا تھا، اور انکی چالیں تاڑ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے۔ کہ ایک عقل کے سیدھے لڑکے سے اُس کا مقابلہ آپڑا ہے۔ جو مٹھی بند کرکے اُس سے پوچھتا ہے۔ کہ "بتاؤ، گولیوں کا عدد جفت ہے یا طاق" وہ جواب دیتا ہے "طاق" اور یہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ لیکن دوسری بار اس کا اندازہ ٹھیک بیٹھتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں سوچتا ہے:" پہلی بار اُس نے گولیوں کا عدد جفت رکھا تھا۔ اور اس میں اتنا عقل کا مادہ کہاں کہ دوسری بار بھی یہی رہنے دے۔ اس لئے مَیں ا بکے جفت کہونگا"چنانچہ

وہ یہی کہتا ہے۔ اور بازی لیجاتا ہے۔ اب اگر بالفرض اُس کا ایک ایسے لڑکے سے مقابلہ ہو جاتے جو حماقت میں پہلے سے ایک درجہ بڑھا ہوا ہے۔ تو وہ اس طرح استدلال کریگا۔ کہ "اس لڑکے نے جو مجھے پہلی بار طاق کہتے ہوتے سُنا ہے۔ تو دوسری آزمائش میں اس کا ذہن قدرتی طور پر سب سے پہلے اس بات کی طرف منتقل ہو گا۔ کہ ایکی عدد جفت رکھنا چاہیئے لیکن معاً اُسے خیال آتے گا۔ کہ یہ تو بہت کھُلی ہوئی بات ہے اس خیال کے آنے پر وہ اپنے ارادے کی ترمیم کرکے گولیوں کا عدد وہی طاق رہنے دیگا۔ اس لئے میں ابکے طاق کہونگا۔" چنانچہ وہ طاق ہی کہتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ اب یہ بتائیے کہ لڑکے کا یہ طریق استدلال جسے اس کے ہم مکتب خوش قسمتی پر محمول کرتے تھے اس کی توجیہ کیا ہے۔ آپ اسے کیا کہینگے؟"

مَیں نے جوابدیا کہ یہ استدلال کرنیوالے کی قوتِ متفکرہ کا اپنے حریف کی قوتِ متفکرہ سے متفق ہو جاتا ہے۔"

ڈوپن نے کہا۔ "بیشک۔ مَیں نے جب لڑکے سے پوچھا کہ کس طور پر وہ اس مطابقت فکر جس میں اُسکی کامیابی کا راز تھا۔ وقوع میں لاتا تھا۔ تو اس نے جواب دیا۔ "جب مَیں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ کوئی شخص کتنا عقلمند یا بیوقوف نیک یا بد ہے۔ یا کسی خاص موقعہ پر اُس کے دل میں کس طرح کے خیالات ہیں۔ تو مَیں اُس کے چہرے کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور پھر دیکھتا ہوں۔ کہ کونسے خیالات یا جذبات اس طرح کا چہرہ بنا لینے سے میرے ذہن میں آتے ہیں۔" اس طالب علم کا یہ فلسفیانہ جواب دنیا کے جتنے بڑے آدمی گذرے ہیں اُن کے حسب حال ہے۔"

"اور اگر مَیں آپ کا مطلب ٹھیک سمجھا ہوں، تو یہ اتحادِ خیال یونہی ایک اتفاقی امر نہیں۔ بلکہ اس بات پر موقوف ہے۔ کہ کہاں تک استدلال کرنے والے نے اپنے مقابل کی عقل کا صحیح اندازہ کیا ہے۔"

ڈوپن نے جواب دیا۔ "عملی اعتبار سے اس کا دارومدار اسی پر ہے۔ اور یہ پولیس والے جو اکثر ناکام رہتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ اپنے استدلال کو حریف کے استدلال کے موافق نہیں بنا سکتے، اور دوسرے اُس کی عقل کا صحیح اندازہ نہیں کرتے۔ بلکہ کرنا نہیں چاہتے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ جو ترکیبیں اُنہیں سوجھتی ہیں، وہی دوسروں کو سوجھ سکتی ہیں۔ جہاں وہ کسی چیز کو چھپائینگے وہیں دوسرے چھپا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنی عقل کو اوروں کی عقل کے جانچنے کا کافی معیار

سمجھے ہوتے ہیں۔ جہانتک عام لوگوں کا تعلق ہے۔ یہ معیار بیشک کافی ہے۔ کیونکہ عام لوگوں میں اوران میں فرق ہی کیا ہوتا ہے؟ لیکن جب کسی ایسے شخص سے واسطہ پڑجائے جس کے دماغ کی ساخت ذرا غیر معمولی ہو تو اُس وقت یہی ہوتا ہے کہ یہ اُس شخص کی نسبت صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور انجام کار زک اُٹھاتے ہیں۔ اُس کی عقل ان سے زیادہ ہو یا کم، دونوں حالتوں میں نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ چند مقرر کردہ اصول بلاحیل وحجت تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور اُنہی پر اندھادھند عمل کئے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ موقعہ کیا چاہتا ہے۔ کہیں یہ اصول ترمیم کے تو محتاج نہیں؟ اگر کوئی فوری ضرورت پیش آگئی، یعنی کسی بڑے انعام کا لالچ ہوا، تو یہ نہ سوچتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں۔ حسبِ دستور اپنے مفروضہ اصولوں کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا تو یہ کہ اپنے تحقیقات کے طریق میں کچھ جدت پیدا کر دی، ورنہ اپنے بنیادی اصولوں کو احتساب کی نظر سے دیکھنا اور اُن میں ذرہ برابر ترمیم کرنا ان کے لئے حرام ہے۔ اُن کو تسلی اس بات کی ہوتی ہے۔ کہ یہ باتیں پہلے کی آزمائی ہوئی ہیں۔ دوبارہ آزمانے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟ مثال کے طور پر موجودہ معاملے کو لیجئے۔ موسیوگ ..... نے اپنے صیغہ کی قدیم روایتوں کو زندہ رکھا ہے۔ اور

تحقیقات کے جو اصول اس کے نزدیک مسلّم ہیں، وہ اُنہی پر کاربند ہوتا ہے۔ ورنہ یہ تمام گڑبڑ جو اُس نے پیدا کی ہے کیا معنی رکھتی ہے؟ یہ کرسیوں کا برمانا اور ٹھونکنا اور بجانا اور سوراخوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنا، اور خرد بینوں سے گھر بھر کی تلاشی لینا، یہ سب کیا ہے؟ دیکھئے میں آپ کو بتاؤں۔ موسیوگ نے اپنے تجربہ کی بنا پر انسانوں کی چالاکی اور شاطری کی نسبت ایک مجموعۂ خیالات مرتب کیا ہے۔ اس کے مطابق اس نے جرائم کی تحقیقات کے لئے چند اصول مقرر کر لئے ہیں اور اپنی مدتِ ملازمت میں انہی کو دستور العمل بنائے رکھا ہے۔ اب وہ عادۃً ان کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر وہ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ شاید آپ نے ایک بات ملاحظہ کی ہو۔ اُس نے یہ فرض کر لیا ہے کہ تمام انسان، بلاتمیز وتفریق، جب کوئی چیز چھپانا چاہیں گے، تو کوئی ایسی جگہ تلاش کرینگے جہاں دوسروں کی نظر کا پہنچنا محال ہو۔ مثلاً اگر کوئی خط چھپانا منظور ہے۔ تو کسی میز یا کرسی کے پایے میں برمے سے سوراخ کریں گے اور اُس کی بتی بنا کر اُس میں پوشیدہ کر دینگے۔ وعلیٰ ہذالقیاس۔ اب آپ نے اس بات کا بھی تجربہ کیا ہوگا کہ ایسی دوردست جگہ کا خیال صرف معمولی معمولی باتوں میں دل میں آتا ہے۔ اور صرف ادنیٰ درجہ کی عقل کے لوگ اس خیال

پر کاربند ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ہر کس و ناکس کا ذہن سب سے پہلے ایسی جگہ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اس لئے ہر کس و ناکس کا وہاں تک پہنچنا ممکن ہے اس کا دریافت کر لینا ڈھونڈھنے والے کے فہم رسا پر منحصر نہیں، بلکہ تمام تر اس کے حزم و احتیاط اور عزم و استقلال پر۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو عموماً پولیس والوں کے لئے کامیابی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اب آپ میری اس بات کا مطلب سمجھ گئے ہونگے کہ اگر گمشدہ خط موسیوگ ..... کے دائرہ جستجو میں ہوتا، یعنی اگر وہ اُنہی اصولوں کے تحت چھپایا جاتا جو موسیوگ ..... کے ذہن میں تھے، تو اُس کا مل جانا یقینی تھا۔ بہرکیف صورت حال یہ ہے کہ موسیوگ ..... اپنی کوششوں میں ناکام رہا ہے جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُس کا بنیادی قیاس ہی سرے سے غلط تھا۔ اُس نے وزیر د ..... کی شاعرانہ شہرت سے یہ نتیجہ اخذ کر رکھا تھا۔ کہ وہ احمق ہے۔ تمام احمق شاعر ہوتے ہیں۔ اس کا موسیوگ ..... کو خوب احساس تھا۔ لیکن جب اُس نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تمام شاعر احمق ہوتے ہیں تو وہ "اوسطِ غیر محصور" کے مغالطے میں مبتلا ہو گیا۔

میں نے قطع کلام کر کے پوچھا "مگر وہ شاعر ہے بھی یا نہیں؟ یہ تو میں جانتا ہوں کہ یہ دو بھائی ہیں، اور دونوں ادبی دنیا میں مشہور ہیں۔ لیکن جہانتک میرا خیال ہے د ..... نے ریاضی کی نسبت عالمانہ کتابیں لکھی ہیں وہ ریاضی دان ہے شاعر کہاں ہے؟"

"آپ نے غلطی کی میں اُسے خوب جانتا ہوں۔ وہ شاعر بھی ہے۔ اور ریاضی دان بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی قوتِ استدلال ایسی زبردست ہے۔ اگر وہ صرف ریاضی دان ہوتا تو اُس کی قوت استدلال اُسے پولیس والوں سے نہ بچا سکتی۔"

"آپ کے ان الفاظ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے کیا آپ ایک ایسی بات کو غلط قرار دینا چاہتے ہیں جسے لوگ صدیوں سے مانتے چلے آئے ہیں۔ یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ ریاضی کا استدلال ہی صحیح استدلال ہے۔"

ڈوپن نے جواب دیا "یقین جانئے کہ ہر وہ خیال جو جمہور کے مسلّمات میں داخل ہو چکا ہے جسے عرف عام کی سند حاصل ہو چکی ہے سراسر حماقت پر مبنی ہے۔ اُس کا اکثریت رائے پر منحصر و موقوف ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے۔ جس غلط العوام کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، مجھے یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کہ وہ ریاضی دانوں کا جسقدر احسان مانے کم ہے۔ کیونکہ اُنہی کی کوششوں سے اس نے اشاعت پائی ہے لیکن اس سے آپ کچھ فایدہ

نہیں ہوا۔ اشاعت سے غلط باتیں صحیح نہیں ہو جاتیں۔"

میں نے کہا " معلوم ہوتا ہے کہ ریاضی دانوں سے آپ کو کچھ خداواسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ خیر چلئے۔ ارشاد فرمائیے۔"

" مجھے اس استدلال کی عملی منفعت اور قدر وقیمت پر شک ہے جس کو افکار مجردہ کے سوا کسی چیز سے تعلق ہو صرف منطق کا استدلال صحیح معنوں میں استدلال کہلانے کا مستحق ہے۔ یوں صوری لحاظ سے تو ریاضی کا استدلال منطق سے کچھ جدا نہیں، بلکہ اس کی نقل ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے اُن میں بہت بڑا فرق ہے منطق کا موضوع بحث افکار مجردہ ہیں۔ اور ریاضی کو اشکال و مقادیر سے تعلق ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہئے کہ ریاضی کا استدلال زیادہ سے زیادہ وہی منطقی استدلال ہے کہ جسے اشکال و مقادیر کی بحث کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ریاضی کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ اُس کے قواعد اولیہ کو کلیات عمومی تصور کر لینا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ ریاضی بحیثیت مجموعی تو کجا، خود الجبرا بھی جو اس کی اعلیٰ ترین صنف ہے کلیئے قائم نہیں کر سکتا۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اتنی بڑی غلطی لوگوں نے کیسے تسلیم کر لی۔ ریاضی کا کوئی قاعدہ لے لیجئے۔ اور اُسے حقیقت کے معیار پر جانچیے۔ یقیناً ناقص ثابت ہوگا۔ مثلاً ریاضی کے علوم متعارفہ میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی کل کے اجزا کا حاصل جمع کل کے مساوی ہے اب ذرا اس کا اطلاق اخلاقیات پر کیجئے۔ دو محرکات عمل ہیں جن کی اخلاقی اعتبار سے جدا جدا ایک قدر وقیمت معین ہے اُن کو ہم اس قاعدے کے مطابق کہ " دو اور دو چار ہوتے ہیں"۔ جمع نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی باتیں ہیں جو ریاضی کے نزدیک تو حقیقت مطلق مانی جاتی ہیں لیکن ہیں اصل میں مفروضہ، یعنی اُن کی صداقت بعض شرائط اور حالات پر منحصر ہے۔ ریاضی دان اپنی عادت سے مجبور ہو کر ان محدود حقائق سے اس طرح نتائج کا استنباط کرتا ہے۔ گویا وہ تمام صورتوں میں کلیتہً صحیح ہیں۔ اور دنیا بھی یہی تصور کئے ہوتے ہے۔ برائنٹ نے اپنی فاضلانہ تصنیف علم الاصنام میں اسی قسم کی ایک اور عام غلطی بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ " اگرچہ فی زمانا ہم ان اساطیر اور احادیث پر اعتقاد نہیں رکھتے جو عہد قدیم کے مشرکین کا جزو ایمان تھیں۔ تاہم کبھی کبھی ہم بھولے سے اُن سے ایسے نتائج اخذ کر جاتے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہم انہیں صحیح مانتے ہیں" الجبرا دان بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ یہ غلطی وہ بھولے سے نہیں کر بیٹھتے، بلکہ اُن کی عقل میں ایسا فتور ہے کہ وہ مشرکوں کی طرح فرضی ڈھکوسلوں کو حقیقت سمجھے بیٹھے ہیں۔ اور ان پر اتنا اعتقاد رکھتے ہیں کہ اُن کے

بغیر ایک قدم نہیں اُٹھاتے۔ مختصر یہ کہ میں نے آج تک
کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا۔ جو صرف ریاضی دان ہو، اور
"مساوی قیمتوں" کی حدود سے باہر نکل کر بھی کوئی معقول بات
کرسکتا ہو۔ یا اُس کے نزدیک یہ بات رُکنِ ایمان نہ ہو۔ کہ
x^2-1-px مساوی ہ کے۔ ذرا اس شخص سے یونہی
آزمائش کے طور پر کہہ دیکھئے۔ کہ ممکن ہے بعض حالات میں یہ
مساوات غلط ثابت ہو، لیکن جب آپ یہ کہیں تو اپنی
حفاظت کے لئے تیار رہئے گا۔ کیونکہ وہ یقیناً آپ پر
حملہ کردیگا۔ کہ کیوں ایسا کفر کا کلمہ کہا۔"

مجھے اس پر بہت ہنسی آئی۔ لیکن ڈوپن اپنی بات
ہانکے گیا۔ "اگر وزیر نرا ریاضی دان ہوتا تو موسیو گ کو مجھے
اپنے ساتھ شریک کرنے کی مجبوری پیش آتی مجھے وہ راز
معلوم تھا جس تک موسیو گ ... کی عقل نہ پہنچ سکتی تھی۔
میں جانتا تھا کہ وزیر شاعر بھی ہے۔ اور ریاضی دان بھی،
اور میں نے وہ ذرائع اختیار کئے جو ایسے شخص کے معاملے
میں اختیار کرنا چاہیئے تھے۔ اور جو موجودہ حالات کے مطابق
تھے۔ اسکے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ دربار کے [illegible]
اور سازش میں اُس کا نظیر نہیں۔ ایک ایسے جامع صفات
شخص کو یقینی طور پر پولیس والوں کی تحقیقات کے معمولی طریقوں
سے باخبر ہونا چاہیئے۔ یہ ناممکن تھا کہ اُسے قرائن سے پتہ
نہ چل جاتا۔ کہ لوگ اُس کے تعاقب میں تھے۔ اور اُس کی
جیبوں پر لٹیروں کا حملہ آور ہونا کچھ دُور نہ تھا۔ وہ یہ بھی ضرور
تاڑ گیا ہوگا کہ اُس کے گھر کی چوری چھپے تلاشی کرنے کے
اہتمام ہورہے تھے۔ اور وہ جو راتوں کو گھر سے
باہر رہا کرتا تھا۔ یہ اُس کی ایک چال تھی۔ اُس کا مقصد اِس
سے یہ تھا کہ پولیس والوں کو تلاشی کا خوب موقعہ مِل جائے
تاکہ اُن کی تسلّی ہوجائے۔ اور وہ اس خیال کو دل سے نکال
دیں کہ خط اُس کے گھر میں ہے۔ مجھے اس بات کا بھی احساس
تھا کہ یہ خیالات جو پولیس والوں کے ذہن میں آسکتے ہیں
اور جن کی ہم نے بہزار وقت ابھی تمہارے سامنے
تشریح اور تحلیل کی ہے۔ ان خیالات کا اندازہ کرلینا وزیر...
کے لئے نہایت آسان کام تھا۔ اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا
کہ اُس جیسا آدمی جو ہمیشہ روشِ عام سے ہٹ کر چلتا ہے
اس موقعہ پر بھی کوئی نئی راہ اختیار کرے۔ وہ ایک لمحہ
کے لئے بھی اس خیال کو دل میں جگہ نہ دے سکتا تھا کہ
اُس کے گھر کا کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ کونہ پولیس والوں
کی خوردبینوں اور برموں اور ٹٹولنے کی سوئیوں سے محفوظ
رہ سکتا ہے۔ ان حالات میں اُس کے لئے کونسی ایسی راہ
باقی رہ گئی تھی، جو پامال نہ ہو؟ یہی کہ وہ کوئی ایسا سادہ طریقہ
اختیار کرے جس کی کسی کو توقع نہ ہوسکے مجبوراً یا برضا و رغبت
بہرحال اُس نے ایسا ہی کیا۔ آپ کو یاد ہوگا۔ کہ جب میں
نے موسیو گ ...... سے اس معاملہ کی نسبت گفتگو کرتے

ہُوئے کہا کہ "شاید معاملے کی سادگی ہی آپ کی راہ میں پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہو" تو اس بات پر وہ کیسا قہقہے لگا کر ہنسا۔"

"ہاں مجھے خوب یاد ہے وہ تو ہنستے ہنستے ایسا لوٹنے لگا تھا کہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں شادی مرگ نہ ہو جائے۔"

"مادّی دُنیا بہت سی باتوں کے لحاظ سے غیر مادی دُنیا کے مماثل ہے۔ ان کی سرحدیں بہت سی جگہ مِل جاتی ہیں۔ اس وجہ سے علم البیان کا یہ قول صداقت کا پہلو لئے ہُوئے ہے۔ کہ تشبیہ اور استعارے سے جس طرح کسی بیان میں لفظی حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی دلیل میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان لاتعداد مشابہتوں کی ایک مثال یہ ہے کہ "قوتِ جمود" یعنی مدافعتِ حرکت کا قانون طبیعیات اور مابعد الطبیعیات دونوں میں مابہ الاشتراک ہے۔ جس طرح اوّل الذکر کے نزدیک یہ درست ہے کہ ایک چھوٹے جسم کی بہ نسبت ایک بڑا جسم زیادہ مشکل سے متحرک کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی حرکت کا معیار اثر اس اشکال پر منحصر ہے۔ اسی طرح موخر الذکر کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ جتنے کسی کے قوائے عقلی زیادہ وسیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ مستقل ہوں اور زیادہ اہم نتائج پیدا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں، اتنا ہی زیادہ اُن پر جمود طاری ہوتا ہے۔ اور جب وہ بروئے کار آتے ہیں تو اوّل اوّل نہایت سُست رفتار ہوتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے کیا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ دیواروں پر جو اشتہار لگائے جاتے ہیں اُن میں سے کونسے زیادہ جاذبِ توجہ ہوتے ہیں"

مَیں نے جواب دیا۔ "نہیں مَیں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔"

"نقشے پر ایک کھیل کھیلتے ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے سے کسی لفظ کے ڈھونڈھنے کو کہتا ہے۔ کوئی لفظ ہو، کسی شہر یا دریا، یا مُلک یا صوبہ کا نام بیندی عموماً اپنے مخالف سے کوئی نہایت خفی سا لفظ پوچھ کر اُسے دھوکا دینا چاہتا ہے۔ لیکن جو لوگ مشاق ہیں وہ ایسے لفظ پوچھتے ہیں جو نہایت جلی حروف میں لکھے ہوں اور نقشے کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیلے ہوں۔ چونکہ یہ لفظ بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے نگاہ ان پر نہیں پڑتی۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ توجہ کی حالت میں نگاہ ایک خاص نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے اشتہارات کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ نمایاں ہونے کی وجہ سے پردۂ تجاہل میں چھپ جاتے ہیں۔ اور بعینہٖ اسی طرح ہماری عقل اُن امور کی طرف توجہ مبذول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ جو بالکل عیاں اور بے نقاب ہوں۔ لیکن یہ بات یا مو سیوگ . . . . کی سمجھ سے

بالاتر ہے۔ یا وہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ اُس کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ ممکن ہے وزیر نے اس عام مقولہ کو مدّنظر رکھ کر کہ "آنکھ کے آگے ناک، سوجھے کیا خاک" خط کو سب کی نظروں کے سامنے رکھ دیا ہو۔ لیکن مجھے تسلّی تھی۔ کہ وزیر نے خط کو لوگوں کی رسائی سے دُور رکھنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہوگا کہ اُسے چھپانے کی مطلق کوشش نہ کی ہوگی۔ یعنی اُسے بے نقابی کی نقاب میں پنہاں کر دیا ہوگا۔ میں جتنا اُس کی جراءت، جسارت اور غیر معمولی فہم و ذکا۔ پر غور کرتا، جتنا اس بات کو سوچتا کہ اگر اُسے خط کا استعمال کرنا مقصود ہے تو اُس نے وقت بےوقت کی ضرورت کے خیال سے یقیناً اُسے اپنے قریب رکھا ہوگا۔ اور جتنی مجھے موسیو گ..... کی ناکامی سے اس امر کی شہادت ملتی کہ اُس نے خط کو عام لوگوں کی رسائی سے دُور چھپایا ہے، اُتنا ہی میرا یقین پختہ تر ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آخرکار مجھے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔

اس لئے میں نے ایک دن ملاقات کے بہانے سے اُس کے گھر جانے کا ارادہ کیا اور سبز رنگ کی عینک لگاکر اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔ وزیر حسن اتفاق سے گھر پر موجود تھا۔ اور حسبِ معمول جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہوا بیفکری کے انداز میں بیٹھا تھا۔ گویا اُسے دُنیا میں کوئی کام ہی نہیں کیا کرے بیچارا بیکار آدمی ہے! ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کے سوا کیا مشغلہ ہے جس میں اسکی طبیعت لگے! لیکن سچ پوچھئے تو آج روئے زمین پر اُس جیسا عملی اور ان تھک انسان آپ کو نہ ملے گا۔

"میں نے اس سے پیشتر کہ وہ میرے غیر معمولی طور پر عینک لگانے کی وجہ دریافت کرے۔ یا دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ آنکھیں دُکھنے کی شکایت شروع کر دی اس میں بڑی مصلحت مضمر تھی اگر میں ایسا نہ کرتا تو قدرتی بات تھی کہ وہ اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے میرے حرکات وسکنات کا بغور مشاہدہ کرتا۔ اور اس سے میرے مقصد کے فوت ہو جانے کا خوف تھا۔ کیونکہ میں نے تو عینک اس لئے لگائی تھی کہ اُسے معلوم نہ ہونے پائے۔ اور میں حسبِ خواہش کمرے کا معائنہ کرلوں۔ چنانچہ میں بظاہر اُس کی گفتگو کو ہمہ تن گوش ہوکر سنتا رہا لیکن میری آنکھیں پردے پردے میں اُس کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میری توجہ بالخصوص اُس لکھنے کی میز پر منعطف تھی جس کے قریب وہ بیٹھا تھا، اور جس پر خطوط اور متفرق کاغذات اور کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ خیر اس میز پر مجھے ایک عرصے تک گھورتے رہنے کے باوجود کوئی چیز ایسی نظر نہ پڑی جس سے میرے شبہ کو تقویت ہوتی۔ آخرکار میری نگاہ دفتی کے ایک خانے پر پڑی۔ جس پر سُنہری کام تھا۔ اور جو ایک میلے کچیلے نیلے

رنگ کے ریشمی فیتے سے انگیٹھی کے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اِس میں اور چھوٹے چھوٹے خانے تھے۔ جن میں پانچ چھ ملاقاتی کارڈ تھے۔ اور ایک اکیلا خط رکھا ہوا تھا جس کی حالت نہایت خستہ و خراب تھی۔ تمام داغ داغ اور شکن در شکن تھا۔ درمیان سے ایسے طور پر پھٹا ہوا تھا۔ کہ گویا اس کو بیکار سمجھ کر پھاڑ دینے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر رہنے دیا ہے۔ اُس پر ایک بڑی سی سیاہ مہر ثبت تھی، جو مَیں سمجھ گیا کہ خطِ طغرا میں د..... کا نام تھا۔ اور پتہ وزیر... کے نام ایک عورت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خط کو نہایت لاپرواہی، بلکہ حقارت سے اس خانے میں پھینک دیا گیا ہے۔ کچھ بھی ہو اُسے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ کہ یہ وہی خط ہے جس کی جستجو مجھے یہاں تک لائی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی۔ کہ موسیو گ..... نے میرے سامنے اس کا بالتفصیل خاکہ کھینچا تھا۔ کیونکہ یہ خط تو اُس خاکے سے قطعاً مشابہ نہ تھا۔ موسیو گ..... کے بیان کے مطابق خط پر چھوٹی سی سُرخ رنگ کی مہر تھی۔ اور پتہ شاہی خاندان کے ایک فرد کا تھا۔ اور بڑے بڑے حروف میں گھسیٹا ہوا تھا۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس کے برعکس تھا۔ مُہر سیاہ رنگ کی تھی۔ اور بہت نمایاں۔ پتہ وزیر د..... کا تھا۔ اور سوادِ خط سے نسوانیت کی نزاکت و نفاست ٹپکتی تھی۔ البتہ تقطیع کے لحاظ سے کچھ فرق نہ تھا۔

لیکن اصلی فرق تو مَیں نے ابھی بتایا ہی نہیں۔ یعنی خط کی شکستہ حالت۔ یہی تو وہ چیز تھی۔ جو موسیو گ...... جیسے اچھے بھلے سمجھدار آدمی کو دھوکا دے گئی؛ - کیونکہ یہ کبھی اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی۔ مَیں نے چونکہ اس خیال سے اپنے کو خالی الذہن کر لیا تھا۔ کہ خط کو ضرور پوشیدگی کی جگہ اور اچھی حالت میں ہونا چاہیے۔ اس لئے میرا ہر معمولی چیز پر شک کر لینا قدرتی امر تھا۔ مَیں تو گیا ہی اس ارادے سے تھا کہ ہر چیز کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھونگا۔ چنانچہ اس خط کی شکستہ حالی دیکھ کر میرے دل میں کھٹک گئی کہ ممکن ہے اس میں یہ مصلحت مضمر ہو کہ دیکھنے والے اسے ردّی سمجھ کر نظرانداز کر جائیں۔ پھر خط ایسی جگہ رکھا ہوا تھا جہاں ہر کسی کی نگاہ پڑنا ضروری تھا۔ یہ میری توقعات کے بالکل مطابق تھا۔ مَیں اس نتیجہ پر پیشتر ہی پہنچ چکا تھا۔ کہ دفعیّہ شک کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔

اب مَیں نے یہ سوچا کہ جتنی دیر یہاں بیٹھوں اُتنا ہی بہتر ہے۔ اس لئے مَیں نے کلام کو طول دینا چاہا۔ اور ایک ایسے مبحث پر گفتگو چھیڑ دی جس کی نسبت مجھے یقین تھا کہ یہ وزیر کے جوشِ تقریر کو برانگیختہ کر دیگا۔ اس عرصے میں مجھے خط کے ملاحظے کا کافی موقعہ مل گیا۔ مَیں نے خط کی ظاہری ہیئت اور جس حالت میں وہ پڑا تھا اس کا نقشہ پورے طور پر ذہن نشین کر لیا۔ مزید برآں مجھ پر

ایک ایسا انکشاف ہُوا جس نے میرے دل سے رہے سہے شک کو بھی دُور کر دیا۔ خط کو بغور دیکھا تو اُس کے کنارے کچھ ضرورت سے زیادہ فرسودہ معلوم ہوتے۔ اُن کی حالت ایسی تھی جیسی کسی سخت کاغذ کی ہو جاتی ہے۔ اگر اُسے ایکبار تہ کرکے دوبارہ الٹا تہ کیا جائے۔ اس انکشاف نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ لفافے کو کھولا گیا ہے اُلٹا کر کے نئے سرے سے وصل کر لیا گیا ہے۔ اور اُس پر نئی مہر لگائی گئی ہے۔ اس بارے میں اپنی تسلّی کرکے مَیں نے رخصت چاہی اور جاتے وقت ایک ناس کی ڈبیہ بھول گیا۔

اور دوسرے دن اپنی ناس کی ڈبیہ لینے کی غرض سے مَیں پھر گیا۔ اور وہی پہلے دن کی گفتگو کا مبحث چھیڑ دیا۔ اثنائے گفتگو میں یکایک ایک کھڑکی کے قریب سے پستول چلنے کی آواز آئی، اور اس کے بعد ایک شور و غل سُنائی دیا۔ د...... اضطراری طور پر کھڑکی کی طرف لپکا۔ تاکہ اسکی وجہ دریافت کرے۔ جبتک وہ آتے آتے۔ مَیں نے اپنا کام انجام دے لیا تھا یعنی وہ خط خانے سے نکالکر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا، اور اُس کی جگہ ایک نقلی خط رکھ دیا تھا جو مَیں نے ہوبہو اُس کے مشابہ بنایا تھا۔ یہانتک کہ آٹے سے ویسی مُہر بھی تیار کر لی تھی۔

"گلی میں یہ جو شور مچا تھا یہ ایک مجنون صورت شخص کی حرکت تھی۔ جو ہاتھ میں ایک بندوق لئے پھر رہا تھا۔ اُس نے مجمع میں بندوق چلادی تھی۔ اگرچہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا کیونکہ بندوق بھری ہوئی نہ تھی۔ لوگوں نے دیوانہ سمجھ کر جانے دیا۔ آپ سمجھے یہ شخص کون تھا؟ اپنا ہی آدمی تھا۔ قصّہ کوتاہ، جب د..... واپس آیا تو مَیں نے سلام عرض کیا اور چلتا بنا۔"

مَیں نے پُوچھا۔ "مگر نقلی خط بنانے سے آپ کا کیا مقصد تھا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ جب آپ پہلی بار اس کے ہاں گئے ہیں تو کُھلّم کُھلّا خط اُٹھا کے چل دیتے؟"

ڈوپن نے جواب دیا۔ "اور کوئی شخص ہوتا تو یہ ممکن تھا۔ لیکن د..... کے معاملے میں ایسا کرنا جان پر کھیلنے کے مرادف تھا۔ ایک تو وہ خود ایسا آدمی ہے کہ کسی بات سے نہیں چُوکتا، دوسرے کئی وفادار خادم اُس کے حکم کے منتظر موجود تھے۔ اگر مَیں ایسی سینہ زوری کرتا تو آج آپ یہ دلچسپ واقعہ میری زبان سے نہ سُنتے۔ اس کے علاوہ میرا ایک مقصد بھی تھا۔ جس کا پُورا کرنا ضروری تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاسیات میں مَیں کس خیال کا آدمی ہوں۔ مجھے بیچاری لیڈی سے جس کا خط چُرایا گیا ہے۔ ازحد ہمدردی ہے۔ پورے ڈیڑھ سال سے وہ وزیر کے سامنے سر اُٹھانے کی مجال نہیں رکھتی۔ لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ اب وزیر کو شامتِ اعمال نے گھیرا ہے۔ اُس کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ ہوگی کہ جس چیز پر اُسکا غلبہ اور اقتدار

منحصر تھا وہ اُس سے چھین لی گئی۔ وہ بڑے مزے سے اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں مصروف رہے گا۔ اور اس طرح خود ہی اپنے سیاسی اقتدار کی تخریب کے سامان پیدا کر لیگا۔ اور یہ سامان ایسی حیرت انگیز سُرعت سے ظہور میں نہ آئیں گے جتنے غیر متوقع طور پر۔ مجھے اُس سے مطلق ہمدردی نہیں۔ کیونکہ وہ ایک طبّاع اور ذہین، لیکن بے اصول اور ناقابلِ اعتبار آدمی ہے۔ اس کی تباہی کا الزام کسی کے سر نہیں ہوگا۔ خود اُسکی روشنیٔ طبع اس کے لئے بلائے جان ثابت ہوگی۔ جب وہ خاتون جسے اُس نے مُدّتوں سے اپنے پنجے میں گرفتار رکھا تھا۔ علانیہ اس کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائیگی۔ اور اسے اپنے اس خط کو جس کے بل پر وہ اترا رہا ہے۔ کھولنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اور اس کے ہاتھ میں وہ خط آئے گا۔ جو میں رکھ آیا ہوں۔ تو اس وقت اس کی کیفیّت دیکھنے کے قابل ہوگی"

"ہیں۔ کیا تم کوئی خاص چیز اُس میں رکھ آئے ہو؟"

"مجھے مناسب نہ معلوم ہُوا کہ اُس کو خالی کا خالی چھوڑ جاؤں۔ یہ تو اس کی ہتک تھی۔ ایک دفعہ د..... نے مجھے ایک نقصان پُہنچایا تھا۔ اور میں نے نہایت خندہ پیشانی سے یہ اقرار کیا تھا کہ میں اس بات کو بُھولوں گا نہیں چنانچہ اب میں نے اس خیال سے کہ اُس کے دل میں ضرور اپنے کامیاب حریف کو جاننے کا شوق پیدا ہوگا۔ کاغذ پر یہ لکھدیا کہ چاہ کن را چاہ درپیش[۵] وہ میرے خط سے خوب واقف ہے۔ پہچان جائیگا۔

ایڈگر ایلن پو

ہادی

افکارِ فیروز

دستۂ گل نے کہا انجمن آرا ہوکر
زینتِ بزم ہوئے پھول، تو یکجا ہوکر

تو وہ یوسف ہے جسے دیکھ کے دامانِ شکیب
چاک ہو پردۂ ناموسِ زلیخا ہوکر

ولولے خاطرِ افسردہ میں کیا پیدا ہوں
ہوگیا راکھ یہ آتشکدہ ٹھنڈا ہوکر

آہ وہ نالہ کہ جو ضعف سے لب تک نہ گیا
جم گیا دِل میں مرے نقشِ سویدا ہوکر

کھاتے ہیں سیلِ حوادث کے تھپیڑے فیروز
متحمّل صفتِ ساحلِ دریا ہوکر

۵ یہ [illegible] فرانسیسی زبان کا ایک شعر تھا جس کا ترجمہ [illegible] کے سمجھانے کے لئے ایک [illegible] حاشیے کی ضرورت ہوتی

نغماتِ آزاد

شکوۂ غم بجا نہیں۔ نہ سہی
حکمِ چون و چرا نہیں۔ نہ سہی

انتہائے جفا نہیں۔ نہ سہی
رحم کھانا روا نہیں۔ نہ سہی

سینکڑوں خوبیوں کے مالک ہو
ایک صاحب وفا نہیں۔ نہ سہی

آپ نے درد سُن لیا ہوتا
درد کی کچھ دوا نہیں۔ نہ سہی

دِل ازل سے ترا شناسا ہے
آنکھ شکل آشنا نہیں۔ نہ سہی

مَیں بھی سرکار ہی کا بندہ ہوں
لائقِ اعتنا نہیں۔ نہ سہی

تو ہو اور تیری زلفہائے رسا
میری قسمت رسا نہیں۔ نہ سہی

اُلفت معنوی بھی کیا کم ہے
پرسش بر ملا نہیں۔ نہ سہی

باطنی قرب اصلِ عزت ہے
ظاہری واسطا نہیں۔ نہ سہی

دولتِ دردِ دل تو حاصل ہے
دولتِ دوسرا نہیں۔ نہ سہی

آپ کا تو پتا لگا ہی لیا
اب جو میرا پتا نہیں۔ نہ سہی

شکرِ غم پر ملال کا کیا کام
قدرِ نعمت بجا نہیں۔ نہ سہی

تم کہ دردِ جہاں کے درماں ہو
میرے دُکھ کی دوا نہیں نہ سہی

صبر کی تاب تو عطا فرما
جبر کی انتہا نہیں۔ نہ سہی

آپ حکمِ سزا سُنا بھی دیں
قصدِ عفوِ خطا نہیں۔ نہ سہی

مَیں تو اظہار درد کرتا ہوں
کوئی درد آشنا نہیں۔ نہ سہی

ترک حاجت بھی ممکنات سے ہے
کوئی حاجت روا نہیں۔ نہ سہی

رند ہوں اور رند پاک نہاد
متقی پارسا نہیں۔ نہ سہی

آخر آزاد حسرتیں کب تک
جو وہ صبح و مسا نہیں نہ سہی

آزاد انصاری

شکوۂ جور و جفا سے کیا غرض
کیا غرض۔ اِک بیوفا سے کیا غرض

اب کوئی امید ہی دِل میں نہیں
زحمتِ بیم و رجا سے کیا غرض

دِل جہاں بہلے وہی گلزار ہے
باغ و گلشن کی فضا سے کیا غرض

مجھ کو اپنی زندگی دوبھر نہیں
التفاتِ جانفزا سے کیا غرض

جو تمہارے عشق کے بیمار ہیں
اُن کو تشویش دوا سے کیا غرض

جو تمہاری دُھن میں دِل افگار ہیں
ان کو امید شفا سے کیا غرض

آپ کے ارمان بھی تھوڑے نہیں
جستجوئے ماسوا سے کیا غرض

آپ کی حسرت بھی ناکافی نہیں
خواہش ہر دو سرا سے کیا غرض

اب سراپا مدعا ہوں اب مجھے
عرضِ حال مدعا سے کیا غرض

آپ تکمیل ستم فرمائیے
آپ کو خوفِ خدا سے کیا غرض

جن کو توفیقِ مے و معشوق ہے
اُن کو خبطِ اتّقا سے کیا غرض

کوئی میرا کیوں شریکِ حال ہو
اِک مصیبت آشنا سے کیا غرض

حضرتِ آزاد ہم اِک رند ہیں
پارسایانہ ریا سے کیا غرض

دستِ گستاخِ طلب کا کیا علاج
کیا علاج اس بے ادب کا کیا علاج

حرمتِ بنت العنب برحق۔ مگر
حسرتِ بنت العنب کا کیا علاج

جراَتِ ترکِ ادب بے جا سہی
عادتِ ترکِ ادب کا کیا علاج

کہتے ہیں معشوق و مے دونوں حرام
ایسے احکام عجب کا کیا علاج

بندہ پرور! دوست بن کر دشمنی
اس ستم کا اس غضب کا کیا علاج

اور کچھ دُکھ ہو تو درماں سینکڑوں
لیکن آزارِ طلب کا کیا علاج

دردِ فرقت قابلِ درماں سہی
آرزوئے جاں بلب کا کیا علاج

حضرتِ آزاد! شکوے رائیگاں
رنجہائے بے سبب کا کیا علاج

اقبال جہانگیری

تیموریہ حکومت کو جب جہانگیر نورالدین کی ذات سے فروغ نصیب ہوا۔ تو زمانہ کا رنگ بدلا۔ جہانگیر نے بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ وہ صرف عیش پرست ہی نہ تھا بلکہ جہانداری اور جہانبانی کے اسرار و غوامض پر بہت زیادہ عبور رکھتا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی نورجہاں کے ساتھ عیش و عشرت ہی میں نہیں گزاری بلکہ امورِ حکومت ہمیشہ اُس کے پیشِ نظر رہتے تھے۔ مورخین نے اُسکے واقعات ایسی دلکشی سے لکھے ہیں کہ اس کے عہد کی ادبی تاریخ کا نمونہ بن گئے ہیں۔ جہانگیر کو پرندوں اور جانوروں کا بہت شوق تھا۔ اور اُس کی اس دلچسپی نے ہزاروں قسم کے جانور اور پرند دُنیا کے ہر حصّہ سے جمع کئے۔ ایک بکری شیر سے اس درجہ مانوس تھی کہ شیر گویا اس پر عاشق تھا۔ ایک کو دوسرے سے جدا ہونا گوارا نہ تھا۔ ایک بکرا ایسا تھا کہ ایک گلاس بھر دودھ دیتا تھا۔

جہانگیر کی عیش پرستیوں کی خبر جب ایران پہنچی تو شاہ ایران نے ان سے فایدہ اُٹھانے کا خیال کیا اور اُس کا ارادہ ہوا کہ ہندوستان پر حملہ کر کے اپنی برسوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کو پُورا کرے۔ چنانچہ اپنے وزیر خوش تدبیر کو آگرہ بھیجا تاکہ واقعات کا صحیح علم ہو جائے اور اگر جہانگیر کی حالت جیسی کہ سُنی جا رہی ہے حقیقتاً ایسی ہی ہے تو اس موقع سے فایدہ اُٹھایا جاتے۔

وزیر سفیر کے لباس میں ہندوستان آیا شاہی دربار میں حاضری کی اطلاع کرائی۔ لیکن باریابی نہ ہوئی۔ اور خلاف دستور یہ حکم ہوا کہ سفیر کو ہندوستان میں ہر جگہ سیر و سیاحت کی اجازت ہے۔ اس اجازت کے پردہ میں سفیر اپنے مقصد کے پُورا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہانتک کہ جشن نوروز کا زمانہ آیا۔ جہانگیر نے اپنے وزیر کی نشست کے برابر ایک نشست اور اضافہ کرنے کا ارشاد فرمایا۔ جس کی تعمیل تو ہوئی۔ مگر اراکین کو بہت تعجب ہوا۔ اس اثنا میں حکم دیا۔ کہ جنگل سے دو خونخوار شیر زندہ گرفتار کئے جائیں۔ اور اجلاس شاہی کے دروازہ پر پنجروں میں بند رکھے جائیں۔ ان شیروں پر جشن تک خاص نظر کیسا اثر رہی۔ جہانگیر اُن کو غذا خاص اپنے ہاتھ سے دیتا تھا۔ جشن کا دن آیا۔ شہر کی آئینہ بندی ہوئی۔ مسلح فوج صف بہ صف کھڑی ہوئی۔ اعیان و

اراکین حکومت اپنی اپنی جگہ پر متمکن ہوتے۔ اس جدید نشست پر وزیر کے برابر سفیر بٹھایا گیا۔ وہ اس مردم شناسی پر متحیر تھا۔ درباریوں کے سامنے شیروں کے پنجرے دربار میں طلب ہوتے۔ اور شیروں کو آزاد کر دیا گیا۔ دونوں خونخوار جانور تخت کے گوشوں پر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے تمام اراکین حکومت اور اہل دربار پر دہشت طاری ہو گئی اور ہر ایک کو اپنی جان کی فکر پڑ گئی۔ لیکن بادشاہ کے رعب وداب کی وجہ سے دم بخود تھے۔ بادشاہ کا ایما پاکر تازہ گوشت حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے نیام سے خنجر نکالکر گوشت کے ٹکڑے خنجر کی نوک سے اُٹھا اُٹھا کر باری باری سے شیروں کو کھلانا شروع کئے یعنی جو شیر جس طرف تھا اُس طرف کے طشت سے وہ گوشت کا حصّہ پاتا تھا۔ اہل دربار خاموشی کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہے تھے بائیں جانب جو شیر کھڑا تھا اُس کے حصّہ کے طشت کا گوشت ختم ہو گیا۔ اور دائیں جانب جو شیر تھا اُس کے حصّہ کا طشت میں ایک ٹکڑا باقی رہا۔ جب بادشاہ نے وہ ٹکڑا خنجر کی نوک میں چھید کر اُس شیر کو کھلانا چاہا تو دوسرا شیر للچائی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ بادشاہ نے اُسی وقت اُس کے سر پر خنجر کا ایسا وار کیا کہ سر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور غصّہ سے یہ فرمایا کہ نمکحرام! دیکھ جو شخص دوسرے کے حصّہ پر نگاہ کرتا ہے اُس کو یہ سزا دی جاتی ہے۔" یہ کہکر بادشاہ اُٹھ کر محل میں چلا گیا اور دربار برخاست ہوا۔ سفیر نے اپنی جگہ پر واپس آکر ایک خط ان حالات کا شاہ ایران کو لکھا اور یہ بیان کیا کہ "یہاں دو باتیں عجائبات سے ہیں۔ ایک تو اجمیر شریف کا مزار جہاں ایک پیر بظاہر مردہ اور بہ باطن زندہ ہندکی حکومت کرتے ہیں۔ دوسرے یہاں ایک میوہ ہے۔ جس کو مُنہ سے چوس کر اُس کا رس پیتے ہیں۔ وہ زرد اور سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ اور بکثرت اُس کے درخت ہیں۔ جسے آم کہتے ہیں اور جہانگیر کے متعلق لکھا کہ ہندوستان پر حکومت نہیں بلکہ خدائی کرتا ہے۔ بہت بیدار مغز ہے جس قدر عیش وعشرت اور شراب نوشی میں سرشار اور مخمور رہتا ہے اسی قدر اسکا دل ودماغ حکومت کے کام میں مصروف رہتا ہے۔ اُس کی توجہ ایک عورت پر زیادہ مبذول ہے جسکا نام نور جہاں بیگم ہے اور انتظام سلطنت بھی اسی کے اشاروں پر ہے۔ عیش وعشرت میں پُورا وقت صرف کرتا ہے۔ بایں ہمہ وہ جزئی وکلّی طور پر امور سلطنت سے واقف ہے۔"

اس خط کے پہنچتے ہی شاہ ایران نے ہندوستان کے سفر کا ارادہ کیا۔ اور کچھ دنوں میں اکبرآباد آپہنچا۔ اس سفر میں اُس کے ساتھ چند خادم تھے۔ خود ایک صوفی اور درویش کے لباس میں تھا۔ اور خادم بطور مرید

کے تھے۔ پھر کیا تھا پیراں می پرند اور مریداں می پرانند کا مضمون ہوگیا۔ زر و مال کی کیا کمی تھی۔ خدام نے ایما پاکر ویران مقامات اور کھنڈروں میں زر و مال کی قابلقدر مقدار مخفی کر دی۔ اور درویش صاحب دل اپنی کشف و کرامات ظاہر کرنے لگے۔ جب ہزاروں آدمی شاہ صاحب کے فیوض سے فایدہ اٹھانے لگے، تو شاہ صاحب کی کرامات کا عام شہرہ ہوگیا۔ اور ہر ایک اُن کو بلاریب و شک تائید غیبی اور فیض دعائے کرامت سمجھنے لگا۔ اس ترکیب سے درویش نے بہت ہی جلد منازل درویشی طے کر لئے اور عالمگیر شہرت کی وجہ سے نورجہاں کو بھی شاہ صاحب سے حسن عقیدت پیدا ہوگئی۔ اولاد کی تمنّا میں زر و جواہر کے خوان تحفہ میں بھیجے۔ پیر و مرشد نے کہلا بھیجا کہ ”فقیر کو مال و دولت کی پروا نہیں، ان ہدایا کی فقیر کو آرزو نہیں، خدا آپ کی تمنّا پوری کرے۔“ شاہ صاحب کی ان باتوں نے نورجہاں کے دل کو مسخر کر لیا۔ اُس کو یقین ہوگیا کہ اُس کا نہال مراد فقیر کی دُعا کی برکت سے بارآور ہوگا اس خیال میں نورجہاں نے پیر و مرشد کی خدمت میں سلام کے بعد پیام بھیجا کہ ”مرشد کی نظر کیمیا اثر بیشک ذراتِ خاک کو زر و جواہر بناتی ہے۔ تاہم میری خاطر سے اگر اس ناچیز ہدیہ کو واپس نہ کیا جائے تو میرے لئے مسرت کا باعث ہے۔“

فقیر نے جواب دیا کہ ”فقیر نے اس ہدیہ کو رد نہیں کیا، بلکہ قبول کر کے بطور تبرک خاص آپ کے پاس بھیجا ہے۔ فقیر کو دنیوی عظمت و مرتبت سے سروکار نہیں ہے۔ اگر اس کے سوا آپ کی کوئی اور آرزو ہو تو اُس کے واسطے بھی فقیر دُعاگو ہے۔“

نورجہاں اس جواب سے متعجب و متحیّر اور فقیر کی خدا پرستی و توکل پر فریفتہ ہوگئی۔ اور یہ سمجھ کر کہ اس خدارسیدہ درویش کی دُعا سے خدا میری مراد ضرور پُوری کرے گا۔ شاہ صاحب کے اس مطمئن لب و لہجہ سے اب تو کھل پڑی اور کہلا بھیجا۔ کہ ”خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے مگر اولاد نہ ہونے کے غم سے گھلی جاتی ہوں اور یہی میری التجا ہے۔“ غرضیکہ مراسم سلام و پیام جاری ہو گئے۔ ایک دن پیر و مرشد سے دریافت کیا کہ ”آخر میں بھی کسی خدمت کے قابل ہوں۔“ جواب میں استغنا و لاپروائی کا پہلو اختیار کیا گیا۔ مگر ایک دن نورجہاں کی طرف سے بہت زیادہ اصرار ہونے پر ارشاد فرمایا گیا کہ فقیر کو زر و مال کی ضرورت نہیں ہے صرف یہ خیال ہے کہ کسی وقت جہاں پناہ ظل اللہ جہانگیر عادل بادشاہ کی زیارت حاصل کرلوں۔ اس لئے کہ خلق اللہ لوان سے امن و امان ہے۔ اگر ہو سکے، تو

شرف اجازت حاصل فرمایئے اور وقت و تاریخ معین فرماکر فقیر کو مطلع کیجئے۔"

نور جہاں نے اپنے اقتدار اور جہانگیر کی ناز برداری کے وثوق پر جواب دیا۔ کہ جہاں پناہ خود ہی حضور کی قدمبوسی کو حاضر ہوں گے۔ وہ فقیر دوست بادشاہ ہیں۔ ان کو مردان خدا کی خدمت میں حاضر ہونے سے عار نہیں ہے۔"

درویش نے دل میں سوچا کہ اپنا جادو چل گیا خوش ہوکر کہا۔ کہ" میرا کلبۂ احزاں شایان قدوم حضرت جہاں پناہی نہیں ہے۔ مجھ ہی کو موقع حاضری و زیارت دیا جائے۔"

غرضیکہ نور جہاں نے وعدہ کیا اور کہا کہ" بہتر ہے بہت ہی جلد درویش کا ذکر خیر کرکے بہ تعین تاریخ و وقت اطلاع دونگی۔"

نور جہاں نے کئی مرتبہ جہانگیر سے درویش کے صفات حمیدہ اور اپنی عقیدتمندی اور درویش کی آرزوئے زیارت کا ذکر کیا۔ کچھ ہاں نہیں کا جواب نہیں ملا۔ بہت پریشان ہوئی اس لئے کہ جہانگیر نے کبھی اس کی التجا کو اس لاپروائی سے نہیں ٹھکرایا تھا۔ ایک طرف تو اپنی التجا کے مسترد ہونے کا غم دوسری طرف درویش سے شرمساری کا خیال۔ اس اندیشہ میں تھی۔ کہ کیا کیا جائے۔ ایک دن جہانگیر نشہ میں مخمور و سرشار تھا۔ نور جہاں نے سوچا کہ اس وقت میرا قابو ہے اور موقع بھی غنیمت ہے۔ اسی محویت کے عالم میں اُس نے ایک خاص انداز کے ساتھ استیذان درویش کی بحث چھیڑ دی۔ جہانگیر آمادہ ہوگیا۔ خدام بارگاہ اجازت پاتے ہی گئے اور درویش کو بہ تعظیم و تکریم لے آئے۔ اور اُس کمرہ میں بٹھا دیا جو فقہا و صلحا کی ملاقات کے لئے مخصوص تھا۔ اور جہاں پناہ کے حضور میں اطلاع کی وہاں سے حکم ملا کہ یہیں بھیجدیا جائے۔ خدام بارگاہ کو حیرت ہوئی۔ کہ یہ نئی صورت ہے کہ خلوت خاص میں کسی کو مجال دخل نہیں دی جاتی ہے۔ مگر تعمیل چارہ نہ تھا۔ درویش کو فوراً حاضر کیا۔

جہانگیر اس وقت عالم مدہوشی میں تھا۔ اور اس کی روح رواں نور جہاں کا سر اُس کے زانو پر تھا اور وہ ہمہ تن اُس کی طرف متوجہ تھا۔ درویش کی طرف مطلق خیال نہیں کیا۔ درویش آداب شاہی بجالایا۔ جہانگیر نے بے رُخی کے ساتھ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جب درویش کا ہاتھ جہانگیر کے ہاتھ میں آیا۔ تو کچھ دیر کے بعد اُسی بے رُخی کے ساتھ جہانگیر نے کہا۔ کہ" حرارت شاہی از دست درویش نہ رفت"۔ درویش اس فقرہ سے متحیر ہی نہیں بلکہ عالم یاس

میں ہوگیا۔ مگر جہانگیر نے ہاتھ نہیں چھوڑا پھر چند منٹ کے بعد فرمایا کہ :۔

"خوب شد کہ دشمنِ جاں از خود بدستم آمد"

یہ سُنکر تو درویش کے اوسان خطا ہو گئے اور چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ اپنے دل میں خیال کیا کہ اب یہاں سے مفر نہیں ہے۔ موت سر پر کھڑی ہے جہانگیر نے درویش کو لرزہ بر اندام پاکر فرمایا کہ "برو بحق ایں خاتون (نور جہاں) جان بخشیدم"

یہ کہکر ہاتھ چھوڑ دیا۔ درویش جان چھڑا کر اپنے مریدوں میں پہنچا اور فوراً ہی اپنے گھر کا راستہ لیا۔ اور جہانگیر کی قیافہ شناسی و مردم شناسی کی داد دیتا رہا۔

نور جہاں، جہانگیر کی اس حرکت سے انگشت بدنداں تھی۔ پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جہانگیر نے اپنے قیافہ کا حال اُسے سُنایا۔ وہ بھی اپنے بادشاہ کی باخبری اور حکمرانی کی داد دینے لگی۔ اور اپنی نادانستگی اور اصرار پر نادم ہوئی۔

ہدایت حسین

وجدانیات

جز دوست اور کوئی مرا رازداں نہ ہو
کیا لطف آئے دل بھی اگر درمیاں نہ ہو

آئے نہ لب پہ کشمکشِ ضبطِ غم کا حال
اے عشق دیکھ! حُسن ترا رائگاں نہ ہو

قربان تیرے فیض کے اے سوزِ اشتیاق
یوں خاک کر کہ خاک کا مجھ پر گماں نہ ہو

دِل سے نقوشِ قصۂ غم مٹ گئے تمام
اتنا بھی کوئی محوِ غمِ داستاں نہ ہو

حسنِ مجاز سے تو نظر آشنا سی ہے
اس پردۂ حجاب میں وہ جانِ جاں نہ ہو

یوں منزلِ حیات کو طے کیجئے جلیلؔ
خاکِ رہِ فنا پہ قدم کا نشاں نہ ہو

جلیل قدوائی

حُسن

(۱)

حسن رنگینیٔ گل بھی خلش خار بھی ہے
نزہت آباد محبت بھی دلآزار بھی ہے
ابرِ تسکین بھی ہے وہ برق شرربار بھی ہے
تلخیٔ زہر بھی ہے بادۂ سرشار بھی ہے
لادوا درد ہے اس درد کا درماں کیا ہے
مرگِ ناگاہ ہے یا چشمۂ حیواں کیا ہے

(۲)

ماہ وانجم میں اگر حسن کا انداز نہ ہو
بربطِ حورِ سحر زمزمہ پرواز نہ ہو
پھول میں رنگ نہ ہو سرو سرافراز نہ ہو
محفلِ دہر اگر جلوہ گہ ناز نہ ہو
کور ہو جائے ابھی چشم تماشائے جہاں
ظلمت آباد بنے بزمِ دل آرائے جہاں

(۳)

سازِ ہستی کے لئے صورت مضراب ہے حُسن
دیدۂ عشق میں رنگینیٔ صد خواب ہے حسن
کشتیٔ ہوش و خرد کے لئے سیلاب ہے حسن
خرمنِ دل کے لئے شعلۂ بیتاب ہے حسن
غرق کر دیتا ہے دم بھر میں سفینے لاکھوں
خاک کر دیتا ہے یہ پھونک کے سینے لاکھوں

(۴)

روح افروز ہے کیا عارض زیبائے شباب
بادۂ حُسن سے لبریز ہے مینائے شباب
اک قیامت ہے مگر قامتِ رعنائے شباب
برق جانسوز ہے یا حسنِ خودآرائے شباب
حسن شاداب بھی گو عشق ہی کے خون سے ہے
داستاں عشق کی رنگیں اسی مضمون سے ہے

امیر مینائی

داغ مرحوم کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ہیں نے ان کے مشہور ہمعصر منشی امیر احمد امیر مینائی کا بھی ذکر کیا تھا۔ اور اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اگرچہ یہ دونوں اُردو شاعری کے موجودہ دور میں پیدا ہوئے لیکن مغربی تعلیم کے اثرات سے محفوظ رہے۔ اور ان کا کلام ہمیں اس لئے عزیز ہے کہ وہ ایک گزشتہ دور کے باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ امیر کے انگریز لوگوں کے میل جول سے محروم رہنے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی کہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے ایک شاگرد سے پوچھا کہ انگریزوں کا لب ولہجہ کیسا ہوتا ہے۔ گویا انہوں نے عمر بھر میں ایک بار بھی کسی انگریز کو بولتے نہ سُنا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر میں وہ خوبیاں اور محاسن بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جو اُردو نظم اور نثر میں انگریزی اثر کے ساری ہونے سے پہلے پائے جاتے ہیں۔ نظم کے میدان میں آپ کے مشہور ترین کارنامے دو دیوان ہیں۔ مراۃ الغیب اور صنم خانۂ عشق۔ آپ کے نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اور محبان دین میں بہت مقبول ہیں۔ آپ کا نام صرف شاعری ہی میں زندہ نہیں بلکہ مدتوں تک اُردو زبان آپ کا یہ احسان مانے گی۔ کہ آپ نے شاید سب سے پہلے ایک مفید اور مستند لغات ترتیب دینا شروع کی اگرچہ افسوس ہے کہ زندگی نے وفا نہ کی اور اس عظیم الشان کام کو ادھورا ہی چھوڑنا پڑا۔ اس کا نام امیر اللغات ہے۔ اور اس کی دو جلدیں آپ کی حینِ حیات میں شائع ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض شاگردوں نے اس کو انجام تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا لیکن جہانتک مجھے علم ہے وہ ابتک اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوئے۔ ان دو جلدوں میں صرف الف کا باب ختم ہوا ہے۔ اور دوسرے حروف ابجد آجتک توجہ کے منتظر ہیں۔ بہرحال کہنا پڑتا ہے کہ جتنا کام بھی اس شعبہ میں وہ کر سکے ہیں۔ وہ بسا غنیمت ہے۔ اور ہمارے شکریہ کا مستحق۔ کیونکہ وہ مرتبانِ لغات کے لئے شمع ہدایت ہے۔

امیر احمد ۱۲۴۵ھ ہجری بمطابق ۱۸۲۶ء میں جب ناصرالدین حیدر اودھ کے حکمران تھے، بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی کرم محمد علوم دینیہ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور آپ کا

سلسلۂ نسب شاہ مینا سے جا ملتا ہے۔ جن کا مزار ہزاروں زائرین عقیدتمند کا مرجع ہے۔ انہیں بزرگوں کی نسبت سے یہ خاندان مینائی کہلاتا ہے اس نسبت کے علاوہ امیر مرحوم کو مینائی کے لفظ کی اس لئے بھی ضرورت پیش آئی تھی۔ کہ آپ کے معاصرین میں ایک اور شاعر آپ کا ہم تخلص تھا۔ امیر احمد نے بچپن میں اپنی خاندانی روایات کے مطابق تعلیم پائی اور عربی کا درس اپنے زمانہ کے بعض بہترین علماء سے ختم کیا جن میں لکھنؤ کے مشہور مرکزِ دینیات فرنگی محل کے علماء بھی تھے۔ اس کے علاوہ آپ کو مفتی محمد سعد اللہ سے بھی رشتۂ تلمیذ رکھنے کا فخر حاصل ہے۔ چنانچہ ایک وقت آیا۔ جب وہ خود ریاست رام پور کے مفتی مقرر ہوئے

یوں تو شعر و شاعری کا شمار ان دنوں فضائل اکتسابی میں ہوتا تھا۔ اور کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسا نہ تھا جو اس مشغلے سے شغف نہ رکھتا ہو۔ اور کبھی کبھی طبع آزمائی نہ کرلیتا ہو لیکن امیر احمد کو اوائل عمر ہی میں محسوس ہونے لگا کہ خدا نے انہیں غیر معمولی موزونیِ طبع ودیعت کی تھی۔

چنانچہ آپ نے منشی مظفر علی خاں لکھنوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ جو استاد مصحفی کے طرز کے متبعین میں اعلیٰ پایہ رکھتے تھے۔ آپ کو تخلص کی تلاش نہ کرنا پڑی، خوش قسمتی سے آپ کا نام ہی تخلص کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اس حسنِ اتفاق کی طرف ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر

یہ عجب لطفِ خداداد میرے نام میں ہے

غدر دہلی کے بعد لکھنؤ کی حالت ہی بدل گئی۔ وہ پرانی باتیں افسانہ ہوگئیں۔ اور وہ اہل کمال جو ابتک لطفِ خسروانہ کے سایہ میں پرورش پاتے رہے تھے انہیں اس گہوارۂ کمال کو خیرباد کہنا پڑی۔ امیر رام پور چلے گئے۔ اور اپنی باقیماندہ زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گذارا۔ نواب نے آپ کی علمیت اور قابلیت کی قدردانی فرمائی۔ اور عدالت دیوانی میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز کیا۔

رام پور میں آپ نے شاعری اور علمی لیاقت کی بدولت جو امتیاز حاصل کیا۔ وہ کچھ آپ ہی کا حصہ تھا۔ یہ فخر کسی کو نصیب تھا۔ کہ اس نے آتش و ناسخ کی آنکھیں دیکھی ہوں۔ اور انیس و دبیر کے عظیم الشان معرکوں میں شریک ہوا ہو۔ واجد علی شاہ کے دربار کی رنگین فضاء میں آنکھیں کھولی ہوں اور رند۔ وزیر۔ جیسے باکمالوں کی صحبت سے فیضیاب ہوا ہو۔ اسے اُردو کی خوش قسمتی کہئے کہ رام پور کی گدی پر یکے بعد دیگرے، نواب آصف علی خاں اور نواب کلب علیخاں

جیسے دو قدر دانانِ سخن جلوہ افروز ہوئے انکے فرخندہ فال عہد میں اُردو جو ترقی بھی کرتی کم تھی۔ دہلی اور لکھنؤ کی اور بات ہے۔ ورنہ اور کسی جگہ ایک وقت میں اتنے کامل الفن اُستاد جمع نہ ہُوتے تھے۔ جتنے اس عہد میں رام پور کے دربار کی زینت تھے۔ داغ۔ امیر۔ جلال۔ تسلیم۔ جہاں ان جیسے پہلوانانِ سخن کا جمگھٹا ہو جائے۔ جن میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر تھا۔ وہاں قدرتی بات ہے کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا خیال سمندِ طبع کے لئے تازیانہ ہو جاتے۔ جولانیوں پر آتی ہُوئی طبیعتیں تھیں بڑھے ہوئے حوصلے تھے ہنگامۂ شوق کے تقاضے تھے۔ ایسے میں جو قدم تھا آگے ہی پڑتا تھا۔ اگر ایسے حالات اور واقعات پیش نہ آتے تو ممکن تھا کہ داغ اور امیر کے کلام کو جو معراج نصیب ہُوئی ہے۔ کبھی نصیب نہ ہوتی۔

امیر کی خوبیوں میں ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی روشنیِ طبع کو ایسی خیرگی کا باعث نہ ہونے دیتے تھے۔ کہ دوسروں کی اچھی باتیں نظر ہی نہ آئیں جس کسی میں جوہر دیکھتے تھے اعتراف کرتے تھے۔ وہ خودستائی اور خود بینی جو عموماً شعرا کی طبیعت کا خاصہ ہے آپ کے مزاج میں بہت کم پائی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو کے تمام شاعروں سے کم۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی دوست نے جو آپ کے کلام کا بہت مداح تھا۔ آپ کے چند اشعار کی داد دیتے ہُوئے کہا۔ "واللہ اُستاد میر کا رنگ بھی آپکے سامنے پھیکا پڑ جاتا ہے۔" امیر پر ان الفاظ کا ایسا اثر ہُوا۔ گویا کسی نے کلمۂ کفر کہہ دیا ہو۔ فرمایا "ہا! ایسا نہ کہئے" آپ کے دوست نے جسے اپنے قول کی صحت پر کامل اعتماد تھا۔ اس کے جواب میں کیا خوب بات کہی۔ کہ "آپ کا تخلص ہی آپ کے تفوق کی دلیل ہے۔" اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ امیر کے تخلص میں الف زیادہ تھا۔

یہ کچھ اساتذہ ہی پر منحصر نہ تھا۔ بلکہ آپ اپنے معاصرین کی خوبیوں کے سامنے بھی سرِ تسلیم جھکا دیتے تھے۔ ہر کہ و مہ سے آپ کا سلوک منکسرانہ اور عاجزانہ تھا۔ یہانتک کہ اپنے نوکروں چاکروں اور ادنےٰ سے ادنےٰ درجہ کے لوگوں کو بھی "آپ" کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے۔ آپ کی بات بات سے حسنِ اخلاق ٹپکتا تھا۔ طبیعت کی سادگی نے رفتار و گفتار کے تکلف۔ لباس کی آرائش اور عادات واطوار کے تصنع سے آپکو بے نیاز کر دیا تھا۔ ذرا وضع کی سادگی دیکھئے۔ عموماً لباس یہ ہوتا تھا۔ کہ سر پر لکھنؤ کی چوگوشیہ ٹوپی اور ایک لمبا کُرتہ جو گھٹنوں سے نیچے پہنچتا تھا۔ اور پُرانی وضع کا پاجامہ اکثر چھڑی ساتھ لیکر چلتے تھے۔ اور کبھی کبھی ہاتھ میں تسبیح

بھی ہوتی تھی۔ جب آپ رام پور تشریف لے گئے ہیں تو اس درویشانہ لباس میں ایک اضافہ مناسب معلوم ہوا یعنی ایک ڈھیلا ڈھالا چغہ ان کپڑوں کے اوپر زیب تن کرلیا۔ آپ کا گزران زندگی کا طریق بھی انتہا درجہ کی سادہ مزاجی کا شاہد ہے۔ صلاح و تقوٰے اور زہد و ورع۔ یہ تھیں آپ کی زندگی کی نمایاں خصوصیات۔

مولوی احسان اللہ خاں ثاقب کا ہمیں بے حد ممنون ہونا چاہیے کہ اُنہوں نے امیر کے خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ جس میں آپ کی زندگی کے حالات عادات و خصائل اور آپ کی شاعری کا ایک مجمل تبصرہ بطور تمہید اضافہ کیا ہے۔ صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ مجھے رام پور میں قریب تین برس کے اُستاد مغفور کی حضوری کا شرف حاصل رہا۔ کبھی نہیں سُنا۔ کہ کسی شخص کا ذکر سوائے بھلائی کے ان کی زبان پر آیا ہو۔ یہی شفقت اور نیکدلی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی زبان کبھی کسی کی ہجو سے آلودہ نہیں کی۔ آپ کے کلام کو اوّل سے لیکر اخیر تک پڑھ جائیے، کہیں کسی پر کوئی چوٹ یا کسی کا ذکر بد نہ پائیگا۔ ایسے مرنج و مرنجان شخص سے کوئی اُلجھ کر کیا لیتا۔ چنانچہ آپ کی ہجو بھی کسی نے نہیں کی۔

قیام رام پور کا زمانہ اگرچہ لطف شاہی کے سایہ میں ہر طرح آسائش اور آرام سے گزرا۔ لیکن وطن کی یاد اکثر ستاتی تھی۔ حب وطن کا بیقرار جذبہ کبھی کبھی اشعار کی صورت میں ٹپک پڑتا تھا۔ لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ پر جو مصیبت نازل ہوئی اس پر ایک شعر میں اظہار غم کرتے ہیں۔ ؎

ہے لکھنؤ کی جان تو کلکتے میں امیر
خاک آئے میری آنکھ کو اب لکھنؤ پسند

ایک اور شعر میں اپنی غریب الوطنی اور وطن کی آرزوئے دید کی طرف کس درد بھرے انداز میں اشارہ کرتے ہیں ؎

شام غربت میں یہ ہر روز خیال آتا ہے
اے خدا ہم بھی کبھی صبح وطن دیکھینگے

نواب رام پور کے الطاف و اکرام اور وہاں کی ادبی صحبتوں کی دلبستگیوں نے آپ کو چالیس سال تک وہیں قیام کرنے پر مجبور کیا۔ یہ زمانہ قریب الاختتام تھا۔ کہ لغات ترتیب دینا شروع کی جرنیل عظیم الدین خاں رام پوری نے جنہیں اس کار خیر سے بہت دلچسپی تھی۔ آپ کو پہلی جلد کے چھپوانے کے لئے بہت مالی امداد دی۔ انہی حالات میں یکایک واقعات نے پلٹا کھایا۔ اور امیر کو سفر حیدر آباد کا عزم کرنا پڑا۔ داغ اس سے چند سال پہلے نظام کے دربار میں پہنچ چکے تھے۔ اور

اپنے جوہرِ طبع دکھا کر خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ آپس میں خط و کتابت رہتی تھی اور کئی بار داغ نے امیر کو دکن میں آجانے کی ترغیب دی تھی۔ لیکن کچھ ضعفِ پیری کی وجہ سے اور کچھ اپنے مزاج کی قدرتی قناعت پسندی کے باعث آپ نے اس دعوت کا انکار کے سوا کچھ جواب نہ دیا تھا سنہ ۱۹۰۰ء میں جب نواب محبوب علی خاں مرحوم والیٔ دکن شمالی ہند میں تشریف لائے۔ تو امیر کو بلا بھیجا۔ اور بنارس میں آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ امیر بنارس گئے اور نظام کی مدح میں ایک مسدس پڑھا۔ ایک تو نظام پہلے ہی امیر کے کلام کے گرویدہ تھے۔ اس پر امیر کی شخصیت نے کچھ ایسا اثر کیا۔ کہ حضور نے انہیں اپنے ساتھ دکن لیجانے پر اصرار کیا۔ امیر نے عذر پیش کیا۔ کہ اتنی مدت تک نواب رام پور کا نمک کھا کر اخیر میں بغیر اجازت لئے چلے جانا مناسب نہیں۔ لیکن جب اُدھر سے مزید اصرار ہُوا تو آپ نے اتنا وعدہ کیا کہ نواب سے اجازت لیکر خدمتِ والا میں حاضر ہونگا۔ نظام کے اصرار کے علاوہ ایک اور بھی امر تھا۔ جو آپ کو سفرِ دکن اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ یہ کہ اُس کارِ عظیم کے انجام دینے کے لئے جس کے ذمے کا بارِ گراں آپ نے اُٹھا رکھا تھا۔ آپ کو مالی امداد کی ضرورت تھی۔ آخر کار رام پور سے اجازت طلب کر کے آپ (امیر) طویل سفر پر روانہ ہُوئے۔

آپ کے بیٹے منشی لطیف احمد اختر اور حافظ جلیل حسن جو آپ کے تلامذہ میں سب سے بلند پایہ رکھتے ہیں ہمراہ تھے۔ حیدر آباد پہنچے تو داغ شہر کے سر برآوردہ اُدبا اور عمائدین کو لئے ہوئے آپ کے استقبال کو موجود تھے۔ اور اگرچہ سرکاری طور پر آپ کی مہمان نوازی کا شاندار انتظام ہو چکا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے دوست داغ کی دعوت کو قبول کیا۔ اور ان کے گھر مہمان ہُوئے یہیں ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء کو ۷۴ سال کی عمر میں ایک مہینے اور ۹ دن کی بیماری کے بعد انتقال کیا۔ بیماری کے دوران میں داغ نے آپ کی خدمت اور تیمارداری کر کے حقِ دوستی ادا کیا۔ اُن کے علاوہ دوسرے ممتاز ادیب بھی جنہیں پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی تھے۔ آپ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد جو اس وقت وزیر اعظم تھے۔ اور جو اعلیٰ درجے کے سخن فہم اور سخن گو بھی ہیں۔ وہ کئی بار امیر کی عیادت کو تشریف لائے۔ ایسی عظیم الشان شخصیت کی توجہ فرمائی کا امیر کے دل پر ایسا اثر ہُوا کہ شکریے میں رباعیاں کہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے۔

رباعی

ہے آپ کا خیال جو ہمدرد مرا
برشک دمِ عیسٰے ہے دم سرد مرا

فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری
درمان میرے حق میں ہُوا درد مرا

جب حضور نظام کو وفاتِ امیر کی خبر پہنچی آپ کو بہت افسوس ہُوا۔ اور ہندوستان کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ادبی حلقے صف ماتم بن گئے۔ کیونکہ امیر جیسے بلند پایہ غزل گو اور محسنِ ادب کی موت اردو کے لئے ایک نقصانِ عظیم تھی۔ زیادہ رونا تو اس بات کا تھا۔ کہ ایسے وقت میں جبکہ آپ لغات ترتیب دیکر ادب اُردو کی عظیم الشان خدمت کرنے میں مصروف تھے اور جب والیِ دکن کی کرم گستری کی امیدوں نے آپ کی ہمت کو ایک شباب تازہ سے آشنا کر دیا تھا۔ پنجۂ قضا نے سررشتۂ حیات کو منقطع کر دیا۔ سفر حیدرآباد پر روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے اپنی ایک غزل کے مقطع میں اپنے انجام کی نسبت حسرت بھرے انداز میں پیشینگوئی کرتے ہیں۔ ؎

اب نہ آؤں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سلطنت نظام نے جس کی سرپرستی ادب اُردو کے اسباب ترقی میں ایک بہت بڑا سبب رہی ہے۔ اور ہے۔ امیر کی وفات کے بعد ان کے ادھورے کام کو انجام تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس غرض سے حافظ جلیل احمد اور بعض اُردو ادیبوں کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ لیکن ہم آجتک منتظر ہیں، کہ دیکھئے یہ عظیم مہم کب سرہوتی ہے۔ امیر اللغات کا طغرائے امتیاز یہ وصف ہے۔ کہ مدوّن نے اس میں ہر لفظ اور جملے کی صرف مکمل تشریح ہی نہیں کی۔ بلکہ اس کے استعمال کی مسلم الثبوت استادوں کے کلام سے سند بھی پیش کی ہے۔ یہ سندیں جس کثرت سے ہیں وہ بتا رہی ہیں۔ کہ مرتب کو اساتذہ اُردو کے کلام سے کتنی واقفیت تھی۔ اور آپ کا حافظہ کس بلا کا تھا۔ یہاں بھی ان کا انکسار اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ اکثر موقعے ہیں کہ جہاں خود ان کے کلام سے بہترین سندیں پیش کی جاسکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے دوسروں کو اپنے پر ترجیح دی۔ سرسیّد احمد مرحوم نے جب لغات کی پہلی جلد دیکھی اور انہیں معلوم ہُوا کہ امیر نے جان بوجھ کر اپنے کلام کو سند میں پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ امیر نے اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم روا رکھا ہے۔ وہ زبان کے معاملے میں کیا کسی سے کم ہیں کہ دوسروں کے محتاج ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہ امیر اللغات کی یہ خصوصیت بہت قابلِ تعریف ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اسے فرہنگ آصفیہ پر تفوق حاصل ہے۔ یہ کہنے سے

میری یہ مراد نہیں کہ فرہنگ آصفیہ کے قابل مرتب مولوی سید احمد دہلوی کی کسر شان ہو۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اپنی جگہ فرہنگ آصفیہ بھی ایک نہایت مفید لغات ہے اور صرف ضمنی بحث کی حقدار نہیں۔ بلکہ اس کی خوبیاں گنانے کے لئے ایک جدا مضمون درکار ہے۔ موخر الذکر کتاب کی سب سے زیادہ خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ تکمیل تک پہنچ چکی ہے۔ اور چار جلدوں میں چھپ کر تیار ہے۔ بلکہ مرتب نے اپنی زندگی ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کرکے شائع کیا۔ اس کے برعکس امیر اللغات کو دیکھئے کہ اُسے دو جلدوں سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ بہرحال یہ دو جلدیں اس مقصد کی کافی دلیل ہیں جو ان کے مدوّن نے پیش نظر رکھا تھا۔ امیر کا مدعا یہ تھا۔ کہ لغات جامع اور مانع ہو اور اُس میں مشہور اور مانے ہوئے اُستادوں کی سندیں پیش کیجائیں۔ تاکہ اختلاف کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ برخلاف اس کے مولف فرہنگ آصفیہ کا طریق یہ ہے کہ جہاں کسی پرانے اُستاد کی سند نہ پیش کر سکے، وہاں اپنے ہی اشعار کو جگہ دیدی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو شاعری کا دعوے زیبا نہیں۔ بہرکیف یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ لغات کی جتنی کتابیں موجود ہیں ان اُن میں تفوق فرہنگ آصفیہ ہی کو حاصل ہے۔

امیر نے اگرچہ متفرق اصناف ادب کیطرف توجہ کی ہے۔ تاہم فی الاصل وہ ایک شاعر تھے۔ مثلاً۔ دینی مسائل کی نسبت متعدد رسالے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو زبان پر کیسی کچھ قدرت حاصل تھی۔ ان رسالوں کے علاوہ خود لغات ہی میں الفاظ و محاورات کی تشریح کرتے وقت جو فقرے مثالاً لکھے ہیں ان سے اسبات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ کہ اچھی نثر لکھنے کا بھی ملکہ قدرت نے آپ کو ودیعت کیا تھا۔ آپ کے وہ مکاتیب جو عزیزوں اور شاگردوں کے نام لکھے گئے صرف اسلئے قابل قدر نہیں کہ وہ اعلےٰ درجہ کی نثر کا نمونہ ہیں بلکہ ان کو ہماری ادبیات کی تاریخ میں وہی رتبہ حاصل ہے جو عموماً بڑے آدمیوں کے مکاتیب کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک قسم کی خود نوشتہ سوانحعمری ہیں۔ جس میں ان کے خیالات و آرا۔ اور ان کی زندگی کے کوائف و سوانح کا خلاصہ درج ہے۔ مولوی احسان اللہ خاں ثاقب نے جن کا ذکر اُوپر بھی آچکا ہے دو سو صفحہ کے حجم کا ایک مجموعہ آپ کے خطوط کا چھاپا ہے۔ انکو شکایت ہے کہ بعض اصحاب نے جو اس مجموعے میں قابل قدر اضافہ کر سکتے تھے، ان کی متواتر درخواستوں کے باوجود بہت بے توجہی کا سلوک کیا ہے۔ یہ مختصر سی کتاب اس قابل ہے کہ اسے امیر کے ذاتی خیالات کا

بے تکلف اظہار سمجھ کر پڑھا جاتے۔ اگرچہ یہ خطوط میرزا غالب کے خطوط بلند معیار پر پورے نہیں اترتے۔ مولانا شبلی مرحوم نے امیر کے مجموعۂ مکاتیب پر تبصرہ کیا تھا جسکے چند فقرے نقل کرنے کے قابل ہیں۔

"اُردو شاعری کے اخیر تاجدار دو شخص تسلیم کئے گئے ہیں۔ امیر و داغ۔ امیر یعنی منشی امیر احمد صاحب مرحوم شاعری کے علاوہ بہت سے کمالات کے جامع تھے یعنی اگر وہ شاعر نہ ہوتے تب بھی ایک نامور شخص ہوتے اس بنا پر اور نیز ان کے کمال شاعری کے لحاظ سے ضرور ہے کہ ان کی مفصل اور جامع سوانحعمری لکھی جائے۔ افسوس ہے کہ ابتک کسی نے اس ضروری کام کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ افسوس اس لحاظ سے اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ منشی صاحب موصوف کا سلسلۂ تلامذہ نہایت وسیع ہے جسمیں متعدد ایسے حضرات موجود ہیں کہ جو اس فرض کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں"

مولوی احسان اللہ خاں صاحب کا یہ اُردو پر احسان ہے کہ اُنھوں نے مذکورہ خطوط شائع کر کے امیر کی سوانحعمری لکھنے کے لئے کافی مواد بہم پہنچا دیا ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ خود اُن کو اس اہم فرض کے ادا کرنے کا خیال نہیں آیا۔ ایک اچھی سوانحعمری کی سب سے لازمی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی مشہور آدمی کی روزمرّہ کی زندگی کا نقشہ کھینچے۔ اور اُس کے اقوال اور خیالات کا نچوڑ ہو۔ اور یہ مسلّم ہے کہ کسی شخص کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا بہترین ذریعہ اُس کے وہ خطوط ہیں جو اُس نے اپنے بے تکلف دوستوں کے نام لکھے ہوں۔ اس لحاظ سے "مکاتیب امیر مینائی" کو جو درجہ بھی دیا جائے کم ہے۔

ان شائع شدہ خطوط میں ریاض الاخبار گورکھپور کے مشہور ایڈیٹر حکیم برہم کے نام بہت سے خط ہیں۔ جو ۱۸۹۱ء سے لیکر ۱۸۹۸ء تک مختلف موقعوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں امیر نے اپنی لغات کا جابجا ذکر کیا ہے اور ایک جگہ اس کے چھپوانے کے مصارف کا تخمینہ درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ اور دیر صرف اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ یہ رقم کہیں سے ہاتھ نہیں لگتی۔ ۱۸۹۲ء کے ایک خط میں دوسری جلد کے زیر طبع ہونے کا ذکر کیا ہے ۱۸۹۵ء کا ایک خط ہے جس میں اپنے دوسرے دیوان یعنی صنمخانۂ عشق کے شائع ہونے کی خبر دی ہے۔ اس پر خود ہی ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اور اُسے صوری اور معنی خوبیوں کے لحاظ سے پہلے دیوان سے بہتر خیال کرتے ہیں۔ لطف

کی بات یہ ہے کہ اُن کی یہ راتے اُس وقت کے اربابِ تنقید کی عام رائے سے متفق تھی۔ وہ اسے صرف امیر کا بہترین دیوان نہ کہتے تھے۔ بلکہ اُردو کے بہترین دواوین میں شمار کرتے تھے۔ مجھے یہ معلوم کرکے کسی قدر تعجب ہوا۔ اور آپ کو بھی ہوگا۔ کہ حضرت شاد عظیم آبادی جیسا عالم اور نکتہ پرور سخن فہم پہلے دیوان کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے۔ ایک اور خط انہی حکیم برہم کے نام ہے جس میں بتاتے ہیں۔ کہ شاگردوں کے کلام کی اصلاح کتنی عظیم ذمہ داری ہے۔ مَیں نے داغ پر جو مضمون لکھا ہے اسمیں بیان کرچکا ہوں کہ ہمارے گزشتہ دور کے شعرا کس درجہ ایثار نفس سے کام لیکر اپنی کوششوں کا ایک حصّہ شاگردوں کی اصلاح کے لیے وقف کردیتے تھے۔ امیر بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ حکیم برہم کی ایک غزل کو بعد اصلاح واپس بھیجتے ہیں اور لکھتے ہیں :۔

"شعر تم نے کتی غزلوں میں بہت اچھے کہے ہیں۔ وجہ تصرف اکثر جگہ تمہارے ذہن سلیم پر اعتماد کرکے نہیں لکھے۔ مَیں جس حال میں ہوں وہ مشغلہ شعر و سخن کے بالکل مخالف ہے محض تمہاری خاطر سے تمہاری غزلیں دیکھی ہیں۔ بستے کے بستے شاگردوں کے کلام سے بھرے پڑے ہیں۔"

یہ شاذ و نادر دیکھنے میں آتا ہے کہ مشاہیرِ ادب کی زندگیاں خوشحالی اور فارغ البالی میں گزری ہوں۔ داغ پر کچھ خدا کی خاص مہربانی تھی۔ لیکن امیر کی قسمت میں وہی لکھا تھا جو عام طور پر اس طبیعت کے لوگوں کی قسمت میں ہوتا ہے۔ مالی مشکلات نے زندگی بھر چین نہ لینے دیا۔ چنانچہ اپنے خطوط میں بار بار ان کی شکایت کرتے ہیں۔ حکیم عابد علی کے نام ایک خط ہے اُس میں لکھتے ہیں :۔

لغت میں مصروفی اور محنت کی بہت حاجت ہے۔ شاعری بالکل چھوٹی ہے۔ اصلاح کو کلام بکثرت آتا ہے۔ کون بنائے کون جواب لکھے۔ انقلابات و تغیرات جو ریاست میں ہو رہے ہیں۔ وہ اور پریشان کر رہے ہیں سینکڑوں روپے ماہوار کا خرچ اور آمد کچھ نہیں —— . . . . . دوسو روپیہ ماہوار وفتر لغت میں صرف ہو رہا ہے۔"

سیّد زاہد حسین سہارنپوری ایک اور شخص ہیں جن کے نام بہت سے خطوط مکاتیب میں درج ہیں۔ انہیں میں سے ایک خط میں وہ اپنی ایک عادت بیان کرتے ہیں جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کبھی کسی کی مخالفانہ رائے سے متاثر نہ ہوتے تھے۔ اخباروں رسالوں میں آپ کے خلاف جو کچھ کہا جاتا تھا۔ آپ اس کی

ذرّہ برابر پروا نہ کرتے تھے۔ شاید زاہد صاحب نے کبھی یہ تجویز پیش کی ہوگی کہ ایک معاندانہ تنقید کا جو کسی رسالہ میں چھپی تھی جواب دیا جائے جس کے جواب میں امیر کہتے ہیں۔

"اخباروں میں جو کچھ میری نسبت کبھی کبھی کسی مہربان کی مہربانی سے چھپتا ہے میں نہ خود کبھی اس کا جواب دیتا ہوں۔ نہ کسی دوست شاگرد کو اجازت دیتا ہوں مناسب یہ ہے کہ اگر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہیئے۔ اور آئندہ احتراز کرنا چاہیئے۔ اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی ہے تو صبر کرنا چاہیئے۔ ردو قدح میں طول عمل ہوگا۔"

انہیں زاہد حسین نے ایک مرتبہ یہ آرزو ظاہر کی کہ آپ اپنے خط چھپوائیں۔ اور لوگوں کو اس دولت سے محروم نہ رہنے دیں۔ اس کا جواب یہ ملا۔

"خطوط جب میں فکر سے اچھے لکھتا تھا وہ ذخیرہ ایک سو کتی جلد کا میرے ایک شاگرد نے جمع کیا تھا سولہ برس ہوئے کہ وہ بیچارہ مر گیا۔ اور اس ذخیرے کا پتہ نہ لگا۔ پھر کسی نے جمع نہیں کیا۔ تین چار شاگردوں نے کبھی کبھی کچھ خطوط کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں۔ وہ جابجا ہیں۔ بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کر لی ہیں۔ اور جب سے دفتر امیر اللغات کھولا گیا ہے۔ محرران دفتر بعض مکاتبات لکھ لیتے ہیں۔ یہ سب بھی اگر جمع ہوں تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے۔ مگر کون یہ کام کرے۔ اسقدر ضرور ہے کہ کوئی خوش سلیقہ فہمیدہ و سنجیدہ آدمی ترتیب دیکر ان کو یکجا لکھ دے اور میں ایک نظر دیکھ کر جو مطالب شائع کرنے کے نہ ہوں ان کو نکال ڈالوں تو بنے مگر اس کی فرصت ہی نہیں۔"

مندرجہ بالا عبارت کو پڑھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ اہلِ مُلک کی بے توجہی اور ناقدردانی کے ہاتھوں کتنی ہی ایسی چیزیں ضائع ہوگئیں جو ہماری ادبیات میں معقول اضافہ کرتیں۔ امیر کے جتنے خطوط دستیاب ہو سکے۔ ہیں۔ یہی بسا غنیمت ہیں۔ اگرچہ ان کا بیشتر حصّہ ایسا ہے۔ کہ اگر امیر اپنی زندگی میں اپنا مجموعہ خطوط شائع کراتے تو ان کو شامل نہ کرتے۔ بہرحال ثاقب صاحب معذور ہیں۔ ناساعد حالات نے اس کی اجازت نہیں دی کہ تمام خطوط مہیّا ہو سکیں اور ان میں سے بہترین

حصّہ انتخاب کر لیا جائے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو یہ مجموعہ اپنی
موجودہ صورت سے بدرجہا بہتر ہوتا۔

آپ کو بہت سے خطوط داغ کے نام ملیں گے۔ جو
اُردو کے ان دو قادر الکلام شاعروں کے باہمی بے تکلفانہ
تعلقات کا اظہار ہیں۔ یہ خطوط ادبی دلچسپیوں سے
معمور ہیں۔ اور امیر کی سیرت پر بہت کچھ روشنی ڈالتے
ہیں۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے میں امیر کے صفات شاعری
کی نسبت کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ نقادانِ ادب
میں امیر اور داغ کے فرق مراتب کی نسبت بہت کچھ
اختلاف ہے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ امیر کو وہ
قبولِ عام نصیب نہیں ہوا۔ جو داغ کا حصّہ ہے۔ یہ
امیر کی ثقہ اور متین طبیعت کا اقتضا نہ تھا۔ کہ وہ
عام وخاص سے خراج تحسین وصول کریں۔ ان کے
ہاں وہ لطفِ زبان اور محاورے کی چاشنی بہت کم
ہے۔ جو داغ کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ داغ کی
طبیعت رواں ہے۔ اور شعر مُنہ سے بولتے ہیں کہ میں
بلایا نہیں گیا۔ بلکہ خود آیا ہوں۔ اس کے مقابلے میں یہ
تو نہیں کہا جا سکتا کہ امیر میں آورد ہے۔ لیکن اتنا
ضرور ہے کہ وہ اپنے اشعار کے ڈھالنے میں بہت محنت
سے کام لیا کرتے تھے۔ اور سچ پوچھئے تو اسی پہ ان کا
تفوق مبنی ہے۔ شاعری کا مقصد منتہا جو وہ سمجھے ہوئے
تھے وہ ان کے کامیاب حریف کے ذہن میں کبھی نہ آیا تھا

۵ امیر اک مصرعِ تر بن کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو برسوں

بلحاظ زبان اور محاورات کے دونوں اُستادوں میں
ایک اور بھی دلچسپ تقابل ہے۔ داغ کے یہاں دہلی کا محاورہ
اور روزمرّہ ہے اور امیر کے یہاں لکھنؤ کا۔ امیر کے کلام میں
جو کبھی کبھی تکلّف اور تصنّع کی خفیف سی جھلک پائی جاتی
ہے۔ یہ اُن کے صاحبِ لغات ہونے کا نتیجہ ہے۔ وہ اس
امر میں بہت محتاط رہتے تھے۔ کہ کسی لفظ یا جملہ میں ذرّہ برابر
تصرّف نہ کیا جائے۔ بلکہ جیسا اُستادوں نے استعمال کیا
ہے بعینہٖ ویسے ہی استعمال کیا جائے۔ اس احتیاط کا نتیجہ
جیسا ہم کہہ چکے ہیں بعض موقعوں پر تصنّع اور تکلّف کی صورت
میں رونما ہوتا تھا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے۔
تو امیر کے کلام کی یہ خوبی کہ وہ سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔
اور الفاظ کی نشست ایسی ہوتی ہے کہ کم از کم صوری لحاظ
سے اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بڑی حد تک اسی کی
مرہونِ منّت ہے۔ تخیّل کے لحاظ سے امیر اگرچہ غالب
کی رفعتِ پرواز کو نہیں پہنچتے۔ لیکن اپنے معاصرین کے
پہلو بہ پہلو ہیں۔ بلکہ اُن سے کسی قدر آگے ہیں۔

چند اشعار کا انتخاب زیادہ سے زیادہ ایک رسمی تعارف

کا ضامن ہو سکتا ہے۔ کما حقہٗ واقفیت حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ اُن کے دواوین کا مطالعہ کریں۔ اور میں یہ بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بغیر آپکا زبانِ اُردو کا مطالعہ نامکمل رہے گا۔ سرِ دست میں چند معروف اشعار کے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل شعر میں جس طرح معاملے کا خیالی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اُس نے اسے تصویر کے تمام معنوی لوازم سے آراستہ کر دیا ہے جو ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ ؎

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

ذرا اس شعر میں الفاظ کی نزاکت اور لطافت ملاحظہ ہو ؎

باغبان کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
چاہتے ہیں ایک کمسن کے لئے

ایک اور شعر ہے جس کی تعریف کرتے میں کبھی نہیں تھکتا:۔

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

شراب کا اس اچھوتے طریق سے بیان کرنا تشبیہ کے لطف کو دوبالا کر رہا ہے۔

ذیل کا شعر دردِ دل اور انسانی ہمدردی کا ایک صادق اظہار ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے،

اُن کے اخلاقی مضامین کے شعر بھی اثر سے خالی نہیں ہوتے۔ مثلاً:۔

اُٹھاؤں سختیاں لاکھوں کڑی بات اُٹھ نہیں سکتی
میں دل رکھتا ہوں شیشہ کا جگر رکھتا ہوں پتھر کا

اور اس شعر کے حُسن و خوبی کی تعریف تحصیل حاصل ہے۔ ؎

چشمِ نرگس نہ ملی دیدۂ آہو نہ ملا!
اے حیا تجھ کو انہی آنکھوں میں کیا رہنا تھا

شاعر کی حیثیت میں ان چند اشعار کے ذریعے میں اُن کا تعارف کرا چکا۔ لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک خط کے پڑھنے کا مشورہ دُونگا۔ جو حکیم برہم کے نام لکھا گیا ہے۔ اور جس سے آپ پر ظاہر ہوگا کہ ترتیبِ لغات کی حیثیت سے امیر کا تحقیق و تدقیق کا طریقہ کیا ہے۔ رسالہ (مصالح) ایک نہایت معمولی لفظ ہے۔ جس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس کی نسبت حکیم برہم نے اُن سے استفسار کیا ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے علمیت کا ایک دفترِ طولانی کھول دیا ہے۔ اس لفظ کا مادہ تو اصل جدید اُردو میں اسکے ہجے اصل عربی ہجے پر اسکو تفوق

دینے کا باعث، اور اس کے مختلف مفاہیم و مطالب، ان سب کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

اس خط کو پڑھ کر بیحد افسوس ہوتا ہے۔ کہ امیر اپنی لغات کو بالخیر اتمام تک نہ پہنچا سکے۔ اگر زندگی انہیں اتنی فرصت دیتی کہ جو اس کے متعلق جی میں سوچا تھا، وہ پورا کر سکتے تو اردو ادب میں کیسا گرانبہا اضافہ ہو جاتا! لیکن کیا ہوا اب بھی اُردو اُن کے احسان کی زیر بار ہے۔ اور مدّتوں رہے گی۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ اُن کے شاگردان رشید نے جن میں بڑے بڑے ناموں والے اصحاب ہیں، کیوں اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا۔ اور کیوں اس ادھورے کام کی تکمیل میں کوشاں نہیں ہوتے!

محمد اعظم

(ترجمہ از مضمون شیخ عبدالقادر بی۔ اے سابق ایڈیٹر مخزن)

جذباتِ اثر

کس چیز کا جویا ہوں، کس بات کا سودا ہے — معلوم نہیں مجھ کو کیا میری تمنّا ہے
اِک لرزشِ پیہم ہے بربطِ مری ہستی کا — گاہے ہمہ نغمہ ہے گاہے ہمہ نالا ہے
سیلابِ تبسّم ہے ساقی کی نگاہوں میں — ساغر مرا ساغر ہے۔ صہبا مری صہبا ہے
بیگانۂ وحدت ہے تیری ہی نظر ورنہ — کعبے میں ہے بتخانہ، بتخانے میں کعبہ ہے
ہستی کے سمندر میں انساں کی حقیقت کیا — موجوں کی کشاکش میں بہتا ہوا تنکا ہے
راضی برضا ہونا ہے خوب اثرؔ لیکن — ایسا نظر آتا ہے ناکام تمنّا ہے

اثرؔ صہبائی

حسّیاتِ وجاہت

کچھ عشق میں راحت کا نہ ساماں نظر آیا — مشکل ہُوا وہ کام جو آساں نظر آیا
جُز میں بھی ہمیں کل ہی نمایاں نظر آیا — جس گل پہ نظر کی وہ گلستاں نظر آیا
وحشت میں جنوں کی ہُوئی جب دست درازی — دامن نظر آیا نہ گریباں نظر آیا
ثانی نہیں دُنیا میں کوئی پیرِ مغاں کا — یہ ایک سمجھ بوجھ کا انساں نظر آیا

وجاہت مرحوم

پس پردہ

(۱)

دریائے سٹین کے کنارے گشت لگانے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جو میجس اور سینٹ وانڈرل کے کھنڈروں کے درمیانی حصہ میں دریا کے وسط میں ایک اونچی چٹان پر ایک عجیب ساخت کا سر بفلک قلعہ ملاکس واقع ہے۔ شاہراہ تک آنے کے لئے ایک پل بنا ہوا ہے۔ اس کے بناروں کا نیچے کا حصہ بھی بادی النظر میں انہیں چٹانوں کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جو اس کی سطح کا کام دیتی ہیں۔ اور یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی زلزلے کے پُر اسرار اثرات سے کسی پہاڑ کے پتھروں نے از سر نو مجتمع ہو کر یہ شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر سمت دریا کا پُرسکون پانی خس و خاشاک سے ٹکرا ٹکرا کر ایک خفیف سے تموج کے ساتھ بہتا ہے۔ اور صدہا قسم کے کیڑے مکوڑے سطح آب سے ابھرے ہوتے پتھروں پر یا ڈرتے ڈرتے بیٹھ جایا کرتے ہیں یا برابر تگاپو میں مصروف رہتے ہیں۔

ملاکس کے تاریخی واقعات اس کے نام کی طرح مہیب اور وحشت خیز بے شمار جنگوں، محاصروں، کشمکشوں بربادیوں، تباہیوں اور خونریزیوں سے مملو ہیں۔ وہاں کے جرائم کی حکایتیں قصبہ کاکس کے لوگ رات کے وقت لرزہ براندام ہو کر بیان کیا کرتے ہیں۔ صدہا پر اسرار و مہیب روایات مشہور ہیں۔ عام طور پر افواہ ہے۔ کہ یہاں سے ایک زمین دوز راستہ منہدم خانقاہ جومیجس کو اور دوسرا سردار ریگنس سورل کے مکان تک گیا ہے۔ جو شاہ چارلس ہفتم کا خاص رفیق و مصاحب تھا۔

آجکل قزاقوں کی اس قدیمی تفرج گاہ میں بیرن ناتھن کا ہرن سکونت پذیر ہے۔ جس کو عام طور پر بورس کے لوگ بیرن شیطان کے نام سے پکارا کرتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ اُس نے بہت ہی قلیل عرصہ میں دولت وافر حاصل کی تھی۔ قلعہ ملاکس کے مفلس و فلاکت زدہ مالکوں نے مجبوراً اپنی پرانی آبائی ملکیت کو بہت ہی سستے داموں فروخت کر دیا تھا۔ بیرن نے اپنی تصاویر منقش ظروف اور سامان آرائش کے ذخیرہ کو خوبی کے ساتھ یہاں سجایا ہے۔ اور وہ صرف تین نوکروں کے ساتھ تنہا رہتا ہے۔ کوئی شخص قلعہ کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ اس پرانے مکان کے کمروں میں اس کی عدیم النظیر تصاویر کا مجموعہ جو تین روبن اور دو ناٹیئر کی تصویروں پر مشتمل تھیں۔ وہ قیمتی پردہ جس پر جین گوجن کے ہاتھوں نے

کشیدہ کاری کی تھی۔ اور دیگر عجائبات کے نادر ذخیرہ کو جس کو اُس نے مختلف نیلام گاہوں سے بڑے بڑے رئیسوں اور متمول اشخاص کے مقابلہ میں زرِکثیر صرف کرکے خرید کیا تھا کسی شخص کی آنکھوں نے آجتک نہ دیکھا تھا۔

بیرن شیطان بہت ہی خوفزدہ زندگی بسر کرتا ہے اُسے اپنی نسبت کچھ ڈر نہیں ہے۔ خوف ہے تو صرف نوادر کے اس مجموعہ کا جسکو اُسنے بیحد شوق و آرزو کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اور جس کے متعلق اُسے فخر ہے۔ کہ اُس نے آج تک کبھی دُکاندار سے معاملہ کرنے میں دھوکا نہیں کھایا ہے اُسے اپنے اس مجموعہ سے اسی قدر محبت ہے جتنی کہ ایک بخیل کو اپنے زر و مال سے ہوتی ہے۔ اور جس میں ایسی پُر حرص محبت ہو اُس میں حسد کا مادہ ہونا ضروری ہے

روز غروب آفتاب کے وقت وہ چاروں آہنی دروازے جو پُل کے دونوں سروں پر ہیں۔ اور خاص صحن کا بڑا پھاٹک احتیاط کے ساتھ مقفل کیا جاتا ہے۔ اور چٹخنیاں لگا دی جاتی ہیں۔ اس کا خاص انتظام ہے کہ اگر کوئی شخص ذرا بھی مس کرے۔ تو خاموشی میں صدہا گھنٹیاں بجلی کی طاقت سے مرتعش ہو جائیں۔ دریائے سین کی طرف سے کسی قسم کا خدشہ نہیں۔ اس لئے کہ چٹان سطح آب سے بہت اُونچی ہے۔

ماہ ستمبر کے ایک جمعہ کو ڈاک کا ہرکارہ حسب معمول پُل کے پھاٹک پر دکھائی دیا۔ اور اپنے ہر روز کے معمول کے مطابق اس بھاری دروازہ کو بیرن نے خود اپنے ہاتھوں سے کھولا۔

بیرن نے ہرکارہ کے چہرے کا اس طرح بغور معائنہ کیا۔ گویا اس نے برسوں سے یہ شکل دیکھی ہی نہ ہو۔ ہرکارہ نے ہنسکر کہا۔

"حضور والا' بیرن صاحب یہ آپ کا پرانا خادم ہی ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ کوئی دوسرا شخص میری وردی پہنکر آگیا ہے۔"

بیرن نے آہستہ سے کہا "یہ کوئی کیا جانے۔"

ہرکارہ نے چند اخبارات کے پلندے دیتے۔ اور کہنے لگا۔

"ہاں حضور بیرن صاحب' آج میں ایک خاص چیز دیتا ہوں۔"

"خاص چیز' وہ کیا خاص چیز ہے؟"

"جی کچھ نہیں' ایک لفافہ رجسٹری شدہ لفافہ..."

بیرن سب سے الگ تھلگ ہر قسم کے تعلقات منقطع کرکے زندگی بسر کر رہا تھا۔ کوئی دوست یا عزیز ایسا نہ تھا جس کو اس کے معاملات سے دلچسپی ہو۔ اِس لئے بیرن کو کبھی بھی خطوط موصول نہ ہوتے تھے چنانچہ اس موقع پر اس خط کو کسی حادثہ کا پیش خیمہ اور فال بد سمجھ کر وہ

سراسیمہ ہوگیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ کسی حد تک
پریشان کن ضرور تھا۔ آخر یہ کون پر اسرار شخص تھا جس نے
اُسے اس کے تنہا و دور افتادہ گوشۂ عافیت میں اذیت دی۔

"حضور، بیرن صاحب رسید پر دستخط درکار ہونگے"

.. بیرن نے رسید پر دستخط کئے اور منہ ہی منہ میں
صدہا گالیاں دیں۔ اس کے بعد لفافہ لیا۔ اور جب تک
کہ ہرکارہ سڑک کے موڑ پر پہنچکر نظروں سے غائب نہ ہوگیا
وہ لفافہ کو پکڑے ہوئے انتظار کرتا رہا۔ پھر دو چار مرتبہ
اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد اُس نے پل کی سلاخوں کا سہارا
لیا۔ اور لفافہ کھولا۔ یہ تحریر سطور کشیدہ کاغذ پر تھی اور سب
سے اُوپر یہ الفاظ تھے۔

" ازجبل خانہ دی لاسانٹی۔ شہر پیرس "

یکدم بیرن کی نگاہ کاتب کا نام معلوم کرنے کے
لئے نیچے پہنچی۔ دستخط کس کے تھے۔

" آرسین لوپن "

دیوانہ وار اُس نے پڑھنا شروع کیا۔

حضور والا۔ جناب بیرن صاحب

اُس گیلری میں جو آپ کے دو ملاقاتی کمروں کے
درمیان واقع ہے۔ ایک تصویر فلپ ڈی چیمپین کی کھینچی
ہوئی موجود ہے۔ یہ صنعت مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔
جسے میں انتہائی تعریف کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ مجھے
آپ کی روبن والی تصاویر اور چھوٹی واٹیز بھی بہت پسند ہیں
ملاقاتی کمرہ کے داہنی جانب لوئی سیزدہم کی میز نوشت وخواند
بودس کے پردے شاہی چوکھٹ جس پر جیکب کے
دستخط ہیں۔ اور پندرھویں صدی کی یادگار صندوقچے...
خاص چیزیں ہیں اور خاصکر کمرہ کے بائیں جانب وہ کل
صندوقچے جنمیں چھوٹی چھوٹی تصاویر اور دیگر قیمتی اشیاء
ہیں۔

اس مرتبہ میں صرف انہیں اشیاء پر اکتفا کرونگا۔ جن
کو میں اپنے خیال کے مطابق بہت جلد نقد قیمت پر فروخت
کرسکتا ہوں۔ لہٰذا میں جناب سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ
تمام چیزوں کو باحتیاط باندھکر میرے نام کا پتہ لکھکر
ریلوے محصول ادا کرنے کے بعد اسٹیشن گیرڈی باٹگنولس
روانہ کردیں۔ اور یہ آئندہ ہفتہ کے آج ہی کے روز تک یا
اس کے اندر اندر اگر جناب نے اس کی تعمیل نہ کی تو میں
آئندہ چہارشنبہ مطابق ۲۷ ماہ حال کو بذات خود انکو لیجانے
کے لئے حاضر ہونگا۔ لیکن اس صورت میں واضح رائے عالی
رہے۔ کہ میں صرف مذکورہ بالا اشیاء ہی پر اکتفا نہ کرونگا۔
اور اگر ایمان کی پوچھئے تو بات بھی یہی مناسب ہے۔

اس تکلیف دہی کی معافی ..... اور یقین جانئے
کہ میں ہوں۔

جناب کا سچا خادم۔ آرسین لوپن"

مگر ازانکہ ذرا اس کا خیال رکھیے گا۔ کہ کہیں واتیہ زکی
چھوٹی تصاویر کے بجائے بڑی تصاویر نہ روانہ کر دیجئے گا
گو مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ نے نیلام گاہ میں انکی قیمت
۳۰ ہزار فرانک ادا کی تھی۔ مگر یہ نقلی ہیں۔ اصلی تصاویر
براس کی ڈائرکٹری کے اندراج کے مطابق جل کر خاکستر
ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ اُس نے اپنے تاریخی واقعہ میں من وعن
بیان کیا ہے۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ فرمایئے غیر مطبوعہ
سوانح گارٹ۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ مجھے لوئی پانزدہم
کی زنانہ ہتھکڑیاں بھی درکار نہیں۔ جن کی اصلیت میں
مجھے بیحد شک ہے۔"

اس خط کے مطالعہ نے بیرن کا ہرن کے سینہ میں
تلاطم برپا کر دیا۔ اگر یہ تحریر کسی دوسرے کے ہاتھ کی ہوتی
اس حالت میں بھی بیرن سراسیمہ ہو گیا ہوتا۔ پھر جب
آرسین لوپن کی تحریر ہو تو اُس کی سراسیمگی کا اندازہ ہو سکتا
ہے۔

(۲)

بیرن اخبار بینی کا بہت شائق تھا اُسے سرقہ و
جرائم کے واقعات معلوم کرنے کا خاص مرض تھا۔ اور
اُس نے اس خوفناک شریف چور کے واقعات کا حال
بخوبی سُنا تھا اُسے اچھی طرح علم تھا۔ کہ آرسین لوپن اپنے
دیرینہ دشمن گینمارڈ کے ہاتھوں گرفتار ہو کر امریکہ سے یہاں
آیا ہُوا ہے۔ اور وہ اس وقت بہت ہی حفاظت کیساتھ
حوالات میں بند ہے۔ اور عنقریب اُس کے مقدمہ کی
ابتدائی کارروائی عدالت میں شروع ہونے والی ہے۔
اس میں کلام نہیں کہ یہ سب باتیں بہت ہی مُدت سے
بعد بمشکل سُننے میں آئی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ اُسے یہ بھی
معلوم تھا کہ آرسین لوپن کے نزدیک کوئی بات محال نہیں۔
علاوہ بریں قلعہ کی حالت کا ایسا اندازہ تصاویر و میز و
کرسی کی صحیح جگہ کا بیان ایک حیرت خیز بات تھی۔ سمجھ میں
نہ آتا تھا کہ آرسین لوپن کو ان اشیاء کے صحیح مقامات کا
علم کیونکر ہو گیا۔ جبکہ کسی کی آنکھوں نے اُن کو آج تک
نہ دیکھا تھا۔

بیرن نے نگاہ اُٹھا کر قلعہ ملاکس کی سرکہ جیسی
عمارت کو دیکھا۔ اُس کے چکنے اور سپاٹ ستون دریا کے
پانی کی گہرائی پر جو اس کو ہر طرف سے گھیرے ہُوئے تھا۔
نظریں ڈالتے ہُوئے اُس نے اپنے شانہ کو حرکت دی۔
نہیں کوئی ممکن خطرہ نہیں۔ دُنیا کا کوئی شخص بھی اس
طلسم امن میں داخل ہونے کی جرأت نہ کر سکتا تھا جس
میں اُس کے نادرات کا مجموعہ بحفاظت تمام رکھا ہوا تھا
واقعی دُنیا کا کوئی شخص نہیں آسکتا تھا۔ مگر.. مگر
صرف آرسین لوپن کیا یہ تمام دروازے بند ہونے والا پل
اور مستحکم دیواریں آرسین لوپن کے لئے کچھ حقیقت رکھتی تھیں

یہ کل احتیاطیں اور پیش بندیاں اس صورت میں بیکار تھیں
جبکہ آرسین لوپن کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کا فیصلہ
کر لے؟

اُسی روز شام کو بیرن نے قصبہ روتن کے سرکاری
افسر کو اطلاع دی۔ اور وہ خط بھی روانہ کر کے پولیس سے
امداد و حفاظت کی درخواست کی۔

اس کا جواب بلاکسی توقف کے موصول ہوا۔ کہ
کاتب خط آرسین لوپن اس وقت جیلخانہ ڈی سانٹی میں
مقید ہے۔ جہاں اُس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ اور یہ
ناممکن ہے کہ وہ کوئی تحریر لکھ سکے۔ اس لئے یہ خط ضرور
کسی بدمعاش کی کارستانی ہے۔ منطق، عقل سلیم اور واقعات
سب اس امر کو زبردست دلائل کے ساتھ ثابت کر رہے
ہیں۔

تاہم مزید اطمینان کے لئے یہ خط ماہر تحریرات
کے پاس بغرض معائنہ روانہ کیا گیا۔ جس نے اپنے جواب میں
لکھا "گو بعض حروف میں کسی قدر مشابہت ضرور ہے۔ لیکن یہ
قیدی کے ہاتھ کی تحریر ہرگز نہیں۔"

"گو بعض حروف میں کسی قدر مشابہت ضرور ہے"
اس جملہ کو بیرن نے بار بار پڑھا۔ اور یہ نتیجہ نکالا کہ یہ مشتبہ
جملہ ہی اس امر کے لئے کافی تھا۔ کہ پولیس دست اندازی کرے
مگر اس نے یونہی ٹال دیا۔ پولیس کی یہ لاپروائی دیکھ کر بیرن کا

خوف اور بڑھ گیا۔ اب اُس نے خط کا مطالعہ شروع کیا۔
اُسے کئی بار پڑھا۔ "میں بذاتِ خود اُن کو لے جانے کیلئے
حاضر ہونگا۔" اور یہ کب؟ اُسی مقررہ تاریخ پر یعنی چہارشنبہ
۲۷ ستمبر کی رات کو۔۔۔

چونکہ وہ فطرتاً وہمی اور خاموش طبیعت کا آدمی تھا۔
اُس نے اپنا یہ خوف نوکروں تک پر ظاہر نہیں کیا۔ جن کی
وفاداری پر اُسے مدّت دراز کی رفاقت اور سخت امتحان و
آزمائش کے باوجود اعتقاد نہ تھا۔ بہت برسوں کے بعد اب
پہلی مرتبہ اُسے یہ ضرورت پیش آئی۔ کہ وہ کسی سے کچھ کسی
سے مشورہ لے۔ قصبہ کی پولیس سے ناامید ہو کر اُسے
اپنے ذاتی وسائل سے حفاظت کرنے پر اعتماد نہ تھا اس
لئے اُس نے خیال کیا۔ کہ پیرس چلکر کسی تجربہ کار سراغرساں
یا اسی قسم کے کسی معقول شخص سے مدد کا خواستگار ہونا چاہیئے
دو روز گزر گئے۔ تیسرے روز وہ حسب معمول اخبارات
کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ کہ یکایک وہ خوشی سے
اُچھل پڑا۔

اخبار ریویل ڈی کاڈیک میں یہ فقرہ درج تھا۔

"ہم بہت خوشی کے ساتھ اپنے ناظرین کو
مطلع کرتے ہیں کہ متواتر تین ہفتوں سے
ہمارے ملاقاتیوں میں چیف انسپکٹر گینمارڈ
صاحب کا بھی شمار ہے۔ جن کے زبردست

سراغرساں ہونے کا حال کسی سے مخفی نہیں گینمارڈ صاحب نے اپنے حال ہی کے معرکہ سے، آرسین لوپن کو گرفتار کر کے تمام یورپ سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے اور اب تمام تکالیف شاقہ اُٹھانے کے بعد وہ کچھ عرصہ کے لئے رخصت لیکر بغرض تفریح و آرام یہاں آتے ہوتے ہیں۔ اور اکثر دریا میں مچھلی کے شکار سے لطف اُٹھایا کرتے ہیں"۔

(۳)

آہا! گینمارڈ ٹھیک وہی آدمی، جس کو بیرن کا ہران چاہتا تھا۔ مدبّر گینمارڈ کے سوا اور کون ایسا تھا جو آرسین لوپن کے مقابلے کی تاب لا سکے۔ اور اُس کے فاسد ارادہ کو ملیامیٹ کر سکے۔

بیرن نے ذرا بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ قلعہ ملاکس سے قصبہ کاڈبک کی مختصر آبادی تک چار میل کا راستہ ہے۔ اس نے یہ راستہ بہت عجلت کے ساتھ خوشی خوشی طے کیا۔ اب اُسے مکمل حفاظت کی قوی امید ہو چکی تھی۔

عرصہ تک چیف انسپکٹر کا صحیح پتہ معلوم کرنے کی بیکار کوشش کرنے کے بعد وہ سیدھا اخبار ریول کے دفتر میں پہنچا۔ جو بالکل لبِ دریا واقع ہے۔ اس نے ایڈیٹر کو موجود پایا۔ اور اُس سے گینمارڈ کا پتہ دریافت کیا۔ ایڈیٹر نے اپنا مُنہ پھیر کر کھڑکی کے قریب جا کر کہا۔

"گینمارڈ ... میں کیسے کہوں کہ آپ اس سے کہاں مل سکتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ڈگ ہوگی۔ اور وہ لبِ ساحل کہیں بیٹھا ہوگا۔ میں نے بھی اُسے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا۔ کہ مجھے اس کا نام ڈگ پر لکھا ہوا مل گیا۔ اور میں نے اسے پڑھ کر اُس کی شخصیت کو پہچان لیا... آہا ... لیجئے دیکھئے ... وہ پستہ قد، ضعیف شخص فراک کوٹ پہنے تنکوں کی ٹوپی لگائے۔ درختوں کے سایہ میں کھڑا ہوا ہے۔"

"اوہو ... اچھا ... وہی فراک کوٹ، اور تنکوں کی ٹوپی والا۔"

"وہی جناب وہی، یہ بھی ایک عجیب وضع ہے۔ وہ بہت ہی کم سخن اور ذرا مشکل سے مخاطب ہوتا ہے۔"

پانچ ہی منٹ بعد بیرن وہاں جا پہنچا۔ اور اس نے مشہور و معروف گینمارڈ کو مخاطب کر کے اپنا تعارف کرایا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کرنا چاہیں۔ مگر گینمارڈ کی نظروں نے اُسے فوراً روک دیا۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہی بیرن یکدم حرفِ مطلب کی طرف آگیا۔ اور اپنے معاملہ کو صاف صاف الفاظ میں بیان کرنا شروع کر دیا۔

گینمارڈ نے بیرن کی گفتگو کو بلا کسی حس و حرکت کے یا نظروں کو پانی کی جانب سے اُٹھاتے بغیر خاموشی سے سُنا

یک بیک اُس نے بیرن کی طرف مڑ کر سر اُٹھایا۔ اور سر سے لیکر پیر تک ایک عجیب رحم آمیز نگاہ ڈالکر کہنے لگا۔

"جناب والا۔ بھلا یہ بات مجرموں کو کیا فایدہ پہنچا سکتی ہے کہ وہ جس کو لوٹنا چاہیں اُسے قبل ازیں آگاہ کردیں اور پھر خاصکر آرسین لوپن! ارے توبہ .... وہ ایسا بیوقوف نہیں کہ ایسی طفلانہ حرکت کرے۔"

"تاہم"

"جناب والا۔ اگر مجھے اپنے بیان میں ذرا بھی شک ہوتا تو آپ جانے۔ کہ آرسین لوپن کو پھر جیل میں پہنچانے کی مسرت مجھے ہر قسم کی رکاوٹوں سے بالاتر آزاد دو بے خوف کر دیتی۔ مگر بدقسمتی سے مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ وہ اس وقت جیلخانہ میں مقید ہے۔"

"فرض کیجئے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے بچکر نکل آسکے۔"

"جی جیلخانہ سانٹی سے آرسین لوپن بھی بچکر نہیں نکل سکتا۔

"لیکن .... لوپن"

"جی ہاں، لوپن، لوپن کا کوئی اور ———"

"تاہم"

"بہت خوب اگر وہ بچکر نکل بھی آسکے۔ تو بھی کوئی ڈر نہیں۔ میں اُسے دوبارہ گرفتار کر سکتا ہوں۔ آپ جاکر اطمینان سے سوئیں۔ آپ خواہ مخواہ میری مچھلیوں کو بھٹکا رہے ہیں۔"

اصل گفتگو ختم ہی ہو چکی تھی۔ بیرن گینمارڈ کی باتوں سے بہت بڑی حد تک مطمئن ہو کر گھر لوٹا۔ اور یہاں پہنچتے ہی اُس نے تمام چٹخنیوں کا معاینہ کیا۔ اور نوکروں کی خاص نگرانی شروع کر دی۔ اسی اثنا میں وہ ہر ممکن طریق سے اپنے دل کو تسلی دے دیکر بہلانے لگا۔ کہ آخرکار یہ تمام خطرات بالکل بے بنیاد ثابت ہونگے۔ اور اب اس میں کیا کلام ہو سکتا تھا۔ گینمارڈ نے خود کہدیا تھا۔ کہ مجرم جس کو لوٹنا چاہیں اُسے قبل از وقت مطلع نہیں کیا کرتے۔

تاریخ مقررہ نزدیک آتی جاتی تھی۔ منگل کی شام یعنے ۲۶ تاریخ کو کوئی خاص بات پیش نہیں آئی۔ لیکن سہ پہر کو ۳ بجے کے قریب ایک لڑکے نے آکر گھنٹی بجائی۔ اور یہ تار حوالہ کیا۔

"سامان باٹگنولس اسٹیشن پر نہیں پہنچا
براہِ عنایت کل رات تک جملہ سامان
تیار رکھئے گا۔ آرسین لوپن"

پھر ایک مرتبہ بیرن کاہن کے حواس باختہ ہو گئے۔ اور وہ یہانتک بوکھلایا کہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا۔ مناسب ہوگا۔ کہ میں اُس کے سامنے شکست تسلیم کر لوں۔ اور بلا تامل اُس کی خواہشات کو پورا کر دوں۔

وہ افتاں وخیزاں کاڈبک پہنچا۔ گینمارڈ ایک سفری سٹول پر بیٹھا ہوا اُسی معمولی انداز سے مچھلی کے شکار میں مصروف تھا۔ بیرن نے زبان سے ایک لفظ کہے بغیر وہ تار اُس کے سامنے پھینک دیا۔

گینمارڈ نے کہا۔ "بہت خوب!"

"یہ جی۔ وہی کیا۔ کل کا دن مقرر ہو گیا۔"

"یہ آخر ہے کیا لغویت؟"

"سرقہ۔ نقب زنی۔ میرے نوادر کی چوری۔"

گینمارڈ نے بیرن کی طرف مُنہ کر کے اپنے ہاتھوں کو سینہ پر رکھ کر عجب انداز بے صبری سے پُوچھا۔

"کیوں جناب، کیا واقعی آپ کا یہ مطلب ہے کہ مَیں اس بیوقوفانہ ومجنونانہ معاملہ میں دست اندازی کروں اور اپنے تفریح کے وقت میں تکلیف اُٹھاؤں۔"

"یہ بتائیے کہ آپ کل کی شب قلعہ میں صرف کرنے کی کیا فیس چارج کریں گے۔"

"ایک پیسہ بھی نہیں۔ آپ مجھے خواہ مخواہ دق نہ کریں۔"

"اجی آپ رقم کا نام لیجئے۔ مَیں متمول اور بہت دولتمند شخص ہوں۔"

ان الفاظ نے گینمارڈ کے حواس بجا کر دئے۔ اور اب اُس نے ذرا زیادہ سنجیدگی سے کام لیکر کہا۔

"مَیں جناب سررِشتہ رخصت پر ہوں۔ اور مجھے کوئی حق نہیں کہ اس کا کسی کو علم تک نہ ہوگا۔ مَیں بہرصورت خاموشی اختیار کرونگا۔"

"اوہ، کچھ بات بھی تو ہو۔"

"خوب! اچھا دیکھئے۔ تین ہزار فرانک کافی ہونگے۔"

چیف انسپکٹر نے ناس کی ڈبیا نکالکر ایک چٹکی لی۔ ذرا دیر سوچا اور کہنے لگا۔

"خیر جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن مَیں یہ کہدینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ اپنی رقم برباد کر رہے ہیں۔"

"کچھ پروا نہیں۔"

"ایسی صورت میں تو...... ہاں.... اس کے علاوہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ لوپن سے کیا معاملہ پیش آتے ممکن ہے کہ وہ ایک زبردست گروہ کے ساتھ آتے۔ اچھا یہ تو بتائیے کیا آپ کو اپنے نوکروں پر اطمینان ہے۔"

"جی ہاں.... نہیں"

"بس۔ مَیں سمجھ گیا۔ ہم کو ان پر قطعی اعتبار نہیں کرنا چاہیئے مَیں تار دیکر اپنے دو خاص آدمیوں کو بُلاتا ہوں جنکی موجودگی سے ہمارا پلہ بھاری ہو جائیگا۔ اچھا تو اب آپ جائیں۔ ہم کو زیادہ اکٹھا نہیں رہنا چاہیئے۔ بس کل شب کو ۹ بجے ٹھیک۔"

(۴)

دوسرے روز صبح کو یعنے آرسین لوپن کی مقرر کردہ تاریخ کو بیرن کاہرن نے اپنے اسلحہ خانہ کا معائنہ کیا۔ اور چند نادر پستول نکالے۔ بعدازاں قلعہ ملاکس کے چاروں طرف گھوم گھوم خوب اچھی طرح دیکھا بھالا۔ مگر کوئی خاص مشکوک بات نظر نہ آئی۔ شام کو ۹½ بجے اس نے اپنے نوکروں کو سونے کی اجازت دیدی۔ یہ لوگ شاہراہ کے مقابل ایک گوشہ میں سویا کرتے تھے لیکن یہ گوشہ کچھ پیچھے ہٹکر قلعہ کے داہنے پہلو سے قطعی ملا ہوا تھا۔ بیرن نے تنہا ہوتے ہی بہت آہستگی سے چاروں دروازے کھولے اور ذرا ہی دیر بعد اُسے قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی۔

گینمارڈ نے آتے ہی اپنے دو مددگاروں کا بیرن سے تعارف کرایا۔ یہ دونوں بہت ہی مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کے تھے۔ ان کی گردنیں بہت ہی بھاری بھرکم تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی قوت اپنی تعریف آپ کر رہی تھی قلعہ کی نسبت کافی معلومات بہم پہنچانے کے بعد گینمارڈ نے بہت احتیاطت اُن تمام راستوں کو بند کر دیا جو خاص کمروں تک پہنچنے میں مدد دے سکتے تھے۔ اُس نے ہر دیوار کا امتحان لیا۔ ہر پردے کو اُٹھا کر دیکھا۔ اور آخر کار اپنے دو مددگار سراغرسانوں کو درمیانی گیلری میں بٹھا دیا۔ "دیکھو ذرا بھی شور نہ ہو۔ سمجھ گئے۔ تم یہاں سونے کے لئے نہیں بلاتے گئے ہو۔ ذرا بھی کھٹکا ہو فوراً صحن کی جانب کی کھڑکی کھول کر مجھے آواز دینا۔ ہاں ذرا پانی کی طرف بھی نگاہ ڈالتے رہنا۔ تیس فٹ بلند چکنی چٹان آرسین لوپن ایسے ماہرِ فن بدمعاش کے لئے چنداں مزاحمت پیدا نہیں کر سکتی۔"

اُس نے اُن دونوں کو وہیں بند کر کے کنجی اپنے قبضہ میں کی اور بیرن کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا اب ہم کو اپنی اپنی جگہ پر چلنا چاہئے۔"

اُس نے اپنے لئے رات گزارنے کی بہترین جگہ تلاش کر لی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ جو دونوں صدر دروازوں کے درمیان واقع تھی کسی زمانہ میں شاید یہ پاسبان کے لئے وقف ہو گی۔ اس میں ایک چھوٹا سا روزن پل کی جانب تھا اور دوسرا صحن کی جانب اور ایک گوشہ میں ایسا ڈھیر سا تھا۔ جو بادی النظر میں کسی دیوار کا سرا معلوم ہوتا تھا۔

حضور بیرن صاحب آپ نے مجھ سے کہا تھا یا شاید نہ کہا ہو۔ کہ یہ کنواں ہی صرف زمین دوز سرنگ کا واحد راستہ ہے۔ اور یہ بہت مدتوں پہلے بند کیا جا چکا ہے۔"

"ہاں"

"لہٰذا تا وقتیکہ اس کے علاوہ اور کوئی خاص راستہ ایسا نہ نکل آئے۔ جس کا علم سوائے آرسین لوپن کے اور

کسی کو نہیں۔ (اگرچہ یہ باور کرلینا ذرا مضحکہ خیز بھی ہے)
اُس وقت تک ہمیں ہراساں ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

اُس نے تین کرسیاں ایک ہی قطار میں رکھیں۔ اور بڑے آرام سے پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔ جیب سے پائپ نکالکر سُلگایا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہنے لگا

" جناب بیرن صاحب اگر مجھ سے پوچھئے تو مَیں چاہتا ہوں کہ مَیں اپنے اُس مکان کے متعلق جس میں مَیں اپنی زندگی کے باقی ایام گزارنا چاہتا ہوں۔ ایک اور چھوٹی سی کہانی گڑھ لوں۔ ورنہ یہ معمولی سا کام میرے لئے ناقابل برداشت ہو جائیگا۔ مَیں اپنے دوست آرسین لوپن سے جس وقت یہ پُرلطف حکایت بیان کرونگا تو مجھے ڈر ہے کہیں ہنستے ہنستے اس کا پیٹ نہ پھٹ جائے۔ واقعی"

بیرن کے چہرہ پر قطعی ہنسی نہ آئی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر ہر لحظہ بڑھنے والی بے چینی کے ساتھ خاموشی میں کھٹکے کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھا۔ گاہے گاہے وہ کنوئیں پر جھک کر اُس کی تاریک گہرائی میں متفکرانہ نگاہیں ڈالنے لگتا۔

گھڑی نے گیارہ بجائے، پھر بارہ، اور ایک۔
یکدم اس نے گینمارڈ کا شانہ پکڑلیا جو چونک کر اُٹھ بیٹھا۔

"کیا تم نے کچھ سُنا؟"

"ہاں، ہاں"

"یہی کہ مَیں خراٹے لے رہا تھا۔"

"نہیں نہیں جی۔ ذرا سُنو۔"

"اوہو، ہاں یہ تو موٹر کی گھنٹی معلوم ہوتی ہے۔"

"خوب"

"بھئی واللہ۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ آرسین لوپن موٹر پر سوار ہو کر یہاں آئے۔ اور نہ وہ کوئی جنگی موٹر اپنے ساتھ لا سکتا ہے۔ اُسے آپ کے قلعہ پر گولہ باری کرنا تو مقصود نہیں۔ حضور والا بیرن صاحب آپ بھی خوب انسان ہیں۔ اگر آپ کی جگہ مَیں ہوتا تو خاموشی سے سوتا۔ اچھا تو کمترین کو ذرا اور سو لینے دیجئے۔ بس تسلیم۔"

(۵)

بس اگر کوئی غیر معمولی بات پیدا ہوئی تو صرف اتنی کہ گینمارڈ نے پھر خراٹے لینا شروع کر دیا بیرن کو سوائے اُس کے خراٹوں کے اور کوئی خاص آواز نہ سُنائی دی۔

صبح ہوتے ہی دونوں اس کمرے سے نکلے صبح کا سہانا سماں۔ ساحل کا خنک اور تازگی بخش سکون تمام قلعہ پر مسلط تھا۔ بیرن کا ہرن، خوشی سے باغ باغ، اور گینمارڈ حسب معمول نہایت سنجیدگی کے ساتھ زینہ پر

چڑھے۔ نہ کسی قسم کی آواز تھی۔ نہ کوئی مشتبہ بات۔

"حضور والا، بیرن صاحب، دیکھئے۔ میں نہ کہتا تھا۔ مجھے ایسے معمولی کام میں واقعی ہاتھ نہ ڈالنا چاہیے تھا اب مجھے خود شرم سی معلوم ہو رہی ہے۔"

اُس نے جیب سے کنجی نکال کر گیلری کا دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہے۔

کہ دونوں کرسیوں پر اُس کے مددگار ہاتھ لٹکاتے بضعف جسم پیچھے کو ڈھلکائے۔ خوابِ خرگوش میں پڑے ہوئے ہیں انسپکٹر نے گرج کر کہا۔ "ہائیں، یہ ان دونوں کو کیا ہُوا۔"

عین اس موقعہ پر بیرن کے مُنہ سے ایک چیخ کی آواز سُنائی دی۔

"ہائے، وہ تصاویر! وہ نوشت وخواند کی میز"

اُس کی زبان میں لکنت آگئی۔ اور وہ برہنہ دیواروں کی خالی کھونٹیوں اور تاروں کی طرف دستِ حسرت پھیلا کر رہ گیا۔ واٹیو اور روبن کی دونوں تصاویر غائب تھیں۔ پردے صاف، شیشے کے خانے چیزوں سے خالی نظر آ رہے تھے۔

"آہ، میرا، لوئی شانزدہم والا شمعدان... وہ ایجنٹ والا فانوس۔ اور بارھویں صدی والی حضرت مریم کی تصویر...."

وہ دیوانہ وار فرطِ مایوسی سے کبھی ادھر جاتا کبھی اُدھر پہنچتا۔ رنج اور غُصّہ سے بیتاب ہو کر اُس نے ہر ایک کی قیمت لکھی۔ اور نقصانات کی رقومات جوڑیں۔ ایک کے نیچے دوسرا عدد۔ ہر ایک کو زبان سے باآواز ادا کرتے ہُوئے، وُہ عجیب مہمل الفاظ بک رہا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں زمین پر مارے اور بیتاب ہو کر گر پڑا۔ مختصر یہ کہ اُس کی ہر حرکت سے ایک ایسے برباد شدہ شخص کے جذبات عیاں تھے۔ جسے اپنا مال ومتاع برباد کر کے سوائے خودکشی کے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آتا ہو۔

اگر کوئی بات اس کے لئے باعث تسکین تھی، تو صرف یہ کہ وہ گینمارڈ کی شرم اور خفت، رونی صورت اور بوکھلاہٹ دیکھ کر اپنا سارا غم بُھول جاتا۔ گینمارڈ بُت بنا کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے ہُوئے انتہائے حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اُسنے ہر چیز کا امتحان لیا۔ کھڑکیاں؟ سب بند۔ دروازوں کے قفل؟ کسی نے چھُوئے تک نہ تھے۔ چھت میں شگاف تک کا نام نہ تھا فرش میں سوراخ تک غائب۔ الٰہی کیا ماجرا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر قائم تھی۔ اور تمام کارروائی کچھ ایسے پُر اسرار طریق پر عمل میں لائی گئی تھی کہ عقل حیران تھی۔

(باقی آئندہ)

شمیم بلہوری

مہربان

گذشتہ سے پیوستہ

خوف تھا کہ کس طرح اس نحیف ونزار جسم کے ساتھ اپنی اس
لطیف زندگی کو قائم رکھ سکونگا۔ آہ ڈرتا تھا کہ کس طرح اسقدر
ضعیف دل کے اندر محبت جیسی امانت کو جگہ دے سکونگا۔
اس خیال سے بےچین ہو جاتا تھا۔ کہ کس طرح ان حسین دِ
جاذبِ نظر مناظر، ان صاعقہ بار اور بجلیاں گرانے والی نظروں
کا متحمل ہو سکونگا۔ مگر دیکھتے ہو کس طرح، کس کامیابی کے ساتھ
میں نے اب تک اپنے کو سنبھالے رکھا۔ دل جو لرز اُٹھتا
تھا۔ جو خوف سے کانپ اُٹھتا تھا۔ اب گویا ان سختیوں کا
عادی ہو گیا۔ آہ دل اتنا کمزور تھا کہ پارسال —— ہائے
تمہیں ابھی تک شاید معلوم نہیں —— جب میری منجھلی بہن
کا بڑی چھٹیوں میں تین گھنٹہ میں خاتمہ ہوا ہے، وہ بہن جو
بہنوں میں مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ بہن جو صرف
ایک سال اپنی شادی شدہ زندگی کا لطف اٹھانے پائی
اور ایک تین ماہ کا بچّہ اپنی یادگار چھوڑ گئی۔ آہ وہ بہن جو میں
جانتا ہوں اپنے معتقدات وعمل میں ہم سب سے زیادہ بلند وبرتر
ایک ہستی تھی۔ آہ جب اُس کا میرے سامنے، میری گود
میں اس حالت میں کہ ایک نبض حکیم کے ہاتھ میں اور دوسرا
ہاتھ میرے ہاتھ میں انتقال ہوا ہے جب وہ دم توڑتے
توڑتے بھی ایک لفظ نہ کہہ سکی اور گھر بھر کی "باجی، باجی،
بیٹی بیٹی" کے جواب میں نظروں نظروں میں بھی کچھ نہ کہہ سکی۔
آہ جب اس کا انتقال ہوا ہے میں خوف وصدمہ سے
لرزتا تھا۔ کہ کہیں میرا کمزور جگر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے
میرا دل اس جاں فرسا کوہِ الم سے کہیں پھٹ کر پارہ پارہ
نہ ہو جائے۔ مگر آہ بے غیرت ہے، بے شرم ہے، دل
سخت ہے۔ دیکھتے ہو میں زندہ ہوں۔ وہ غم ورنج جو
اُس شب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر میری حیات کے
ہر ماضی ومستقبل رُخ پر پوری طرح چھا جائیگا۔ میرے
وجود کو اپنے بے تھاہ عمق میں جذب کر لیگا۔ آہ وہ غائب
ہو گیا، اس طرح کافور ہو گیا۔ جس طرح آسمان پر ابر کے
غلیظ ٹکڑے دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا والوں پر بغیر ایک قطرہ
برسائے غائب ہو جاتے ہیں۔ اب میں ہوں، کوئی رنج
نہیں، دل ہے کسی قسم کا بوجھ نہیں، بھول گیا، محو کر دیا
کسی نے یاد رکھا ہے۔ جو یہ یاد رکھتا۔ آہ تم نہیں سمجھتے،
دِل کیسا سخت واقع ہوا ہے ...... "اب بے اختیار

اپنی آنکھوں کی چمک سے میری نظر کو خیرہ کر کے اپنی
آنکھوں کے قطرۂ اشک کی چمک سے میرے سخت دل
پر بجلی گرا کے، اپنے انداز بیان کی سحر کن و تاثر زا کیفیت
سے میرے قلب کو پارہ پارہ کر کے رُک گیا۔ جیب سے
رومال نکال کر ٹھنڈی سانس بھری۔ اور کانپتے ہُوتے
ہاتھوں سے اُس نے آنسو پونچھے اور اپنی جگہ سبزہ پر اپنے
جسم کو دراز کر کے پڑ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ کم بولتا تھا مگر جس زمانہ میں
وُہ بولنے پر اُتر آتا یعنی اُس کے ذوقِ نظر کا سامان یا طبیعت
کے اُکسانے والی چیزیں مہیا ہوتیں تو اس کا اظہار بے تکان
اور بے امان ہوتا تھا چپ اسی وقت رہتا تھا جب اُس
کو اُلجھنے کی کوئی چیز نہ ملتی، جب وہ اپنی جراحت کا کوئی
سبب نہ پاتا۔ مگر جہاں اُسے اس قسم کی کوئی صحبت میسّر
ہو جاتی جس کے لئے پیدائش کے دن سے آج تک وہ
بیتاب تھا تو وہ کبھی چپ نہ بیٹھتا، آج جس پُرسحر طریقہ
سے اُس نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا تھا یہ
میری زندگی ہم دونوں کی دوستانہ زندگی میں پہلا موقع
تھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے اس تسلسل و روانی سے
گفتگو کرتے ہُوئے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مگر میں ابتک یہ نہ
سمجھا کہ اس موقع پر اسے کس طرح اس موت کا حادثہ
یاد آ گیا۔ قلعہ کی سیر سے گویا اُس کے زخموں پر ایک ٹھیس
لگی، دل کی سختی کا ذکر کر رہا تھا کہاں سے کہاں موت کا
قصہ لے بیٹھا، مجھے اس وقت اس سے بہت ہمدردی
ہو گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنے جسم کو حرکت دی۔
میں کچھ تلقین صبر کے سلسلہ میں کہتا مگر اُس کی فطرت کا
رازدار ہونے کی وجہ سے میرا کچھ نہ کہنا ہی بہتر تھا، یہ معلوم
تھا کہ زیادہ سے زیادہ یہ واقعہ اُسنے برسبیلِ تذکرہ اپنے
بیان کی تائید میں پیش کر دیا ہے۔ اور بس، اگر میں اُسے
کچھ نصیحت کرنے بیٹھتا تو وہ میرے خیالات کی اصلاح
کرنے میرے شکوک زائل کرنے کی کوشش کرتا اور
پھر ایک بے تکان اور بے تکی بحث چھیڑ دیتا، اس لئے
میں چپ رہا۔

"پھر!" مجھے امید نہ تھی کہ اتنی طولانی تقریر کے
بعد اب اس میں کچھ اور بولنے کی سکت باقی ہے۔ مگر یہ
کہتے ہُوئے اُس نے میرے خیال کو باطل ثابت کرنا شروع
کیا۔ "قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے یقین جانو میرا دل اس
خیال سے کانپ رہا تھا کہ کس طرح میں ان "در و دیوار
شکستہ" اس "بزمِ رفتگاں" کے دید کی تاب لا سکونگا۔
لیکن ان توہمات پر میں کامل طور پر غالب آ گیا۔ دل اسقدر
سخت چیز ہے کہ ان سے زیادہ دلخراش مناظر کی تاب

لے آئیگا۔ آہ ان روشوں پر، اس چار دیواری کے چپہ چپہ
پر جب مَیں قدم ڈالتا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا
دِل ڈُوب جائیگا۔ ضعیف دِل اس سنسان اور وحشتناک
ویرانی کی تاب نہ لاسکیگا۔ جو آج یہاں برس رہی ہے
آہ جب مَیں نے دیوانِ عام کے اُس منقش مرمریں تختِ جلوس
پر جس پر کبھی شاہانِ مغلیہ، عیش و تنعم کے خمار میں چور
جلوہ افروز ہوتے ہونگے۔ بخت و کامرانی جنکا استقبال
کرتی ہوں گی، آج ایسی ناکارہ ہستی ایسی ناپاک و خبیث
ہستی کو پایا جیسی کہ میری ہستی ہے تو مَیں لرزہ بر اندام ہوگیا
جب اس قصرِ ارم میں جو " فردوس بر روئے زمیں " کے
نام سے بجا طور پر مشہور ہے، مَیں نے ایسا المناک تماشا
دیکھا جیسا کہ مَیں جب ان روشوں، آہ، ان روشوں کے
ذرّہ ذرّہ پر جن پر ایک وقت ہوگا۔ کہ " حوران بہشتی "
مصروفِ گلگشت ہوتی ہونگی۔ آہ، ان خشک اور پیاسی
نہروں، ان سبزہ کیاریوں کے کنارے جہاں کون کہہ سکتا
ہے کہ کبھی عشق و محبت کی غیر مختتم داستانیں، جہاں
حسن و زیبائی کے سچّے مجسمے زیبِ محفل ہوتے ہونگے
آہ غور کرو۔ ان چار دیواریوں کے اندر جہاں آج چند
بلا کی حسین، برق رفتار فتنہ ہائے مجسم نازنینیں جو کبھی
خواب میں کنیزیں بن کر بھی یہاں آنے کا حق نہیں رکھتی
ہیں۔ دیکھنے والوں کے دلوں کو پیسے ڈالتی ہیں، آہ یہاں
جب مَیں نے اپنے کو پایا تو مَیں ٹھٹھر گیا اور معلوم ہوتا تھا کہ
میری رُوح جسم سے جُدا ہو جائیگی۔ میرا دل گویا ان مناظر میں
جذب ہو کر اپنی حرارت کو کھو بیٹھیگا۔ مگر دیکھتے ہو دل موجود
ہے۔ اسے کوئی ضرر نہیں پُہنچا۔ وہ ان سب چیستانوں کی
پُرہیبت و جلال عظمت کو ایک لمحہ میں ڈرتا ڈرتا نظروں
میں طے کر گیا۔ اور زندہ ہے۔ مرا نہیں، خوف نہیں کھاتا
اُن تمام لرزشوں اُن تمام خوفناک توہمات کے باوجود
اس سے قبل میرے قلب میں پیدا ہو رہے تھے۔ اُن
سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو چکا اور کون کہہ سکتا ہے کہ
کہ اِس میں کمزوری کا ایک ذرا سا بھی شائبہ ہے۔
بہادر نوجوان، طاقتور و توانا انسان اس سے زیادہ اور
کیا کرسکتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کرسکنے کا حق رکھتا
ہے ..... ؟ "

اب مَیں سمجھا وہ میرے رات کے سوال کا تفصیلی
جواب دے رہا تھا۔ اپنی گفتگو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔
مگر خدا معلوم کس رو میں اُس نے میرے چہرہ کی طرف
پھر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ گویا اس بات سے
خوش ہو کر کہ وہ اس مرتبہ اپنی قوتِ بیانیہ سے کامیاب
ہو کر اپنی گزشتہ شب کی شکست پر فتح حاصل کر چکا ہے
مجھ پر ایک پُر رعب نظر گاڑنا چاہتا ہے۔

غرض اُس کی گفتگو ہمیشہ اسی قسم کی ہوتی جس سے

اس کے دوست لطف اُٹھاتے تھے اور اگر وہ غلطی پر بھی ہوتا تو وہ اپنی شکست کا اعتراف کرنے میں کبھی پس وپیش نہ کرتے ورنہ خوف تھا کہ وہ سہم کر کہیں اپنی ان نازک حسیات کی لطیف نہر کو اپنی شرم و حجاب کی چٹانوں میں لاکر روک نہ دے۔ آج کی صحبت میں مجھے اُس سے ایک نئی محبت پیدا ہوگئی جو شاید اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

ایک شام مغرب سے کچھ پہلے ہم دونوں نمائش میں پہنچے۔ ٹکٹ خرید کر مَیں چاہتا تھا کہ سب سے پہلے اس "چار ہاتھ چار پاؤں اور دو سر والی لڑکی" کو دیکھوں جو مدراس سے آئی تھی۔ مگر مہربان کی رائے ہوئی کہ پہلے ہوٹل میں چلکر چائے پی جائے۔ بیرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ ایک دُکان کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگا۔

"دیکھتے ہو وہ سامنے دُکان ہے وہاں دیکھو!

کیا دکھا رہا تھا مَیں ابھی تک نہ سمجھا تھا۔

اس نے پھر ایک طرف کو اُنگلی اٹھائی، اور اشارہ کیا۔

سامنے کی دُکان پر جو بریلی کے مشہور فرنیچر والے "مختار برادرس" کی تھی۔ ایک لڑکی کھڑی تھی۔ مسہریوں، میزوں، کرسیوں اور بڑے بڑے صوفوں کے درمیان سجی ہوئی، وارنش کی چمک سے آنکھ کو خیرہ کر دینے والی ایک بڑا جلی آئینہ لئے ایک سنگار کی میز تھی، برقی روشنی اس آئینہ پر پڑ رہی تھی۔ جس کا عکس لڑکی کے چہرہ پر پڑکر اُس کے سفید خوبصورت رنگ کو ایک حسین وجاذب اُس کے کافوری، گورے گورے گالوں کو ایک شفاف رنگ لطافت بخش رہا تھا۔ ایک پیازی رنگ کی ریشمی ساڑی جس پر بڑے بڑے سنہرے ٹپے اور پھول تھے۔ اُس کے نازک اور دُبلے پتلے جسم کو چھپاتے تھی ایک آنچل سر سے اُوپر جاکر اُس کی بائیں بغل کے اندر ہوتا ہوا اُس کے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ جس کا پّلو وہ کبھی کبھی آئینہ میں دیکھ کر دانتوں کے نیچے دبا لیتی ایک چُست سفید مخمل کا شلوکہ جس پر سچے سلمہ ستاروں کا کام تھا اس کی کہنیوں تک جاکر ختم ہوگیا تھا۔ آستین پر گنگا جمنی رنگ کے سچّے تار جھالر کی طرح جھل جھل ہوتے اور ہاتھ کی ہر جنبش کے ساتھ برقی قمقموں سے چھن چھن کر برسنے والے نور سے کسب فروغ کرتے، کبھی برقی روشنی کی چھلکتی ہوئی موجوں سے مقابلہ کرتے کرتے، اُن کی تاب لاتے لاتے تڑپ کر رہجاتے اونچی ایڑی کا سیاہ رنگ کا جوتا جو اس کے سفید موزوں میں لپٹے ہوئے پیروں کو اچھی طرح چمٹ چمٹ کر بوسے دے رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ صرف اسی کے

پیروں کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا اس کے کپڑوں کو ایک لطیف سرسراہٹ بخش رہی تھی۔ وہ نا طورۂ جمال اس طرح وہاں کھڑی آئینہ میں اپنے حسن کی سحر کاریاں دیکھ دیکھ کر مبہوت و ششدر ہو رہی تھی۔ آئینہ میں اپنے عکسِ حُسن کی سحر کاریوں کو مبہوت و ششدر دیکھ دیکھ کر اور زیادہ ششدر تھی۔ اور اس کی ہر نظر جو آئینہ پر پڑتی اُسے زیادہ ششدر و مبہوت کرتی جاتی۔

مہربان نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا اور اب میں نے دیکھا۔ یہ منظر اسقدر دلکش تھا کہ میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مہربان کے چہرہ پر چمک آگئی اور آنکھوں میں مسرت کی روشنی گویا جس چیز کا وہ بھوکا تھا اُسے مل گئی۔

"دیکھتے ہو اس لڑکی کو دیکھتے ہو۔" اُس نے شروع کیا۔ "یہ فریب کاریاں کس لئے کی جا رہی ہیں؟ اس لئے کہ میری طرح کوئی مجنون ان سے لطف اُٹھائے ......"

"اُسے تو تمہاری خبر بھی نہ ہوگی۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں اُسے میری خبر بھی نہ ہوگی۔ مجھے اس کی خبر ہے۔ آہ جب تک میری خبر نہ ہو اچھا ہے۔ جانتے ہو عورت اپنے حسن سے اپنی اداؤں سے تنہائی میں اسی طرح لطف اُٹھاتی ہے جس طرح یہ سامنے کی دُکان پر لطف اُٹھا رہی ہے۔ اُسے میری خبر نہیں ہے۔ اُسے کسی کی خبر نہیں ہے۔ اور اگر کہیں خبر ہو جاتی کہ اُس کی خواہش کسی کے دل میں پیدا ہو گئی۔ اگر کہیں اُسے محسوس ہو کہ کوئی اسکی کافر اداؤں پر دم توڑ رہا ہے تو وہ فوراً جان لینے کو تیار ہو جائیگی جان لے لے گی، معصوم، بہت بھولی، آہ، دور سے یہ خلعت ایک رنگین غبار میں گھری ہوئی ایک رنگین فضا میں پھُدکنے والی ایک رنگین اور مبہم روشنی میں تیرنے والی ایک تیتری، ایک خوبصورت ننھی سی رُوح ایک بھولی چیز معلوم ہوتی ہے، انجان، الھڑ، گویا دُنیا میں دُنیا کی ہر روش ہر جھگڑے سے دُور کچھ نہ سمجھنے والی، کسی کو آزار نہ پہنچانے والی، ایک خوشبودار ہستی ہے۔ مگر یہ علم ہونے پر کہ کوئی شخص اُس کا خریدار ہے یہ خلعت غبار نہیں، خوشبو نہیں، ایک رنگین اور مبہم روشنی میں تیرنے والی تیتری نہیں بلکہ خاردار قدم قدم پر آزار پہنچانے والی، اُس شخص کے دِل پر، جگر پر، اُس کے جسم پر رُوح پر اُس کی پُوری ہستی پر آبلے ڈالنے والی ایک آگ بن جاتی ہے۔ اُس میں سے شعلے نکلتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ سحابِ رنگیں سے ہلکی ہلکی پھوار برس رہی ہے۔ اُس

اب اس آخری مرتبہ دیکھ کر اُس کے لبوں پر ایک خفیف سی
مُسکراہٹ بھی دوڑنے لگی۔ اور اُس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔
پھر تو یہ ہوا کہ اُس کی نگاہ سوائے مہربان کے کسی پر نہ ٹھہرتی تھی۔ سہیلی کے کان
میں کچھ کہہ کے وہ پھر مہربان کو دیکھ لیتی۔ اب گویا دونوں طرف
سے باتیں ہو رہی تھیں۔ مہربان کی نظروں کا وہ جواب
دے رہی تھی۔ اور اُس کی نگاہوں کا جواب مہربان دے
رہا تھا۔ میں نے مہربان کے چہرہ پر نگاہ ڈالی جو خوشی سے
تمتما رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ عورت ہٹ گئی۔ ہجوم کے ریلے
میں کہیں بہ گئی اور مہربان نے ہر چند اُسے تلاش کرنے
کی کوشش کی مگر وہ نہ ملی۔ میں مایوس ہو چکا تھا مگر مہربان
کو امید تھی۔ کہ وہ ضرور ملے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ بہت دیر
کی تلاش و جستجو کے بعد وہ پھر ملی۔ اور کچھ دیر تک صرف
نگاہوں میں باتیں ہونے کے بعد مجمع کی ریل پیل میں
پھر غائب ہو گئی

تین گھنٹہ کے قیام و تفریح میں وہ اس طرح کئی
مرتبہ ملی اور جُدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ہر ملاقات میں رفتہ
رفتہ یہ معاملہ طول پکڑتا گیا۔ کیونکہ اب ایک طرح کی
یگانگت ہو گئی تھی۔ اور وہ دوشیزۂ بہار و لطافت مہربان
کو ہر مجمع میں تلاش کرتی تھی۔ اُسی طرح جس طرح مہربان
ہر ہجوم میں اُسے دیکھتا، یہانتک کہ ہم دونوں واپس
چلنے لگے تو مہربان نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے پیچھے
آرہی ہے۔ پھاٹک پر میں مہربان سے چند منٹ کے
لئے علیحدہ ہوا کہ پاس کی دُکان سے پان اور سگار خرید
لوں۔ مہربان پھاٹک پر کھڑا اُس کا اور میرا منتظر رہا۔ وہ
ایک درخت کے نیچے مہربان سے کچھ فاصلہ پر ٹہل رہی
تھی۔ سردی کی وجہ سے اس نے سیاہ کھال کا اُورکوٹ
اپنے اُوپر ڈال لیا تھا۔ جس میں وہ پری پیکر ایک فتنۂ جادو
معلوم ہوتی تھی۔

میں واپس ہوا تو مہربان راستہ میں ملا۔

"جلد آؤ" میں اُس کے پاس سے ہو کر اُسے
یہ دکھا کر کہ میں ادھر آرہا ہوں تمہارے پاس آیا ہوں
وہ ضرور اب بھی کھڑی ہو گی!"

"تم آئے کیوں؟"

"آہ، میں اُس کے پاس سے ہو کر نکلنا چاہتا تھا"

اب ہم دونوں اپنی جگہ واپس آگئے۔ مگر
وہ غائب تھی۔ اور اس مرتبہ ہزار جستجو کرنے سے بھی نہ
ملی، مایوس ہو کر اور اپنے دلوں پر سنگِ سخت رکھ کر
ہم ہوٹل آئے۔ "کاش میں جگہ سے نہ ہلتا، اُس کا پتہ
معلوم کرتا۔"

مہربان اپنی غلطی پر سخت نادم تھا۔ مجھ سے اس
کی پاداش دریافت کرتا تھا۔ اُسے سخت اُلجھن تھی۔

رات بھر وہ مضطرب رہا۔ مَیں جانتا تھا۔ کہ اسی طرح وُہ خدا معلوم کتنے معصوم چہروں کی پرستش کر چکا تھا۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ یہ نقش بھی باطل ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ زائل ہو جائیگا۔ لیکن مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہُوا کہ روز بروز اُس نقش میں پائداری آتی گئی اور مہربان سخت مغموم رہنے لگا۔

ہم نے چار دن اور قیام کیا اور روز شام کو تماشہ جاتے۔ مگر باوجود ہماری آنکھوں کے انتہائی تجسس کے وہ پری پیکر پھر ایک دن بھی نظر نہ آئی۔ خدا معلوم کہاں غائب ہوگئی۔

مہربان کو تسلّی دینے کے لئے ایک دن دوپہر کے وقت جب ہم کھانا کھا کر چائے پی رہے تھے۔ مَیں نے سلسلۂ کلام یوں جاری کیا۔

"تم نے مجھے خوب تجربہ کرایا۔ عورت کے متعلق جو خیالات تم نے ظاہر کئے تھے عملاً اور فعلاً مَیں نے آنکھوں سے دیکھ لئے۔ یہ تمہاری اسی شعریت کا نتیجہ ہے۔ کہ اس وقت اس کرب میں مبتلا ہو!"

میرے فقروں نے جو دراصل اسکے اندمال زخم کے لئے کہے گئے تھے۔ اُس کی آگ پر پانی کے چھینٹوں کا کام کیا۔ اس میں سے دُھواں نکلنے لگا! مگر یہ آگ سرد پڑ کر اور زیادہ تیز ہوگئی۔ اور اب انگارے اور زیادہ تیزی سے سلگنے لگے۔ اس کے چہرہ کا رنگ سُرخ ہوگیا۔

"تم مجھ سے بیزار نظر آتے ہو" اُس نے شروع کیا۔ "شعریت! کتنے ہو شعریت ایک طلسم ہے۔ دھوکا ہے، زندگی کے اس ناپیدا کنار سمندر میں ایک تنکا ہے جو ایک ہلکی سی تھپیڑ میں غائب ہو جائیگا۔ لیکن سچ کہو زندگی کیا چیز ہے۔ خود زندگی ایک طلسم نہیں، ایک دھوکا نہیں، پھر کہا تنک۔

"بات یہ ہے کہ......"

"کچھ نہیں" اُس نے غصّہ ہو کر میرے فقرے کو کاٹ کر کہا۔ "زندگی ایک طویل لمحۂ خواب ہے۔ جس طرح ہم سو جاتے ہیں اور عالمِ رویا میں جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے عین حقیقت سمجھتے ہیں۔ سوتے میں، خواب کی حالت میں ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں اسی طرح اس طویل خواب میں جسے ہم زندگی کہتے ہیں ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ کہ یہ واقعی ایک خواب ہے جب مرتے دم ہماری آنکھ کھلے گی تو ہمیں یاد آئیگا کہ ہم کسی جگہ سے چلے تھے۔ اُسی جگہ پہ اب ہیں۔ کسی عالم میں تھے اُسی عالم میں اب آگئے۔ اور یہ صرف ایک خواب تھا۔ زندگی کچھ نہیں، پھر اس خواب، اس دھوکے، اس طلسم کے پیچھے

تم اس بُری طرح تباہ ہو اور مجھے الزام دیتے ہو' انسان'
کج فہم انسان نہیں سمجھتا کہ زندگی کیا ہے، رہنے کیلئے،
بہت قلیل عرصہ تک رہنے کے لئے وہ زبردستی فطرت
کے خلاف جنگ کرکے اپنی آزادی کو کھوکر غلام بننا
چاہتا ہے۔ قواعد کی زنجیروں میں رسوم کے جکڑبند
میں خود کو قید کرلیتا ہے۔اور پھر اُس پر ناز کرتا ہے۔
کہ ہم آزاد ہیں۔ ہر فعل کو اپنی آزادیِ رائے سے
نہیں بلکہ جمہور کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔اُس
پر رائے قائم کرتا ہے۔اور پھر دعویٰ کرتا ہے کہ
ہم آزاد ہیں۔ یہ فعل محمود ہے، یہ کام خراب ہے، دُنیا
کی یہ روش نہیں، لوگ کیا کہیں گے۔شعریت ایک
دھوکہ ہے، زندگی میں کام آنے والی نہیں۔انہیں حق
کیا ہے کہ یہ رائے ظاہر کریں۔ دُنیا میں آتے ہو، تو
خبر نہیں ہوتی، تمیز نہیں ہوتی، معصوم بچّہ نہیں جانتا کہ
غم کیا ہے، مسرت کیا ہے۔ وہ روتا بھی ہے تو نہیں
جانتا کہ کیوں، ہنستا بھی ہے تو نہیں معلوم کس لئے۔
وہ دونوں کیفیتوں مختلف و متضاد کیفیتوں کے احساس
سے عاری ہے۔سوچو تو زندگی کو رسوم وآداب میں جکڑکر
تم کسقدر تکلیف دہ بنا لیتے ہو، جو سچّی مسرت یا سچّا
غم اور ان دونوں سے نکلی ہوئی ایک بے نام کیفیت
کا لطف ایک معصوم بچّہ کا دل ایک غیر معلوم طریقہ پر
اُٹھاتا ہے۔وہ تمہیں خاک نصیب نہیں ہوتا۔ اور خود
اپنے ہاتھوں اُن چیزوں کے لطف کو اپنے لئے کھودیتے
ہو، جو زندگی میں تمہیں عنایت کئے گئے ہیں۔یہ معلوم
کرلینے کے بعد کہ دنیا کا راز بڑے بڑے فلسفی
نہیں معلوم کرسکے۔اتنے مذاہب ہیں، اتنے گروہ ہیں۔
مختلف خیالات و معتقدات، ایک دوسرے سے
بیزار دعوے کرتے ہو کہ فلاں مذہب کامیاب ہے
فلاں شخص اچھا ہے۔کس طرح کوئی رائے قائم کرتے ہو؟
جیسے چار آدمی اچھا کہیں، گویا اپنی ودیعت کی ہوئی فطرت
سے اپنے ذاتی جوہر سے کام نہ لیکر دوسروں کی
اندھا دھند نام نہاد حکمت پر عمل پیرا ہوتے ہو،
سوسائٹی کی کیا حالت ہے۔آج ایک بات اچھی ہے
کل بُری سمجھی جائیگی۔ خیالات ہمیشہ بدلتے رہیں گے
جب بُرائی اور اچھائی کا یہ معیار ہے اور ظاہر ہے کہ
انسان کی محدود عقل و بصارت جسے وہ اپنی غلط روی
اور سوسائٹی کے نظریوں کے ماتحت اور بھی محدود بنا
لیتا ہے۔ ہمیشہ نئے بُت تراشا کرتی ہے۔پھر کس طرح
تم لوگ معصوم و جاہل لوگوں کو عقل فراست کے
سبق دیکر گمراہ کرتے ہو۔ دُنیا کی وضع پر جاتے ہو۔
اپنی افتادِ مزاج سے کام نہیں لیتے اور دوسروں کے
بیجا دباؤ میں آکر اپنی آزادی کھو بیٹھتے ہو۔ میں

تمام کارگہ ہستی کو ایک خواب سمجھتا ہوں۔ اسی لئے تو ہر چیز کو خود جانچتا ہوں۔ اور اگر میری عقل اُسے پسندیدہ قرار دیتی ہے کبھی دوسروں سے شکوک نہیں رفع کراتا ذرا غور کرو تھوڑی دیر کے لئے۔ مَیں نے تمہیں اس عالم کی سیر کرائی جس میں اکثر میں رہتا ہوں۔ شعریت جس کا تم اسقدر مضحکہ اُڑاتے ہو۔ اس سے تم کو بھی کچھ دیر کے لئے لطف اُٹھانے دیا۔ اب سچ کہنا اگر تمام عمر اپنی عمر کی ہر سانس اس عالم میں گزارو گے، تو خود کو کسقدر دلکش و مرغوب پاؤ گے ......"

اتنا کہکر رُک گیا اور تھک کر بستر پر پڑ گیا۔ اور اپنی تکان دُور کرنے کے لئے ایک تصویر اُتار لی جو صنعتِ مُصوّری کا ایک اعلےٰ نمونہ تھی، اُسے دیکھتا رہا۔

مَیں اُس کیلئے بیحد تکلیف دہ ثابت ہُوا۔ باقی تمام دن اُس نے کچھ گفتگو نہ کی۔ مَیں نے چاہا، کہ اُسے اُکساؤں مگر اسی خوف سے کہ کہیں وہ پہلے کی طرح ابل کر اپنے خیالات کی رو میں کہیں سے کہیں نہ پہنچ جائے غیر مسلسل و غیر منضبط داستانیں جنہیں فلسفہ سمجھتا ہے نہ سُنانے لگے اور جس کا تکان پھر اتنا ہی صرکچی نہ ہو جیسا کہ اب ہُیں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بہت مغموم رہنے لگا۔

چوتھے دن جبکہ تعطیلات کا آخری دن تھا اور ہم دونوں ۲ بجے رات کو دہلی اسٹیشن کے سکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں ہوڑہ میل کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اُس نے مجھ سے طلبِ عفو کر کے مجھے شرمندہ کیا۔

"مَیں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بیحد ناراض ہو۔ لیکن مجھے معاف کرو کہ چند ہی لمحوں میں ہم جدا ہونے والے ہیں۔"

"شرمندہ نہ کرو۔ مَیں ممنون ہوں کہ تمہارے ساتھ یہ دن اسقدر پُرلطف گزرے۔"

بس اس کے بعد کچھ گفتگو نہ ہُوئی۔ ٹرین آئی ہم دونوں سوار ہُوئے۔ راستہ میں بھی کچھ بات چیت نہ ہُوئی اب وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا تھا۔ اور کوئی چیز الجھاؤ پیدا کرنے والی نہ پاکر بولتے ہُوئے جھجکتا تھا۔ مَیں نے بہت چاہا کہ ریل پر اُس سے گفتگو کروں۔ مگر وہ مغموم سی کیفیت اپنے اُوپر طاری کئے رہا۔ اور سوائے اس کے کہ علیگڈھ اسٹیشن پر جب مَیں اُس سے جُدا ہُوا اُس نے باچشم نم مجھ سے ہاتھ ملاتے ہُوئے "خدا حافظ" کہہ کر یہ شعر ؎

من زبند اے عشقت کاہیدہ تر زگاہم
طاقت کجا کہ چینم گل از رُخِ جوانی

پڑھا اور کوئی بات نہ کی۔

معلوم نہیں اُس کے دل سے یہ آخری نقش بھی فنا ہوا یا نہیں۔شاید نہ فنا ہوا ہو۔لیکن یہ جانتا ہوں کہ کچھ دن اسی طرح بے تکان و بے امان خاموش رہ کر وہ اپنی اس طویل بکواس کا کفارہ ادا کریگا۔اور خود پر انتہائی رنجیدہ کیفیت طاری کر کے اپنی موت کے اسباب پیدا کرلیگا۔ کسی دوسری ملاقات میں شاید وہ اپنے ان تاثرات کو پھر الفاظ کا جامہ پہنانے پر قادر ہو سکے۔

جلیل احمد قدوائی

بادۂ کہن

دل میں قوت ہے کچھ نہ جان میں ہے
زندگی اب فقط زبان میں ہے

ساتھ یاروں کے ہماری راحتِ دل اُٹھ گئی
ایک دو کا ذکر کیا محفل کی محفل اُٹھ گئی

ظلم جتنے ہیں ہمیں پر وہ کئے جاتے ہیں
ہم بھی ایسے ہیں کہ اس پر بھی جئے جاتے ہیں
شیخ کے حق اُٹھا رکھا ہے کیا رندوں نے
ظرف انہیں کا ہے کہ سب کچھ یہ پئے جاتے ہیں

پیارا ہے فقط اللہ کا نام
آرام اسی سے رُوح کو ہے
اور یوں تو حوادث بیحد ہیں
دُنیا میں بہت افسانے ہیں

اکبرالہ آبادی

کبھی مسجد میں جو وہ شوخ پریزاد آیا
پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا
کونسا طائرِ گم گشتہ اسے یاد آیا
دیکھنا بھالتا ہر شاخ کو صیاد آیا
دی موذن نے شب وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کس وقت خُدا یاد آیا

داغ

خارجی و باطنی دُنیا

دو چیزیں ایسی ہیں کہ مَیں اُن پر جتنا زیادہ غور و فکر کرتا ہوں اُتنا ہی زیادہ اُن کی عظمت و سطوت کا رعب میری رُوح پر طاری ہوتا جاتا ہے۔ یہ تاروں بھرا آسمان جو میرے سر پر چھایا ہے، اور یہ اخلاقی قانون جو میرے باطن کی مملکت پر فرمانروا ہے۔

ان دونوں کی نسبت مَیں کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ ایک ایسے پردۂ راز میں پنہاں ہیں جہاں میری عقل کو دخل نہیں یا میری سرحدِ ادراک سے ماورا کسی ایسے طبقۂ دُور و دراز میں ہیں۔ جہانتک میری رسائی ناممکن ہے۔ مَیں اُن کو اپنے سامنے اور بالکل قریب پاتا ہوں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اُنہیں میری ہستی سے بہت قریب کا تعلق ہے۔ کیونکہ مَیں اُن کے بغیر اپنی ہستی کا شعور نہیں کر سکتا۔

تاروں بھرے آسمان سے میرا تعلق اس بناء پر ہے کہ مَیں بھی اور وہ بھی عالمِ محسوس کے دو وجود ہیں۔ اُسکا نظارہ مجھے اپنی ہستی کے محدود دائرے سے نکالکر لامتناہی وسعتوں سے، لاتعداد نظاماتِ موجودات اور اُن کی گردش کے طول طویل سلسلوں سے میرا رشتۂ ارتباط مستحکم کرتا ہے۔

اخلاقی قانون کا شعور میری رُوح، میرے وجودِ باطنی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مجھے ایک ایسی دُنیا میں جگہ دیتا ہے۔ جو حقیقی معنوں میں غیر محدود ہے۔ جس کی ابتدا و انتہا کا سراغ لگانا صرف عقل کا کام ہے، جس سے میرا تعلق محض اتفاقی اور ہنگامی نہیں، بلکہ لازمی اور ابدی ہے۔

جب مَیں تاروں بھرے آسمان اور اُس کی ناپیدا کنار وسعتوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی ہیچ میرزی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے۔ کہ دُنیائے حیات میں مجھے کچھ حیثیت حاصل نہیں! مَیں آب و گل کا ایک پُتلا ہوں اور یہ عناصر جن سے میرے وجودِ جسمانی کی ترکیب ہوتی ہے۔ مَیں نے کُرۂ ارض سے مستعار لئے ہیں۔ جو خود صفحۂ کائنات پر ایک چھوٹا سا نقطہ ہے۔ آخر ایک دن مجھے یہ قرض ادا کرنا ہوگا۔ اور پھر مَیں لاشئے محض ہو جاؤنگا۔

برخلاف اس کے جب مَیں قانونِ اخلاقی پر غور کرتا ہوں، تو مجھے اپنی قدر و قیمت بے نہایت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے

معلوم ہوتا ہے کہ مَیں ایک ذی عقل ہستی ہوں اور ایک ایسی شخصیت کا مالک ہوں جس کو فنا نہیں۔ میرے اندر اخلاقی قانون کارفرما ہے۔ اور وہ مجھ پر ظاہر کرتا ہے کہ مَیں حیوانیّت سے مافوق اور دُنیائے محسوسات کی حدود سے آزاد ہوں۔ مکان وزمان کی قیود مجھ پر عاید نہیں ہوتیں، اور مَیں اپنی ذات میں لامحدود و لامتناہی ہوں۔

ایمنوئیل کانٹ

ہادی

راز کی باتیں

ناز کی یا نیاز کی باتیں — کچھ بھی ہوں سب ہیں راز کی باتیں
اُس نے چھانٹا مجھے ہزاروں میں — دیدۂ امتیاز کی باتیں
طشت از بام ہو گئیں افسوس — میری اور اُن کی راز کی باتیں
شکوۂ لطف اور سپاسِ جفا — یہ ہیں راز و نیاز کی باتیں
ذکرِ مے میں ہیں بہکی بہکی سی — صوفیِ پاکباز کی باتیں
گوشِ محمود سے سُنے کوئی — خمِ زلفِ ایاز کی باتیں
سیکھ لیں آہِ شعلہ پرور نے — نفسِ جانگداز کی باتیں
چھوڑ واعظ بیانِ صوم و صلوٰۃ — کر مئے خانہ ساز کی باتیں

کچھ نہ سمجھیں گے حضرتِ شامی
ناز والے نیاز کی باتیں

شامی

تبصرے

تاریخ الامت - مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری۔
جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب اُمت اسلامیہ کی تاریخ ہے۔ اور ظہور اسلام سے لے کر زوال بغداد تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں آنحضرت صلعم کی سیرت ہے۔ اور تمہید اعرب کے مختصر حالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ دوسری جلد خلفاء راشدین، تیسری جلد خلفائے بنی اُمیہ اور چوتھی اور پانچویں خلفائے عباسیہ کے متعلق ہیں۔ مجموعی حیثیت سے کتاب کے نمایاں اوصاف یہ ہیں۔ کہ ہر عہد سے جُدا جُدا بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ اور ہر عہد کے خاتمہ پر ایک باب ہے جس میں اُس کی خصوصیات پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے ہر خلیفہ کا زمانہ حکومت متعدد عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً احوال خارجیہ و داخلیہ، فوج، وزارت، مالیہ، نظم ونسق ولایات، صفات خلیفہ، ولایت عہد وغیرہ

یہ ہے اس کا مختصر سا خاکہ۔ اس اجمال کی تفصیل مجھے اس وقت مقصود نہیں۔ تاہم ایک بات عرض کرنے کے قابل ہے۔ فاضل مؤلف نے تاریخ کے لفظ کو نہایت محدود معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اُن کی کتاب صرف اسلام کی سیاست وحکومت کی تاریخ ہے۔ تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں مسلمانوں کا جو مہتم بالشان حصہ رہا ہے اس سے ضمنی بحث تک نہیں کی گئی۔ حالانکہ یہی وہ چیز ہے جو ان کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہم آج بھی جبکہ مرور ایام کے اثر سے ہمارے اسلاف کے سیاسی اقبال کا دفتر گاؤ خورد ہو چکا ہے۔ اور اُن کے فاتحانہ کارنامے تقویم پارینہ کے اوراق کی زینت ہو گئے ہیں فخر ومباہات کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اُس کا غیر فانی نقش جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ اگر تاریخ کا وسیع اور صحیح مفہوم لیا جائے۔ جو آجکل رائج ہے تو یہی کافی نہیں کہ کسی مُلک یا قوم کی حکومت میں جو تغیر اور انقلاب واقع ہوئے۔ اُن کو ترتیب وار بیان کر دیا جائے۔ انہیں تو محض ایک ثانوی اہمیت حاصل ہے۔ مقدم اس بات کو سمجھنا چاہیئے کہ اُس مُلک یا قوم پر تہذیب ومعاشرت کے کیا کیا دور گزرے ہیں۔ اور وہ کونسے اسباب تھے۔ جن کے ماتحت اُس کی ذہنی و اخلاقی حالت میں عروج یا انحطاط رونما ہوتا رہا۔

پھر کتاب کا عنوان کچھ ایسا ہے کہ اس سے توقع اسی بات کی ہوتی ہے۔ اگر اُمت صرف خلفاء امراء و وزراء

اور قائدین تک محدود ہے۔ تو یہ اور بات ہے لیکن اگر اس سے جمہورِ اسلام مُراد لینا صحیح ہے تو تاریخ الامت کو محض سیاسی تاریخ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ جمہور کو سیاست سے کہیں زیادہ تہذیب و معاشرت سے تعلق ہوتا ہے۔ سیاست خواص کے حلقے تک محدود ہے۔ اُس میں لازمی طور پر بعض منتخب افراد کو نمایاں حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ عمومیت جاتی رہتی ہے جس کا ایک قوم یا ملت کی مجموعی تاریخ کو سب سے زیادہ لحاظ رکھنا چاہیئے۔ بیشک ایک زمانہ تھا جب یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر قوم کی تاریخ اُس کے مشاہیر کی تاریخ ہے لیکن اب وہ وقت گیا۔ موجودہ زمانے کی جمہوریت پسندی کا اقتضاء یہ ہے کہ تاریخ کو شخصی تذکرے تک محدود نہ کیا جائے بلکہ اُسے نفسِ اجتماعیہ کا ایک مطالعہ سمجھا جائے۔

بہر حال میرا اعتراض صرف اسقدر ہے کہ عنوان اور مضمون میں عدم مطابقت ہے۔ اگر اس سے قطعِ نظر کر لیں تو کتاب "مملکتِ اسلام کی تاریخ" کی حیثیت سے جامع اور مکمل ہے۔ اور وہ سب سے بڑی خوبی جو اس کے مفید عام ہونے کی ضامن ہے۔ وہ صراحت ہے جس سے کام لیکر مصنف نے ہر عہد کے تفصیلی واقعات اور حالات بیان کئے ہیں۔ شاید اسی خوبی کو برقرار رکھنے کے خیال سے اُنھوں نے تاریخی الجھنوں میں نہیں پڑنا چاہا۔ ردّ و کد سے گریز اس حد تک کیا ہے کہ اوّل سے لیکر آخر تک کتاب کے ورق اُلٹ جایئے۔ آپ کو حاشئے پر کہیں کسی مورّخ کا حوالہ یا اقتباس نظر نہ آئیگا۔ اگر کہیں ایسی بات آگئی ہے جو مختلف فیہ ہے۔ تو وہاں آپ نے مورخین کی متبائن اور متضاد آراء کا اقتباس دیکر پڑھنے والے کو منطقی استدلال کے پیچ میں نہیں ڈالنا چاہا۔ بلکہ جس نتیجے پر وہ اپنی وسعتِ مطالعہ اور ذاتی اجتہادِ رائے کی بنا پر پہنچے ہیں۔ اسے تیقّن کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے لہجے میں ایک وثوق پیدا ہو گیا ہے۔ جو کم از کم عوام الناس کی نظر میں استناد و استشہاد کا محتاج نہیں۔

اگر یہ کتاب اختصاصیینِ تاریخ کے لئے نہیں لکھی گئی اور اس کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ اردو دانوں کی عام جماعت کو فایدہ پہنچے تو جو طریقِ بیان اس میں اختیار کیا گیا ہے اس سے بہتر تصوّر میں نہیں آسکتا۔ یہ طریقہ علمی تحقیق و تدقیق کے منافی ہے تو ہوا کرے۔ لیکن عوام کو علم تاریخ سے کیا نسبت؟ اُن کی طبیعت کو تاریخ سے بحیثیت ایک فن کے لگاؤ ہے۔ اُن کا مطمح نظر تاریخ پڑھتے وقت واقعات کی تحقیق نہیں ہوتا بلکہ وہ اُسے اپنی فطرت کے اُس جبلّی تقاضے سے مجبور ہو کر پڑھتے ہیں جو اُنہیں اپنے ہمجنسوں کے حالات کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرنے پر

آمادہ کرتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت اُن کی وُہی ذہنی کیفیت ہوتی ہے جو قصّہ پڑھتے وقت۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخ الامّت قصّے سے کم دلچسپ نہیں۔ اگرچہ جیسا میں اُوپر کہہ چکا ہوں۔ اُس میں وہ عنصر مفقود ہے۔ جو ہمارے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ یعنی معاشرت و تمدّن کی بحث۔ طباعت و کتابت کے لحاظ سے کتاب تعریف کے قابل ہے مکتبہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے مل سکتی ہے۔ قیمت ہر جلد کی جُدا ہے۔ مکمّل لعہ

اسلامی رسول کے معجزے
خدائی انکم ٹیکس
تاکید نماز

از خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی کی نثر! کون ہے جس نے اُسے پڑھا ہو اور متاثر نہ ہوا ہو! اُس کی وہ سادگی جس پر لاکھوں بناؤ قربان ہیں۔ اُس کی وہ بے تکلفی جس میں شیرینیٔ گفتار کا مزا آئے، اور وہ دلنشینی جو اُن کی ہر دلعزیز شخصیت کا ایک مکمل اظہار ہے۔ یہ خوبیاں وہ سحرِ حلال ہیں۔ جس کا استعمال وہ ہمیشہ بہترین مقاصد کے لئے کرتے آتے ہیں۔ یہی وہ تسخیرِ قلوب کا عمل ہے۔ جسکے ذریعے اُنھوں نے اپنی قوم کو ایسے ایسے مفید سبق پڑھائے جو کوئی اور پڑھانا چاہتا تو کامیاب نہ ہوتا۔ یہ ہر کسی کا کام نہیں کہ پند و موعظت کے خُشک مباحث میں جان ڈال دے یا روزمرّہ کی باتوں میں جن کو ہر کوئی جانتا ہے۔ لیکن اُن پر محض اس لئے عمل نہیں کرتا کہ وہ ہر وقت کی تکرار سے پُرانی ہو جاتی ہیں۔ نُدرت اور جدّت پیدا کر دے۔ یا اگر زندگی کے رموز اور نکات کو بیان کرنا چاہے تو ایسا عام فہم بنا دے کہ پڑھنے والا پُکار اُٹھے۔ "ارے یہ تو میرے دل کی بات کہی" حالانکہ اُس نے کبھی خواب میں بھی وہ دیکھے یا سُنے نہ ہوں یہ وہ خُداداد صفات ہیں۔ جو لاکھوں میں ایک شخص میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہی وہ صفات ہیں جن میں خواجہ صاحب کے ایک کامیاب مصلحِ قوم اور رہنمائے خلق ہونے کا راز مضمر ہے۔

پہلی صفت کا ثبوت اُن کی مذہبی اور اخلاقی کتابوں میں ملتا ہے۔ دوسری اُن کی تجارتی اور تعلیمی کتابوں سے ظاہر ہے۔ اور تیسری صفت کی حامل اُن کی اختراع فائقہ یعنی سیپارۂ دل ہے۔ اور ابھی میں نے اُن کی چوتھی قسم کی کتابوں کا تذکرہ نہیں کیا جو اُنھوں نے ایک ادیب کی حیثیت میں لکھی ہیں۔ کیونکہ سردست مجھے اُن سے بحث نہیں۔

زیرِ تبصرہ کتابیں مندرجہ بالا تقسیم کے مطابق پہلی قسم کی کتابیں ہیں۔ اور اُسی سادہ، بے تکلف، اور

دلنشین پیرایے میں لکھی گئی ہیں جس کی میں نے ابھی تحلیل کی ہے۔ ایک لحاظ سے وہ دوسری قسم کی کتابوں سے بھی مشابہ ہیں۔ کیونکہ اُن میں وہ سبق دُہراتے گئے ہیں۔ جن کے جاننے کی ہر مسلمان سے توقع رکھنی چاہیئے۔ لیکن حالات بناتے ہیں کہ لوگ انہیں بھُولتے جا رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ صدیوں کے اعادے کے باعث جدّت سے عاری ہو گئے ہیں۔ یعنی نماز اور زکوٰۃ کے اصول۔ خواجہ صاحب نے اپنے اسی لطفِ خداداد سے جس سے وہ پُرانی اور بار بار کی دُہرائی ہُوئی داستانوں کو تازہ کر دیا کرتے ہیں۔ ان باتوں میں بھی جن کو ہم آئے دن سُنتے رہتے ہیں۔ ایسی دلچسپی پیدا کر دی ہے کہ قندِ مکرر کا مزا آتا ہے۔

خواجہ صاحب کے عنوان ہمیشہ ایسے اچھوتے ہوتے ہیں کہ دیکھتے کے ساتھ ہی مضمون کی نسبت کئی قسم کی توقعات دل میں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اور ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی تسلّی کرنے کے لئے اُس کو پڑھیں خدائی انکم ٹیکس! یہ عنوان دیکھکر کس کا یہ معلوم کرنے کو جی نہ چاہے گا۔ کہ اس کے تحت میں کیا لکھا ہے! اگر آپ کے دل میں بھی یہ شوق پیدا ہُوا ہے تو حلقۂ نظام المشائخ بک ڈپو سے یہ کتابیں منگا لیجئے۔ اُن کی قیمتیں یہ ہیں:۔ اسلامی رسول کے معجزات ۶ ر تاکید نماز ۳ ر۔ خدائی انکم ٹیکس ا ر۔ سرورق نہایت خوشنما اور رنگین ہیں۔ اور لکھائی چھپائی اعلےٰ درجے کی

سُنہری گیت:۔ مُصنّفہ وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی مرحوم۔

وجاہت مرحوم جن کی قبل از وقت موت کا افسوس ابھی تک دلوں میں تازہ ہے۔ موجودہ دَور کے شعرا میں ایک ممتاز رتبے کے مستحق ہیں آپ کا کلام رسالوں اور اخباروں میں (خصوصاً روزنامہ آفتاب میں جو آپکے زیر ادارت لاہور سے نکلا تھا) چھپکر مقبولیّت عامہ حاصل کر چکا ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں ایک مجموعہ بھی چھاپا تھا۔ لیکن وہ اب نایاب ہے۔ حال میں اُن کے شاگرد رشید سلطان صاحب نے ایک مختصر سا مجموعہ ترتیب دیا ہے جسے اُن نظموں کا جو اُنہوں نے بچوں کے لئے لکھی تھیں۔ بہترین انتخاب کہنا چاہیئے۔ اور اس کی وقعت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے۔ کہ بعض غیر مطبوعہ نظمیں بھی اس میں شامل ہیں۔ بچّوں کے شاعر کی حیثیت سے وجاہت کا درجہ اسمٰعیل و حاؔلی کے پہلو بہ پہلو صفِ اوّل میں ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی گوارا ہے۔ قیمت ۴ر چار آنے۔

ملنے کا پتہ:۔

اُردو ہاؤس چیمبرلین روڈ لاہور ہادی

دو باتیں



یاد رکھنے اور ان پر عمل کرنے سے آپ بیماری تکلیف و تشویش سے بچینگے

(۱) امرت دھارا تقریباً کل امراض کا جو عام طور پر گھروں میں ہوتی رہتی ہیں حکمی علاج ہے لاکھوں استعمال کرنیوالوں میں سے

بیس ہزار

لکھ کر بھیج چکے ہیں کہ امرت دھارا ہر وقت پاس رکھنی چاہیئے اور کوئی گھر اس سے خالی نہ ہونا چاہیئے! مفصل حالات جاننے کیواسطے رسالہ امرت مفت منگاویں! قیمت ۱۲ فی شیشی نمونہ آدھ آنہ

(۲) **امرت دھارا** لاہور کے مشہور معالج کوی ونود وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید کی ایجاد ہے اسکی بہت بڑی کامیابی کو دیکھ کر لوگ جھوٹی نقلیں کرتے ہیں اور کئی طرح سے پبلک کو دھوکہ میں لاتے ہیں۔ ہمیشہ دھوکہ سے بچیئے! اور اصل چیز کو خریدیئے!

المشتہر

امرت دھارا لاہور

خط و کتابت و تار کیلئے پتہ:- منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

ہزار داستان



ایڈیٹر

احمد شجاع

لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے   رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴   قیمت ششماہی سہ روپے فی پرچہ ۱۰ر

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے علیگ

ایڈیٹرز

سیّد عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی وکیل۔ محمد اسمٰعیل۔ محمد ہادی حسین بی اے (آنرز)

جلد ۶ نمبر ۶ | اشاعت ماہ جون و جولائی ۱۹۲۵ عیسوی | جلد ۷ نمبر ۱

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

غیر مساعد واقعات کی ناگزیر مجبوریوں کے باعث جون و جولائی کا پرچہ اکٹھا شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ کہنا کہ آیندہ قارئین کرام کو اس شکایت کا موقع نہ ملیگا۔ عذرِ گناہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ لیکن اسکے سوا میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔

پچھلی دو اشاعتوں میں جناب جمیل قدوائی کا مضمون (مہربان) قارئین کرام پڑھ چکے ہونگے۔ صاحب مضمون کی خواہش تھی کہ مضمون کا تعارف اختتام پر کیا جائے۔

مہربان ایک عکسی افسانہ تھا۔ جس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں۔ کہ جس شخص کا عکس کھینچا جائے۔ اُس کی زندگی، اُس کے خیالات اور اُس کی گفتگو کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو نمایاں کر دیا جائے۔ جس حد تک صاحب مضمون اس خصوصیتِ فن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ وہ آپ پر روشن ہے۔

ہم جنابِ سیّد راز چاندپوری کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ ہر ماہ انگریزی کے بہترین افسانوں میں سے ایک افسانے کا ترجمہ کر کے بزمِ ہزار داستان کو رونق دیتے ہیں۔ میں اس مہارتِ فن پر جو انہیں ترجمے میں حاصل ہو چکی ہے۔ اپنی اور ناظرینِ ہزار داستان کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شاید کہا جا سکتا ہے کہ گولڈ سمتھ روانیٔ انداز اور سلاست بیان کے لحاظ سے انگریزی علمِ ادب میں بہت کم حریف رکھتا ہے۔ جس طرح اس کا طرزِ تحریر نرم رو ہے۔ اُسی طرح اُس کے خیالات بھی نرم رو ہیں۔ تلوّنِ طبع اُس کے ایک مضمون کا چربہ ہے۔ جناب عبدالرشید نے کوشش کی ہے کہ اصل مصنّف کے ادائے مطالب کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور کسی حد تک اُن کی کوششیں مشکور ہیں

جناب افتخار الرسول صاحب بدر ایم-آر-اے-ایس ہم سے اسقدر دُور ہونے کے باوجود بھی ہزار داستان کے حقوق اور اپنے علمی شغف کو فراموش نہیں کرتے۔ امید ہے کہ بہشت و دوزخ جو ڈبینٹے سے ماخوذ ہے۔ اُن کے علمی عواطف کی پہلی قسط ثابت ہوگا۔

جس طرح ورڈس ورتھ۔ کیٹس۔ بائرن اور شیلی انگریزی نظم کی تاریخ میں ایک نئے تحریک کے علمبردار ہیں۔ اسی طرح جناب اثر صہبائی اُردو شاعری میں ایک جدید انداز کے موجد ہیں۔ اُن کی شاعری کائنات سے ہم آہنگ ہے اور اُن کے اکثر شعر کائنات کی صداقتوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ حقائق کو جس رنگیں انداز میں وہ بیان کرتے ہیں۔ اُسے بلاخوف تردید سہل الممتنع کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے کلام میں رندی اور مستی کے عناصر اس طرح دست و گریباں ہیں۔ کہ وہ جس جذبے کو ادا کرتے ہیں وہ رنگیں ہو جاتا ہے۔ وہ عرصے سے شاعری کی رسمیات کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اور اُن کی کامیابی کا ثبوت اُن کی مقبولیتِ عام میں جھلک رہا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

پرتو میں ایک حُسن کا رند اور محتسب
بالا مری نظر ہے نشیب و فراز سے

"پریم چند" کتنی ایک تاثرات کا مطالعۂ ثانی ہے۔ پریم چند کی قبیل کے اشخاص آپ کو اکثر ملینگے۔ اور یہ افسانہ ایک ایسے شخص کا لکھا ہُوا ہے۔ جو ایسے اشخاص کو ناپسند کرتا ہو۔ اس لئے لازمی طور پر صاحب مضمون کی آنکھوں پر تعصب کی رنگین عینک ہوگی۔ میں کس قدر مسرور ہوں۔ اگر کوئی کسی اور نقطۂ نگاہ سے اسی قبیل کے کسی شخص کا چربہ کھینچے۔

ایڈیٹر

اے حُسنِ دل آویز

کس شوق سے، کن ارمانوں سے مَیں نے اپنی
محبوب ترین کتاب تیری خدمت میں گزُرانی تھی!

خیال تھا کہ جب تو اس کتاب کو پڑھے گی، ان
صفحات پر اپنی جگر گداز و دلسوز نظریں گاڑ کر اُسے دیکھے گی
تو گویا مجھے ایک لطفِ خاص حاصل ہوگا۔ ایک ربطِ خاص
سے میری تھکی ہُوئی اور محرومِ تماشا آنکھوں کو جو میری
عزیز ترین کتاب کے ہر صفحے پر گویا غائبانہ طور پر میری
رُوح کی گہرائیوں میں جہاں سوز و التہاب کا آتشیں سمندر
سرد سا پڑا ہے۔ اِک خاص لہر، اِک خاص تڑپ، ایک
بلند و بار و شعلہ پیدا ہو کر میرے خرمنِ حیات کو بھڑکائیگا
تھپک تھپک کر کچوکے لگائیگا۔ جلائیگا۔ میری خاک
کو خاک سیاہ کر کے اُنسے آسمانی بلندیوں پر لیجائے گا۔
وہاں جہاں خیال کی رسائی ہے۔ گویا غائبانہ طور پر،
ایک خاص انداز میں میری آنکھیں تیری آنکھوں سے
چار ہونگی۔ اور مجھے حصولِ دیدار کی ایک انوکھی، ایک
نرالی سرسبز و شاداب سعادت نصیب ہو گی!

کس شوق سے، کن ارمانوں سے مَیں نے اپنی
محبوب ترین کتاب تیری خدمت میں گزُرانی تھی!

خیال تھا کہ جب تو اُسے پڑھے گی، اُن صفحات
پر جن کا ایک ایک حرف کثرتِ مطالعہ سے میرے دل
پر نقش ہو گیا ہے۔ اور اس موہوم امید پر کہ تو انہیں پڑھیگی
وہ حروف ایک زرّیں خطِ غبار میں میرے صفحۂ دل پر پڑے
تڑپ رہے ہیں۔ خیال تھا کہ جب تو اُن پر نظر ڈالے گی
تو گویا میرے صفحۂ دل پر، میرے دماغ پر، میرے تخیّل
پر ایک مبہم روشنی، ایک خیالی عکسی تصویر، ایک پرّاں و
سوزاں عکسِ خندہ اپنی چمک سے حاوی ہو جائیگا۔ گویا تیرے
لطیف و پاک حسیات میرے اُن پرکیف و پُر تموج خیالات
سے جو پڑھتے وقت میرے قلب گداز میں پیدا ہوتے تھے
ایک دور از عقل و گمان، ایک سمندروں سے نیچے اور
بادلوں سے بالا والے عالمِ نور میں ٹکرائیں گے گویا اُن میں
اور میرے خیالات میں ایک رابطۂ اتحاد پیدا ہوگا۔ اس
خیال سے کہ میرے اور تیرے یکساں و ہم رنگ احساسات
میں ایک جذب، ایک ربط، ایک میل پیدا ہوگا۔ اس
طرح وصل ہوگا جیسے دو متلاطم بجلیاں، دو مرتعش سحابِ رنگیں

کہیں ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتیں، وہاں وصل ہوگا جہاں تنہائی ہوگی جہاں جدائی کا نام نہیں۔ میری رُوح کو ایک سکون، ایک اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

یہ سکون تمام خوشیوں سے بالا، یہ اطمینان تمام مسرتوں سے بلند ایک حیثیت رکھتا ہے۔

مگر آہ، اے حُسنِ دل آویز! تیری سرد مہری سے میرا شوق منجمد ہوگیا۔ اور تیرے انکار نے میرے گدازِ قلب کو پاش پاش کر دیا ہے!

جلیل قدوائی (علیگ)

مَیں تُجھ سے مُحبّت نہیں کرتا

مَیں تجھ سے محبّت نہیں کرتا، اے میرے پیارے کیونکہ جب مَیں تیری لطافت و پاکیزگی کا خیال کر کے اپنی ناکارہ ہستی پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک شدید قوّتِ احساس سے کانپنے لگتا ہوں۔

جب مَیں تجھے دیکھتا ہوں تو میری ناتواں نگاہیں بے اختیار فرشِ زمین پر گر جاتی ہیں۔ اور میری مضمحل و مضطرب رُوح، میرا قابلِ ملامت نفسِ خیال تیرے رنگ و لطافت کا خیال کر کے ایک بے نام خلش ایک ناقابلِ بیان جذب و تاثر کے زیرِ اثر لرزنے لگتا ہے۔

مَیں تجھ سے محبت نہیں کرتا، اے مجسمۂ بہار و نزاکت، کیونکہ مَیں اپنے میں اتنی صلاحیت، اتنی ہمّت نہیں رکھتا کہ تجھ جیسی صاف و شفاف، آسمانی نور میں ڈھلی ہُوئی ایک بے لوث و پاک ہستی کے مقابل، اپنی کمزور و نحیف، اپنی گمنام و بے صدا، ایک ناقابلِ التفات ہستی کو پیش کروں۔

جب مَیں تجھے دیکھتا ہوں تو میری آرزو ہوتی ہے۔ کہ لرزاں و گریاں تیرے راستے میں اپنے کو ڈال دُوں۔ بچھا دُوں۔ تیرے بلند و برگزیدہ ایک پُر سحر غبارِ قدس کے مانند متجلّی وجود کے نیچے اپنے بیکار، فضا میں ایک متلاطم و مرتعش آہنگِ نغمہ کے مثال رائیگاں وجود کو گرا کر خود کو پسوا ڈالوں۔ روند ڈالوں، میرا حقیر و ناتواں جسم خاک ہو جاتے۔ اس طرح کہ کسی کو اس پر خاک کا گمان نہ ہو۔ میرا ناکام و مایوس وجود پس کر مٹ کر

ناپید ہو جاتے۔ اس طرح کہ کسی کو اُس کی یاد بھی باقی نہ رہے

مَیں تیرا احترام کرتا ہوں، تیری وقعت و عزّت کرتا ہوں۔ اے میرے پیارے، محبت نہیں کرتا کیونکہ میرا ظرفِ تنگ تیری نگاہِ مہر کی تاب نہیں لا سکتا مَیں تیرا احترام کرتا ہوں۔ ایسے جیسے کہ بیکس و لاچار رعایا رحیم بادشاہ کا احترام کرتی ہے۔ تیری مہر پرور نظروں کے سامنے میری نگاہِ التجا گنگ، تیرے مترنم اور نرم الفاظ کے مقابل میری زبان مفلوج اور ادائے مطالب کے لئے ناکافی۔

جب تو میرے سامنے ہوتا ہے تو میرے افسردہ چہرے کا رنگِ پریدہ سوزِ اشتیاق سے جل جل کر تیرے حسنِ نظر نواز میں جذب ہو ہو کر دادِ حسن دینا چاہتا ہے۔ میری عاری زبان کی تمام سلب کردہ قوتِ گویائی تیری میٹھی باتوں میں بل بل کر، تیرے رسیلے قہقہوں میں گم ہو ہو کے تجھ پر فدا ہو جانا چاہتی ہے۔ اور میری مخمور نا شناگاہوں کا نور مضمحل میری آنکھوں سے چھن چھن کر تیری نگاہ مہر پر تصدق ہو جانا چاہتا ہے۔

لیکن آہ! اے میرے رحم و کرم والے بادشاہ، اے میرے شوکت و اجلال والے آقا، مَیں رحم کے لائق نہیں، مجھے نظرِ کرم سے مت دیکھ کہ مَیں سخت مظلوم ہوں۔ مجھ پر رحم مت کر کہ مَیں مر رہا ہوں۔ بلکہ تو اپنی ایک نگاہِ قہر سے مجھے پھونک دے، جلا دے، خاک سیاہ کر دے، اس طرح کہ کسی کو میری موت کا گمان نہ ہو۔ میرے نحیف و نزار وجود کو مسل دے، مٹا دے، پیس دے، اس طرح کہ کسی کو میری یاد بھی باقی نہ رہے!!

مَیں تجھ سے التجا کرتا ہوں!

جلیل قدوائی (علیگ)

بیچسی

کاش پھر عشقِ یار پیدا یار　　دِل میں کوئی شرار پیدا ہو

کون رازِ جہاں پہ غور کرے　　ہاں کوئی بادہ خوار پیدا ہو

"۹"

افکارِ پریشان

(۱)

زندگی کیا ہے، اور قضا کیا ہے! ابتدا کیا ہے، انتہا کیا ہے!
یہ فنا کیا ہے، یہ بقا کیا ہے! یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے!
دل کہ برق و شرار ہوتا ہے
دم میں مشتِ غبار ہوتا ہے ۔

(۲)

رُوح زار و نزار ہوتی ہے ہجر میں بے قرار ہوتی ہے
وہ اسیرِ غبار ہوتی ہے اِک غریب الدّیار ہوتی ہے
جوشِ وحشت اُسے ستاتا ہے
ایک سیلِ رواں بناتا ہے

(۳)

خانۂ دل کو توڑ دیتی ہے پیکرِ گل کو توڑ دیتی ہے
اپنے محمل کو توڑ دیتی ہے سب سلاسل کو توڑ دیتی ہے
پھر وہ آزاد ہو کے گاتی ہے
اور فضا میں سماتی جاتی ہے

(۴)

جا چمکتی ہے وہ ستاروں میں رقص کرتی ہے لالہ زاروں میں
نغمہ پیرا ہے آبشاروں میں جلوہ فرما ہے کوہساروں میں
وہ کبھی جامِ ماہتاب میں ہے

گرمیِ حسن آفتاب میں ہے

(۵)

اے دلِ زار، بے قرار نہ ہو! چشمِ پُر آب اشکبار نہ ہو!
مائلِ آہ دلفگار نہ ہو! عشق ہو اور وصلِ یار نہ ہو!
وہ ہمیں میں ہے، وہ جدا نہ ہو!
وہ یہیں ہے کہ وہ فنا نہ ہو!

(۶)

خندہ ہائے بہار میں وُہ ہے نغمہ ہائے ہزار میں وہ ہے
شبنمِ آبدار میں، وہ ہے اور گُلِ خندہ بار میں وہ ہے
آنکھ کے تِل میں بس رہا ہے وُہ
رُوح میں دل میں بس رہا ہے وُہ

غزل

کوئی ایسا فسوں اب مجھ پہ اے پیرِ مغاں کر دے
مرے خوں کے ہر اک قطرے کو جامِ ارغواں کر دے
الٰہی! ہر گھڑی وقفِ کشاکشہائے طوفاں ہے
حبابِ زندگی کو ایک بحرِ بیکراں کر دے
بہت گھبرا گیا ہوں اب تیرے اس دورِ پیہم سے
مٹا دے خاک کر دے بے نشاں اے آسماں کر دے
جنوں میرا ابھی خارِ بیاباں سے گریزاں ہے
الٰہی! بے نیازِ کاوشِ سود و زیاں کر دے
کھڑا ہوں حُسن کے حیرتکدے میں مثلِ آئینہ
مری اس خود فراموشی کو یا رب! جاوداں کر دے
وہ فردوسِ نگہ جلوہ فشاں ہے تختۂ گل پر
الٰہی اس مرے کیفِ نظر کو جاوداں کر دے
اثرؔ تیری نگاہِ پاک ہیں تکرارِ پیہم سے
کہیں ایسا نہ ہو، اس بے خبر کو بدگماں کر دے

اثر صہبائی

جوانی کی پہلی محبّت

(۱)

سلیم نے قاہرہ کے سربفلک میناروں کی طرف دیکھ کر۔ جو چاند کے نور میں دُھل کر تاباں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

پھر اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔" ان دنوں مَیں جوان تھا۔ اور وہ آرزوئیں جو جوانی اپنے ہمراہ لائی مجھ پر مسلط تھیں۔ مَیں شہرت کے آسمان پر مہر و ماہ کی طرح روشن ہونا چاہتا تھا۔ مصر میں آکر مجھے خیال پیدا ہُوا کہ مَیں صحرائے اعظم کی سیّاحی کروں۔ اور اس کے رموز کو دُنیا پر منکشف کر دوں۔ آہ صحرا ہزاروں تشنہ کام مسافروں کے خون سے رنگین صحرا۔ اٹھتے بیٹھتے۔ سوتے۔ جاگتے مجھے صحرا کی سیاحی کا خیال رہتا تھا۔ حتےٰ کہ صحرا کا شوق میرے لئے خواب حیات بن گیا۔

یہ آرزو بہار کے ایک شگفتہ موسم میں مجھے صحرا میں بہت دُور تک لے گئی۔ ایک دن پُورا ضائع کرنے کے بعد آغازِ شب کے وقت میں عربوں کے ایک خیمے کے قریب آپہنچا۔ دن بھر سُورج کی بے پناہ حدّت سے تپتی ہُوئی ریت کو طے کرنے کے بعد اور ایسے آسمان کے نیچے گزُرنے کے بعد جس میں دوزخ کی تمام گرمیاں منعکس تھیں۔ عرب بدّوؤں کے یہ خیمے خلدِ نعیم معلوم ہوتے تھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بدّو اپنی مہمان نوازی کے لئے دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ شیخ قبیلہ ہر مسافر کے آرام کا انتظام اپنا فرض سمجھتا ہے۔ مسافر بلا تکلف جتنا عرصہ چاہیں اُن کے ہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ اور اس مہمان نوازی کا صلہ دینے کی کوشش کرنا گویا تمام قبیلے کی بے عزّتی کرنا ہے۔ شیخ قبیلہ کے خیمے کے آگے ایک نیزہ ریت میں گاڑ دیا جاتا ہے جس سے یہ مُراد ہوتی ہے کہ جو شخص مہمان پر ہاتھ اُٹھانے کا ارادہ کریگا اُسے پہلے شیخ قبیلہ سے نپٹنا پڑیگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ بدّوؤں کے قیام کے قریب اپنا خیمہ نصب کرنا ہتکِ عزّت تصوّر کیا جاتا ہے۔

مَیں ان باتوں سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ خانہ بدوشی کی زندگی خود مجھے محبوب تھی۔ اور اس لئے مَیں نہایت بیباکی سے۔ غصیلے اور ہٹیلے بدووں کے گروہ سے گزر کر شیخ سید محمد کے پاس جا پہنچا اور جھک کر

سلام کیا وہ مجھے بھائی بھائی کرتا ہوا اندر لے گیا۔

ایک خیمہ میرے لئے وقف کر دیا گیا۔ اور بہت جلد میرے آرام کے بندوبست کی تکمیل ہو گئی۔

شاید تم شام مصر سے واقف ہو۔ ابھی ابھی آسمان ایک ایسی تصویر کی طرح خوبصورت اور درخشاں ہوتا ہے جس میں اُن تمام رنگوں کی آمیزش ہو۔ جو کوئی چابکدست مصوّر اپنی ذہنی قوت سے اختراع کر سکتا ہے۔ اور دوسرے لمحے میں آسمان گہرے قرمزی رنگ کا ایک مخملی نقاب اوڑھ لیتا ہے۔ ستارے اس طرح نمودار ہوتے ہیں۔ گویا نفیس ترین ململ میں سے جواہرات روشن ہیں۔

پھر رات۔ تاریک مخملی رات۔ تم نے قاہرہ میں ایسی ہزاروں راتیں دیکھی ہونگی۔ لیکن صحرا میں یہی رات کتنے درجے زیادہ خوبصورت، کتنے درجے زیادہ موثر ہوتی ہے اور انسان کی رُوح سے زبان خاموشی میں گفتگو کرتی ہے آہ شام ہائے صحرا کچھ اس طرح کی رات تھی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ بدّووں کا سادہ کھانا کھا کر۔ میں بدووں کا آبحیات ——— لذیذ ترین قہوہ ——— پی رہا تھا۔ اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں سے دُور اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جہاں صحرا کا ریتلا فرش سیاہ رنگ میں تبدیل ہو کر اُفق کی سُرخی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے اُسے سب سے پہلے دیکھا۔ لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اُس بدّو نے جو خیام کے قریب پہرے پر کھڑا تھا اُسے نہیں دیکھا۔

میں اُس کا حلیہ کیسے کھینچ سکتا ہوں۔ جس وقت وہ چاند کی روشنی میں میری طرف لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آ رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے اُس کی مثیل آج تک نہیں دیکھی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ میرے خوف اور تعجب کا باعث کیا تھا۔ اُس میں کچھ ایسی بات تھی جو نفرت اور خوف کی محرّک ہوتی ہے۔ اُس کے لمبے سفید بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کی زرد خوفناک آنکھوں کو سایہ کئے ہوئے تھے۔ وہ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ وہ اس طرح قدم اُٹھا رہا تھا گویا بہت کمزور اور نحیف ہو۔

پھر یوں محسوس ہُوا گویا خیموں کا ہر ایک کُتّا اُس کے آنے سے خبردار ہو گیا ہو۔ خیموں کی تاریکی میں سے کُتّوں کی سایہ نما صورتیں بھونکتی ہُوئی نکلیں۔ میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔ زرد اور سیاہ کُتّوں کے ہجوم میں خیموں کے دروازے پر بُوڑھا ایک خوفناک چیخ مار کر گر پڑا۔ میں ایک ڈنڈا لیکر جنگ برق کی تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ اب ہر طرف سے مدد پہنچ رہی تھی۔ لیکن سب سے پہلے میں نے چیخم دھاڑ مچا کر کُتّوں پر بلا امتیاز برسانی شروع کیں۔ تھوڑے عرصے میں میدان

صاف ہو گیا۔ نیچے جھک کر میں نے بوڑھے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے نیم وا آنکھیں سکتے ہوئے زبانِ حال سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اس کے حلق سے کچھ ناقابلِ فہم الفاظ نکلے۔ اور ہاتھوں سے اس نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کے حلق میں پانی ٹپکایا۔ لیکن مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا۔ کہ بدوؤں کا گروہ جو میرے اردگرد پرا جمائے کھڑا ہوا تھا۔ تحیر خیز طور پر خاموش تھا۔ اور جب بیچارہ بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا تو تمام بدوؤں کے منہ سے ایک اجنبی سا لفظ نکلا۔ جو باوجود عربی دان ہونے کے میں سمجھ نہ سکا۔ ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہوا کہ بدو مجھ سے اور بوڑھے سے دُور دُور ہی رہتے تھے۔

اب انبوہ کو چیر کر شیخ سید محمد آگے بڑھا۔ اور بوڑھے سے پوچھنے لگا۔ "آیا وہ رات اس کے خیمے میں بسر کرے گا"۔ بوڑھے نے سر ہلایا۔ اور کچھ کھانا طلب کیا۔ بہت جلد اس کو کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھانے کو ایک کپڑے میں باندھ لیا۔ پانی کا برتن دوسرے ہاتھ میں پکڑا۔ مجھے سلام کیا۔ اور بدوؤں کی طرف بغیر دیکھے بھالے صحرا کی طرف چل دیا۔

کُتّے پھر بھونکنے لگے۔ بدو کھڑے بوڑھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور اس وقت تک دیکھتے رہے جبتک وہ افق کی تاریکی میں غائب نہ ہو گیا۔ سیّد محمد نے باوقار اور پُر شکوہ الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا۔ کہ میں نے انکے قبیلے کو بے عزّت ہونے سے بچا لیا تھا۔ ورنہ تمام عمران کے دامن پر یہ بدنما داغ رہتا۔ کہ وہ ایک بوڑھے کی مدد نہ کر سکے تھے۔

دوستو! اگر تم نے اس بدّو سردار کو دیکھا ہوتا۔ جو کسی فرانسیسی خاندانی امیر کی طرح یا لکھنؤ کے کسی بانکے کی طرح مہذب شیر کی طرح بیباک اور عورت کی طرح رحمدل تھا۔ تو تمہیں محسوس ہوتا کہ اس شکریے نے مجھ پر کس طرح اثر کیا تھا۔

دو کتّے بوڑھے کے تعاقب میں چلے گئے تھے۔ کیونکہ دُور سے ان کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر یکبارگی گیدڑوں کے ایک عظیم گروہ کے چیخنے کی آواز آئی۔ اور کتّوں کی آوازیں ان میں ڈوب گئیں چیخیں اس زور و شور سے بلند ہو رہی تھیں۔ گویا بادل گرج رہے ہوں۔ اب وہ چیخیں بھی بند ہو گئیں۔ لیکن کتّے واپس نہیں آتے۔

اس عجیب واقعے کی وجہ سے کچھ پریشان سا ہو کر میں لیٹ گیا۔ سونے کے لئے نہیں بلکہ غور کرنے کے لئے آخر نیند آئی۔ لیکن کس پریشانی کے بعد۔ تمام رات مجھے زرد چشم بوڑھوں۔ بھونکتے ہوئے کتّوں اور چیختے ہوئے گیدڑوں کی خوابیں آتی رہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں

کتنا عرصہ سوتا رہا۔ لیکن جس وقت مَیں اُٹھا تو صبح کی سنہری نازک اُنگلیاں ریت کے بلند ٹیلوں کو مس کر رہی تھیں۔ خیمہ مدھم سی روشنی سے لبریز تھا۔ اور کوئی شخص باہر سرگوشیوں میں مجھے بلا رہا تھا۔ مَیں فوراً اُٹھ بیٹھا پنچہ ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اور باہر دیکھا کل والا بُوڑھا مجھے اشارے سے بلا رہا تھا۔ دوستو! ان دنوں مَیں جوان تھا۔ اور تم جانتے ہو کہ جوانی ان دنوں بے پروا ہوتی ہے۔ مَیں نے جلدی سے کوٹ پہنا۔ اور بُوڑھے کے پیچھے ہولیا۔ اس نے اشاروں سے مجھے سمجھایا۔ کہ وہ مجھے خیام سے دُور لیجا کر کوئی ضروری بات کہنا چاہتا ہے۔ آخری خیمے سے سو گز کے فاصلے پر بُوڑھا رُک گیا۔ اور پہلے اس نے خیموں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر میری طرف اشارہ کیا۔ اور پھر اس راستے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سے کارواں گزر کر مصر کی طرف جاتے تھے۔ مجھے محسوس ہُوا یا تو وہ گونگا ہے اور یا اُس نے خاموش رہنے کی قسم کھائی ہے۔ مَیں نے پُوچھا "کیا تمہارا مطلب ہے کہ میں خیموں کو چھوڑ کر چلا جاؤں"

اُس نے اپنا سر ہلایا اور اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہُوئی۔

مَیں نے پھر پُوچھا "اسی وقت"

اُس نے پھر اپنا سر ہلایا۔

"کیوں؟"

اُس نے مجھے اشاروں سے سمجھایا کہ خیموں میں رہنے میں میرے لئے موت کا اندیشہ تھا۔ اور مجھے غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے بدّوؤں کو چھوڑ کر چلا جانا چاہیئے۔

مَیں اس کی مجنونانہ سنجیدگی کا ایک شمہ بھی الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہوں لیکن افسوس جوانی پختہ کار بڑھاپے کے مشوروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مَیں نے اپنا سر انکار کے انداز سے ہلایا۔ اور اُس سے رخصت ہُوا۔ رخصت ہوتے وقت مَیں نے اس کی زرد آنکھوں میں افسوس کی ایک ایسی جھلک دیکھی۔ جو بعد میں مجھے کئی دفعہ یاد آتی رہی اس ملاقات کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں آفتاب بلند پہاڑیوں کے پیچھے سے بلند ہُوا۔ دوستو تم لو سے واقف ہو۔ لیکن وسطِ صحرا کی سموم سے واقف نہیں اُس صبح سموم کا ایک طوفان آیا۔ ایک ریت کی دیوار اس قدر بلند کہ اس نے سُورج کی روشنی کو چھپا لیا۔ اس قدر تاریک کہ اُس نے دن کو رات بنا دیا۔ اسقدر گہری گویا مَیں اُس میں ڈوبتا جا رہا ہُوں۔ توبہ۔ معلوم ہوتا تھا کہ سموم جنّات کا ایک لشکر ہے۔ جو اپنی ریتلی اُنگلیوں سے میرے گلے کو دبا کر میری جان نکال لینا چاہتا ہے۔ مَیں نے سوچا وہ یہی آفت تھی جس کے متعلق مجھے اُس بُوڑھے نے

خبردار کیا تھا۔ اگر میں صبح ہی خیموں سے چل پڑا ہوتا تو اس وقت تک میں کسی گاؤں میں اطمینان سے قہوہ پی رہا ہوتا لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کہ اُن واقعات کے مقابلے میں جو مجھے پیش آنے والے تھے۔ سموم کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ طوفان گذر گیا اور ہر ایک شخص نے خدائے قدوس کی درگاہ میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ کہ اُس کی رحمت کاملہ نے ہر ایک کو صحیح و سالم رکھا۔ اُس پریشانی اور بدانتظامی کے دوران میں جب خیموں کو دوبارہ درست کیا جا رہا تھا۔ میں نے سکینہ کو پہلی بار دیکھا۔

وہ سید محمد کے خیمے سے ایک مختصر سے غالیچے کو جھاڑنے کے لئے باہر نکلی تھی۔ غالیچے کو جھاڑتے وقت سورج کی روشنی اُس کی چوڑیوں پر اُس کے گوندھے ہوئے بالوں پر اُس کے لباس پر۔ اُس کے چاندی کے پازیبوں پر۔ اُس کے خوبصورت پاؤں پر رقصاں تھی۔ میں چپ چاپ اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر روشنی اُس کی آنکھوں کی سیاہ گہرائیوں پر رقصاں ہوئی اور میں نے اپنے آپ کو دو نہایت خوبصورت سیاہ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اُس کے رخسار تمتما اُٹھے۔ اُس نے جلدی سے اپنے لبادے کو درست کیا اور خیمے کی طرف بھاگ گئی۔ دوستو اُس نے میری طرف صرف ایک نگاہ کی تھی۔ لیکن اُس ایک نگاہ میں۔ کیوپڈ نے اپنا تیر چلا دیا تھا۔ یاد رہے میں جوان تھا اور جوانی بے پروا ہوتی ہے۔

میں بیمار بن گیا۔ اور یہ ظاہر کیا کہ سموم نے مجھ پر بہت بُرا اثر کیا۔ میرے کمینے دل نے سکینہ کے والد سید محمد کی مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ وہ مہمان نوازی جو شبہ سے ناآشنا ہے۔ اور صرف زر کے خوف سے بے نیاز۔ میں اپنے بستر پر پڑا رہتا اور دو خوبصورت سیاہ آنکھوں کے خواب دیکھتا۔ یا رات کو جب گیدڑوں کے چیخنے کی آواز آتی تو مجھے اُس بوڑھے کا خیال آتا۔ جس کے متعلق مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ ساحر ہے۔ دوستو تم ہنستے ہو۔ بیشک قاہرہ کے سب سے پر رونق بازار میں ایک محفوظ مکان کے برآمدے میں بیٹھ کر مذاق اُڑانا آسان ہے لیکن ذرا سُنتے رہو۔

(۲)

پندرہ دن گزر گئے۔ سردار سید محمد کے گھر کی عورتیں نقاب اوڑھ کر اور اپنے آپ کو مناسب و موزوں لباس میں چھپا کر میری تیمارداری کیا کرتیں۔ لیکن سکینہ نہ آتی۔ یہ سب کچھ تھا مگر مجھے مایوسی نہ تھی۔ دوستو تم جانتے ہو۔ میں جوان تھا اور جوانی بے پروا ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس ذلیل فریب دہی سے پھر مجھے شرم آنے لگی تھی۔ آخر ایک دن وہ شور بپا کا ایک

پیالہ لئے ہوئے میرے خیمے میں داخل ہوئی اور ڈوبنے والے آفتاب کی آخری کرنوں نے اُس کے لباس کے باوجود بھی اُس کے پریزاد جسم کے نازک تناسب کو نمایاں کر دیا۔ میرا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ دل کی دھڑکن مجھے جو طوفانِ سموم میں اپنی سخت جانی کی وجہ سے بچ رہا تھا مار ڈالے گی۔ دوستو۔ جوانی میں محبت کے شعلے چمکتی ہوئی آنکھوں کی ایک نگاہ سے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ عرب کی وہ دوشیزہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ اور شوربے کا پیالہ زمین پر رکھ دیا میری مشتاق نگاہوں نے باریک نقاب میں سے دیکھا کہ اُسنے اپنی آنکھیں میری طرف سے پھرا رکھی ہیں۔ آہ وہ حسین آنکھیں جن پر سیاہ پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں اور میرے دل نے یا شاید میرے غرور نے بتایا کہ وہ مجھے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ وہ اُٹھنے لگی۔ اور مَیں نے انتہائی جُرأت سے کام لیکر اُس کے ہاتھوں کو مس کیا۔ وہ چونک اُٹھی میری طرف ایک نظر دیکھا۔ اور غزالِ رعنا کی طرح طراسے بھرتی ہوئی چلی گئی وہ گئی۔ اور میری رُوح کو اپنے ساتھ لے گئی میں اپنے بستر پہ لیٹا ہُوا اُس ایک نگاہ کا لطف لیتا رہا میرے ارادے؟

دوستو مَیں جوان تھا اور جوانی ارادوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ خاصکر جب دو چمکتی ہوئی آنکھوں کا تعلق ہو۔

خیمے ایک چشمے کے قریب نصب کئے گئے تھے جو کھجوروں کے ایک جھنڈ کے قریب نشیب میں واقع تھا یہاں غروب آفتاب کے وقت خیموں کی بانقاب پُر اسرار اور وفا آفریں مصری عورتیں گھڑے اُٹھاتے ہوئے پانی بھرنے آیا کرتیں۔ بہت جلد محبت نے دانائی اور مصلحت اندیشی کو خیرباد کہہ دیا۔ اور مَیں ہر روز ہوا خوری کی خاطر چشمے کی طرف نکل جایا کرتا۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ سکینہ سب سے بعد پانی بھرنے آیا کرتی تھی۔ مَیں نے اُسے اپنا نام سکھایا جب وہ اپنی موسیقی نواز آواز میں "سلیم" کہتی اور اسکا عطر افشاں سانس مجھے اپنے رخساروں پر گرم محسوس ہوتا تو مجھے خیال ہونے لگتا تھا کہ شاید مجھے کوئی پری دُنیا سے اُٹھا کر کوہ قاف کی پُر فضا سیرگاہوں میں لے گئی ہے۔ دو ہفتوں کے اندر اندر ہمارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ مَیں نے سید محمد کے گھوڑے کو اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ اور اُسے اچھی طرح سدھا لیا تھا آخر ایک رات میں گھوڑے پر سوار ہو کر چشمے کے قریب جا پہنچا تھوڑے عرصے میں وعدہ کی پکّی محبت کی دیوانی سکینہ میرے پاس آپہنچی۔

جب صبح ہوئی تو ہم ابھی اُس مقام سے بہت دُور

تھے۔ جہاں ہمیں چھپنے کے لئے کوئی جگہ مل سکتی تھی میں صحرا سے اچھی طرح واقف تھا لیکن اس سنسان اور ویران مقام کو دیکھ کر جہاں ہم پہنچے ہوئے تھے میری رُوح لرز اُٹھی۔ کئی جگہ ریتلے ٹیلوں کے قریب پتھر کی چھوٹی چھوٹی دیواریں تھیں۔ جو دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور جن میں کہیں کہیں مختصر سے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پُرانے زمانے کی قبریں تھیں۔ چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔ اور سبزے اور نمی کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔ اُس مقام پر حسرت اس طرح برس رہی تھی۔ گویا شاہانِ سلف اُس جگہ مدفون ہوں۔

آہ۔ خاکِ مصر۔ خاک خوشبوئے مصر اس صحرا میں کسقدر خوفناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ سکینہ نے اعتماد کے ایک عجیب انداز میں میری گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے لیکن اُس کی طاقت کم ہو رہی تھی۔ آرام کرنا اشد ضروری تھا۔ ابھی تک ہمارے تعاقب میں کوئی شخص نہ آیا تھا۔ مَیں نے سکینہ کو ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ اور اُسے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس دیا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے پاس پانی کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے۔ اور ہمیں جلد کسی جائے پناہ تک پہنچنا چاہئے۔ ہمارے پاس صرف معمولی روٹی اور کھجوریں تھیں لیکن جب بوسوں کی شیرینی موجود ہو تو اس سے بہتر غذا اور کیا ہو سکتی ہے۔

آہ وہ جوانی کی پہلی محبت۔

دوستو۔ کبھی کبھی تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص نے کوئی گناہ نہیں کیا وہ کبھی مسرور بھی نہیں ہوتا۔ ذرا تصوّر کرو ـــــ اگر کر سکتے ہو ـــــ ہم ایک سنسان مقام میں بیٹھے ہیں جو ہمارے لئے نعمائے بہشت سے زیادہ لذیذ ہے۔

تھوڑا عرصہ ہم اس طرح بیٹھے رہے۔ ایک ہذیان مسرت سے مخمور اور پھر مجھے ایک آواز سُنائی دی۔

یاد رہے مَیں نے کسی شخص کی آواز نہیں کہا صرف ایک آواز سُنائی دی۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ مَیں سکینہ کے نازک باہوں کو اپنے گلے سے جُدا کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اب بھی مَیں اس لمحے کا خیال کرتا ہوں۔ تو میرا دل کانپ جاتا ہے۔

ایک بُت کی طرح بے حس وہ بوڑھا جسے مَیں جادوگر سمجھتا تھا۔ کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ خدا جانے مَیں کتنا عرصہ اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن جب مَیں نے مُڑ کر سکینہ کی طرف دیکھا تو وہ خاک پر مرجھائے ہوئے پھول کی طرح گری ہوئی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ اور کانپ رہی تھی۔ کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

بوڑھا کودتا ہوا نیچے کی طرف آیا۔ اور مَیں نے

انتہائی خوف سے دیکھا کہ کبھی کبھی وہ اپنے ہاتھوں کے بل بھی چلتا تھا۔ اس بڑھاپے کے باوجود اس پُھرتی سے آیا۔ گویا پہاڑی بکرا ہو۔

دوستو۔ تم جادو تے مصر کے قائل نہیں ہو اچھا سنو اس بُوڑھے نے نیچے اُتر کر میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جس طرح ایک کُتّا مار کھا کر اپنے مالک کی طرف دیکھتا ہے اس کے علاوہ مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے تمام بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اور مجھ پر جنونِ غم کی ایک ایسی کیفیت طاری ہُوئی کہ اس وقت میں خوفناک سے خوفناک موت کے لئے تیار تھا۔ لیکن اس بُوڑھے سے آنکھیں ملانے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اس نے افق کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں تین چار سوار میری طرف آتے دکھائی دے رہے تھے۔ مَیں سکینہ کے قریب گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ عشق کا جن سر سے اُتر گیا۔ اور موت کے تاریک سائے نے میری رُوح کو محیط کر لیا۔ مَیں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مَیں اپنی محبت کی خوفناک زنجیروں کو جکڑ کر سکینہ کو موت کے مُنہ میں کشاں کشاں لے آیا تھا۔

پھر وہ بُوڑھا جس کی تمام عادات انسانوں سے مختلف تھیں اشارے کرنے لگا۔ دیوانوں کی طرح اشارے کرنے لگا۔ دوستو! مَیں تمہیں کس طرح اس کے اشاروں کی حالت سمجھاؤں۔ آہ! وہ اشارے سکینہ خوف کے مارے مجھ سے چمٹی ہُوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں تکلیف کا ایک ایسا سیلاب موجزن تھا کہ اس وقت بھی خیال کر کے مَیں رو پڑتا ہوں

بہنے دو۔ ان آنسوؤں کو بہنے دو۔ یہ مردانگی کے خلاف نہیں ہے۔ خیر مَیں پھر افسانے کی طرف آتا ہوں اسی اثنا میں وہ تین چار سوار جو مَیں نے افق کی طرف دیکھے تھے۔ قریب ہوتے جا رہے تھے۔ قریب تر ہوتے جا رہے تھے ابھی تک وہ بوڑھا میرے شانے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے کچھ اشارے کر رہا تھا۔ اور آخر کار خطرے کے قرب نے مجھے اپنی حالت کے دردناک احساس پر مجبور کیا۔ اور اب مجھے سمجھ آئی کہ وہ مجھے ان ریتلے ٹیلوں اور پتھروں میں جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ جن کے متعلق میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ اب قریب آنے والے سواروں میں مَیں سید محمد کو صاف پہچان سکتا تھا۔ وہ بُوڑھا اب مجھے پُوری قوت سے کھینچ رہا تھا۔ اور مجھے ان سوراخوں کی طرف لیجانا چاہتا تھا۔ جو پتھروں میں بنے ہُوئے تھے۔ اس کی آنکھیں جنونیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور اس کی باتوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مجھ سے درخواست کر رہا ہے۔ التجا کر رہا ہے۔ کہ مَیں اندر چلا چلوں مَیں نے سکینہ کی گردن کے گرد اپنے ہاتھ ڈالے۔ اور کہا "چلو سکینہ یہ شخص ہمیں چھپا سکتا ہے"

اس نے سہم کر جواب دیا۔ "نہیں۔ نہیں مجھے خوف آتا ہے۔"

مَیں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اور بُوڑھے کو رہبری کا اشارہ کرتے ہُوئے لڑکھڑاتا ہُوا اس کے پیچھے پیچھے چلا راستہ کانی تھا۔ اور اگر بُوڑھا میری مدد نہ کرتا تو مَیں یقیناً مرگیا ہوتا۔ کیونکہ پتھروں پر سکینہ کے بوجھ کی وجہ سے میرا پاؤں بار بار پھسل پھسل جاتا تھا۔ سکینہ کا خوف لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ حتےٰ کہ وہ خوف سے دیوانی ہوگئی۔ لیکن میں نے اسے زور سے اپنے سینے سے لگاتے رکھا۔ سوراخ کے مُنہ کے قریب پہنچکر سکینہ نے ایک چیخ ماری۔ اور مافوق الفطرت طاقت سے کام لیکر میری گود سے جُدا ہوکر بُوڑھے سے پرے بھاگی۔

اس نے روتے ہُوئے کہا "وہاں نہیں۔ وہاں نہیں یہ بُوڑھا مجھے کھاجائیگا۔"

اور عین اس وقت سید محمد نے جو ہمارے قریب آچکا تھا۔ بندوق اُٹھائی اور فیر کیا۔ اس واقعے کو سالہا سال گزر چکے تھے۔ لیکن یہ واقعہ میرے ذہن میں اسی طرح نقش ہے۔ گویا کل گزرا ہے۔ بُوڑھے نے ایک خوفناک چیخ ماری۔

جس وقت سید محمد نے گولی چلانے کیلئے بندوق اُٹھائی تھی۔ اس وقت تقدیر اس کی اُنگلیوں کے ذریعے اپنا خوفناک کام پُورا کرنا چاہتی تھی۔

ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ —— ہلکی سی بے شک لیکن ایسی جس میں تکلیف کی ایک دنیا لرز رہی تھی —— سکینہ میرے قدموں کے قریب گر پڑی۔ اور اس کے پہلو سے خون کی ایک دھار جس میں میری جوانی بر باد ہوکر رہ گئی۔ نکل کر تپتے ہُوئے پتھروں کو رنگین کرنے لگی۔

(۲۲)

جو شخص ایسے وقت میں اپنے جذبات کو بیان کرنے کی کوشش کرے۔ میرے دوستو! اس کا کبھی یقین نہ کرنا وہ جھوٹا ہے مفتری ہے۔ کاذب ہے۔ لیکن عاشق نہیں دُنیا میری نگاہوں میں اندھیر ہوگئی۔ اور میرے حواس مختل ہوگئے۔ مجھے سوائے سکینہ کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا آہ اس کی آنکھوں میں ابھی تک محبت مرتعش تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو اس کے قریب گرادیا۔ اور جب اس نے میری چھاتی پر سر رکھ کر اپنا آخری عطر آلود سانس لیا۔ تو مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ میری جوانی کی پہلی محبت اب اندوہِ حیات بن گئی۔ میرے لئے اب صبح کی مسکراہٹ اور شام کی خاموشی بے معنی چیزیں ہونگی۔

بُوڑھے نے کُتّے کی سی وفاداری سے مجھے پھر سوراخ کے اندر گھسیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اسے اپنے آپ سے پرے پھینک دیا۔ اس شخص نے مجھے کھینچ کر غار کے اندر لے جانا چاہا۔ کیونکہ سید محمد اب

بالکل قریب آچکا تھا۔ اور اس کے رفقا میری طرف بندوقوں کے مُنہ کئے ہوتے تھے۔ اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے۔ کہ میرے دل میں اتنا خیال پیدا ہُوا کہ شاید بُوڑھا ڈر کے مارے بھاگ گیا ہے لیکن نہیں مَیں غلطی پر تھا۔

دوستو! تم جادو ئے مصر پر یقین نہیں کرتے۔ اچھا سُنو۔

میرے کانوں میں ایک چیخ کی آواز آئی۔ اور اس چیخ میں کچھ ایسی بات پنہاں تھی۔ کہ مَیں کانپ اُٹھا۔ مَیں نے اپنا سر پھرا کر دیکھا اور غار میں سے پتھروں میں سے۔ ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سے گیدڑوں کا ایک عظیم الشان گروہ چیختا اور چلاتا ہُوا نِکلا۔ اور پیشتر اس کے کہ سید محمد یا اس کے رفیق مجھے کچھ نقصان پہنچا ئیں۔ گیدڑ جھپٹ کر ان پر جا پڑے۔ تم جانتے ہو گیدڑ آدمی سے کس طرح گھبراتے ہیں۔ آدمی سے کس طرح بھاگتے ہیں۔ پھر جادوئے مصر پر یقین رکھنے سے انکار کرتے ہو سید محمد اور اس کے رفقا بھاگے۔ دم دبا کے بھاگے پھر ایک چیخ کی آواز سُنائی دی۔ اور گیدڑ واپس آنا شروع ہُوتے اس کے بعد مَیں بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو معلوم ہُوا کہ وہ بوڑھا وہ جادوگر۔ وہ گیدڑوں کا سردار جس نے مجھے اس مہربانی کے عوض میں جو میں نے اس کی جان کُتّوں سے بچانے میں ظاہر کی تھی میری اتنی مدد کی تھی۔ ایک گہری خندق کھود کر غائب ہو چکا تھا سورج اپنی پوری حدت اور تیزی سے چمک رہا تھا۔ مَیں نے خود اپنے ہاتھوں سے سکینہ کو قبر میں اُتارا۔ اس کی لحد پر کوئی نشان نہیں ہے۔ لیکن دوستو! کیا یہ کم ہے کہ مَیں اپنی جوانی اس کی قبر پر چھوڑ آیا ہوں۔

(۴)

سالہا سال گزر گئے۔ اور آخر ایک دن پھر مَیں سکینہ کی قبر پر دو آنسو بہانے کے لئے گُزرا۔ اس کی قبر کے قریب پُہنچنے سے پیشتر مَیں نے گدھوں کا ایک عظیم اجتماع دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی شخص حال ہی میں مرا ہے۔ ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ کر نیچے نظر ڈالی۔ اس کے بعد مَیں نے گھوڑے کو واپس موڑا۔ ایڑ لگائی اور سرپٹ دوڑایا۔

دوستو! مَیں نے کیا دیکھا۔ چاندنی میں کھجور کے درختوں کے سائے ریت پر پڑ رہے تھے۔ اور ہزاروں گیدڑوں کا ایک گروہ حلقہ جمائے بیٹھا تھا۔ ان کے درمیان ان کے سردار بوڑھے کی لاش پڑی تھی۔ اور وُہ بیٹھے تھے۔ کہ گدھ اس کی لاش کو کھانے نہ پائیں۔ ہاں وہی گیدڑ جو گدھوں کے ساتھ مِل کر ہمیشہ مردہ انسان کو کھا جایا کرتے ہیں۔"

ساتے بلند ہو رہے تھے۔ شام پڑنے والی تھی۔ ہم تمام اُٹھے اور سلیم سے رخصت چاہی۔ اب گھر واپس جاکر خدا جانے مجھے بھی کتنا عرصہ زرد چشم بوڑھوں، بھونکتے ہُوئے کتوں اور چیختے ہُوئے گیدڑوں کے خواب آتے رہیں گے۔

عابد

کیفیات

اب مجھے ہجر کا خیال کہاں — تم جہاں ہو وہاں ملال کہاں
شیخ ہے صرف قال کا بندہ — اس کو احساسِ کیفِ حال کہاں
دلِ ناداں یہ بزمِ ساقی ہے — اس جگہ ہوش کا سوال کہاں
اب تو جو حال ہو محبت میں — دل کو اندیشۂ مآل کہاں
کشمکشہائے رنج فرقت میں — دل کو امید کا خیال کہاں
تم مرے حال سے ہو کیوں آگاہ — اور ہو بھی تو پھر خیال کہاں
سوزِ پروانہ خود ہے جانِ حیات — شمعِ محفل کا یہ مآل کہاں
میرے دم تک ہے عجزِ مایوسی — پھر یہ غمناکیِ سوال کہاں
میرا آئینۂ خیال تو دیکھ — کیا کہا مجھ سا خوش جمال کہاں
کیا کروں عہدِ ضبط توڑ کے میں — مجھ کو خود تابِ عرضِ حال کہاں
اب تو اک بے کسی کا عالم ہے — آرزو بھی شریکِ حال کہاں
میں کہاں اور کہاں تری امید — تو کہاں اور مرا سوال کہاں
میری صورت ہے دل کی خود تصویر — درد محتاجِ عرضِ حال کہاں
دل سکوتِ وفا پہ مرتا ہے — جوشِ غم کا اُسے خیال کہاں

زخمِ دل شوق سے بڑھے ہادیؔ
اب مجھے فکرِ اندمال کہاں

ہادی مچھلی شہری

تلوّنِ طبع

گولڈسمتھ میں اگرچہ سخاوت کا مادہ بافراط پایا جاتا تھا۔ مگر وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ کہ وہ پرلے درجے کا جزرس اور کفایت شعار ہے۔ اور اگرچہ اس کی بات چیت صاف طور پر اسکی تنگدلی اور خودغرضی پر دلالت کرتی تھی۔ مگر باطن میں اس کے دل میں ہر بنی نوع انسان کے لئے الفت اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اکثر اوقات میں نے اسے اپنے تئیں بنی نوع انسان سے اظہار نفرت کرنیوالا پایا ہے جب کوئی فلاکت زدہ بھکاری اس سے سوال کرتا تو اُسکا چہرہ تمتما اٹھتا۔ اور ہمدردی کے مارے اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں اس کے پسیجے ہوئے دل کا پتہ دیتیں۔ بجائے اس کے کہ وہ نرم کلامی سے کام لے وہ ایسے ناسزا الفاظ استعمال کرتا جن پر بعد میں وہ شاید ہی کبھی پشیمان ہوا ہو۔

اکثر اصحاب دردمندی اور ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہوئے ظاہرداری سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے ان خصلتوں کو اپنی فطرت کا جزو قرار دیتے ہیں لیکن یہی اور صرف یہی آدمی تھا۔ جو اپنی اس خداداد نیکی کو اپنے لئے ایک بڑا نقص خیال کرتا تھا۔

ایک دفعہ ہمیں اکٹھے ہواخوری کے لئے بازار نکلنے کا اتفاق ہوا اور ہماری گفتگو اس موضوع پر آ اتر آئی جس کا اس زمانے میں عام چرچا ہو رہا تھا یعنی غریب خانوں کی احتیاج ...... تو اس نے بہت حیران ہو کر مجھ سے کہا۔ "لوگوں میں بھیک مانگنے اور بیکار رہ کر ساہلانہ زندگی بسر کرنے کا مرض کیوں روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جبکہ قانون ان کے کفیل ہونے کا ذمہ خود اپنے سر لیتا ہے۔ غریب خانے کھول دئے گئے ہیں۔ جن میں محتاجوں کی خوراک کپڑے لتے اور دیگر ہر قسم کی سہولتوں کا خاصہ انتظام ہے۔ یہ وہاں کیوں نہیں جاتے اور اس سے زیادہ انہیں اور چاہتے ہی کیا؟ اگر مجھے بیٹھے بٹھاتے یہ سب کچھ میسّر آجاتے تو میں خود اتنی ہی چیزوں پر قناعت کر سکتا ہوں۔ لیکن پھر بھی یہ بے صبرے اور ناشکرے نظر آتے ہیں۔ ہمارے مجسٹریٹ بھی کیسے لاپروا واقع ہوتے ہیں۔ ان ہرزہ گردوں کو بڑے گھر کیوں نہیں بھیج دیتے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ یہ غریب محنتی لوگوں پر بار ہیں۔ اور افسوس ہے ان اہل بصیرت پر جو نادانستہ طور پر اس مرض کو پھیلا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں ان کی مدد پر جھٹ

آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے ملک میں فریب بیکاری اور فضولخرچی کی ترغیب دلاتے ہیں۔ جن کے نتائج تمہارے سامنے پیش ہیں۔ آئے دن چوریاں ہوتی ہیں۔ کہیں کشت وخون کے واقعات سنائی دیتے ہیں۔ آخر یہ ہیں کون؟ یہی بیکار فریبی گداگر۔ مگر حکام ہیں۔ کہ ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

مَیں تو ہر جان پہچان کو جس سے مجھ کو ذرا سا بھی لگاؤ ہے۔ اس کو ہر طرح ان کی طرف سے خبردار کر دیتا ہوں۔ تاکہ ان دھوکہ بازوں کے جھانسے میں نہ آئیں یقین جانو بھائی یہ ایک نہیں سب کے سب اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے جیل بھروائے جائیں نہ کہ ان سے ہمدردی کی جائے۔

وہ بڑی سرگرمی سے مجھ پر ان پند و نصائح کی بوچھاڑ کرتا چلا جا رہا تھا اور مجھے ایسی حرکت سے باز رکھنے کی ترغیب دلا رہا تھا۔ جس کا مَیں شاید ہی کبھی مرتکب ہوا ہونگا۔ کہ اتنے میں ہمیں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ملا۔ جس کے تن پر ایسے پھٹے پُرانے کپڑوں کے چیتھڑے تھے۔ جو کبھی اپنی اصلی حالت میں شاندار پوشاک ہونگے۔ وہ ہمارے پاس آیا اور ہم سے رحم کی استدعا کی اس نے ہمیں ہر طرح یقین دلایا کہ وہ عام بھکاریوں کی طرح نہیں لیکن غربت کے شرمناک ہاتھوں اسے یہ پیشہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ تاکہ اپنی جاں بلب بیوی اور پانچ گرسنہ بچوں کا پیٹ پال سکے۔ مَیں جو آگے ہی ان دروغ بافیوں اور غلط بیانیوں کا قائل نہ تھا مجھ پر اس کی اس داستان کا رتی بھر بھی اثر نہ ہوا۔ لیکن گولڈ سمتھ کے لئے تو معاملہ ہی دیگرگوں تھا۔ مَیں بھانپ گیا کہ اس کی اس عاجزانہ درخواست نے اس کے دل پر نمایاں اثر کیا ہے۔ اس وقت اس کے دل کا خون ان غریب بچوں کی ہمدردی کے لئے جو مارے بھوک کے بیتاب ہونگے۔ جوش مارنے لگا۔ لیکن وہ اپنی اس حالت کے اظہار کرنے سے جھجکا۔ جب وہ اس ہمدردانہ احساس اور اپنی پُرغرور ہیبت کو برقرار رکھنے کے مجادلے میں گرفتار تھا۔ مَیں نے اسے دھوکا دینے کی خاطر مُنہ موڑ لیا۔ اس نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور غریب سوالی کی مٹھی میں ایک نقرئی سکہ تھما دیا۔ اور اس غرض سے کہ مَیں دیکھ نہ پاؤں اُسے ان الفاظ میں ڈانٹنا شروع کر دیا۔ کہ جاؤ محنت مزدوری کر کے کھاؤ۔ اور آتے جاتے مسافروں کو تنگ نہ کرو۔

اس نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ کسی نے اس کی اس حرکت کو نہیں دیکھا۔ اپنے سلسلہ کلام کو چلتے چلتے طول دینے لگا۔ اور ان فقیروں پر بڑے بغض آلود الفاظ میں لعن طعن کرنے لگا۔ اور اپنی محیر العقول دور اندیشی اور کمالِ فن جس سے وہ ان فریبوں کو پہچان لیتا تھا۔ ان کو واضح کرنے لگا۔

پھر اس نے اپنے مخصوص انداز و قار سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا۔ کہ اگر وہ حاکم بنا دیا جائے۔ اور اسے ان سے پالا پڑے تو وہ ان سے اس طریقہ پر برتاؤ کریگا۔ کہ ان کے استقبال

کے لئے جیلخانوں کی تعداد اور بڑھاتے۔ پھر اس نے مجھے دو خاتونوں کی کہانی سُنائی۔ جو کہ بھک منگے لٹیروں کے ہاتھوں لُوٹی گئی تھیں۔ اسی قسم کی تیسری داستان شروع کرنے کو تھا کہ ایک ملّاح جو لنگڑا تھا۔ دو ایک دفعہ ہمارے آگے پیچھے سے گزرا۔ اور پہلے فقیر کی طرح ہمیں دُعائیں دیتا ہُوا خیرات کی درخواست کرنے لگا۔ مَیں بے پروا ہو کر چل نکلنے کو تھا لیکن میرے دوست نے اس کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھتے ہُوئے مجھے ٹھیرنے پر مجبور کیا۔ شاید اپنی نرم دلی کے پردہ میں یہ جتلانا چاہتا تھا کہ وہ کس چالاکی سے کسی نہ کسی وقت ایک آدھ فریبی کو پہچان لیتا ہے۔ اور اس کو اس فن میں کیسی دستگاہ حاصل ہے۔

اب اس نے بارعب ہیبت اختیار کر کے اپنی رعونت آمیز نگاہوں سے ملاح کا سر سے پاؤں تک معاینہ کیا۔ اور سوال کیا۔ تم کس لڑائی میں ناکارہ ہو گئے۔ اور تمہاری ٹانگ کس لڑائی کی بھینٹ چڑھی۔ ملاح نے ویسی ہی زہرآلود آواز میں جس طرح وہ مخاطب کیا گیا تھا کہا۔ ٹانگ یہ ان ننگ قوم حضرات کی حفاظت میں کام آئی جو گھر بیٹھے رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اس جواب کو سُنکر گولڈ سمتھ کا سارا رعب داب اُڑتا نظر آیا۔ اور وہ ایک گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ کہ کسی نہ کسی طرح اس غریب لنگڑے کی مدد کرے۔ اس طرح کہ دوسروں پر یہ بات نہ کُھل سکے۔

اس نے ملاح پر ایک زہرآلود نگاہ ڈالی جو ایک دیا سلائیوں کا بکس لئے ہُوتے تھا۔ اور دریافت کیا کہ آیا وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ ملاح کچھ جواب میں کہے اس نے درشت آواز میں پُوچھا کہ آیا وہ اس کی قیمت ایک شلنگ قبول کریگا۔

ملاح اس کے اس سوال پر حیران سا ہُوا۔ مگر کچھ دیر جھجک کر گٹھا اس کے حوالے کیا۔ اور دام لیکر کہا۔ یہ لو صاحب گٹھا اور ساتھ ہی غریب کا شکریہ۔

گولڈ سمتھ اسے خرید کر ایک فاتحانہ انداز سے چل پڑا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے بڑی مہم سر کی ہے۔ راستے میں اس نے کہا۔ مجھے پُورا یقین ہے کہ یہ ضرور مسروقہ مال ہے جسے وہ لگے ہاتھوں کوڑیوں کے دام پھینک گیا ہے۔ پھر اس نے مجھے ان تیلیوں کے کئی ایک اوصاف گنوائے۔ جو ان میں موجود نہ تھے۔ اور ان کے متعلق تعریف کا پل باندھ دیا۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی اس کفایت شعاری کی مدح کب تک جاری رکھتا۔ اگر اس کی توجہ ایک ایسی چیز کی طرف منعطف نہ ہوتی جس کی حالت پہلے دونوں ہستیوں سے کہیں ناگفتہ بہ تھی۔

ایک عورت بوسیدہ لباس میں ملبوس ایک گود میں

ایک بچہ اور پیٹھ پر دوسرا اُٹھائے رقت آمیز راگ الاپنے کی ناکام کوشش میں گلا پھاڑ رہی تھی آواز بھی ایسی پُر درد کہ گانے اور رونے میں بمشکل امتیاز ہو سکتا تھا۔ ایک مصیبت زدہ جس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اپنے باطنی اضطرار پر ظاہری تبسم کا پردہ ڈال رہی تھی۔ یہ ایسی بات تھی جس کا نظرانداز کرنا وہ ہرگز گوارا نہ کر سکتا تھا۔

اس موقعہ پر اس کی گفتگو اور خوش مذاقی ویسی کی ویسی دھری رہ گئی۔ اور وہ قوت جس سے اخفائے حسیات کا کام لیتا تھا۔ اس طرح رفوچکر ہو گئی۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ گویا دنیاداری کا عارضی پردہ اُٹھ گیا اور اب وہ اپنی اصلی حالت میں رونما تھا۔

میرے سامنے ہی جلدی جلدی اس نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کیں لیکن اس کی پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جبکہ اسے معلوم ہوا کہ اس کی سب کی سب نقدی پہلے فقیروں پر ختم ہو چکی ہے۔ اب گولڈسمتھ کے چہرے سے شدتِ قلق کے آثار نہاں ہونے لگے . . . . کچھ دیر جیبوں کے ٹٹولنے کی سعی لاحاصل میں مشغول رہا۔ مگر اُن میں تھا ہی کیا۔ اب تو مایوسی نے اسکے دل و دماغ پر تسلط جما لیا۔ یکایک اسکا رنگ بدلا۔ چہرہ بشاش ہوتا نظر آیا۔ اُسنے ایک نہایت مسرور انداز میں وہی ماچسوں کا گٹھا اُٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔

عبدالرشید

غزل

نگہِ حُسن سے کھُلتی ہے حقیقت میری		رونق افروزِ سکونِ غمِ پنہاں ہوں میں

جس سے پیدا ہوں اُسی ذات سے مَیں برہم ہوں		بحرِ ایّام میں اِک موج پریشاں ہوں مَیں

لطف آتا ہے عجب عالمِ ناکامی میں		دن خزاں کے ہیں یہ شیدائے گلستاں ہوں مَیں

شمعِ محفل تو مبارک تیری مستی ساقی		رونقِ دیر نشینانِ بیاباں ہوں مَیں

آبلہ پائی کا ہر وقت گلہ کیوں ہے حمید
عشق کہتا ہے کہ "آ" خارِ مغیلاں ہوں مَیں

حمید

غزل

فغانِ بے صدا ہوں میں دعائے بے اثر ہوں میں
جہانِ عشق میں اک مبتلائے بے خبر ہوں میں

غبارِ راہِ اُلفت نقش پائے رہگذر ہوں میں
غرض جو کچھ بھی ہوں آشفتۂ ذوقِ نظر ہوں میں

ترے وعدہ میں جتنی پختگی ہے باخبر ہوں میں
نظر سوئے فلک ہے گوش برآوازِ در ہوں میں

نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے مآلِ جستجو میرا
سرِ منزل پہنچکر خانہ بر دوشِ سفر ہوں میں

بساطِ دہر پر کل تک جو صدر آرائے حکمت تھا
وہی بکھرا ہوا شیرازۂ علم و ہنر ہوں میں

بجز کلفت مجھے دورِ وفا میں اور کیا ملتا
قیامت جس کی ہمسر ہے وہ شام بے سحر ہوں میں

نہ دن بھر چین پاتا ہوں نہ شب بھر نیند آتی ہے
بساطِ دہر پہ بازیچۂ شام و سحر ہوں میں

مجھے دیکھو کہ میرا درد ہمدردی کے قابل ہے
مجھے ڈھونڈو کہ انجام وفا سے چارہ گر ہوں میں

مذاقِ عشق نے اب قیدِ ملت بھی اُٹھا ڈالی
بتوں کو چھوڑکر باسطؔ پرستارِ بشر ہوں میں

باسط بھوپالی

اپنی کروں تلاش میں کس کی پھروں تلاش میں

حشر سا ہوگیا بپا دل کی ہر ایک قاش میں
یاد نمک چھڑک گئی سینۂ پاش پاش میں

حاصلِ زیست جب ہے یہ خود ہی نہ کیوں میں مر مٹوں
اپنی کروں تلاش میں کس کی پھروں تلاش میں

ظلم ہو بے نقاب کیوں پردے تمام اُٹھ نہ جائیں
آگ لگائیے نہ آپ میری غریب لاش میں

انورِ بے ریا سے یوں پوچھ نہ سرِّ زندگی
عمر تمام کاٹ دی جس نے غمِ معاش میں

انور

جوانمرد

(۱)

ایک فوجی ملازم کی زندگی جس بے لطفی سے گزرتی ہے۔ اُس سے زمانہ واقف ہے۔ آبادی سے دُور ویرانے میں وحشیانہ زندگی بسر کرنا کیا خوشگوار ہوسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عموماً فوجی ملازموں کو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان کی زندگی کسقدر بے لطف و بے کیف ہے اور اسی لئے وہ اپنی تمام عمر بیابانوں میں ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں۔

ہماری رجمنٹ ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم تھی صبح کی قواعد وغیرہ سے فرصت پانے کے بعد دوپہر کا کھانا ہم ایک یہودی کے ہوٹل میں کھاتے تھے۔ اور شام کا وقت عموماً تاش یا شطرنج کھیلنے میں گزرتا تھا۔ اس گاؤں میں تفریح طبع کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ نہ تو کوئی کلب تھی اور نہ کوئی بال روم کہ ہماری فرصت کے چند لمحے ہنسی خوشی میں گزر سکتے۔ گاؤں بھر میں کوئی حسین دوشیزہ بھی نہ تھی جس سے ہماری دلبستگی اور دلچسپی کا کچھ سامان مہیا ہوسکتا ہم ایک دوسرے کے کمرہ میں جانے اور ادھر اُدھر کی فضول باتیں کرنے کے عادی تھے۔

ہماری سوسائٹی میں سوائے ایک سویلین کے تمام فوجی عہدہ دار تھے۔ اس کی عمر تقریباً پینتیس سال تھی۔ اور ہم سب نوجوان تھے۔ اس لئے ہم اس کو اپنا بُزرگ سمجھتے اور اس کی عزت کرنا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ وہ اپنی تجربہ کاری اور مستقل مزاجی کی بدولت ہم پر حاوی تھا۔ اور اس کی پُر معنی خاموشی اور متانت و سنجیدگی کی وجہ سے ہر شخص اُس کا لحاظ کرتا تھا۔ اس کی زندگی ایک راز تھی۔ اگرچہ اس کے نام سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر مُلک کا باشندہ ہے۔ مگر اُس کا چہرہ اور اس کی طرزِ معاشرت اس کے روسی نژاد ہونے پر دلالت کرتے تھے۔

سلوپو (اُس نے اپنا یہی نام ہم کو بتایا تھا) ایک مُدّت تک فوجی خدمات انجام دے چکا تھا لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ کس وجہ سے اُس نے ملازمت ترک کرکے اس کور دیہہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ بظاہر وہ افلاس زدہ معلوم ہوتا تھا اور عموماً بوسیدہ میلے کپڑے پہنتا تھا۔ مگر وہ فیاض منش تھا۔ اور ہم لوگوں کو اکثر دعوتیں دیا کرتا تھا۔ اگرچہ دسترخوان پر محض معمولی کھانے

لیکن شراب کے خم کے خم لنڈھانے میں اس کو باک نہ تھا۔ اُس کے یہاں آتے جاتے ہمیں عرصہ گزر گیا تھا لیکن آج تک اس راز سے کوئی بھی واقف نہ تھا کہ وہ کون ہے کیا کرتا ہے۔ اور اس کی آمدنی کا کیا ذریعہ ہے۔ نیز کسی شخص کو اس سے اس قسم کے سوالات کرنے کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کے پاس کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جن میں اکثر کتابیں فوجی قواعد و ضوابط کے متعلق تھیں۔ اور کچھ تاریخی افسانے تھے۔ وہ خوشی سے ہر شخص کو کتابیں پڑھنے کے لئے دیدیتا تھا۔ اور پھر کبھی واپس نہ مانگتا تھا۔ اُس کا دلچسپ مشغلہ پستول کی نشانہ بازی کرنا تھا۔ اس کے کمرہ کی دیواریں گولیوں سے چھلنی بنی ہوتی تھیں۔ قسم قسم کے پستولوں کا کافی ذخیرہ اس کے یہاں موجود تھا۔ نشانہ بازی میں اس کو ایسا کمال حاصل تھا کہ اگر وہ ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز کسی شخص کے سر پر رکھنے اور اس کو اپنے پستول سے نشانہ بنانے کی خواہش کرتا تو ہم میں سے کسی کو بھی عذر نہ ہوتا۔ کیونکہ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ تھا کہ اس کا نشانہ کبھی خطا نہ کرتا تھا

ہمارے لئے سب سے زیادہ دلچسپ موضوع سخن مجادلہ و مقابلہ تھا لیکن سلویو کبھی اس میں حصّہ نہ لیتا تھا۔ اگر اُس سے پوچھا جاتا کہ آیا اس کو بھی کبھی کسی سے مقابلہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ تو وہ بہت ہی بے رخی کے ساتھ اثبات میں جواب دیتا۔ اور بات ٹالنے کے لئے اِدھر اُدھر کا ذکر چھیڑ دیتا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قسم کے سوالات اس کو پسند نہ تھے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوئے کہ کسی موقع پر وہ زک اُٹھا چکا ہے۔ جس کی یاد ہنوز اس کے لئے موجب تکلیف بنی ہوتی ہے۔ تاہم ہم کو کبھی یہ شک نہ ہوا کہ وہ بزدل اور کم ہمت ہے۔ دُنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی شکل دیکھ کر ان کی عالی ہمتی اور بہادری یا بزدلی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک دن ایک ایسا ناگہانی واقعہ پیش آیا جس نے ہم سب کو متحیّر بنا دیا۔

ایک روز ہم دس بارہ دوست سلویو کے یہاں مدعو ہوئے۔ کھانا کھانے کے بعد معمول کے مطابق دورِ جام چلا۔ اور جب سب سرور کیف سے بیخود ہونے لگے تو ہم نے اپنے میزبان سے تاش کھیلنے کی خواہش کی۔ اوّل اوّل تو اُس نے انکار کیا۔ کیونکہ اس کو اس قسم کے کھیلوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ لیکن ہمارے اصرار پر وہ کھیلنے پر مجبور ہو گیا۔ ہم سب ایک گول میز کے کنارے بیٹھ گئے۔ اور کھیل شروع ہو گیا۔

سلویو کی عادت تھی کہ کھیل کے وقت وہ ہمیشہ خاموش رہتا اور مکالمہ و مباحثہ سے ہمیشہ گریز کرتا تھا ہم اسکی اس عادت سے بخوبی واقف تھے اور کبھی بھول کر بھی

کوئی ایسا موقع نہ دیتے تھے۔ جو اس کی ناخوشی کا باعث ہو۔ لیکن آج ہمارے ساتھ ہمارا ایک نووارد افسر بھی تھا جو حال ہی میں ہماری رجمنٹ میں شامل ہوا تھا۔ یہ افسر نوعمر اور ناتجربہ کار تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق ہار جیت کے موقعہ پر بیجد شور و غل مچاتا تھا۔ سلویو کچھ دیر تک خاموش بیٹھا ہوا کھیلتا رہا۔ مگر آخر کار اس افسر کو خاموش رہنے کی فہمائش کی۔ افسر جو شراب کے نشہ میں بالکل چور تھا سلویو کی تنبیہ کو اپنے لئے موجب توہین سمجھا۔ اور میز سے شمعدان اُٹھا کر سلویو کی طرف کھینچ مارا۔ مگر وُہ بال بال بچ گیا۔ اور شمعدان دیوار پر جا لگا۔ ہم نے بنظرِ حیرت افسر کی طرف دیکھا سلویو غصہ میں بھرا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور غضبناک لہجہ میں اس کو مخاطب کر کے کہا:۔

"جناب! بس خیریت اسی میں ہے کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جایئے اور خُدا کا شکر ادا کیجئے۔ کہ اِس وقت آپ میرے مہمان ہیں۔ ورنہ آپ کو اپنی اس حرکت کا نتیجہ اچھی طرح ملتا۔"

افسر غُصّہ میں بھرا ہوا اُٹھا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ وہ صبح کو سلویو سے مقابلہ کریگا۔ اور اس کو اس گستاخی کی سزا دیگا۔ کھیل پھر شروع ہوا۔ اور چند منٹ تک بدستور جاری رہا۔ لیکن اپنے مہمان کو کبیدہ خاطر دیکھ کر ہم نے کھیل بند کر دیا۔ اور سلویو سے رُخصت ہو کر اپنی قیامگاہ پر واپس چلے آئے۔

علی الصبح جب ہم قاعد کے لئے میدان میں نکلے تو رات کے واقعہ کے متعلق اپنے اپنے خیال کا اظہار کرنے لگے۔ ہم سمجھتے تھے کہ سلویو صبح ہونے سے پہلے ہی ہمارے یہاں آجائیگا۔ اور افسر کے چیلنج کے مطابق اس سے مقابلہ کریگا۔ لیکن ایسا نہیں ہُوا۔ شام کو ہم سلویو کے یہاں گئے اور حسبِ معمول اس کو نشانہ بازی میں مشغول پایا۔ اُس نے معمول کے مطابق ہم کو خوش آمدید کہا۔ اور گزشتہ شب کے ناگوار حادثہ کے متعلق ایک لفظ بھی زبان پر نہ لایا۔ تین دن گزر گئے۔ مگر سلویو اور ہمارے افسر میں مقابلہ کی نوبت نہ آئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ اُس نے افسر کی معذرت قبول کر لی ہے۔ اور اب وہ مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔

سلویو کے اس طرزِ عمل سے ہمارے جوشیلے نوجوانوں کے دلوں میں اس کی وہ عزت نہ رہی جو پہلے تھی۔ ہم نے اس کے اس ولیلانہ عمل کو اس کی کمزوری پر محمول کیا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک تمام انسانی نیکیوں کی سرتاج صرف بہادری ہے۔ اور کسی کے قصور کو نظرانداز کر دینا ہم ایک گناہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ فوجی ملازموں کو اسی قسم کی تعلیم دیجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ واقعہ فراموش ہو گیا۔ اور سلویو کی عزت

ہمارے قلوب میں پھر جاگزیں ہوگئی۔

مگر میرے دل میں سلویو کی گزشتہ عظمت و عزت اپنی پہلی حالت پر قائم نہ ہوئی۔ کیونکہ میں فطرۃً وہمی طبیعت کا مالک ہوں۔ میلان رجحان اس عجیب و غریب ہستی کی طرف سب لوگوں سے زیادہ تھا۔ اور میں ہمیشہ اس کے راز کا جویا رہتا تھا۔ وہ بھی مجھ پر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مہربان تھا۔ اور مختلف موضوعات پر نہایت آزادی و محبت سے گفتگو کرتا تھا۔ تاہم سلویو کے طرزِ عمل نے جس کو میں اپنی دانست میں اس کی کمزوری سمجھتا تھا لیکن حقیقت میں وُہ بڑی عالی ہمتی تھی۔ میرے دِل میں ایک خلش سی پیدا کردی اور میں نے تنہائی میں اس سے مِلنا جُلنا ترک کردیا۔

شہر کے باشندے اپنے کاروبار اور تفریح کے سامانوں میں اسقدر مصروف رہتے ہیں کہ ان کو دیہات اور چھوٹی بستیوں کے باشندوں کی طرح معمولی معمولی باتوں کا خیال نہیں ہوتا۔ مثلاً ڈاک کی آمد کا انتظار جس طرح ایک دیہات میں رہنے والوں کو ستاتا تھا۔ شہر میں بسنے والوں کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ منگل اور جمعہ کے دِن ہماری رجمنٹ کے آدمی دفتر میں عجیب چہل پہل نظر آتی سلویو کے خطوط ہمارے دفتر کی معرفت آتے تھے اور وہ مقررہ دِن اور وقت پر ہمارے یہاں موجود رہتا تھا۔

ایک دِن سلویو کو ایک خط مِلا۔ جِس کو اُس نے بے صبری کے ساتھ کھولا۔ اور جیسے ہی مضمون خط سے آگاہ ہُوا اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک پیدا ہوگئی دوسرے لوگ اپنے اپنے خطوط کے مطالعہ میں مصروف تھے اور کسی نے اس کی اس حالت کو نہیں دیکھا لیکن میرے نام آج کوئی خط نہیں آیا تھا۔ اس لئے صرف میں اس کی متغیر حالت کو اچھی طرح دیکھ سکا۔ سلویو ہماری طرف مخاطب ہُوا اور کہنے لگا:۔

"حضرات! مجھے ایک ضرورت سے فوراً یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ اور میں آج رات کو چلا جاؤنگا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ شام کو آپ حضرات میرے یہاں تشریف لاکر ماحضر تناول فرمائیں۔" پھر اُس نے میری طرف مخاطب ہوکر خصوصیت سے زور دیکر کہا۔" مجھے امید ہے کہ آج تم بھی ضرور آؤ گے۔" یہ کہکر وہ بعجلت اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

مقررہ وقت پر میں سلویو کے یہاں گیا۔ قریب قریب تمام دوسرے احباب مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے دسترخوان چُنا گیا۔ آج معمول کے خلاف عمدہ عمدہ قسم کے کھانے تھے۔ ہمارا میزبان بھی ہمیشہ کی بہ نسبت آج بہت مسرور نظر آتا تھا۔ اور ہر شخص سے مسکرا کر باتیں کرتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بادہ نوشی کا شغل شروع ہُوا۔ اور چند لمحوں میں درجنوں بوتلیں خالی ہوگئیں۔ آخرکار

اکل و شرب کے بعد ہم اپنے رخصت ہونے والے میزبان سے جُدا ہوتے۔ اس نے ہر شخص سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا۔ اور الوداع کہا۔ جب مَیں سلویو سے ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھا اور اس سے رخصت ہوتے تو اس نے مجھ سے ٹھیرنے کے لئے کہا۔

جب سب مہمان رُخصت ہو گئے۔ اور صرف ہم دونوں کمرہ میں تنہا رہ گئے۔ تو ہم نے ایک دوسرے کے مقابل نشست اختیار کی۔ اپنے اپنے سگار سلگائے۔ اور ایک دوسرے کو حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ سلویو افسردہ و دلگرفتہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرہ پر اُس مسرت و شادمانی کی جھلک باقی نہ تھی۔ جو چند لمحے پہلے تھی۔ بلکہ اس کے بجائے ایک پریشانی اور اضطراب نمایاں تھا۔ چند لمحوں کے بعد سلویو نے قفلِ خموشی وا کیا۔ اور کہنے لگا:۔

"شاید ہم اس دُنیا میں ایک دوسرے سے پھر نہ مل سکیں گے اور ہماری یہ ملاقات آخری ملاقات ہو گی۔ مَیں چاہتا ہوں کہ تم سے جُدا ہونے سے پہلے چند راز کی باتیں تمہارے گوش گزار کر دُوں۔ تاکہ میری طرف سے جو بدگمانی تم کو پیدا ہو گئی ہے وہ دُور ہو جائے۔"

یقیناً تم نے محسوس کیا ہو گا کہ باوجود اسقدر بے تکلفی اور میل جول کے مَیں نے کبھی کسی شخص کی طرف زیادہ التفات نہیں کی۔ مگر تمہاری جگہ میرے دل میں ضرور ہے۔ اس لئے مَیں نہیں چاہتا کہ میرے چلے جانے کے بعد تم مجھے نفرت و حقارت سے یاد کرو۔ اور میری طرف ایسی باتیں منسوب کرو۔ جن سے میرا دامن پاک ہے۔"

"تم کو تعجب ہو گا۔ کہ مَیں نے اس گستاخ افسر کو معاف کر دیا۔ اور اس سے انتقام نہیں لیا۔ اگرچہ مجھے اپنے نشانہ لگانے پر خود بھروسہ ہے لیکن پھر بھی مَیں نے مصلحتاً اس گستاخ کے عذر لنگ کو قبول کر کے اُس کو معاف کر دیا۔ اُس کی وجہ ایک اہم واقعہ ہے۔ پانچ سال ہُوئے کہ ایک شخص نے میرے مُنہ پر ایک طمانچہ مارا تھا اور آجتک مَیں اُس سے انتقام نہیں لے سکا ہوں۔"

یہ کہکر سلویو خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا مَیں بھی خاموش بیٹھا ہُوا حیرت کے ساتھ اس کے چہرہ کو دیکھتا رہا۔ مَیں نے پُوچھا۔ "آخر تم نے اُس سے بدلہ کیوں نہیں لیا؟ غالباً اس واقعہ کے بعد تم کو کسی وجہ سے اُس سے جُدا ہو جانا پڑا۔ اور پھر ملاقات نہیں ہُوئی۔"

اُس نے جواب دیا۔ "مَیں نے اُسی وقت اس سے انتقام لینے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر وہ قسمت کا دھنی تھا کہ میرے ہاتھ سے بچ گیا۔ تم کو معلوم ہے کہ مَیں ایک رسالہ میں نمایاں خدمات انجام دے چکا ہوں۔ میرے مزاج سے بھی تم بخوبی واقف ہو۔ سب کے آگے رہنا اور سب پر حکمرانی کرنا

میری فطرت میں داخل ہے۔ عنفوان شباب ہی سے یہ جذبہ میرے دل میں موجود ہے۔ بلکہ لڑکپن کے زمانے میں بھی میں اپنے ہم عمر لڑکوں میں ایک سردار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ میں اپنی رجمنٹ میں سب سے زیادہ غضبناک اور پُرجوش افسر خیال کیا جاتا تھا۔ اور باہمی مقابلوں میں جو اکثر ہوتے تھے میں یا تو اوّل نمبر ورنہ دوئم نمبر پر ضرور رہتا تھا۔"

اتفاقاً ایک نوجوان افسر جو ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا (میں اس کا نام ظاہر نہ کرونگا) ہماری رجمنٹ میں تبدیل ہو کر آیا۔

میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا جوشیلا حسین نوجوان نہیں دیکھا تم اپنی جوانی اپنی عقلمندی و زود فہمی خوبصورتی اور علوہمتی پر قیاس کر لو۔ اور اب تم کو اس افسر کی حالت کا کچھ اندازہ ہو جائیگا۔ میں اپنی چابکدستی اور فراست و دانائی کی وجہ سے اپنی رجمنٹ میں بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ اور ہر شخص میری عزّت و فرمانبرداری کرتا تھا۔ شہر کے لوگوں میں بھی مجھ کو کافی رسوخ حاصل تھا۔ مگر اس کے آنے سے میری قدر و منزلت کسی قدر کم ہو گئی۔ وہ نوجوان تھا، حسین تھا۔ خدا معلوم اس کی آنکھوں میں کیسا جادو اور زبان میں کیسی موہنی تھی کہ جو ایک بار اس سے ملتا اُسی کا دم بھرنے لگتا۔ چند ہفتوں کے اندر ہی ہر طبقہ کے لوگوں میں وہ ہر دلعزیز بن گیا۔ مجھے اس کی اس ہر دلعزیزی پر شک آیا۔ اور میں اس کو ذلیل کرنے کی فکر کرنے لگا۔ اکثر اُس سے چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ مگر باہم مقابلہ کی نوبت نہ آتی۔ آخر کار ایک محفلِ رقص میں جبکہ تمام حاضرین کی نظریں اُس پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے آہستگی سے اس کے کان میں چند ایسے الفاظ کہے جو اس کی ذات کے موجب ہو سکتے تھے۔ اس پر اس کو غُصّہ آ گیا۔ اور اُس نے میرے مُنہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ میں نے اپنا پستول سنبھالا اور اُس نے بھی لیکن حاضرینِ محفل کی پریشانی دیکھ کر جن میں زیادہ تعداد نوعمر حسین لڑکیوں کی تھی، ہم دونوں محفل سے اُٹھ کر چلے آئے۔ اور دوسرے دن صبح کو باہم مقابلہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔"

وہ رات میں نے بہت ہی بے چینی میں بسر کی صبح ہونے سے پہلے ہی میں اپنے تین ماتحتوں کے ساتھ مقررہ مقام پر جا پہنچا۔ اور بے صبری سے اپنے حریف کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ موسم بہار کا آفتاب بصد تابش حجلۂ مشرق سے برآمد ہُوا۔ اور ساتھ ہی میں نے اپنے حریف کو بھی اپنی طرف آتے ہوتے دیکھا۔ وہ ایک شخص کی معیت میں آہستہ آہستہ آ رہا تھا اور اپنی ٹوپی میں سیاہ شاہ دانے بھرے ہُوئے کھا رہا تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے بارہ قدم کا فاصلہ ناپ کر نشان لگا دیا۔ اور ہم ایکدوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے۔"

"اگرچہ مجھ کو پہلے وار کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ رات اپنا حملہ کر چکا تھا۔ لیکن اس وقت غم و غصّہ کی وجہ سے میرا اضطراب قلب اسقدر بڑھا ہُوا تھا۔ کہ مجھے اپنے نشانہ کے خطا ہونے کا خوف پیدا ہُوا۔ اپنے جذباتِ غضب کو فرو کرنے کے لئے اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے مَیں نے اپنا حق اپنے حریف کو دینا چاہا۔ مگر وہ اس پر رضامند نہ ہُوا۔ آخر قرعہ اندازی پر فیصلہ ہُوا۔ خوش قسمتی سے قرعہ اس کے نام پڑا۔ اور اُس نے فوراً اپنا پستول سنبھال کر داغ دیا۔ اس کی گولی میری ٹوپی سے چھلتی ہُوئی گزر گئی۔ اب میری باری تھی اور بظاہر اس کی موت و زیست میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن وہ باطمینان میرے سامنے کھڑا ہُوا شاہ دانے کھاتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس کا یہ اطمینان دیکھ کر مجھے بیحد تعجب ہُوا۔ اور فوراً ہی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا۔ کہ ایسے شخص کو مارنے سے کیا فایدہ جس کو اپنی زندگی کی مطلق پروا نہیں ہے۔"

" مَیں نے اپنا ہاتھ نیچا کر لیا۔ اور اُس سے کہا۔ جاؤ کھانا کھاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت بھُوکے ہو اور ابھی مرنے کے لئے تیار نہیں ہو' اُس نے جواب دیا۔ نہیں نہیں تم اپنا وار کرو یا پھر جیسی تمہاری مرضی۔ تمہارا حق مجھ پر ہے۔ اور مَیں ہمیشہ اس کی ادائیگی کے لئے تیار ہوں۔"

" اس واقعہ کے بعد مَیں اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر یہاں چلا آیا۔ اس دن سے آجتک کوئی روز ایسا نہیں گزرا کہ انتقام کا خیال میرے دل میں نہ آیا ہو۔ لیکن مَیں ایک خاص وقت کا منتظر تھا۔ اور اب وہ وقت آگیا ہے۔"

سلویو نے اپنی جیب سے وہ خط نکالا جو آج ہی کی ڈاک سے اس کو ملا تھا۔ اور میری طرف بڑھا دیا تاکہ مَیں اس کو پڑھوں۔ اُس کے کسی دوست نے ماسکو سے اس کو اطلاع دی تھی کہ " وہ شخص" ایک نوجوان حسین دوشیزہ سے شادی کرنے والا ہے۔

جب مَیں خط پڑھ چکا تو اُس نے کہا۔ " اب تم اندازہ کر سکتے ہو کہ " وہ شخص" کون ہو سکتا ہے مَیں ماسکو جا رہا ہوں۔ دیکھونگا کہ اب بھی اس کو اپنی زندگی کی طرف سے ایسی ہی بے پروائی ہے جیسی کہ پہلے موقع پر تھی۔" یہ کہکر وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور غضبناک شیر کی طرح کمرہ میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس عرصہ میں ایک ملازم کمرہ میں داخل ہُوا اور سلویو کو اطلاع دی کہ روانگی کا وقت آگیا ہے۔ سلویو نے پورے جوش و خلوص سے مجھ سے ہاتھ مِلایا۔ ہم دونوں بغلگیر ہوئے اور الوداع کہکر ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

(۲)

کئی سال گزر گئے ہیں خانگی ضروریات سے مجبور ہو کر

ملازمت ترک کرنے اور ایک چھوٹے سے موضع میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب میں ایک کاشتکار کی خاموش زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور اپنے گزشتہ غیر مطمئن زمانے کو یاد کر کے افسوس کرتا تھا۔ کہ میں نے اتنی مدت کیوں پریشانیوں میں گزاری لیکن موسم بہار اور سردی کا خوشگوار زمانہ تنہائی میں بسر کرنا میرے لئے موجب تکلیف تھا۔ میری رفیق زندگی ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ اور اس کی کوئی یادگار بھی نہ تھی۔ میں بالکل تنہا تھا۔ اور اکثر اوقات اپنی اس تنہائی سے گھبرا جاتا تھا۔ شام کے کھانے کے وقت تک میں ادھر اُدھر پھرتا۔ اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا یا اپنے ملازموں سے گفتگو کرتا تھا۔ آفتاب کے غروب ہوتے ہی میں گھر آجاتا اور سوچنے لگتا کہ "اب کیا کروں ؟" چند کتابیں جو میرے پاس تھیں۔ بار بار پڑھنے سے مجھے یاد ہو گئی تھیں۔ اور میری داروغہ مکان کو جسقدر کہانیاں یاد تھیں میں سب سن چکا تھا۔ دیہاتی لڑکیوں کے گیت سنتے سنتے میں اکتا گیا تھا۔ الغرض تنہائی میرے لئے عذاب جان تھی۔

میرے ہمسایہ میں سوائے دو تین معمولی درجہ کے کسانوں کے کوئی میرا ہم مذاق نہ تھا۔ اور اُن کی صحبت میری افسردہ دلی کو دور نہ کر سکتی تھی۔ میرے مکان سے چار میل کے فاصلہ پر ایک جاگیر تھی۔ جو ایک کاؤنٹیس کی ملکیت تھی۔ وہاں صرف ایک کارندہ جاگیر کی دیکھ بھال کے لئے رہتا تھا اور اس کی مالکہ زندگی بھر میں صرف ایک بار وہاں آئی تھی۔ امسال موسم بہار میں یہ افواہ پھیلی کہ کاؤنٹیس مع اپنے شوہر کے موسم گرما بسر کرنے کے لئے اپنی جاگیر میں آئیگی کسی بڑے آدمی کی آمد دیہاتیوں کیلئے ایک واقعہ سا ہوتا ہے۔ اس کی آمد سے قبل اس کے دوران قیام میں اور اس کے چلے جانے کے بعد عرصہ تک اس کا ذکر خیر رہتا ہے۔ اور جہاں چار آدمی ملکر بیٹھتے ہیں وُہی افسانہ بار بار دھرایا جاتا ہے۔

اوائل جون میں کاؤنٹیس مع اپنے شوہر کے آگئی اور اُن کی آمد کے چوتھے روز میں اُن سے ملنے گیا بحیثیت ہمسایہ ہونے کے میرا فرض تھا کہ میں اپنے محترم پڑوسیوں سے ملکر تبادلۂ خیالات کروں۔ خادم مجھے ملاقات کے کمرہ میں بٹھا کر کاؤنٹ کو اطلاع کرنے کے لئے گیا۔ کمرہ ہر قسم کے سامان سے آراستہ تھا۔ دیواروں پر تصاویر و آئینے آویزاں تھے۔ اور فرش پر خوشنما قالین بچھے ہوئے تھے۔ میں کمرہ میں بیٹھا ہوا بے صبری سے کاؤنٹ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنے آپ کو اس سے متعارف کروں۔ کہ یکایک کمرہ کا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت بتیس سالہ جوان اندر داخل ہوا میں اسکی تعظیم کے لئے سروقد کھڑا ہو گیا۔ کاؤنٹ میری طرف آیا۔

اور دوستانہ طریقہ پر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

بحیثیت ایک فوجی ملازم کے مَیں بڑے بڑے افسروں سے مِل چُکا تھا۔ مگر آج خلافِ معمول کاونٹ سے ملکر میرا اضطراب قلب بڑھ گیا۔ مَیں بار بار اپنے دل پر قابو پانے اور اُس سے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر مَیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہ پا سکتا تھا۔ اسی حالت میں کاونٹیس بھی یکایک کمرہ میں آگئی اور مَیں بالکل حواس باختہ ہوگیا۔ وہ حسین تھی ایسی حسین کہ آجتک کوئی ایسی عورت میری نظر سے نہ گُزری تھی۔ کاونٹ نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ لیکن میرا اضطراب لحہ بہ لحہ ترقی کرتا گیا۔ آخر وہ میری حالت دیکھ کر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ اور میری طرف سے بالکل بے خبر ہو گئے۔

مَیں اپنی پریشانی کو دُور کرنے اور اپنے اُوپر قابو حاصل کرنے کے لئے کمرہ میں ٹہلنے اور تصاویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ تصویروں سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن ایک تصویر نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا اس تصویر میں سویزرلینڈ کا ایک منظر دکھایا گیا تھا۔ اس کا رنگ و روغن میرے لئے زیادہ خوش آئند نہ تھا لیکن جس چیز نے مجھے اس کو بغور دیکھنے پر مجبور کیا وہ اس کے وہ دو سوراخ تھے۔ جو نیچے اُوپر کسی چابکدست نشانہ باز کے غیر فانی نقوش ہونے کا پتہ دیتے تھے۔ اس تصویر کو دیکھ کر بیساختہ میری زبان سے نکلا:۔

مَیں۔ واہ! کیا خوب کسی نے نشانہ لگایا ہے۔

کاونٹ۔ واقعی۔ کیا تم بھی اچھا نشانہ لگا سکتے ہو۔

مَیں۔ شاید۔ مَیں تیس قدم کے فاصلہ سے صحیح نشانہ لگا سکتا ہوں۔

کاونٹیس۔ سبحان اللہ! (کاونٹ سے مخاطب ہوکر) اور تم میرے پیارے! کیا تم بھی اتنے فاصلہ سے صحیح نشانہ لگا سکتے ہو؟

کاونٹ۔ مَیں اپنی ملازمت کے زمانہ میں کچھ بُرا نشانہ نہ لگاتا تھا لیکن اب تو چار سال سے مَیں نے پستول کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اچھا کسی دن ہم آزمائش کرینگے۔

مَیں۔ چار سال! جناب! پستول کی نشانہ بازی کیلئے تو روزانہ مشق کی ضرورت ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ مَیں اپنی رجمنٹ میں بہترین نشانہ باز خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ اتفاق سے مَیں بیمار پڑ گیا۔ اور ایک ماہ تک کچھ نہ کر سکا۔ مگر جب پہلی بار مَیں نے پستول ہاتھ میں لیا۔ تو باور کیجئے۔ مَیں صرف بیس قدم کے فاصلہ سے ایک بوتل کو ہدف نہ بنا سکا۔ مَیں نے ایک بہترین نشانہ باز کو دیکھا ہے۔ جو روزانہ بلا ناغہ اس کی مشق کرتا تھا اسکا معمول تھا کہ دوپہر اور شام کے کھانے سے قبل کم ازکم تین نشانے وہ ضرور لگاتا تھا۔ اور اس کی مشق اسقدر

بڑھی ہوئی تھی کہ دیوار پر بیٹھی ہوئی مکھی کو ہدف بنانا اور کبھی اس کا نشانہ خطا نہ کرتا۔

کاؤنٹیس میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ گویا اس کو میرے کہنے کا اعتبار نہ تھا۔ مگر کاونٹ خاموش بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ آخر اس نے مجھ سے پوچھا۔

کاونٹ۔ وہ شخص کون تھا؟

میں۔ سلویو۔

کاونٹ۔ سلویو! کیا تم اس کو جانتے ہو؟

میں۔ جی ہاں، وہ میرا گہرا دوست تھا۔ لیکن اب پانچ سال سے اس کا کچھ حال معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی اس سے واقف ہیں۔

کاونٹ۔ ہاں، بہت اچھی طرح۔ کیا کبھی اُس نے کوئی اہم واقعہ تم سے بیان کیا تھا؟

میں۔ کیا جناب کا مطلب اُس واقعہ سے ہے جب ایک معزز شخص نے سلویو کے منہ پر طمانچہ مارا تھا؟

کاونٹ۔ ہاں۔ لیکن کیا اُس نے تم کو اپنے حریف کا نام نہیں بتایا تھا؟

میں۔ جی نہیں —— مگر میں سمجھتا ہوں —— معاف کیجئے —— شاید وہ آپ ہی ہیں۔

کاونٹ (کسی قدر پریشان ہوکر) بیشک، میں ہی ہوں اور یہ تصویر جس پر دو گولیوں کے نشان ہیں ہماری آخری ملاقات کی یادگار ہے۔

کاؤنٹیس جو خاموش بیٹھی ہوئی ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ یکایک بول اُٹھی۔ اور کاونٹ سے کہا کہ وہ اس منحوس واقعہ کا اعادہ نہ کرے۔ کیونکہ اُس کے سُننے سے اس کو پریشانی ہوگی۔ لیکن اُس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھو یہ شخص سلویو کا دوست ہے اور اس کو معلوم ہے کہ میں نے اس کے دوست کی کس طرح توہین کی تھی۔ لہٰذا میرے لئے یہ لازمی ہے کہ میں پورا افسانہ اس کے سامنے بیان کردوں۔ تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ سلویو نے کس شریفانہ طریقہ سے مجھ سے بدلہ لیا۔"

یہ کہکر کاونٹ میری طرف مخاطب ہوا اور اس طرح کہنے لگا:۔

"پانچ سال ہوئے کہ میری شادی ہوئی تھی۔ اور میں کاؤنٹیس کے ہمراہ اسی گاؤں میں مقیم تھا۔ یہ مکان جس میں اس وقت ہم بیٹھے ہوتے ہیں۔ اگر ایک صورت سے مسرت آمیز لمحات کی یادگار ہے تو دوسری حیثیت سے ایک خوفناک واقعہ کی بھی یاد دلاتا ہے۔ ایک روز جب ہم شام کی تفریح کے بعد مکان واپس آتے تو مجھے اطلاع ملی کہ کوئی شخص ملاقاتی کمرہ میں بیٹھا ہوا میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اپنا نام بتانا نہیں چاہتا لیکن کسی خاص

ضرورت سے مجھ سے ملنے کا آرزو مند ہے۔"
مَیں کمرہ میں داخل ہُوا۔ اور ایک ایسے شخص کو جس کے کپڑے گرد آلود تھے۔ سر جھکائے کسی گہرے خیال میں بیٹھے ہُوئے دیکھا۔ کمرہ میں کافی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے مَیں اس کو نہ پہچان سکا۔ کمرہ کے دروازہ کُھلنے کی آواز سے وہ چونک پڑا۔ اور میری طرف دیکھ کر طعن آمیز لہجہ میں کہا۔" اخّاہ! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"
اس کی آواز سُنکر مَیں نے اس کو پہچانا اور حیرت زدہ ہو کر پُوچھا۔" سلوِیو! تم یہاں کہاں؟" مجھے گزشتہ واقعہ یاد آگیا۔ اور موت کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہُوئی۔"
اُس نے کہا۔ کاونٹ! آج مَیں تم سے انتقام لینے کے لئے آیا ہوں۔ کیا تم جان دینے کے لئے تیار ہو؟ اُس کے اس سوال نے مجھے پریشان کر دیا۔ لیکن ایفائے وعدہ کرنا ضروری تھا۔ اس لئے مَیں اس کے سوال کا جواب دینے کے عوض بارہ قدم کا فاصلہ ناپ کر کمرہ کے ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا۔ اور اُس سے کہا کہ جلد اپنا وار کرو۔ سلوِیو نے جیب سے پستول نکالکر میری طرف نشانہ باندھا۔ اُس وقت مَیں اپنی بدقسمتی پر افسوس کر رہا تھا کہ ایسے وقت میں پیغام اجل آیا ہے جبکہ مجھے شادی کئے ہُوئے صرف چند ہفتے گزرے ہیں اور دل کے ارمان دل ہی میں ہیں۔ میرے چہرہ سے افسردگی اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ سلوِیو میری اس بے بسی کی حالت سے بہت متاثر ہُوا۔ اور اُس نے اپنا ہاتھ نیچا کر لیا اور کہا۔" کاونٹ۔ دیکھو اس پستول میں شاہ دانے کی گٹھلیاں بھری ہُوئی نہیں ہیں بلکہ فولادی گولیاں ہیں لیکن بہتر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم نئے سر سے مقابلہ کریں۔ یہ کہکر اس نے قرعہ پھینکا۔ اور میرے نام پر پڑا۔ اس نے مُسکرا کر کہا۔ کاونٹ! تم بڑے خوش نصیب ہو معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی مرنا نہیں چاہتے۔ خیر اب تم وار کرو۔ دیکھو قسمت کیا دکھاتی ہے۔ مَیں اسقدر پریشان تھا کہ مَیں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس موقع کو غنیمت سمجھکر اپنا پستول سنبھال کر اس کی طرف داغ دیا لیکن نشانہ خطا ہُوا۔ اور گولی اس تصویر پر پڑی۔"
پستول کی آواز سُنکر کاونٹیس بیتابانہ کمرہ میں داخل ہُوئی اور میری گردن میں باہیں ڈال کر حیرت آمیز لہجہ میں مجھ سے پُوچھا کہ کیا واقعہ ہے۔ مَیں نے اس کو تسلّی دی اور بتایا کہ ہم صرف مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن اس کو اطمینان نہ ہُوا اور اس نے سلوِیو سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ اُس نے کہا۔ کاونٹیس! کاونٹ تو ہمیشہ مذاق ہی کیا کرتا ہے۔ ایک بار مذاق ہی مذاق میں اس نے میرے مُنہ پر ایک طمانچہ مارا تھا۔ اور ایک مرتبہ مذاق ہی میں اپنا

پستول میرے اُوپر خالی کیا تھا۔ اور ابھی ابھی اُس نے پھر مجھ کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ بھی مذاق ہی تھا۔ اور اب میں بھی ایسا ہی مذاق کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے اپنا پستول میری طرف سیدھا کر لیا۔ یہ دیکھکر کاؤنٹیس بیتابانہ اُس کے قدموں پر گر پڑی اور بے اختیار رونے لگی"

"کاؤنٹیس کی اس کمزوری پر مجھ کو بے حد غصّہ آیا اور میں نے اس کو سلویو کے قدموں سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا۔ اور سلویو سے کہا کہ براہِ کرم جلد اپنا وار کرو لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اُس نے اپنا ہاتھ نیچا کر لیا۔ اور کہنے لگا "کاؤنٹ! بس میں نے تمہاری ہمت اور بہادری دیکھ لی۔ اب میں مطمئن ہوں۔ اور تم کو معاف کرتا ہوں تاکہ تم عمر بھر اپنی بُزدلی اور میری عالی ہمّتی کو یاد رکھو۔ اور تمہارا ضمیر ہمیشہ تم کو ملامت کرتا رہے۔"

یہ کہکر واپس جانے کے لئے وہ دروازہ کی طرف مُڑا۔ اور چلتے چلتے اس تصویر پر اپنا پستول خالی کر دیا۔ جس پر میرا نشانہ پڑ چکا تھا۔ یہ تصویر اسی واقعہ کی یادگار ہے۔"

کاؤنٹ خاموش ہو گیا۔ کاؤنٹیس کے چہرہ سے پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ اور اس طرح مجھے اُس افسانہ کا انجام معلوم ہوا جس کے ابتدائی واقعات نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔

اس واقعہ کو مُدّت گزر گئی مگر پھر سلویو کا کہیں پتہ نہ ملا لیکن سلویو کی عزّت و وقعت اب پہلے سے زیادہ میرے دل میں ہے۔ اور میں اس کی عالی ہمّتی اور جوانمردی کا مدّاح ہوں۔

(ماخوذ) **راز چاندپوری**

نوائے راز

سراپا آرزو بن کر سراپا آرزو ہو کر
تلاش یار میں نکلا ہوں محو جستجو ہو کر

یہ عالم ہے کہ ہر داغِ محبت گلشنِ غم ہے
چلا ہوں اس گلستاں سے خرابِ رنگ و بو ہو کر

مدد اے دیدۂ خونریز میری بات رہ جائے
حضورِ داورِ محشر تو پہنچوں سرخرو ہو کر

نہ کیفِ زندگی باقی نہ ذوقِ بے خودی باقی
ملا کیا خاک مجھ کو بے نیازِ آرزو ہو کر

بتاؤ تو سہی اے راز آخر راز ہے یہ کیا
بُتوں کو پُوجتے ہو تم ہمیشہ قبلہ رو ہو کر

راز

احساسات

عجب طرح کا ہے کچھ آج اضطراب مجھے　　کہ زندگی نظر آتی ہے اک عذاب مجھے
دکھا رہے ہیں جو وہ حُسن بے حجاب مجھے　　بنا رہے ہیں وہ ذرّے سے آفتاب مجھے
چمن میں خوب ہی دیکھی گلوں کی جلوہ گری　　ملا نہ حسن کا تیرے کہیں جواب مجھے
دُعائے وصل کے بعد اب یہ خوف ہے مجھ کو　　کہ جذبِ دل کہیں کہہ دے نہ کامیاب مجھے
رہِ درازِ محبت کی مشکلات نہ پُوچھ　　قدم قدم پہ ملی منزلِ صحاب مجھے
یہ کس کے پرتوِ رنگیں کا فیض ہے یارب　　کہ داغِ دل نظر آتا ہے آفتاب مجھے
کرے گا غرقِ محبّت یہ دیدۂ خونبار　　مٹائے گا یہ مرے دل کا اضطراب مجھے
مرے ملال کا جب ہو سکا نہ اُن سے علاج　　چھپا لیا پسِ صد پردۂ حجاب مجھے
وہ ابتدائے محبّت میں شوق کی تاثیر!　　کہ ہر ستم میں تھا اِک لطفِ بے حساب مجھے
اب انتہائے جنوں میں یہ میری محرومی!　ق　کہ تیرے لطف و کرم نے کیا خراب مجھے
مرے ملال کی وسعت کا کیا ٹھکانا ہے　　سکونِ عیش میں بھی حبب ہے اضطراب مجھے

نگاہِ ناز سے وہ ارتباط کا آغاز!
جلیلؔ یاد ہے اب تک مثالِ خواب مجھے

جلیلؔ قدوائی
علیگ

بہشت و دوزخ

(ڈینٹے کے نقطہ نظر سے)

یورپی تہذیب کی تاریخ کو چار ابواب میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جن کے زیب عنوان چار عظیم الشان شاعروں کے نام ہیں۔ پہلا باب قرون قدیمہ کی تہذیب پر مستعمل ہے۔ جس کا خلاصہ ابوالآبائے شاعری ہومر کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا دور قرون وسطیٰ کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس دور کی روح رواں اٹلی کے شاعر اعظم ڈینٹے کی تصانیف ہیں۔ تیسرا دور پہلے دور کی علمی و فنی تجدید تھا۔ اسی وجہ سے اُسے احیاء العلوم کا نام دیا جاتا ہے۔ اور اس کا نمائندہ فن ڈرامہ کا اُستادِ کامل یعنی شیکسپیئر ہے۔ چوتھا دور زمانہ حاضرہ کا ہے جو اٹھارہویں صدی کے اخیر سے شروع ہوتا ہے۔ اور اگرچہ جنگ عالمگیر نے دُنیا کی تہذیب میں ایک انقلاب عظیم برپا کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا حقیقت سے بعید نہیں کہ اس چوتھے دور کی خصوصیات تمام و کمال باقی ہیں۔ اس دور کے ذہنی ارتقا کا مظہر کامل جزی کا سب سے بڑا شاعر گوئٹے آج بھی عصر جدید کا مجدد مانا جاتا ہے۔

یورپی تہذیب کے ان اراکین اربعہ میں سے دوسرا رکن یعنی ڈینٹے اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے۔ وہ اٹلی کے مشہور اور خوبصورت شہر فلارنس میں مئی ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا تھا بعض سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ ڈینٹے اٹلی کے پرانے خاندان "فرانگی پانی" سے تعلق رکھتا ہے مگر شاعر خود اپنا سلسلہ نسب بہادر کیسا گیڈا سے ملاتا ہے۔ جس نے ایلڈیگری سے شادی کی تھی اور جو شہنشاہ کانرڈ سوم کے ساتھ مذہبی جنگ کے دوران میں شہید ہوا۔ شاعر کا باپ اٹلی کا ایک زبردست وکیل تھا۔ اور خاندانی ہونے کے باعث قرب و جوار میں ہر دلعزیز تھا

ڈینٹے کے زمانہ طفلی کے متعلق ہمیں زیادہ علم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ بچپن ہی سے ذہین، عالی دماغ اور برنیٹو ٹینی کا شاگرد تھا۔ جو اپنے زمانے کا مشہور فلاسفر گزرا ہے۔

ڈینٹے کے کلام کی دلچسپی کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ اس سے اُس زمانہ کی معاشرت، تہذیب و تمدن اور مذہبی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنی مشہور نظم "زمزمۂ قدس" میں ہمیں سارے عالم کے اندر ایک

حیرت انگیز سفر کراتا ہے۔ کہیں تو وہ ہمیں تحت الثریٰ
میں لیجاتا ہے۔ اور کہیں عالم بالا میں عالم سیارگان سے
بھی پرے لیجاتا ہے۔ اور اس کی وسعتِ نظر اس لحاظ
سے ہمیں حیرت انگیز اور مافوق العادۃ معلوم ہوتی ہے۔ کہ
تیرھویں صدی میں طبقاتِ عالم کے متعلق دُنیا کی معلومات
کا احاطہ اتنا وسیع نہ تھا جتنا آج ہے۔

ڈینٹے کے زمانہ کے نقشوں کا اگر ملاحظہ کیا جائے
تو معلوم ہوتا ہے کہ باغ عدن دریائے گنگا سے بھی پرے
کہیں مشرق میں واقع ہے لیکن چونکہ درمیان میں ایک
وسیع سمندر حائل ہے۔ اس لئے اُس تک پہنچنا ناممکن
ہے۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ طارطارش جہاں مردوں کی
رُوحیں جمع ہوتی ہیں۔ زمین کے اندر ہے۔ اور اسی خیال
کی بنا پر اکثر مسیحی مفسرین نے دوزخ کو زمین کے اندر قرار
دیا ہے۔

ڈینٹے کے عشق و محبت کا افسانہ بھی اس قابل
ہے کہ اُسے نظر انداز نہ کیا جائے۔ بیٹرس کے متعلق جس
سے اُس کی محبت پرستش کے درجے تک پہنچی ہوتی تھی
کہتا ہے:۔

مَیں نہیں کہہ سکتا مگر ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جس
طرح بادشاہ بے نوا گداؤں سے نفرت کرتے ہیں اور
گدا آآکے انہیں کے در پر صدا دیتے ہیں۔ جس طرح
شمع پروانوں کی دشمن ہے۔ اور پروانے چھا چھا کے اسی
پر دم توڑنے آجاتے ہیں۔ اسی طرح اے بیٹرس!
مَیں بھی ہر پھر کے تیری ہی حریم ناز کے سایہ میں دم لیتا ہوں

بیٹرس کی بیوقت موت نے ڈینٹے پر جو اثر کیا
اس کے متعلق وہ اپنی نظم موسومہ   میں
کہتا ہے۔ "جو فوق العادہ ہستی میرے مقاصد و مطالب
کو ایک شیرازے میں منضبط کئے ہوتے تھی۔ اُس کی
جُدائی سے میرے نظام حیات میں ہلچل مچ گئی۔ دُنیا میری
نگاہ میں تاریک ہو گئی۔ اور مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ
گویا مَیں دُنیا میں چند ہی دن کا مہمان ہوں۔" کہتے ہیں۔
کہ وہ اسقدر رویا کہ کچھ عرصہ کے لئے اُسے دُنیا کی ہر چیز
فراموش ہو گئی تھی۔

مذکورہ نظم   کے افتتاحی سین
میں شاعر اپنی اس تکلیف کا خاکہ کھینچتا ہے۔ جب وہ ایک
تاریک، ویران اور خوفناک جنگل سے نکلنے کی کوشش
کرتا ہے۔ مگر تین جنگلی جانور اس کے راستے میں حائل
ہوتے ہیں۔ اس وقت بیٹرس اس پر رحم کھا کر بہشت
سے ورجل کو اس غرض سے اپنے عاشق کے پاس بھیجتی
ہے۔ کہ وہ اسے دوزخ اور اعراف کے اندر سے گزار
دے۔ جس کے بعد اس کا ارادہ خود اُسے آسمان پر
لیجانے کا تھا۔ یہ ایک استعارہ ہے جس سے مراد یہ ہے

کہ انسانی روح گناہوں کے جال اور غلط کاریوں میں پھنسی ہوتی ہے۔ فلسفہ اُسے گناہ کی تاریکی اور تکالیف دکھا کر استغفار کے راستہ پر لیجاتا ہے۔ اس کے بعد اُس کی آنکھیں نیکیوں کے سرچشمہ (یعنی خدا) کا مشاہدہ کرتی ہیں۔

جس وقت ڈینٹے اور ورجل دوزخ کے دروازہ سے نکل کر تحت الثریٰ میں اُترتے ہیں شفق کی سُرخی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مگر زمین کے نیچے کے طبقہ میں بیحد تاریکی ہے۔ جس سے مُراد گناہ کی تاریکی ہے۔ وہاں ستارے نہیں چمکتے، سُورج نہیں نکلتا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

دروازہ پر ہر رُوح کا امتحان کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ سب طبقات اسفل میں اپنی جائے مقررہ کی طرف جانے لگتی ہیں۔ اُن میں سے زیادہ گناہگار روحیں اور بھی نیچے جاتی ہیں۔ جس طرح تمام وزنی چیزیں مرکزِ زمین کی طرف کھنچتی ہیں۔ اُسی طرح گنہگار روحیں اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبی چلی جاتی ہیں۔ دوزخ بہت بڑی مخروطی شکل کا ہے۔ جس کے اندر ہزاروں سینکڑوں ستون ہیں۔ ان ستونوں کے قریب سے دونوں شاعر یکے بعد دیگرے گزرتے ہیں۔ دروازہ کے قریب ایک دریا ہے ناپید اکنار کے اندر نیک بُت پرستوں اور ان کی اولاد کے رہنے کی جگہ ہے۔ جن کا بپتسمہ نہیں ہوتا۔ یہ روحیں ایک قسم کی مدھم روشنی میں رہتی ہیں۔ اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی

اس سے نیچے ان لوگوں کے طبقات آتے ہیں۔ جنہوں نے شہوتِ نفسانی، مرض طمع یا غُصّہ میں آکر گناہ کیئے۔ اور اب ان کی سزا بھگت رہے ہیں۔

جن لوگوں نے زیادہ خوفناک جرم کیئے ہیں اُن کے بوجھ زیادہ بھاری ہوتے ہیں۔ ان طبقات پہنچنے کے لیئے جہاں اُن کی روحیں رہتی ہیں۔ ڈینٹے کو ڈیس کے شیطانی شہر کی فصیلوں کے اندر سے گزرنا پڑتا ہے جن کے محافظ خُدائی قہر کے مجسمے ہیں۔ راستہ میں اُسے ایک خون کی اُبلتی ہوئی ندی نظر آتی ہے۔ اور ایک خوفناک جنگل ہے جس میں انسان صورت درخت اُگے ہوئے ہیں۔ گرم ریت کا ایک صحرا ہے۔ جہاں آگ کے شعلے، برف کے گالوں کی طرح برستے ہیں۔ یہ ظالموں، بدکاروں مفسدوں اور مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کی رُوحوں کا مسکن ہے۔

کنارے کے تپتے ہوئے رہگذار پر ایک بہت بڑا ٹیلہ ہے جس سے پیدل اُترنا ناممکن نظر آتا ہے۔ اس جگہ ورجل کا اشارہ پاکر ایک صورت نمودار ہوتی ہے۔ جس کا بدن ایک بہت بڑے اژدھے کی مانند ہے۔ ڈینٹے یہ معلوم کر کے کہ انہیں اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر پار اُترنا ہوگا بہت گھبراتا ہے۔ یہ طبقہ دس گڑھوں پر منقسم ہوتا ہے۔

جو کہ مرکزی گڑھے کے گرد اس طرح نظر آتے ہیں۔ جیسے قلعہ کے گرد خندقوں کا سلسلہ۔ ڈینٹے جونہی ان میں سے گزرتا ہے۔ اُسے چور، مکار اور جادوگر وغیرہ سزا پاتے ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہاں روحیں پہلے طبقات کی بہ نسبت زیادہ غلیظ ہوتی ہیں۔ آگے چل کر انہیں ایک عمودی گہرائی سے گزرنا پڑتا ہے۔ جہاں ایک بڑا دیو انہیں اُتار کر نیچے لیجاتا ہے۔ یہاں وہ یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ منجدھار پر چل رہے ہیں۔ اس جھیل کے اندر اُن لوگوں کی روحیں غرق ہیں۔ جنھوں نے پیمان شکنی کی۔ اور اپنے رشتہ داروں اور ہوا خواہوں سے غدّاری اور دغابازی کا سلوک کیا۔

اس تاریک کرۂ ہوائی میں ڈینٹے کو ایک چیز نظر آتی ہے۔ جسے وہ پون چکّی تصوّر کرتا ہے۔ جس کی گردش سے برف کی طرح سرد ہوا پیدا ہوتی ہے لیکن نزدیک پہنچکر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام بدیوں کے منبع، شیطان کے پر ہیں۔ کسی زمانہ میں وہ عالم بالا پر فرشتوں کا اُستاد تھا۔ لیکن اب تمام گناہوں کا مرکز و مرجع ہے۔

یہاں پہنچکر ورجل واپس چلنے کے لئے کہتا ہے ڈینٹے اس وقت بیحد خائف ہوتا ہے جبکہ وہ اس عظیم الجثّہ دیو کے جسم پر سے آہستہ آہستہ نیچے اُترتے ہیں۔ یہاں تک کہ وسط میں پہنچکر ورجل بہت بڑی کوشش کر کے پلٹتا ہے۔ اور ڈینٹے کو ساتھ لیکر پھر ایکبار اُوپر کو چڑھنے لگتا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جب وہ دم لینے کے لئے ٹھہرتے ہیں تو ورجل کہتا ہے کہ اب صبح کا وقت ہے اور جہاں سے ہم ابھی گزرے ہیں وہ دُنیا کا مرکز ہے۔ ہم شہر یروشلم کے نیچے اُتر چکے ہیں۔ اور اب کرّہ کی سمت مقابل کی طرف جا رہے ہیں۔

آرام کا خیال نہ کر کے دونوں شاعر پوشیدہ زینہ پر چڑھنے لگتے ہیں۔ اور آخرکار کوئی بیس گھنٹے کے بعد ڈینٹے کو چٹان کے اندر ایک گول شگاف نظر آتا ہے جس کے اندر سے " وہ تمام خوشنما چیزیں جو آسمان پر چمکتی ہیں۔ جب باہر نکلتے ہیں۔ تو ستارے نظر آتے ہیں۔ دوزخ کے اندر وہ رات کو داخل ہوئے تھے۔ اور اعراف میں اس وقت پہنچے۔ جب پو پھٹنے والی تھی۔ اسی جگہ نظم کے ایک نہایت نفیس حصّہ میں نیلگوں آسمان کی کیفیّت بیان کی گئی ہے۔ جس میں ستارہ زہرہ چمکتا ہے اور جنوبی ستارے چمکتے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ طلوعِ آفتاب سے اُن کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ یہاں ڈینٹے نے خصوصیت کے ساتھ قطب جنوبی کے چار چمکدار ستاروں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں شمال کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے جب سے

آدم علیہ السلام کو اس فردوس بریں سے جو اس پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا نکالا گیا۔ کسی انسان کی نظر ان ستاروں پر نہیں پڑی۔ شام کے وقت جب یہ ستارے کسیقدر نیچے ہوتے ہیں تو تین اور ستارے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ ساتوں ستارے نیکیاں ہیں۔ جن سے انسان کے گناہ میں مبتلا ہونے کے وقت سے عدم توجہی برتی گئی ہے۔

اس جگہ روحیں ایک جہاز میں سوار ہو کر آتی ہیں جس کی ناخدائی ایک فرشتہ کرتا ہے۔ اتنے میں دونوں شاعر کوہ اعراف پر چڑھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ دُنیا میں سب سے اُونچا پہاڑ ہے۔ لیکن جوں جوں گناہ کے بوجھ سے دبی ہُوئی رُوح آزاد ہوتی جاتی ہے۔ چڑھائی آسان ہوتی جاتی ہے۔ بہشت میں ہمیشہ روشنی رہتی ہے۔ لیکن یہاں دن رات باری باری آتے ہیں۔ آفتاب دونوں شاعروں کی رہبری کرتا ہے۔ یہاں ڈینٹے مختلف اوقات، موسموں اور طول بلد و عرض بلد کے لحاظ سے اجرام فلکی کی حرکات کا حساب بڑی صحت کے ساتھ درج کیا ہے۔

کنارے پر اور پہاڑ کی ڈھلوانوں پر بعض ایسی روحیں تھیں۔ جو تزکیۂ نفس کے عمل کی ابتدا ابھی نہیں کر سکتیں کیونکہ اُنہوں نے دُنیا میں اپنی زندگی کے آخری حصّے سے پہلے توبہ نہ کی تھی۔ حقیقی اعراف کی ابتدا اسوقت سے ہوتی ہے۔ جب وہ اس دروازہ میں داخل ہو جائیں جو پہاڑ پر اسقدر بلندی پر واقع ہے کہ اُس سے نکل کر وہ روحیں بادلوں سے اوپر کے طبقہ میں داخل ہو جاتی ہیں۔ جہاں اثر کے توجات کا کچھ اثر نہیں پڑتا یا جہاں بارش، اولے اور برف کا نام و نشان نہیں۔ اس پہاڑ کے ساتھ تین چبوترے اس طرح بنے ہُوتے ہیں۔ کہ نیچے کے چبوترہ سے شروع ہو کر بالائی چبوترہ تک ایک زینہ سا بن گیا ہے۔ غرض تین دن تک ڈینٹے اور اس کا رہبر دونوں اس زینہ پر چڑھتے گئے اور راستہ میں اُن روحوں سے گفتگو کرتے گئے۔ جو اس خیال سے خوش تھیں کہ جونہی ہم اُن گناہوں سے پاک ہو جائینگی جو ہم نے دُنیا میں کئے ہیں تو ہم بہشت میں داخل کیجائینگی

تیسری شام کو ڈینٹے چٹان کے آخری زینہ پر سو جاتا ہے اور دن نکلنے پر اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر پاتا ہے۔ درختوں پر پرندے چہچہاتے ہیں۔ زمین پر پھول اُگے ہُوتے ہیں۔ اور شفاف پانی کی ندیاں بہ رہی ہیں۔ درحقیقت وہ اعراف کے چبوتروں سے بھی بالائی کرہ ہوائی میں پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ جب وُہ طلوع ہونے والے سورج کی طرف دیکھتا ہے۔ تو

دھیمی دھیمی رفتار سے چلنے والی بادِ نسیم اس کے چہرہ سے مس کرتی ہے اور اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ طبقات کی گردش کا اثر ہوا پر بھی پڑتا ہے۔ اور ہوا مشرق سے مغرب کی طرف چلتی رہتی ہے۔ فردوسِ بریں کو اس جگہ قائم کرنے کی اہمیت اب واضح ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی معصومی کی ابتدائی حالت میں یہاں آسمان کے قریب رہا کرتا تھا۔ اور اس کی رُوح جب دوبارہ پاکیزگی حاصل کرتی ہے۔ تو اس وقت بھی یہیں پہنچ جاتی ہے۔ تاکہ وقتِ مناسب پر آسمان کی طرف چلی جاتے۔

یہاں ڈینٹے اپنی معشوقہ بیٹرس کو دیکھتا ہے اور وہ جلد انہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ دوپہر کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور آفتاب نصف النہار پر پہنچ جاتا ہے تو بیٹرس اپنی آنکھیں اس پر جما دیتی ہے۔ ڈینٹے بھی اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ مگر تیز روشنی کی کرنیں اس کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہیں۔ لیکن بیٹرس اس کو تسلی دیتی ہے اور کہتی ہے کہ " اب تم زمین پر نہیں ہو۔ بلکہ تمہاری رُوح گناہ سے پاک ہو کر قدرتی طور پر آسمان کی طرف جا رہی ہے۔"

یہاں بیٹرس اس سے خوش ہو کر کہتی ہے کہ اب وہ ستارۂ اول میں پہنچ چکے ہیں۔

ڈینٹے نے ساتوں ستاروں کی کیفیت جن میں وہ یکے بعد دیگرے پہنچا ہے۔ نہایت دلچسپ لکھی ہے اُن میں اُسے راحت کے مختلف مدارج کی رُوحیں نظر آتی ہیں۔ جو اُس سے ملاقات کرتی ہیں۔ وہ سب فلک الافلاک ہی میں رہتی ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ڈینٹے ایک دفعہ پھر کوشش کر کے بیٹرس کے ساتھ فلک اولیٰ پر پہنچا ہے جس کو بیٹرس ایک گلدستہ سے مشابہ قرار دیتی ہے۔ جس کے اندر کے درختِ وقت کی جڑیں پوشیدہ ہیں۔ اور جس کے پتے دوسرے طبقات عالم میں نمودار ہوتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں یہی طبقہ، سُورج، چاند، ستاروں کی حرکت کا منبع ہے جس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں۔

آخرکار شاعر آخری آسمان پر پہنچتا ہے۔ جہاں زمان و مکان کا کچھ حساب نہیں۔ اور نہ کسی قسم کی حرکت ہوتی ہے۔ بلکہ ہر شے اپنی جگہ پر قائم ہوتی ہے۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ یہاں محبت اور خوشی حکمران ہوتے ہیں۔ تمام شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ اور اعلےٰ ترین نیکی کے سامنے تمام خواہشیں پُوری ہو جاتی ہیں۔

(ماخوذ)

افتخار الرسول بدر ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لنڈن) از انگلینڈ

غزل

انتہائے یاس و حسرت ہوگئی | زندگی سامانِ کلفت ہوگئی
اب فریبِ مہربانی رائگاں | زندگی بھر کو نصیحت ہوگئی
اب امید چشمِ الفت بے محل | نامرادی وجہ عبرت ہوگئی
یاس، کل تک جس سے ہم واقف نہ تھے | آج امیدوں کی غایت ہوگئی
بیکسی جس سے کبھی بیگانہ تھے | اب شریکِ رنج و راحت ہوگئی
وہ دلی تسکیں کہ وجہ ناز تھی | پائمال رنج و کلفت ہوگئی
وہ امید وصل جو دلساز تھی | خوبی قسمت سے حسرت ہوگئی
قصہ ناکامیابی کیا کہوں | آہ ہر کوشش اکارت ہوگئی
اب علاج کاوشِ غم کچھ نہیں | جو نہ ہونی تھی وہ حالت ہوگئی
آجتک ارمان باقی ہیں تو ہوں | شادمانی مل کے رخصت ہوگئی
اب غمِ فرقت نہ ارمانِ وصال | آس کیا ٹوٹی کہ فرصت ہوگئی
اب کسی منظر سے دلچسپی نہیں | آہ! دُنیا بھر سے وحشت ہوگئی
اِک دلِ دمساز کیا غارت ہُوا | ہر متاعِ ناز غارت ہوگئی
عرضِ حالت کرکے خود حیران ہوں | کیا کہوں کیونکر یہ جرأت ہوگئی
کیا کریں اہل نیاز اب کیا کریں | بے نیازی اُس کی عادت ہوگئی
آپ کو ہم سے عداوت ہی سہی | کچھ سہی اِک گونہ نسبت ہوگئی
کیا بتا سکتا ہوں کچھ دیکھا بھی ہو | پردہ اُٹھنا تھا کہ حیرت ہوگئی
اے زہے ارمانِ بے پایانِ دوست | دل میں دُنیا بھر کی وسعت ہوگئی
اے کمالِ عشقِ صادق! مرحبا | میری ان کی ایک حالت ہوگئی
کچھ تو لے آزاد! حالِ دل بتا | کچھ تو کہہ۔ آخر یہ کیا گت ہوگئی

آزاد انصاری

بارش کا پہلا چھینٹا

گرمی کی رُت تھی شعلہ زا، ہر سمت تھا محشر بپا — وہ لو کی حدت الحذر! وہ سوز گرما الاماں
مضطر ہر اک ذی رُوح تھا راحت سے کوسوں دور تھا — دن رات کس فضل سے رہتی تھی دُنیا سرگراں
مور و ملخ ماہی مگر اژدر پلنگ و شیر نر — روباہ و گرگ فتنہ گر، سب ہو رہے تھے نیم جاں
ہر ایک جھاڑی اور شجر تھا خشک سر سے پاؤں تک — باقی نہ تھا گلزار میں سبزہ کا کچھ نام و نشاں
بلبل کی وہ نغمہ گری، طوطی کی وہ دلکش صدا — آتی نہ تھی اب کان میں، خاموش تھا ہر گلستاں
فریاد سے لب آشنا تھے اہل عالم رات دن — برپا تھا بزم دہر میں ہر سمت شور الاماں
اک یاس کی کالی گھٹا ہر سمت تھی چھائی ہوئی — تاریک نظروں میں جہاں کی تھی فضائے آسماں
انسان اور حیوان سب تھے مضمحل اور مضطرب — فطرت کے در پر رات دن رہتے تھے وہ نالہ کناں
تحلیل تھی روحِ رواں بیکار تھے اعضائے جسم — سب کی زبانوں پر مگر تھا العطش اور الاماں
مایوس تھے سب زیست سے جینے کے تھے لالے پڑے — اُٹھتی تھی رہ رہ کر نظر حسرت سے سوئے آسماں

جب یاس ہر سو چھا گئی جب جان لب پر آ گئی — فطرت کو بھی رحم آ گیا، اک ابر اُٹھا ناگہاں
ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، دل کی کلی کھلنے لگی — پُر شوق نظریں اُٹھ گئیں حیرت سے سوئے آسماں
مسرور دُنیا ہو گئی امید جینے کی بندھی — بادل کی صورت دیکھ کر آئی تنِ بے جاں میں جاں
پھر ابر نے چھینٹے دیئے، پھر برق لہرانے لگی — پھر ہو گیا راحت فزا نظّارۂ باغِ جہاں
سرسبز جنگل ہو گئے، لبریز دریا ہو گئے — پھر منظر ویراں ہُوا رشکِ بہارِ بوستاں
پھوٹیں نئی پھر کونپلیں ہر شاخ میں ہر خار میں — پھر بڑھ گیا جوشِ نمو، پھر آ گئی مٹی میں جاں
جھمگٹ ہیں صحن باغ میں جھولے پڑے ہیں جابجا — دلکش ہے نغموں کی صدا، پرکیف ہے روحِ رواں
آباد اب ہیں میکدے، ہے دورِ ساغر آجکل — بدمست ہیں میخوار سب، مسرور ہے پیرِ مُغاں
دل میں ہر اک کے جوش ہے، سر میں ہر اک کے کیف ہے — مسرور ہیں شاہ و گدا، مخمور ہیں پیر و جواں
افسردگی و بے حسی سب دُور دل سے ہو گئی — اب جان میں جان آ گئی، شکر خدائے دو جہاں

راز چاندپوری

وجدنیاز

وہ افشاں چنے آرہے ہیں جبیں پر	پڑی اوس لو چاند کی چودھویں پر
یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ کالی گھٹائیں	یہ رونق گل و نسترن کی زمیں پر
گرے ٹوٹ کر رند اس بیخودی میں	مئے آتشیں پر خم و ساتگیں پر
کسے دیکھ کر وہ ہنسے یا الٰہی	یہ بجلی گرے کس کے ایمان و دیں پر
ہُوا اور سونے پہ گویا سہاگہ	نشان شکن گیسوئے عنبریں پر
نہ چھیڑو یہ قصہ نہیں کیا بتائیں	بہت غم رہے جانِ اندوہگیں پر
وہ دیتے رہے وقتِ رخصت تسلّی	نشاں آنسوؤں کے رہے آستیں پر
کرینگے حرم جا کے کس منہ سے سجدہ	کہ خاکِ دریار ہوگی جبیں پر
مری عاشقی پختہ کار جنوں ہے	نہ جائیے کبھی شیوۂ دوربیں پر
وہ کہتے ہیں شوخی سے آئے قیامت	کہ الزام آئے گا سارا تمہیں پر

وہ بس آچکے آج عابد مگر ہم
مٹے جارہے فریب یقیں پر

عابد

شام گرما

شامِ گرما بہار پیکر ہے　　کسقدر دلفروز منظر ہے
ہر گلِ تازہ تر معطّر ہے　　بوستاں کی فضا معنبر ہے
دلرُبا ہے کنارِ جو کی ہوا
واہ کیا ہے کنارِ جو کی ہوا

ضوفشاں ہے فلک پہ ماہِ مبیں　　چاندنی سے چمک اُٹھی ہے زمیں
ہو گئی ہے ہر ایک شے سیمیں　　تابشِ نور کا جواب نہیں
خاک پر سر بسر ہے بارشِ نور
تا بحدِ نظر ہے بارشِ نور

غرق ہیں نور میں جو دشت و دمن　　پھول مثلِ چراغ ہیں روشن
صحن فردوس ہے زمینِ چمن　　گلفشاں ہے نگاہ کا دامن
لہلہاتے ہیں سبز پوش درخت
ہو گئے ہیں شراب نوش درخت

کچھ تبسّم نہاں ہے تاروں میں　　کچھ ترنّم ہے آبشاروں میں
پھول کھلتے ہیں لالہ زاروں میں　　کیا بہاریں ہیں ان بہاروں میں
مُسکراتی ہے کائنات تمام
روشنی سی رہیگی رات تمام

فتنہ پرواز گلفروش حسیں ماہ وش، ماہ روح، ماہ جبیں
سر بسر جس کی زلف عطر آگیں خوبیِ تن سے پیرہن رنگیں
موتیا بیچنے کو لائی ہے
ہائے کیا بیچنے کو لائی ہے

دل میں بے اختیار درد اٹھا ہاں یہی پھول ان کو پیارا تھا
پھر تصور کا بندھ گیا نقشا پھر اسی گلعذار کو دیکھا
مہک اٹھی خیال کی دنیا
جھلک اٹھی جمال کی دنیا

یاد آیا وہ دورِ راز و نیاز آہ وہ عاشقی کا سوز و گداز
اوّل اوّل حجاب کے انداز پھر سلام و پیام کا آغاز
لبِ دریا پہ وہ ملاقاتیں
وہ محبت کی چاندنی راتیں

ایک تو حسن تھا قیامت کا شوخیوں میں ادا ادا میں حیا
شوقِ آرائشِ رُخِ زیبا اور سونے پہ بھی سہاگہ تھا
موتیے کا سنگھار کرتی تھیں
وہ بہت اس کو پیار کرتی تھیں

عابد

پسِ پردہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس نے دیوانوں کی طرح بڑبڑاکر کہا۔"آرسین لوپن۔ آرسین لوپن !"

یکایک اپنے غصّہ پر قابو پاکر وہ اُن دونوں سراغرسانوں کی طرف لپکا۔ اور اُنہیں شانہ پکڑکر ہلاتے ہُوئے صدہا غلیظ کلمات کی بوچھاڑکردی۔ مگر وہ بیدار نہیں ہُوتے۔

"ارے توبہ.... یہ کیا" اُس نے گھبراکر کہا۔

"ہائیں کیا یہ لوگ"

وہ اُن کے اُوپر اور جھک گیا۔ اور یکے بعد دیگرے ہرایک کا بغور معائنہ کیا۔ وہ دونوں گہری نیند سو رہے تھے مگر یہ نیند قدرتی نہ تھی۔ اُس نے بیرن کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔

"ان کو دوا سے بیہوشی دی گئی۔"

"ہاں ! توکس نے دی۔"

"اُسی .... اُسی مردود نے یا اُس کے گروہ کے کسی ایسے شخص نے جو اُس کے زیرہدایت کام کررہا تھا اس کی یہ عیاری تو ایک معمولی بات ہے۔ میں اُس کی ہررگ سے واقف ہوں۔"

"بس چلئے۔ آپ کی آگ رہ گئی میں تو تباہ ہوگیا اب کوئی امید نہیں۔"

"آخر نا امیدی کیوں ؟"

"اف .... یہ دیدہ دلیری .... یہ سینہ زوری۔ اور پھر امید !"

"جی نہیں۔ فوراً رپٹ لکھائیے۔"

"اس سے فایدہ"

"خوب۔ کوشش کرنا فرض ہے۔ قانون کے وسائل بہت وسیع ہیں۔"

"قانون ؟ سبحان اللہ کیا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ دُور کیوں جاتیے۔ اسی وقت آپ کو سب کچھ نظر آرہا ہے۔ آپ نے دریافت بھی کرلیا۔ مگر پھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔"

"دریافت ! دریافت کرلینا اور وہ بھی آرسین لوپن کا معاملہ .... مخدوم بندہ۔ آرسین لوپن اپنے عقب میں کبھی ایسی علامات نہیں چھوڑتا۔ جس سے کوئی شخص اُس کی کارروائی کو شناخت کرسکے۔ واقعی آرسین لوپن کو شکست

دینا اب ناممکن سا نظر آتا ہے۔ اب مجھے خیال کر کے تعجب سا ہو رہا ہے۔ کہ کہیں اُس نے امریکہ میں خود ہی تو اپنے کو میرے ہاتھوں میں گرفتار نہیں کرا دیا تھا۔"

"تو گویا میں اپنی تصاویر یا کسی شے کو دوبارہ حاصل کرنے کی ہر ایک امید کو بالائے طاق رکھ دُوں۔ مگر ہائے اُس نے تو میرے سچے موتیوں کا مجموعہ بھی چُرا لیا۔ میں اُن کو واپس لینے کے لئے اپنی ساری دولت نثار کر سکتا ہوں اُف.... اگر اُس کے خلاف ہر ایک کارروائی ناممکن ہے تو کاش وہ اُن کی قیمت ہی مانگ لیتا۔ یا اب بھی۔"

گینمارڈ نے یکایک اُس پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔

"واقعی یہ عمدہ خیال ہے۔ کیا درحقیقت آپ اس پر قائم رہینگے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ہاں مگر یہ آپ کیوں پُوچھتے ہو؟"

"اس لئے کہ میری سمجھ میں بھی ایک بات آئی ہے۔"

"وہ کیا"

"اگر تفتیش و تحقیقات ناکام ثابت ہُوئی تو میں آپ سے بیان کرونگا۔ ہاں ایک بات کا خیال رہے۔ وہ یہ کہ اگر آپ میری تفتیش کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ تو میری بابت کسی شخص سے تذکرہ نہ کیجیے گا۔"

پھر زبان داب کر یہ بھی کہا۔

"علاوہ بریں میں اس شکست پر چنداں فخر بھی نہیں کر سکتا۔"

دونوں سراغرسانوں کے مزاج رفتہ رفتہ اصلاح پذیر ہُوتے۔ اور یہ معلوم ہُوا۔ گویا کسی سمر بزم کے اثر سے چونک کر اب آنکھیں کھول رہے ہیں۔ آنکھیں کھُلتے ہی اُنھوں نے ہر سمت دیکھنا شروع کیا۔ گویا وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ کیا ہو گیا۔

گینمارڈ نے ان سے سوالات کرنا شروع کئے۔

اُنہیں کچھ بھی یاد نہ تھا۔

"تاہم تم نے کسی شخص کو آتے دیکھا ہو گا۔"

"نہیں۔ کسی کو بھی نہیں"

"دیکھو۔ کوشش کرو۔ سوچو۔"

"نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔"

"کیا تم نے شراب پی تھی۔"

دونوں سوچنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے جواب دیا۔

"ہاں۔ میں نے ذرا سا پانی پیا تھا۔"

"وہ جو بوتل رکھی ہے۔ اس سے۔"

"جی ہاں"

"اور تھوڑا سا میں نے بھی پیا تھا" دوسرا کہنے لگا

گینمارڈ نے پانی سُونگھ کر ذائقہ چکھا۔ اُس میں کوئی خاص بات یا مزہ میں تبدیلی نہ تھی۔

اِدھر آئیے ہم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آرسین لوپن کی مجوزہ ترکیب پانچ منٹ میں حل نہیں ہو سکتی۔ مگر خدا گواہ ہے۔ مَیں اُسے بلا گرفتار کئے مانوں گا تھوڑی گو وہ یہ بازی لے گیا لیکن اس کے بعد سمجھ لیجئے۔ میری باری ہو گی۔"

اسی روز بیرن کاہرن نے جیلخانہ ڈی سانٹی کے اسیر زیر کارروائی مقدمہ آرسین لوپن کے خلاف سرقہ بالجبر کا استغاثہ دائر عدالت کر دیا۔

(۶)

جس وقت بیرن نے قلعہ ملاکس کو پولیس کے جندرمۂ سرکاری افسر مجسٹریٹ تفتیش۔ اخباروں کے نامہ نگار اور نیز دیگر پرسان حال اشخاص کا جو محض بیکار ایسے موقعوں پر حملہ بول دیا کرتے ہیں۔ جولانگاہ دیکھا تو اُسے رپٹ کرنے پر سخت تاسف ہوا۔ دنیا کی نگاہ میں اس واقعہ نے ایک عجیب دلچسپی پیدا کر رکھی تھی۔ اس کا وقوع ایسے عدیم النظیر طریق پر ہوا تھا۔ مزید برآں آرسین لوپن کے نام کی شرکت نے ایسا سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا کہ صدہا محیر العقول روایتیں گڑھ لی گئیں۔ اور اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ ہونے لگے۔ اس پر مزہ یہ کہ ان بیانات کو ہر شخص سچ سمجھا۔

لیکن آرسین لوپن کا پہلا خط جو ایکو ڈی فرانس میں شائع ہوا۔ اور جس کے فرستندہ کا نام و پتہ مخفی تھا۔ یعنی وہ خط جس میں آرسین لوپن نے نہایت گستاخانہ طریق پر بیرن کاہرن کو اپنی دھمکی سے آگاہ کیا تھا۔ بغایت سنسنی خیز تھا۔ اس کے متعلق عجیب عجیب قصے پیش کئے جاتے تھے۔ پرانی بھولی ہوئی دقیانوسی حکایتیں پھر ایکبار تازہ ہو گئیں۔ اخباروں نے اپنے بیانات میں ناظرین کو اُس زمین دوز راستہ کی موجودگی سے بھی آگاہ کیا۔ چنانچہ سرکاری افسران بھی ان بیانات کے زیر اثر بیوقوف بنکر اُسی کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اور بیکار وقت ضائع کیا۔

قلعہ کی چپہ چپہ زمین کو دیکھا گیا۔ کوئی چمنی، روشندانی آئینوں کے چوکھٹے اور چھت کی لکڑی ایسی نہ تھی۔ جس کا امتحان نہ کیا گیا ہو۔ مشعل کی روشنی لیکر بہت سے لوگ اُن تہ خانوں میں اُتروائے گئے جہاں قلعہ ملاکس کے گزشتہ مالک سامان رسد۔ غلہ اور اشیاء جنگ کا ذخیرہ رکھا کرتے تھے۔ وہاں کی بھی اینٹ اینٹ بجائی گئی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا خاک، کسی زمین دوز راستہ کا ذرّہ برابر بھی تو نشان نہ نظر آیا۔ اب یہ امر مسلمہ تھا۔ کہ کسی زمین دوز راستہ کا وجود ہی نہیں۔

بہت خوب۔ ہر شخص کی زبان سے یہی نکلتا مگر تصویریں و پردے وغیرہ۔ آسیب تو تھے نہیں کہ خود بخود غائب ہو جاتے۔ اُنہیں نکالنے و لیجانے کے لئے ضرور

دروازوں و کھڑکیوں کا استعمال کیا گیا ہوگا۔ اور وہ لوگ جو انہیں چرا کر لے گئے ضرور انہیں دروازوں و کھڑکیوں میں سے ہو کر گزرے ہونگے۔ اب یہ لوگ کون تھے۔ کس طرح اندر پہنچے۔ اور کس طرح سامان لے کر باہر نکل گئے۔

روتن کے سرکاری افسر نے اپنی قابلیت پر کامل بھروسہ نہ کرکے پیرس کی پولیس سے امداد چاہی۔ چنانچہ ایم۔ ڈوڈس محکمہ سراغرسانی کے افسر اعلےٰ نے اپنے چند زبردست ماتحت افسران کو موقعہ پر روانہ کیا۔ اور خود بھی وہاں پہنچکر متواتر ۴۸ گھنٹہ تک اپنی تحقیقات جاری رکھی مگر سب اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔

چنانچہ یہاں سے ناکام واپس ہونے کے بعد اُس نے چیف انسپکٹر گینمارڈ کو بلا بھیجا۔ جس کی اعلےٰ صفات کا اُسے بہت کچھ تجربہ تھا۔ گینمارڈ نے اپنے افسر کی ہدایات تفتیش کو بہت غور سے سُنا۔ اور بعد ازاں سر ہلا کر کہنے لگا :۔

"میرا خیال ہے کہ جب تک ہم قلعہ ملاکس میں تفتیش جاری رکھینگے محض تضیع اوقات اور غلط راستہ اختیار کرنا ہے۔ اس کا حل تو کہیں دوسری ہی جگہ ہے۔"

"ہاں، صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ آرسین لوپن کے پاس۔ بس اس کا نام یاد آیا۔ اور تم اُسی کی بابت یقین کرنے لگے۔ کہ اُس نے ضرور اس واردات میں حصّہ لیا۔"

"صاحب خیال ہی تو ہے۔ مگر نہیں میں یہی کیوں نہ کہدوں۔ کہ مجھے اس کی بابت یقین کامل ہے۔"

"دیکھو گینمارڈ کسقدر لچر خیال ہے کہ تم نہیں جانتے کہ آرسین لوپن قید خانہ میں بند ہے۔"

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ آرسین لوپن قید خانہ میں نہیں بلکہ اُس کی سخت نگرانی بھی ہوتی ہے۔ لیکن جناب اگر اس کے پیروں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا ہوا ہو۔ تب بھی میں یہی کہونگا کہ یہ کارروائی آرسین لوپن کی ہے۔"

"آخر یہ اصرار کیوں کس لئے۔"

اِس لئے کہ کوئی بھی دوسرا شخص ایسی اعلےٰ تدابیر پر کسی کارروائی کا انحصار نہیں کر سکتا۔ اور نہ پھر ایسے پُراسرار طریقے سے اُسے کامیاب بنانے کی ترکیب کر سکتا ہے۔ یہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ترکیب بالکل کامیاب ثابت ہوئی۔"

"گینمارڈ۔ دیکھو۔ یہ صرف لفاظی ہی لفاظی ہے۔"

"آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے تاہم میں یہ عرض کرونگا کہ زمین دوز راستہ کا پتہ لگانا پتھروں کو اکھیڑ اکھیڑ کر دیکھنا بھی فایدہ بخش نہیں۔ یہ سب لغو اور تضیع اوقات ہے۔

ہمارا دوست ایسے دقیانوسی طریقے استعمال نہیں کرتا۔ وہ ابن الوقت ہے۔ اور وہ تراکیب استعمال کرتا ہے۔ جن کا آئندہ معرض وجود میں آنا ممکنات سے ہو۔"

"اچھا تم نے کیا نتیجہ نکالا۔"

"میرا تو فیصلہ یہ ہے کہ آپ براہِ راست مجھے اجازت دیں کہ مَیں جیلخانہ میں ایک گھنٹہ لوپن سے گفتگو کر لوں۔"

"اُسی کوٹھڑی میں۔"

"جی ہاں۔ امریکہ سے یہاں آتے ہوئے میرے اور اُس کے درمیان بہت کچھ مصالحت ہو گئی ہے۔ اور مَیں کہہ سکتا ہوں کہ اُسے اپنے گرفتار کرنے والے سے نفرت کلی نہیں جو کچھ کہ مَیں جاننا چاہتا ہوں اگر اس نے اُن حالات کو اپنا دامن بچاتے ہوئے ظاہر کر دیا تو یقین جانئے اس تمام دوڑ دھوپ سے نجات مِل جائیگی۔"

(۷)

ٹھیک دوپہر کے کچھ دیر بعد گینمارڈ کو آرسین لوپن کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ لوپن اس وقت بڑے آرام سے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اُٹھ بیٹھا اور حیرت سے خوش ہو کر چلا اُٹھا۔

"اخاہ کتنی حیرت کی بات ہے۔ میرا پیارا دوست گینمارڈ اور یہاں!"

"ہاں مجسم اصالتاً۔"

"اپنی منتخب کردہ جائے امن میں مَیں نے بہت سی باتوں کی امید کر رکھی تھی۔ مگر یقین جانئے آپکی تشریف آوری سے جو خوشی و راحت دل کو محسوس ہو رہی ہے اُسکا لُطف مَیں بیان نہیں کر سکتا۔"

"یہ آپ کی بندہ نوازی ہے۔"

"بالکل نہیں قطعی نہیں۔ بلکہ میرے دِل میں آپ کی بیحد قدر و منزلت ہے۔"

"مَیں اس پر جسقدر فخر کروں کم ہے۔"

"مَیں نے صدہا مرتبہ اس امر کا اعلان کیا ہے اور بعض اوقات اعتراف بھی کر دیا ہے۔ کہ گینمارڈ ہمارے مُلک کا بہترین سراغرسان ہے۔ ذرا میری صاف گوئی ملاحظہ فرمائیے۔ مَیں آج کہتا ہوں کہ گینمارڈ قریب قریب اُسی پایہ کا ہے۔ جیسا کہ شرلاک ہومس۔ مگر افسوس مَیں سخت ہی شرمندہ ہوں۔ کہ اس وقت میرے پاس اس ناتراشیدہ اور بھدّے اسٹول کے سوائے کوئی بھی چیز آپ کے بیٹھنے کے لئے پیش کرنے کو نہیں اور نہ خاطر کے لئے کوئی اعلےٰ شراب۔ زیادہ کیا کہوں۔ بیر تک میسر نہیں آپ غالباً مجھے معاف کرینگے۔ یوں سمجھ لیجئے۔ کہ مَیں آجکل کسی گاؤں میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

گینمارڈ مُسکرا کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اور قیدی نے اس موقع گفتگو کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنی تقریر یوں

جاری رکھی۔

"خدا قسم کسی بھلے آدمی کا چہرہ دیکھ لینا ہی کس درجہ باعثِ انبساط ہوتا ہے۔ یقین جانتے کہ مَیں ان جیلخانہ کے نامعقول اشخاص سے بیحد تنگ ہوں۔ جو دن میں دس دس دفعہ میرے کمرے اور جیبوں کا معائنہ محض اس خوف سے کیا کرتے ہیں کہ کہیں مَیں یہاں سے فرار ہونے کی ترکیب تو نہیں کر رہا ہوں۔ آہا۔ کیا خوش نصیبی ہے کہ گورنمنٹ مجھ سے ناچیز کی یہ عزّت افزائی کرے۔"

"نہیں۔ وہ صرف اپنی معدلت گستری دکھلانا چاہتی ہے۔"

"اے سبحان اللہ۔ مَیں باز آیا۔ وہ اگر مجھے پُرسکون زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دے۔ تو مَیں بیحد شکر گزار ہوں۔"

"جی دوسروں کی دولت لُوٹ کھسوٹ کر۔"

"ہاں بات تو یہی ہے مگر مَیں بہت سہولت سے کام لونگا۔ لیکن توبہ۔ میری تو زبان ہی کُھل گئی۔ خدا معلوم مَیں کیا لغویت بک رہا ہوں۔ اور آپ کی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو جلدی ہے۔ اچھا۔ جناب گینمارڈ فرمایئے۔ جناب کی اس عزّت افزائی اور تشریف آوری کا سبب۔"

"بیرن کا ہرن والا قصّہ" گینمارڈ نے بعجلت جتا دیا۔

"اچھا.... یہ بات .... ٹھیرتے۔ ذرا صبر کیجئے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس وقت میرے ہاتھ میں صدہا معاملات ہیں۔ پہلے مَیں ذرا امور خانہ دماغ میں تلاش تو کر لوں۔ کہ کا ہرن کا خانہ کونسا ہے۔ .... آہا .... مل گیا۔ کا ہرن کا معاملہ، قلعہ ملاکس۔ وہی دریائے سین کے کنارے والا دروبن اور ایک واتنز والی تصویر اور چند دیگر معمولی چیزیں ...."

"معمولی چیزیں!"

"اور کیا یہ سب معمولی تو ہیں ہی۔ اس سے کہیں عظیم الشان کام میرے ہاتھ میں ہیں۔ خیر۔ چونکہ آپ کو اس سے دلچسپی ہے۔ اس لئے میرے لئے یہی سب کچھ ہے۔ ہاں تو گینمارڈ صاحب۔ اب آگے فرمایئے۔"

"یہ کہنے کی غالباً ضرورت ہی نہیں کہ ہم کو اپنی تحقیقات میں کس حد تک کامیابی ہُوئی۔"

"نہیں نہیں اس کو بیان کرنے کی کیوں زحمت فرمایئے گا۔ مَیں آج صبح کے اخبارات کا مطالعہ کر چکا۔ اور اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ ہو تو مَیں عرض کرونگا۔ کہ آپ حضرات نے کوئی خاطر خواہ تسلّی بخش ترقی نہیں کی۔"

"بس اسی وجہ سے تو مَیں آپ کی عنایت سے فایدہ اُٹھانے کے لئے یہاں حاضر ہُوا ہوں۔"

"زہے قسمت۔ چشم ما روشن دلِ ماشاد۔"

"سب سے اوّل سوال تو یہ ہے کہ یہ کارروائی آپ ہی نے کی۔ کیا یہ صحیح ہے۔"

"الف سے لیکری تک صحیح"

"وہ رجسٹری شدہ لفافہ، وہ تار"

"جی آپ ہی کے خادم کے روانہ کردہ تھے۔ اب اس کی ضرورت تھی۔ کہ مجھے ان کی رسیدیں کسی نہ کسی طرح ملنا چاہتے تھیں۔ چنانچہ جناب کی عنایت سے وہ بھی آگئیں"۔

آرسین لوپن نے اُس چھوٹی سی میز کی دراز کھولی۔ جو ماسوائے ایک پلنگ و اسٹول کے اس کے کمرہ زندان کی کل کائنات تھی۔ اور دو پرزے کاغذ کے نکالے۔ ان کو گینمارڈ کے ہاتھ میں دیدیا۔

"اوہ" گینمارڈ نے چلا کر کہا۔ "مَیں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ کی ہر وقت سخت نگرانی ہوتی ہوگی۔ اور ذرا ذرا بات پر تلاشی لیجاتی ہوگی۔ مگر یہاں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ برابر اخبارات کا مطالعہ اور ڈاکخانہ کی رسیدیں بھی وصول کیا کرتے ہیں۔"

"واہ صاحب واہ۔ کیا جیلخانہ والے نرے بیوقوف ہی ہیں۔ وہ لوگ تو میری واسکٹ کی گوٹ۔ جوتوں کے تلے اور کمرہ کی دیوار تک کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ مگر آپ ہی بتایئے۔ کیا کوئی عقلمند سے عقلمند بھی اس بات کو باور کرسکتا ہے کہ سب سے زیادہ معمولی و کھلی جگہ کو آرسین لوپن چھپانے کی جگہ کے لئے استعمال کریگا۔ دیکھئے مَیں نے کیا عمدہ نتیجہ نکالا تھا۔"

گینمارڈ نے دل ہی دل میں مسرور ہو کر کہا۔

"واقعی آپ بھی کسقدر خوش مزاج لونڈے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ میرے بھی چچا ہیں۔ خیر اب قصّہ بیان کیجئے۔"

"ہاں ہاں دیکھئے کہتا ہوں۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ یکدم بیان کردوں۔ آپ کو اپنے رازوں سے آگاہ کرنا اپنی معمولی عیاریوں کو ظاہر کرنا۔ ذرا دیر طلب معاملہ ہے۔"

"کیا مَیں یہ خیال کرنے میں حق بجانب نہ تھا۔ کہ آپ یقیناً مجھے اپنی عنایت سے فایدہ اٹھانے کا موقعہ دیں گے۔"

"اوہ یہ بات نہیں گینمارڈ صاحب۔ چونکہ آپکو اصرار ہے۔ اس لئے ....."

آرسین لوپن نے اپنی کوٹھری میں دو تین مرتبہ چکّر لگایا اور ایک مرتبہ رُک کر کہنے لگا۔

"مَیں نے جو خط بیرن کو بھیجا تھا۔ اُس کی بابت آپکا کیا خیال ہے۔"

"بس یہ کہ آپ کوئی چکمہ کھیلنا چاہتے ہیں۔ تاکہ گیلری کا کچھ حال معلوم ہوجائے۔"

"ارے توبہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ گیلری کا پتہ لگانا ....

واللہ۔ گینمارڈ صاحب۔ آپ نے حد ہی کر دی۔ اجی استغفراللہ ذرا تو سمجھ سے کام لیجئے۔ کیا آپ سا گرگ بارہ دیدہ یہ خیال کر سکتا ہے کہ مَیں آرسین لوپن ایسی طفلانہ باتوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر سکتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر مَیں بیرن کو یونہی بوکھلا سکتا۔ تو مَیں اس خط کے بھیجنے کی زحمت گوارا کرتا۔ ذرا غور کیجئے کہ یہی خط میرے معاملہ کا سب سے زیادہ ضروری و اہم پہلو تھا۔ وہ خاص پرزہ جس سے ساری مشین حرکت میں آگئی۔ اس طرف دیکھئے۔ اب مَیں سلسلہ وار بیان کرتا ہوں یا اگر آپ چاہیں تو ملاکس کی واردات کو بھی پہلو بہ پہلو رکھ لیں۔ اچھا ملاحظہ فرمائیے۔"

"بہت خوب۔ مَیں خوب غور سے سُن رہا ہوں۔"

"ہاں ذرا کان کھول کر سُنئے گا۔ دیکھئے مجھے ایک ناقابلِ داخلہ اور محفوظ قلعہ میں واردات کرنا ہے۔ کیا مَیں اُن آدمیوں میں ہوں۔ کہ کسی بات کو ناممکن سمجھ کر اپنے کھیل سے باز آجاؤں۔ اور اُس قیمتی مال کو جسے مَیں لینا چاہتا ہوں۔ صرف اس لئے چھوڑ دوں۔ کہ وہ مقام جس میں وہ بند یا محفوظ ہے۔ اُس تک رسائی غیر ممکن ہے۔"

"بیشک۔ کبھی نہیں۔"

"کیا مَیں اُن پرانی کاٹ کے آدمیوں میں ہوں۔ کہ ایک باقاعدہ جماعت کے ساتھ بیوقوفوں کی طرح اس پر حملہ کر دوں یا بالفاظ دیگر ڈاکہ ماروں۔"

"یہ واقعی بچپنے کی دلیل ہوتی۔"

"تو کیا مَیں اُس میں چوری سے داخل ہوتا۔"

"ناممکن"

"بس۔ صرف ایک صورت باقی رہ گئی۔ وہ یہ کہ مجھے خود اس کا مالک مدعو کرے۔"

"واقعی۔ بغایت نادر و قابلِ رشک خیال۔"

"مگر انتہائی آسان۔ فرض کیجئے کہ ایک دن وُہی مالک ایک خط وصول کرتا ہے۔ جس میں آرسین لوپن نقب زن، اُس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اب بتلائیے۔ وہ مالکہ یا بیرن کیا کریگا۔"

"وہ خط سرکاری افسر کے پاس بھیجدیگا۔"

جو اُسے دیکھ کر سخت مضحکہ اُڑائیگا۔ اِس لئے کہ آرسین لوپن قید خانہ میں قفل میں بند۔ مقید ہے۔ اس کا فطرتی و لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بیرن مخبوط الحواس ہو جائے گا۔ اور جو شخص بھی اُسے پہلے مل جائے۔ اُس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ کہئے۔ مَیں سچ کہہ رہا ہوں نا؟"

"بالکل درست"

اب اگر اُسے کسی مقامی اخبار میں یہ فقرہ نظر آجائے کہ ایک مشہور و معروف سراغرسان سردست اُس جوار

میں موجود ہے۔ تو وہ فوراً اس کے پاس جاکر اس کی امداد حاصل کرنے کی درخواست کریگا۔"

"بالکل بجا فرمایا۔ لیکن برخلاف اس کے ہم کو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اس کے لازمی نتیجہ کو پہلے ہی معلوم کرلے۔ اب اگر آرسین لوپن اپنے کسی گہرے دوست کو موضع کاڈبک ہی میں سکونت اختیار کرنے کے لئے مقرر کردے۔ اور اس کو ہدایت کردے۔ کہ وہ وہاں کے مقامی اخبار ریول کے کسی نامہ نگار سے دوستی پیدا کرکے اُس سے بر سبیلِ تذکرہ بیان کردے۔ کہ وہ فلاں فلاں مشہور و معروف سراغرسان ہے۔ اور واضح رہے۔ کہ اخبار بھی کونسا ہے۔ وہی جس کا بیرن خریدار ہے۔ اب آپ خود سمجھ جائیے۔ کہ کیا بات پیدا ہوگی۔"

"وہ نامہ نگار اخبار ریول کے دفتر میں ایک اطلاع روانہ کریگا۔ کہ فلاں فلاں مشہور و معروف سراغرسان آجکل قصبہ کاڈبک میں ٹھیرا ہوا ہے۔"

"بالکل بجا فرمایا۔ اب دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی۔ یا تو مچھلی پھنسی یعنی بیرن کاہرن یا کوئی کھٹکا ہی نہیں ہوئی۔ موخرالذکر صورت میں سمجھ لیجئے۔ سارا کھیل خراب ہوگیا۔ ورنہ دوسری صورت میں تو یوں ہی ہوگا۔ کہ ہمارا دوست بیرن میرے ساتھیوں میں سے ایک سے امداد کی درخواست کرتا نظر آتے۔ اور میرا دوست میرے خلاف کارروائی کرنے پر آمادگی ظاہر کردے۔"

"واللہ۔ یہ تو اب بہت ہی دلچسپ اور اچھوتی ترکیب ہوتی جاتی ہے۔"

"اب وہ مصنوعی سراغرسان اولاً انکار کرتا ہے۔ بیرن واپس آتا ہے۔ کہ یہاں اسے آرسین لوپن کا ایک تار ملتا ہے۔ بیرن بوکھلا جاتا ہے اور مکرر دوڑ کر میرے دوست کے پاس پہنچتا ہے۔ اور اپنے مال کی حفاظت کرنے کے صلہ میں بھاری رقم پیش کرتا ہے۔ میرا دوست بڑے نخروں کے بعد اس کی استدعا منظور کرکے اپنے ہمراہ ہمارے ہی گروہ کے دو اور آدمی ساتھ لاتا ہے۔ رات کے وقت اُس طرف تو میرا دوست محافظ بنکر بیرن کاہرن کو اطمینان دلاکر باتوں میں لگاتا ہے۔ اور اس طرف وہ دونوں آدمی وہی چیزیں رسی میں باندھ باندھ کر کھڑکی کی راہ سے دریا کی جانب ایک چھوٹی کشتی میں اُتارتے جاتے ہیں۔ جس کو خاص اسی موقعہ کیلئے معقول کرایہ پر پہلے ہی سے لے لیا جاتا ہے۔ اب دیکھئے۔ یہ اسقدر معمولی اور آسان ترکیب ہے۔ جس طرح زبان سے اینجاب کا نام لیکر یہ ایک لفظ کہدینا۔ لوپن"

گینمارڈ نے چلاکر کہا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ انتہائی حیرت انگیز۔ "میں کس زبان سے ان خیالات کی عدیم المثالی اور ندرت کی تعریف کروں۔ مگر ہاں میرے

دماغ میں اُس مشہور و معروف سراغرسان کا نام اس وقت تک نہیں آیا۔ جس کا ذکر دیکھتے ہی بیرن کا خیال اس حد تک اُس پر مائل ہوگیا۔"

"جی، ایک، صرف ایک شخص ایسا ہے۔"

"وہ کون؟"

"تمام سراغرسانوں کا سرتاج۔ سردار اعلیٰ آرسین لوپن کا ازلی دشمن۔ یعنی چیف انسپکٹر گینمارڈ۔"

"ار...... ر...... ر...... رے.. خود میرا ہی نام ہے۔"

گینمارڈ صاحب خود آپ ہی کا نام..

یہی تو اس تمام واردات کا بہترین دلکش پہلو ہے۔ اب اگر آپ جاکر بیرن کاہرن سے حالات معلوم کریں۔ تو انجام میں آپ کو یہی معلوم ہوگا۔ کہ یہ آپ کا فرض ہے۔ آپ خود گینمارڈ ہوکر گینمارڈ ثانی کو اُسی طرح گرفتار کیجئے جس طرح آپ نے اینجانب کو امریکہ میں گرفتار کیا تھا۔ نہ کہتے گا۔ کیا اچھوتا اور اعلیٰ انتقام لیا ہے۔ میں اب گینمارڈ کے ہاتھوں گینمارڈ کو گرفتار کراتا ہوں۔"

آرسین لوپن بہت ہی مزہ سے دیر تک قہقہہ لگا لگاکر مذاق اُڑاتا رہا۔ اس طرف انسپکٹر گینمارڈ فرط غضب سے دانت پیس رہا تھا۔ یہ مذاق اُس کے نزدیک اسقدر اظہارِ خوشی کے قابل نہ تھا۔

عین اسی موقعہ پر محافظ جیل کے داخلہ نے ہوش و حواس بجا کرائے۔ یہ شخص وہ کھانا لیکر حاضر ہوا۔ جو آرسین لوپن قریب ہی کے ایک ہوٹل سے منگایا کرتا تھا۔ یہ آرسین لوپن کے ساتھ ایک خاص رعایت تھی۔ کھانا میز پر رکھکر وہ واپس گیا۔ آرسین لوپن نے کرُسی پر بیٹھکر ایک روٹی توڑی دو ایک لقمہ کھائے۔ اور یوں کہنا شروع کیا۔

"مہربان بندہ جناب گینمارڈ صاحب۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ میں ابھی آپ کو جانے نہیں دونگا۔ میں آپ سے ابھی ایک خاص بات کہنے والا ہوں۔ جسے سُنکر آپ متحیّر ہوجائینگے۔ کاہرن والے مقدمہ میں عنقریب دست برداری داخل ہونے والی ہے۔"

"ہائیں۔ یہ کیسے۔"

"میں نے عرض کیا نا؟ کہ اس میں عنقریب دست برداری داخل ہُوا چاہتی ہے۔"

"لغو۔ جھوٹ۔ میں ابھی ابھی افسر اعلےٰ سے ملکر آرہا ہوں۔"

"اچھا تو پھر کیا موسیو ڈوڈس میرے معاملات کو مجھ سے زیادہ جان سکتا ہے۔ گینمارڈ صاحب معاف فرمایئے گا۔ مگر مجھے آپ کو بتلانا چاہیئے۔ کہ آپ کے ہمنام مصنوعی گینمارڈ نے بیرن کاہرن سے بہت ہی خوش معاملگی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ سمجھ لیجئے۔ کہ بیرن کے اس معاملہ

میں بہت ہی خاموشی سے کام لینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُس نے مصنوعی گینمارڈ کو بہت ہی نازک کام پر مامور کیا تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ مجھ سے یعنے آرسین لوپن سے اِس معاملہ کو طے کر دے۔ بس اس موقعہ کا آنا تھا کہ سارا معاملہ طے ہوگیا۔ یعنے ایک معقول رقم کی ادائیگی پر بیرن پھر ایک مرتبہ اپنے نادرات پر قابض ہو چکا ہے اس کے صلہ میں وہ اپنا مقدمہ اُٹھالیگا۔ اب آپ بتلایئے۔ چوری کا سوال کہاں رہا۔ لہذا سرکاری افسر کو تحقیقات کرنے کا کوئی مجاز ہی نہیں۔"

گینمارڈ بالکل بیوقوف بنا ہوا اپنے قیدی پر نظر ہیں ڈال رہا تھا۔

لیکن آپ کو یہاں یہ سب حالات کیونکر معلوم ہو گئے۔"

"مجھے ابھی ابھی وہ تار ملا جس کا مَیں انتظار کر رہا تھا۔"

"ارے۔ ابھی ابھی آپ کو تار ملا۔ یہ کیسے۔ کیونکر؟"

"مہربان۔ واقعی اسی وقت۔ یہ میرا انتہائی اخلاق تھا۔ کہ مَیں نے اُسے آپ کے سامنے ہی پڑھ دیا۔ لیکن اگر آپ اجازت دیں۔ تو مَیں . . . "

دیکھئے۔ میاں لوپن صاحب۔ اب آپ بہت زیادہ بڑھتے جاتے ہیں۔"

"کرم فرما۔ ذرا تکلیف تو ہوگی۔ مگر اس انڈے کا بالائی حصّہ ذرا آہستگی سے کاٹیے۔ بس آپ پھر خود ملاحظہ کر لینگے۔ کہ مَیں آپ سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ واقعہ۔"

گینمارڈ نے اس کی تعمیل کی۔ اور ایک چھُری کی نوک سے انڈے کو تراشا۔ اس کے مُنہ سے حیرت کی ایک چیخ سی نکل گئی۔ انڈا اندر سے قطعی خالی تھا۔ اور بجائے زردی و سفیدی کے اس میں ایک پرزہ کاغذ کا تہ شدہ رکھا تھا۔ آرسین لوپن کے کہنے سے اس نے اُسے کھولا۔ وہ ایک تار یا تار کا ایک جُز تھا۔ جس میں سے ڈاکخانہ کی مہر اور پتہ کاٹ ڈالا گیا تھا۔ عبارت یہ تھی

"معاملات طے ہو گئے۔ ایک لاکھ ادا کر دیئے گئے۔ مال واپس کر دیا گیا۔ باقی خیریت . . ."

"ایک لاکھ ادا کر دیئے گئے!" گینمارڈ نے چیخ کر کہا۔

"جی ہاں۔ ایک لاکھ فرانک۔ گو یہ رقم کچھ زیادہ نہیں مگر کیا کیا جائے۔ آجکل وقت ہی خراب ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ میرے اخراجات بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو میرے بجٹ کا حال معلوم ہو تو آپ تعجب کریں۔ اینجانب کا خرچ ایک چھوٹی ریاست کے محاصل سے کم نہیں۔"

گینمارڈ جانے کے لئے اُٹھا۔ اُس پر بدمزاجی غالب آ چکی تھی۔ اس نے چند لمحہ تک غور کیا۔ اور اس سارے معاملہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ کہ اگر کوئی

بات رہ گئی ہو، تو دریافت کرلے۔ اس کے بعد ایسے لہجہ میں جس سے ایک ماہر فن کی طرح جذبہ تعریف کا اظہار ہوتا تھا اس نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم سے آدمی ایک درجن نہیں پیدا ہوتے۔ ورنہ ہم لوگوں کو سوائے بوریا بندھنا باندھنے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہتا۔"

آرسین لوپن نے بہت ہی حلیمانہ انداز اختیار کرکے یوں جواب دیا۔

"اوہ جناب اتنا تو سمجھئے کہ آخر میں ان بیکاری کے اوقات میں اپنے دل کو بہلانے کے لئے کچھ تو سامان پیدا کرتا۔ یہ اسی حالت میں ہونا تھا کہ میں بدستور جیلخانہ میں رہتا۔"

گینمارڈ نے کڑک کر کہا۔" اچھا! اس کا کیا مطلب؟"

"ارے میاں آپ کا مقدمہ، الزام کی صفائی، گواہوں کی جرح، کیا یہ سب باتیں آپ کے دل بہلانے کے لئے کافی نہ تھیں۔"

"جی نہیں۔ اس لئے کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ میں اپنے مقدمہ کی تاریخ سماعت پر حاضر نہ ہوں۔"

"آہا۔ یہ بات ہے۔"

آرسین لوپن نے بہت ہی سنجیدگی سے اعادہ کیا۔

"جی ہاں میں عدالت میں حاضر نہ ہونگا۔"

"کیا واقعی؟"

"کیوں، مہربان، کیا آپ جانتے نہیں کہ میں کبھی لغو بات زبان سے نہیں نکالتا۔ بلکہ اس لفظ کا کہنا بھی ہتک عزت سمجھتا ہوں۔ ذرا سن لیجئے۔ آرسین لوپن جیلخانہ میں اسی وقت تک رہ سکتا ہے جبتک اس کا مزاج چاہے۔ ورنہ ایک منٹ نہیں رہ سکتا ایک منٹ۔"

"تو پھر یہ زیادہ عقلمندی تھی کہ اس میں آتے ہی نہ ہوتے" گینمارڈ نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

"اوہو یہ کہئے۔ آپ مجھے بنا رہے ہیں۔ کیا بھول گئے کہ میری گرفتاری کی عزت آپ ہی کو حاصل ہے۔ حضرت یاد رکھئے اگر گرفتاری کے موقعہ پر کوئی خاص مشکل پیش نہ آتی۔ تو آپ یا آپ سے کسی دوسرے شخص کی کیا تاب و مجال تھی کہ اینجانب پر انگلی اٹھا سکتا۔"

"آپ تو مجھے حیرت میں ڈال رہے ہیں۔"

"ہاں۔ گینمارڈ صاحب۔ بات تو کچھ ایسی ہی ہے یاد کیجئے۔ مجھ پر ایک خاتون کی نظریں پڑ رہی تھیں۔ اور مجھے اس سے محبت پیدا ہوگئی تھی۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ جب کوئی عورت کسی شخص پر نگاہ محبت ڈالنے لگے۔ تو وہ شخص ہر ایک پس و پیش کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اینجانب کو جو آپ آج یہاں دیکھ رہے ہیں اس

کی خاص وجہ یہی تھی۔"

"مگر معاف فرمایئے۔ آپ کو یہاں کافی عرصہ ہو گیا۔"

"میں اسے بھلانا چاہتا تھا۔ آپ ہنستے نہیں۔ واللہ وہ سفر بھی کتنا دلفریب اور راحت بخش تھا۔ خدا قسم میرے دل میں آجتک اسکی خوشگوار یاد باقی ہے۔ اور اُس سے میرے دل کو ایک خفیف سا صدمہ بھی ہوتا ہے۔ اللہ جانتا ہے آجکل زندگی بھی کس درجہ سوہانِ روح ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ گاہے ماہے آرام بھی کیا جائے۔ چنانچہ اس جیلخانہ سے بہتر جگہ اس مصرف کے لئے کوئی نہیں یہاں کے لوگ بہت ہی پابندی کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

گینمارڈ نے کہا۔ "آرسین لوپن" "اب آپ مجھے ٹانگ پکڑ کر کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔"

لوپن نے جواب دیا۔ "گینمارڈ" "آج جمعہ ہے۔ آیندہ چہارشنبہ کو میں انشاء اللہ روبر گلنولس میں سہ پہر کو چار بجے کے قریب آپ کے ساتھ سگار نوشی کرونگا۔ جایئے۔"

"آرسین لوپن۔ میں منتظر رہونگا۔"

دونوں نے ایسی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ جس سے ظاہر تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی قدر و قیمت سے خوب واقف ہیں۔ اس کے بعد یہ پُرانا سراغرسان دروازہ کی طرف مُڑا۔ "گینمارڈ" گینمارڈ نے مڑ کر دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"اجی حضرت آپ اپنی گھڑی بھول گئے۔"

"میری گھڑی"

"جی ہاں میں نے ابھی ابھی اسے اپنی جیب میں پڑے ہوئے محسوس کیا۔ دیکھئے تو آپکی جیب سے میری جیب میں آگئی۔"

گینمارڈ نے خفیف ہو کر معافی مانگتے ہوئے اُسے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

"معاف کیجئے گا۔ ایک ذرا سی شکایت رہ گئی۔ یہ کسقدر ظلم کی بات ہے۔ کہ ان لوگوں نے بلاوجہ میری گھڑی چھین رکھی ہے۔ یہ ہرگز داخل انصاف نہیں کہ میں اُس کے عوض میں آپ کی گھڑی چھین لوں۔ علاوہ بریں میرے پاس ایک موجود بھی ہے۔ جو وقت بتانے کے علاوہ میری ہر ضرورت کو بخوبی پورا کر دیتی ہے۔"

لوپن نے میز کی دراز کھولکر ایک بڑی اور اعلےٰ درجہ کی طلائی گھڑی نکالی جس میں نہایت خوبصورت زنجیر لگی ہوئی تھی۔

"کیوں۔ یہ تم نے کس کے جیب سے اُڑائی۔"

آرسین لوپن نے بہت ہی لاپروائی سے اُس پر کندہ حروف دیکھنا شروع کئے۔

"ج۔ ب۔ خدا معلوم کس کے نام کے ابتدائی حروف ہیں۔ آہا۔ ہاں۔ خوب۔ یاد آگیا۔ جولیس بوور۔ میرا بیان قلمبند کرنے والا مجسٹریٹ، ہے بیچارہ نیک آدمی۔"

ایم شمیم بلہوری

جذبات

(۱)

دامن میں ایک جلوۂ تاباں لئے ہوتے ہر گل ہے اپنے ساتھ گلستاں لئے ہوتے
مینا بکف ہے ساقی خوش رنگ خوش ادا سرمایۂ نشاطِ فراواں لئے ہوتے
دلہن بنی ہوتی ہے شبِ غم کی چاندنی آغوش میں تصوّر جاناں لئے ہوتے
پایانِ اضطراب ہے آغازِ بے حسی اب درد دل میں اٹھتا ہے درماں لئے ہوتے
اُن کی نگاہِ مست پر اترا رہا ہے دل گویا ہے جامِ بادۂ عرفاں لئے ہوتے
فرحت کہیں پڑے نہ بتوں سے معاملہ
اِترا رہے ہو دولت ایماں لئے ہوتے

---

(۲)

حسرتِ نظّارہ کی تاثیر سے پردہ اُٹھا یار کی تنویر سے
شامِ غم کے رونے والے صبر کر صبح بھی ہوگی تری تقدیر سے
ادّعائے ضبطِ غم کرنا پڑا تنگ آکر آہِ بے تاثیر سے
ہو گئی تسکین فرحت کچھ نہ کچھ
خوش ہوں اپنی آہِ بے تاثیر سے

فرحت

غزلیات

(۱)

شعلہ زا بیتابیاں اظہار ارماں میں رہیں
نقش خونیں داستان دل کے عنواں میں رہیں

شمع بنکر داغ دل اُن کے شبستاں میں رہیں
نقشِ پا بن کر یہ آنکھیں کوئے جاناں میں رہیں

اِک جہانِ آرزو ہو جائیگا آتش بدل
بجلیاں مستور کیوں اُس چشمِ حیراں میں رہیں

جذب ہو جائیں نہ آنسو وقتِ اظہارِ جنوں
کچھ تو قطرے گفتگو کو نوک مژگاں میں رہیں

آشیاں اپنا تو پھونکا فصل گل میں رآبعہ
دیکھیں برق و باغباں کبتک گلستاں میں رہیں

رآبعہ پنہاں

(۲)

مٹتا ہے کہیں شاؔمی حرفِ خطِ پیشانی
پیش آئیگی وہ اِک دن جو کچھ کہ ہے پیش آنی

چھپتا ہے چھپاتے سے کب راز محبت کا
ہو جائیگی آئینہ اِک دن میری حیرانی

محروم رہے کوئی کیوں دور صبوحی سے
جب واور توبہ ہے ناحق ہے پریشانی

دل نذر مرا کرنا انکار اُدھر اُن کا
یہ شانِ گدایانہ وہ سطوتِ سلطانی

کیوں بار اُٹھاؤں میں دامان و گریباں کا
تو کام کب آئیگا اے جامۂ عریانی

ہے پیشِ نظر کوئی فیضانِ تصوّر سے
نافہم ہے تو درباں بیکار ہے دربانی

پاتا نہیں کیوں دل میں اے شاؔمیِ افسردہ
وہ ذوقِ سخن گوئی وہ لطف غزل خوانی

شاؔمی

سنگم کے راستے میں

دیکھتی ہوں راہ میں سنگم کی میں جاتے ہوئے
چھاؤں میں تاروں کی پتے ناز سے گاتے ہوئے

سبز کلیوں میں نئی اک رُوح دوڑاتے ہوئے
تازہ پھولوں کو قبائے سُرخ پہناتے ہوئے

یاسمن کے لب پہ اک موجِ تبسّم نور پاش
اور بھونرے ہر طرف اُڑتے ہوئے گاتے ہوئے

ڈالیاں چمپا کی رقصاں ہیں ہوا کے ساتھ ساتھ
پھول نیلوفر کے تالابوں میں شرماتے ہوئے

ننھے بچّے چلتے پھرتے اور ہنستے کھیلتے
گیت سب معصومیت کے رنگ میں گاتے ہوئے

پیاری پیاری بچّیاں جھولا فضا میں جھولتی
ننھے گیسو عارضِ رنگیں پہ لہراتے ہوئے

خوش نوا ہمجولیاں تالاب پر جاتی ہوئیں
اُن کے چاندی کے کڑے گاگر سے ٹکراتے ہوئے

صاف تالابوں میں چھالے سیم گوں اُٹھتے ہوئے
مست وش چلتے ہوئے سو پیچ و خم کھاتے ہوئے

جھونپڑے خس پوش موجِ نور میں ڈوبے ہوئے
ڈوبتے تارے فلک سے اوس برساتے ہوئے

مُسکرانے والے غنچے ہیں صبا حسن آفریں
صبح کے دلکش مناظر نور پھیلاتے ہوئے

بلقیس جمال

غزل

آنکھ سے آنسو جو ٹپکا ترجمانِ دل بنا
اضطرابِ دل نہاں تھا گریۂ شبگیر میں

حُسن کی بخشش انہیں اور عشق کی ہم کو عطا
وہ انہیں انعام میں اور یہ ہمیں تعزیر میں

کوششوں کی کامیابی تابعِ قسمت رہی
بے بسی کا راج پایا عالمِ تدبیر میں

آہ عالم سوز نے اپنے کمالِ جذب سے
تیر پھینکا عشق کا ڈوبا ہُوا تاثیر میں

فرطِ بیتابی سے اُن کا فتنۂ معصوم حسن
پابجولاں ہو کے آیا عشق کی زنجیر میں

دامنِ بخشش میں میری معصیت ہے یوں چھپی
ظلمتِ شب جس طرح ہو پردۂ تنویر میں

اثر دریاپوری

ہیرا سنگھ کا آخری جرم

(۱)

انسپکٹر مسعود سگرٹ سلگاتے کسی گہرے خیال میں محو تھا۔ یہ محویت جو اس پر اکثر و بیشتر طاری رہتی تھی۔ دوستوں کی نگاہ میں قوتِ متخیلہ کہلاتی تھی۔ اس کے مخالف اسی محویت کو مرض کا لقب دیتے تھے۔ لیکن ایک سوانح نگار کو ایسے نازک امتیازات سے کوئی کام نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ وہ سگرٹ سلگاتے کسی گہرے خیال میں محو تھا۔ شاید وہ کسی مجرم کے ذہنی ارتقاء پر غور کر رہا تھا۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جس دن سے وہ پولیس میں ملازمت کرنے پر مجبور ہوا تھا اسی دن سے وہ مجرموں کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ علیگڑھ کالج کا گریجوایٹ تھا اور شروع ہی سے علمی جرائم کے نفسیات سے اُسے خاص دلچسپی تھی۔ وہ گھنٹوں رات کو اپنے بستر پر لیٹا ہوا، ڈراؤنی تاریکی میں اپنے تخیل کی مدد سے فضا میں خوفناک جرائم کی ازسرِ نو تعمیر کرتا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوتا گویا مجرموں کی سایہ نما ہیتیں اس کے ارد گرد منڈلا رہی ہیں۔ رقص کر رہی ہیں۔ دن بدن اس کی دلچسپی زیادہ ہوتی گئی۔ اور اُس نے اس موضوع پر ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں پھر وہ دور آیا۔ جب اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے تمام مطالعہ کی تدقیق و تحلیل کرے۔ اور کسی بیّن نتیجے پر پہنچے۔ کتنی سال وہ اپنے خیالات کی ترتیب و تدوین میں مصروف رہا۔ اور آہستہ آہستہ وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ ہر جرم ایک اتفاقی واقع ہوتا ہے یا اگر زیادہ صحیح الفاظ کی ضرورت ہے تو یوں کہنا چاہیئے۔ کہ جرائم پیشہ اشخاص کا پہلا جرم ایک اتفاقی واقع ہوتا ہے انسان کی زندگی میں واقعات کی مختلف کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایک واقعہ جو ابتداً میں جرم کے ہر عنصر سے خالی تھا۔ گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر ایک جرم میں تبدیل نہ ہو جائے دو ایماندار مسافر جو اپنی عام زندگی میں نہایت دیانتدار شہری ہیں۔ کسی ویران جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ جہاں پانی کی قلت ہے۔ دونوں کو قریب ہی ایک مختصر سا کنواں نظر آتا ہے۔ وہ پانی کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں۔ اور بغیر سمجھے بوجھے۔ بغیر دیکھے بھالے اُن میں سے ایک دوسرے کو ہلاک کر دیتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے

کہ ان میں سے کسی ایک کی فطرت مسخ شدہ تھی لیکن اُن کے افعال کی کڑیاں آپس میں اس طرح مربوط تھیں کہ ایک معمولی واقعہ اتفاق سے جرم بن گیا۔ جس میں پیش از وقت ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ جس میں پیش از وقت بدنیّتی کا کوئی عنصر نہ تھا۔ کچھ اس قسم کے خیالات سے متاثر انسپکٹر مسعود پولیس کی ملازمت میں داخل ہوا۔ رفتہ رفتہ جب اس کے خیالات اس کے ہم پیشہ دوستوں پر ظاہر ہوتے تو انہوں نے اس کا مضحکہ اڑانا شروع کیا۔ لیکن مسعود کی حیرت انگیز قابلیت اس کی مستعدی اور تندہی اور اس کی عدیم النظیر ذہانت بہت جلد غالب آگئی۔ ہاں اُس کے زاویہ نگاہ میں اور دوسروں کے نقطہ نظر میں جو اختلاف کی وسیع خلیج حائل تھی وہ اسی طرح رہی۔ اکثر وہ اور انسپکٹر فیاض حسین اس موضوع پر حریفانہ گفتگو کیا کرتے۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتے تھے۔

مسعود نے ایک اور سگرٹ سلگایا۔ اور غالباً یہ فعل اس کے سلسلۂ خیال میں حارج ہوگیا۔ کیونکہ اُس نے چونک کر اس طرح گویا وہ ابھی کسی بڑے حیرتناک خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اپنے دائیں طرف گھڑی کی طرف دیکھا۔ جو کمرے کی دیوار پر نہایت سکون سے ٹک ٹک۔ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ گویا زبانِ حال سے مسعود کی پریشانی کا مضحکہ کر رہی تھی۔ تاریکی سکون آمیز خاموشی سے بڑھ رہی تھی۔ اور کمرے کی چیزوں پر ایک دھندلا سا سیاہ پردہ پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر لیمپ جلایا اور ابھی پھر بیٹھنے نہ پایا تھا کہ اس کو اپنے دوست فیاض حسین کی آواز سُنائی دی۔ جو حسبِ معمول اپنی گونجتی ہوئی باصحت آواز میں اُس کے نوکر سے باتیں کر رہا تھا۔

"اُوپر ہیں"

مسعود کو اپنے نوکر کی آواز نہیں سُنائی دی۔

"کیا کر رہے ہیں۔ توبہ اس وقت تک۔ نعوذ باللہ"

اور اس کے ساتھ ہی مسعود کے خیال میں گویا سیڑھیاں فیاض کے چڑھنے سے لرزنے اور گونجنے لگیں۔ یقیناً اگر کئی ایک باتوں میں فیاض اور وہ قطعاً ہمخیال نہ ہوتے تو مسعود جیسا سکون پسند آدمی یقیناً فیاض کی سپاہیانہ شورش حسیات اور ہنگامہ خیز حرکات سے بیزار ہو جاتا۔ وہ بغیر دروازہ کھٹکھٹائے اندر داخل ہوا۔ مسعود کی طرف ہنستی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ نہایت بےتکلفی سے اپنی طرف ایک کرسی کھینچ لی۔ اور بیٹھ گیا۔ دونوں تقریباً نصف گھنٹہ ایسی سنجیدگی سے سگرٹ نوشی کا شغل فرماتے رہے۔ جو بیکاروں کا خاصہ ہے۔

پھر یکایک فیاض حسین چونک کر بولا۔

"سُنائیے ہیرا سنگھ کا کیا حال ہے۔ اسکی حرکات پر ذرا نگاہ رکھئے گا۔"

مسعود نے اپنی ٹھوڑی کو کھجلاتے ہوتے کہا "میں تو پریشان ہوگیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

فیاض نے بلند آواز سے قہقہہ لگایا "کیوں"

"مجھے یہ معلوم ہے کہ شہر کے تمام جرائم پیشہ اشخاص مصیبت کے وقت اُس سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اور اکثر چوری اور ڈاکے کی وارداتیں اُس کی مدد سے وقوع میں آتی ہیں۔ لیکن وہ کمبخت اس احتیاط سے کام لیتا ہے کہ حرف گیری کی گنجائش نہیں رہتی۔"

فیاض ایک لمحے کے لئے سنجیدہ ہوگیا اور اسکی آنکھوں میں جو ہر وقت مسکرانے کی عادی تھیں، ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہُوتی۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہُوئے کہا۔ "لیکن مسعود، اس کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ وہ مدتوں سے پولیس کی آنکھوں میں خاک جھونک رہا ہے۔ لیکن مسعود پھر کسی گہرے خیال میں غرق ہوگیا تھا۔ فیاض نے پھر مسکرا کر اس کا شانہ جھنجھوڑتے ہُوتے کہا۔ "سُنتے ہو۔ ضروری ہے۔ اور ضروری ہے"

مسعود نے چونک کر ایک محجوب سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "بیشک۔ بیشک ضروری ہے۔ کیوں نہیں۔ آپ کا لاہور جانا ضروری ہے۔"

اب فیاض ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے مسعود کو شانوں سے پکڑ کر کرسی سے گرا دیا۔ اور اس کو گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں لمپ کے نیچے لے آیا۔ اور پیشتر اس کے کہ مسعود کچھ مدافعت کر سکے۔ جلدی سے قریب کے ایک جگ سے پانی کا چلّو بھر کر اس کے منہ پر چھینٹا دیا۔

مسعود نے کہا۔ "بھئی معاف کرنا۔ میں نے تمہاری آخری بات نہیں سُنی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ہیرا سنگھ کا پہلا جرم کس طرح وقوع میں آیا تھا۔

"تو تمہیں اب تک یقین ہے کہ ہیرا سنگھ جیسا شقی القلب سیاہ دل اور بدبخت آدمی کا پہلا جرم اتفاقی ہوگا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ایسے شخص کی فطرت کبھی سلیم رہ چکی ہو۔ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔"

مسعود کے لبوں پر ایک تمسخر آمیز سا تبسم نمودار ہُوا۔ تم ابھی اس کہنہ مشقی کے باوجود انسانی فطرت کی گہرائیوں سے ناواقف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہر مجرم ناگزیر واقعات کی بنا پر اپنے پہلے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔"

اس کی آواز زیادہ بلند ہوتی گئی۔ زیادہ پُر زور ہوتی گئی۔ "مجھے یقین کامل ہے کہ ہیرا سنگھ کی مجرمانہ زندگی کا پہلا واقعہ ایک اتفاق تھا۔ ایک حادثہ تھا۔"

فیاض حسین نے دیکھا کہ اب وہ اُس مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ جہاں اختلاف رائے ایک ناگوار صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس نے مسعود کے شانوں پر تھپکی دیتے ہُوئے کہا۔

"واقعات آپ کی تردید یا تائید کر دینگے۔"

اور فوراً موضوعِ سخن کو بدل کر کہا" سینما چلوگے۔ یا تھیئٹر۔ یاد ہے نا آج محمد حسین سے وعدہ کیا تھا۔"

(۲)

ایک شکستہ مکان کی دوسری چھت پر ہیرا سنگھ ایک تنگ و تاریک کمرے میں جس میں روشنی کی چند آوارہ شعاعیں مختلف روزنوں میں سے داخل ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ایک کتّے کو اپنے زانو پر بٹھائے اس کے سر پر تھپکیاں دے رہا تھا۔ کتّے نے اپنی بھوری آنکھیں جن کی طرف غور سے دیکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا گویا انہیں ذہانت کی ایک ایسی چمک ہے۔ جو اولادِ آدم صرف اپنے آپ سے مخصوص سمجھتی ہے۔ اپنے مالک کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں ہیرا سنگھ کا چہرہ حقیقت میں کسی ماہر نفسیات کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہوتا۔ مختلف کیفیات اور تجربات نے اُس کے نقش و نگار پر اپنے تاثرات ثبت کر رکھے تھے۔

وہ اُٹھا اور کمرے کی شمالی دیوار کی طرف ایک مختصر سی کھڑکی کی طرف بڑھا اور نہایت احتیاط سے کیونکہ کھڑکی میں سے کئی اینٹیں گر چکی تھیں۔ سر نکال کر ادھر اُدھر دیکھا چاروں طرف ایک مہیب چپ مسلط تھی۔ اور گُم سُم اندھیرا اپنے سیاہ لبادے کے وسیع دامن میں شہر کو لپیٹے ہوئے تھا۔

اُس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اور دبے پاؤں واپس مڑا۔ پھر ایک الماری میں سے چند اوزار اور ایک بڑا شکاری چاقو نکالا۔ اس نے کُتّے کے سر پر ایک آخری تھپکی دی۔ اور سیڑھیوں کے راستے نیچے اُتر گیا چند ایک پیچدار گلیوں سے گُزر کر ایک موڑ پر اسے ایک مبہم سی صورت نظر آئی۔ ہیرا سنگھ نہایت احتیاط سے قدم اُٹھاتا ہُوا اُس کی طرف بڑھا اور آہستہ سے کہا محمد خاں:۔

"جی ہاں"

جواب بھی جس میں تعظیم کا سا عنصر ملا ہُوا تھا اسی احتیاط سے دیا گیا تھا۔

"تیار ہو"

"جی ہاں"

دونوں چپ چاپ چل دیئے۔ ہیرا سنگھ کوئی پانچ قدم آگے آگے، محمد خاں پیچھے پیچھے۔ آباد اور کھُلی شاہراہوں کو چھوڑ کر وہ غیر معروف گلیوں سے گزرتے ہُوئے۔ ابھی تک بہت احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ ذرا سی آہٹ پر دونوں چوکنے ہوکر کسی دروازے کی آڑ میں یا کسی محراب کی پناہ وہ سائے میں چھپ جاتے۔ خدا جانے ہیرا سنگھ کیا سوچ رہا تھا۔ لیکن محمد خاں کے خیالات بہت خطرناک سے تھے۔ اگر ہیرا سنگھ کو اُن خیالات کا شبہ بھی

ہو جاتا۔ تو وہ یقیناً اپنی حفاظت کی تدابیر عمل میں لاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد خاں کے خیالات بولشوزم کی حد تک پہنچے ہوتے تھے۔

"کسقدر ظلم ہے۔ مکان کا پتہ میں نے دریافت کیا۔ مالک مکان کی عادات کا پتہ میں نے لگایا۔ نوکروں کو رشوت میں نے دی۔ جواہرات اور روپوں کے صندوق کا مقام میں نے تحقیق کیا۔ اور اب اس تمام محنت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہیرا سنگھ کے حصے میں آدھے سے زیادہ منافع آئیگا۔ اور باقی مجھے ملیگا۔ کیا اچھا ہو......"

یہاں اس کے خیالات کا سلسلہ رک گیا۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں منزل مقصود پر پہنچ گئے تھے۔ تاریکی میں سڑک کے کنارے درختوں کی قطار عظیم الجثہ دیووں کی ایک صف معلوم ہوتی تھی۔ ہیرا سنگھ نے جیبی لالٹین نکالی۔ اور اس کی روشنی میں درختوں کے دوسری طرف ایک بلند دیوار کی ہیئت دیکھی۔

پھر اس نے محمد خاں کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے قریب کے ایک درخت پر کسی نہایت چالاک اور پھرتیلے بندر کی سی کہنہ مشقی سے چڑھنا شروع کیا۔ درخت کی سب سے مضبوط آخری شاخ پر پہنچ کر جو مکان مقصود کی دیوار سے متوازی تھی۔ وہ نہایت اطمینان اور بیباکی سے دیوار پر پھاند گیا۔ چند لمحوں میں محمد خاں بھی اسکے پاس آ پہنچا۔ ہیرا سنگھ نے پھر لالٹین نکالی اور اس کا رخ نیچے زمین کی طرف کر کے غور سے دیکھنا شروع کیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باغ کی دیوار پر کھڑے ہیں۔ مدھم روشنی میں مختلف رنگوں کے پھول دور ستاروں کی طرح نہایت مبہم سی روشنی سے لبریز نظر آتے تھے۔ زمین کو حال ہی میں پانی دیا گیا تھا۔

ہیرا سنگھ نے سرگوشیوں میں کہا "عین ہمارے نیچے کی زمین نرم معلوم ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے جسم کو ایک چھلانگ کے لئے تیار کیا۔ اور پھاند گیا۔ محمد خاں پہلے کچھ ہچکچایا۔ لیکن ہیرا سنگھ کو صحیح سلامت اپنے قدموں پر دیکھ کر وہ بھی کود گیا۔ وہ دونوں دبے پاؤں باغ کی روشوں پر سے گزرتے ہوئے مکان کی طرف بڑھے جس کی ایک کھڑکی میں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہیرا سنگھ نے استفہامیہ نگاہوں سے محمد خاں کی طرف دیکھا جس نے جواب میں صرف یہ فقرہ کہا۔

"یہ نوکر کا کمرہ ہے وہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

ہیرا سنگھ مطمئن ہو کر پھر آہستہ آہستہ بڑھا لیکن اب محمد خاں اپنے خیالات کو اپنی محدود ذہنیت کے استدلال سے زیادہ قوی بنا رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اسقدر ظلم سخت ناانصافی ہے۔ ابتک کئی وارداتیں اس کی مدد سے عمل میں آئی تھیں۔ لیکن منافع میں سے

اُسے بہت تھوڑا حصّہ دیا گیا تھا۔ اس بہیم ناانصافی کا خیال
کرکے وہ اندھا دھند غصّے سے کانپ اُٹھا۔ اُس نے
اپنا لٹھ خطرناک انداز میں اونچا کیا۔ لیکن پیشتر اس کے
کہ وہ اپنے خوفناک ارادے کو پورا کرے۔ کسی پیش آنیوالے
خطرے کے اس ادراک نے جو جرائم پیشہ اشخاص میں نہایتی
طور پر ارتقاپذیر ہو چکتا ہے۔ ہیرا سنگھ کو خبردار کردیا۔ اُس
نے چشمک برق کی تیزی سے مڑکر اپنے شکاری چاقو سے
محمد خاں کے سینے پر ایک کاری وار کیا۔ اور لٹھ اس کے
ہاتھ سے گر پڑا۔ گرم خون کی ایک تیز دھار نکلی۔ ایک چیخ
زمین پر کسی بھاری چیز کے گرنے کا دھماکا اور بنی نوع انسان
میں سے ایک فرد کم ہوگیا۔ ہیرا سنگھ کے جرائم میں ایک اور
جرم کا اضافہ ہوگیا۔"

کوئی گھنٹے بھر کے بعد ہیرا سنگھ مکان سے واپس
نکلا۔ اس نے اپنے کاندھوں پر ایک گٹھڑی اُٹھائی ہوئی تھی
جس میں غالباً مختلف قسم کے جواہرات، روپے اور زیورات
کا انبار تھا۔ جھاڑیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے جہاں
محمد خاں کی لاش پڑی ہوئی تھی کسی نامعلوم جذبے نے
اُسے مجبور کیا کہ وہ لالٹین کی مدد سے ایک دفعہ پھر محمد خاں
کا چہرہ دیکھے۔ اُس نے مقتول کے سفید بیجان چہرے پر
نگاہ ڈالی اور دانت پیستے ہوئے کہا۔

"بیوقوف"

یہ کہکر اس نے جلد از جلد مکان سے نکل جانے کی
تدابیر سوچنا شروع کی۔ کیونکہ خلاف معمول آج اطمینان قلب
اُس سے کوسوں دُور تھا۔ اُسے یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا تقدیر
اُس سے ایک خوفناک کھیل کھیل رہی ہے آج کا دن شروع
ہی سے بدشگونیوں کا دن تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ محمد خاں
اس پر اس طرح حملہ کرنے کی کوشش کریگا۔ اور پھر اسبات
سے قطع نظر یہ کیسے شبہ ہوسکتا تھا کہ مکان کا مالک
جاگ رہا ہوگا۔ اور ہیرا سنگھ کو مجبوراً اپنی حفاظت کی غرض
سے اُسے بھی خاموش کرنا پڑیگا۔ یہ اور سوال تھا کہ چاقو
کی ضرب اتفاق سے بہت خطرناک ثابت ہوئی۔ اور
مالکِ مکان نے فوراً دم دے دیا۔ ورنہ ہیرا سنگھ کے خیال
میں تو اسکی بدنیتی کو مطلق دخل نہ تھا۔

(۴)

مذکورہ بالا واقعات پولیس انسپکٹر مسعود کی سرکردگی
میں معلوم کرچکی تھی۔ محمد خاں اور مالکِ مکان کا قتل، جواہرات
کی چوری۔ ان تمام باتوں کے متعلق انسپکٹر مسعود پر ہیرا سنگھ
کی حرکات روز روشن کی طرح آشکارا تھیں لیکن اسوقت
سے لیکر جب ہیرا سنگھ مقتول شخص کے مکان سے نکلا اس
وقت تک جب وہ اپنے شکستہ مکان کے نیچے اپنے مُردہ کُتّے
کے ساتھ مرا ہوا پایا گیا۔ ہیرا سنگھ کی حرکات و سکنات
کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ ہیرا سنگھ کا سر پھٹا ہوا تھا۔

گویا کسی بھاری بھدّی اور بڑی شے سے اُس کے سر پر ضرب لگائی گئی ہو۔ اس کے کُتّے کی لاش بھی اس کے قریب پائی گئی۔

واردات کے پُراسرار واقعات کی وجہ سے خود سپرنٹنڈنٹ صاحب موقع پر آکر تفتیش کر رہے تھے۔ انسپکٹر فیاض حسین اُن کے ساتھ تھا۔ لیکن خدا جانے مسعود آج کیوں غائب تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے فیاض سے کئی دفعہ اس کی عدم موجودگی کا سبب دریافت کیا لیکن اُسے بھی اپنی طرح لاعلم پاکر خموش ہو رہے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب اس بات پر غور کر رہے تھے کہ آخر وہ کون شخص ہے جس نے ہیرا سنگھ کو قتل کر دیا کہ یکایک ہیرا سنگھ کے مکان سے مسعود اُترتا ہُوا دکھائی دیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب اور فیاض حیرت کے مارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ پھر دونوں نے ہم آواز ہو کر پُوچھا "تم ہیرا سنگھ کے مکان میں کیا کر رہے تھے"

اُس نے نہایت ادب اور اطمینان سے جواب دیا

"جناب عالی میں اپنی تفتیش مکمل کرنے گیا تھا"

سپرنٹنڈنٹ نے حیرت سے پُوچھا "تفتیش"

"جی ہاں"

"کس کے متعلق"

"ہیرا سنگھ کی موت کے متعلق"

فیاض حسین مُسکرایا۔ وُہ سوچ رہا تھا۔ کہ اس کے دوست کا مراق انتہا کو پُہنچ گیا ہے۔ غالباً وہ اس جرم کو بھی اتفاقی ثابت کرے گا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایسی نرمی سے جو اکثر ایسے آدمیوں سے برتی جاتی ہے، جو صحیح العقل ہونے کے باوجود کسی بات کے متعلق ایک مستقل غلط عقیدہ قائم کر بیٹھتے ہیں۔ کہا۔

"اور نتیجہ کیا نکلا"

"مجھے معلوم ہُوا۔ کہ ہیرا سنگھ کو کسی نے قتل نہیں کیا"

"تو اس کی موت کیسے وقوع میں آئی"

مسعود نے مکان کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "دیکھئے یہ پانی کا نل جو اوپر کھڑکی کی طرف جا رہا ہے۔ اس پر چڑھنے کی کوشش میں اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ نیچے گر پڑا"۔

سپرنٹنڈنٹ اور فیاض اس کی طرف بڑھتی ہُوئی حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔

مسعود نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھ کر کہا "میری تفتیش بالکل مکمل ہے۔ مَیں نے پہلے اُوپر جاکر ہیرا سنگھ کے کمرے کا معائنہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ ہیرا سنگھ اپنے کُتّے کو وہیں چھوڑ گیا تھا۔ کُتّا تنہائی میں پریشان ہو گیا۔ اور کھڑکی کے راستے باہر چھجے کی طرف نکل آیا۔ کھڑکی نہایت

بوسیدہ حالت میں تھی۔ بہت سی اینٹیں کھڑکی سے گر پڑیں اور کھڑکی کے راستے کو مسدود کر دیا۔ اینٹوں کو اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُن کے نیچے کُتّے کے پنجوں کے نشان تھے جس سے ثابت ہوا کہ کھڑکی کی اینٹیں اس وقت گری ہیں جب کُتا چھجّے پر پہنچ چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ جب کُتّے نے یہ محسوس کیا کہ واپس کمرے کی طرف جانے کا راستہ مسدود ہو چکا ہے، تو وہ بہت مخوف ہو گیا۔ اور اُس نے ڈر کے مارے بھونکنا شروع کر دیا۔ عین اُس وقت ہیرا سنگھ واپس آیا اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چھجے کی طرف دیکھا اور تمام معاملہ سمجھ گیا۔ وہ محض اپنے کتّے کو بچانے کی خاطر اس نل کے راستے سے اُوپر چڑھا۔ اگر آپ سرسری نظر سے نل کا معائنہ کرینگے تو معلوم ہوگا کہ نل پر جو مٹی کی تہ جمی ہوئی ہے اس پر کسی آدمی کے ہاتھ اور ایڑیوں کے نشان ہیں وہ کُتّے کو لیکر نیچے اُتر رہا تھا۔ کہ اُس کا پاؤں پھسل پڑا۔ اور دونوں نیچے گر پڑے۔"

مسعود کی آواز اب زیادہ تیز زیادہ بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔ "صاحبان ذرا خیال کیجئے۔ ہیرا سنگھ جو کسی شخص کو قتل کرنے میں ذرا باک نہیں کرتا۔ اپنے کُتّے کو بچانے کی خاطر اپنی جان دے دیتا ہے۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ اُسے کُتّوں سے کسقدر محبت ہوگی۔ ممکن ہے میں غلط ہوں۔ لیکن اس واقعہ سے میں اس کے پہلے جرم کے متعلق اندازہ لگا سکتا ہوں۔ آج سے کئی سال پہلے ہیرا سنگھ نوجوان پاکباز ہیرا سنگھ ایک ایسی ہی گلی سے گزر رہا تھا۔ جہاں کوئی شقی القلب شخص کسی کتّے کو مار مار کر ادھ مؤا کر رہا تھا۔ ہیرا سنگھ اپنی جوانی کی بے پناہ طاقت سے ناآشنا تھا۔ بے زبان پر یہ ظلم دیکھ کر وہ جھپٹ کر آگے بڑھتا ہے اور اُس شقی القلب شخص کو گلے سے دبوچ لیتا ہے۔ وہ شخص نہایت کمزور ہے ہیرا سنگھ نہایت طاقتور، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ اپنی طاقت سے بیخبر ہیرا سنگھ کی گرفت بے خبری کے عالم میں زبردست ہوتی جاتی، اور وہ شخص گر کر دم دیدیتا ہے۔

یہ تھا ہیرا سنگھ کا پہلا جرم۔ ایک اتفاقی واقعہ ——
لیکن قانون ان امتیازات سے بے نیاز ہے۔ انصاف کا وہی معمولی کھیل کھیلا گیا۔ دونوں طرف کے وکیلوں کی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ جج نے دونوں کی تعریف کی۔ پھر ایک فاضلانہ فیصلہ سپردِ قلم کیا۔ اور ہیرا سنگھ کو سات سال قید بامشقت کی سزا دی۔

وہی رحمدل ہیرا سنگھ قید کاٹ کر آیا تو سوسائٹی کے خلاف قانون کے خلاف اپنے دل میں حقارت اور نفرت لیکر آیا۔ اور ہیرا سنگھ ڈاکو کے نام سے مشہور ہوا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ممکن ہے میں غلط ہوں لیکن واقعات میری تائید کر رہے ہیں۔"

یہ کہکر وہ فیاض حسین کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

عابد

غزل

پلائے جا ساقیا! پیا پے پلائے جا انتظار کیا ہے؟
جو لڑکھڑا جائے ایک دو ساغروں میں وہ بادہ خوار کیا ہے!

چمن میں رقص طرب بپا ہے رباب ہاتھوں میں مقام طرب
عبث ہیں یہ کاوشیں تیرے دل میں پھول کیا ہیں بہار کیا ہے؟

لپٹ لپٹ کر گلوں کو ہم چوم لینگے اے نوحہ خوانِ گلشن!
بہار ناپائدار لیکن ہمارا بھی اعتبار کیا ہے

ازل سے خورشید و ماہ کے جام بزم ساقی میں چل رہے ہیں
مرید پیرِ مغاں کی نظروں میں دورِ لیل و نہار کیا ہے

کسی کو میخوار کر دیا ہے کسی کو واعظ بنا دیا ہے
اثرؔ اسی کے ہیں سب کرشمے کسی کا کچھ اختیار کیا ہے؟

اثرؔ صہبائی

رباعیات

ہنگامہ بدوش ہیں ادائے بہار
خمخانۂ مے ہے روئے زیبائے بہار
اس جانِ بہار کی ہے آنکھوں کو تلاش
اے وائے قرار و صبر اے وائے بہار

تاریکیِ اندوہ ہے باقی ساقی!
ہاں بادۂ دلگداز ساقی! ساقی!
یہ رنگ یہ محفلیں رہیں یا نہ رہیں!
ہے عہدِ شباب اتفاقی ساقی!

اثرؔ صہبائی

پریم چند

(۱)

پریم چند کے نقوش میرے دماغ میں اسلئے تازہ ہیں۔
کہ وہ بہت عظیم الجثہ اور اچھا آدمی تھا۔ اور شاید اس لئے بھی
کہ اُس کی شخصیت اور اُس کے اطوار میں وہ فلسفہ جو محاربۂ عظیم
سے پہلے عروج کمال تک پہنچکر دوران جنگ میں دب گیا تھا۔
اور اختتام پر پھر ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک نقطۂ مختصر بن کر سما گیا تھا۔
وہ اطالیہ کے مرغزاروں کا بہت شائق تھا۔ مجھے اکثر اس
کی وطنیت کے متعلق شبہ ہوا کرتا تھا۔ مجھے ابتک یہ معلوم نہیں
ہو سکا۔ کہ وہ کس مُلک کا باشندہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں
نیلاہٹ شامل تھی، اس کے بالوں میں ایک دلکش چمک۔
لیکن جب میں اس سے متعارف ہوا ہوں اس کے بال کچھ
خراب سے ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے کا گوشت کبھی کبھی
کچھ مکروہ سی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اُس کا لمبا جسم اسکے
اپنی ساخت کے لباس میں کبھی کبھی علم بغاوت بلند کرتا ہوا
نظر آتا۔

اس کی عمر پچپن سال کی تھی۔

ہر ایک کو محسوس ہوتا تھا۔ کہ پریم چند ایک فلسفی ہے
لیکن اُس نے کبھی اپنے نقطۂ نگاہ کے بیان سے لوگوں کو
اُکتانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس پر مطمئن تھا کہ آپ یہ دیکھکر
کہ وہ کیا کھاتا ہے۔ کیا پیتا ہے اور کس طرح اپنے اردگرد
اس عالمِ فانی کے خوبصورت اشخاص اور اشیاء کو جمع کر لیتا
ہے۔ اُس کے فلسفے کے احساس کا اندازہ کر لے۔ زندگی
اس کے اردگرد بے حس طریق سے گردش کرتی تھی، یا
شاید یہ ہنگامۂ حیات اس کے لئے ایک خاص درجۂ حرارت
سے زیادہ نہیں بڑھنے پاتا تھا۔ عین اسی طرح جس طرح
کسی امیر کے باغ میں ایک ایسے پھول کے لئے جو گرم ہوا
کی تاب لا سکتا ہو مصنوعی وسائل سے ہوا میں
ایک خاص درجہ حرارت پیدا کر دیا جاتے۔

پریم چند کی تشبیہ ایک پھول سے مجھے بہت بھلی
ہوتی ہے۔ کیونکہ اس پھول سے مجھے لارنس گارڈن کا واقعہ
یاد آ گیا۔

پریم چند اس طرح کا آدمی تھا کہ آپ اطمینان سے
کبھی نہ کہہ سکتے تھے۔ کہ آیا وہ کسی خوبصورت تیتری (عورت)
کے گرد بھونرے کی طرح رقص کر رہا ہے۔ یا کوئی خوبصورت
تیتری اس کے گرد رقص کر رہی ہے۔ اس کی خوبصورتی اُس

کی دولت، اُس کا ذوقِ صحیح اور اسکی شہرت نے اُسکی شخصیت
کو آفتاب مثال درخشانی بخش رکھی تھی۔ لیکن اس کی
عمر اس کے بالوں کا گرنا اور اس کی توند کی وسعت اُس
کی درخشانی کے کم کرنے کی موجب ہو رہی تھی۔ اس لئے یہ
مسئلہ کہ آیا وہ شمع ہے یا پروانہ کم از کم میرے
لئے جب میں اس کو اور جانکی کو دیکھا کرتا۔ لاینحل تھا۔
سطحی نگاہ رکھنے والا نقاد کہدیتا۔ جس طرح میرے ایک
نوعمر شاعر دوست نے کہدیا ہے کہ جانکی اس سے کھیل رہی
تھی لیکن میں سطحی نقاد نہیں۔ اور ان دونوں کا بہ امکان نظر
مطالعہ کر رہا تھا۔ جانکی خوبصورت تھی۔ آنا دیباک اور ایک
بیرسٹر کی لڑکی۔ بلند بالا۔ بھورے بھورے بال گنجان
سیاہ ابرو، گداز آنکھیں۔ اور اگر وہ کبھی کبھی ہونٹوں کو سرخی آلود
نہ کیا کرتی تو میں اُس کے دہن کو بھی خوبصورت کہہ دیتا اُس
کو ہنستے اور کھیلتے ہوئے دیکھنا۔ گویا فطرت کے ایک دلکش
نظارے کا مطالعہ کرتا تھا اُس کی آنکھیں ہنستی تھیں اور
اُس کی گفتگو میں غیر معمولی طور پر ایک جوہر قابل کی سی تابنا کی
موجود ہوتی تھی۔ میں نے اُسے کبھی سُست اور پریشان نہ
دیکھا تھا۔ قصہ مختصر اگر اُسے ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں
تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ جاذب نظر تھی اور پریم چند اُس کا متوالا
تھا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جو لوگ حسن کی پرستش کو فن قرار
دے لیتے ہیں۔ وہ واقعی کسی حسین عورت کو اپنے قابو میں
لانا چاہتے ہیں۔ یا اُن کی پرستش برسوں کی عادت کا نتیجہ
ہوتی ہے۔ پریم چند اس کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ٹہلنا گانا
سُننا اور تاش کھیلنا اور اُس کی آنکھیں ہمیشہ جانکی کا
تعاقب کیا کرتیں۔ تعجب کا مقام ہے۔ جانکی چھبیس سال
کی عمر تک کس طرح کنواری رہی۔ آخر آدمی یہ سمجھنے پر مجبور
ہو جاتا۔ کہ وہ عشرتِ حیات میں اسقدر محو تھی۔ کہ اُسے
شادی کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ صبح سے لیکر شام تک
۲۴ گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی۔
اُس کو ایک بچے کی طرح نیند آجاتی ہوگی۔ مجھے خیال
ہوتا تھا کہ جہاں اُس نے تکیے پر سر رکھ کر اپنے مشکین بال
پھیلائے اور اُسے نیند آگئی۔

اُن دنوں مجھ پر فلسفۂ جبر کا بہت اثر تھا۔ خیال
پیدا ہوتا تھا کہ تہذیب نو جو مادی ترقی کے وسائل پیدا
کرنے پر مبنی ہے۔ صرف ترقیٔ مزید کی خواہش پیدا کرنے
کا باعث بن سکتی ہے لیکن ترقی پیدا نہیں کر سکتی۔
سوائے اُن ممالک کے جہاں کے ذرائع معاش اور
پیداوار باشندوں کی تعداد سے فزوں تر ہے۔

محاربۂ عظیم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی
تھی کہ انسان کے سفلی جذبات اس قسم کے نہیں کہ وہ
افادۂ عام کو افادۂ شخصی سمجھنے لگیں۔ دورانِ جنگ میں

بنی نوع انسان کی بہادری کا خیال ایک شعاع امید کی طرح روشن تھا۔ لیکن وہ بھی بہت جلد مٹ گئی۔ من حیث المجموع تہذیب تو ہمیں تنزل کی طرف لے جا رہی تھی۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ ایسے بھی زمانے گزر چکے ہیں۔ جب کرہ زمین کی آبادی ہر چند کہ قلیل تھی۔ لیکن نسبتاً ہم سے صحت مند تھی باقی رہا مذہب تو مجھے قطعاً یقین ہی نہ تھا۔ کہ خدائے قدوس اس عالم فانی کی غربت کا انعام یہ دیگا کہ انکا مستقبل شاندار اور امیرانہ ہوگا۔ یہ نظریہ غیر منطقی معلوم ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ حقیقت میں غریب اور رحم کے قابل وہ شخص ہیں جو اس دنیا میں کامیاب کہلاتے ہیں۔ اور انہیں پر خلد نعیم کے دروازے بند ہیں۔ اس حالت میں مجھے کسی ایسے فلسفے کی تلاش تھی جو میرے ذہن کو آرام دے سکے حتیٰ کہ میں پریم چند کا فلسفہ بھی قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔

میں یہ دریافت کرنا چاہتا تھا۔ کہ آیا خوبصورت تصاویر کو دیکھنا۔ گداز راگوں کو سننا۔ مختلف قسم کی قیمتی شرابوں کو پینا۔ بہترین تمباکو کا استعمال کرنا۔ اور خوبصورت عورتوں میں گھرے رہنا۔ ذہن کو توازن بخش سکتا۔ ہے یا نہیں۔

جو کوئی کشمیر جاتا ہے ——— باغ میں بھی جاتا ہے۔ میں کہ خود پودوں اور درختوں کا نقاش ہوں میں ہر روز باغ کی سیر کے لئے جاتا اور ہر روز اپنی نقاشی کے کاغذات کو لیکر سامنے بیٹھا رہتا۔ اس خواب آلود مقام میں مو قلم کو ہاتھ لگانا جرم معلوم ہوتا تھا۔ ایک شام میں درختوں کے خوبصورت جھنڈ میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ مجھے پریم چند کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مس جانکی میرے لئے خوبصورتی کے سوا دنیا میں اور کوئی چیز نہیں۔“

وہ دونوں مجھ سے بہت قریب تھے لیکن درختوں کا جھنڈ ایسا گنجان تھا۔ کہ میں انہیں اتنا ہی صاف دیکھ سکتا تھا۔ جتنا وہ اگر چمن میں ہوتے تو دیکھ سکتا۔

”فن تو بہت وسیع لفظ ہے۔ مسٹر پریم چند اس کی تعریف کیجئے۔“

”تعریف کی کیا ضرورت ہے۔ فن میرے سامنے موجود ہے۔“

”آپ تو بہانہ سازیاں کر رہے ہیں کیا فن جسم سے تعلق رکھتا ہے یا روح سے۔“

”روح کیا چیز ہے۔ میں اس کے وجود سے انکار کرتا ہوں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”یوں کہئے کہ روح لذات جسمانی کا نفیس پہلو ہے۔“

”شاید“

"یہ بات میرے تمام عمر کے تجربے کا نچوڑ ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں جو احساسات یہ باغ پیدا کر رہا ہے یہ قطعاً لذّات جسمانی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"بیشک اگر آپ اس جگہ حواسِ باصرہ اور شامہ کے بغیر کھڑی ہوتی ہو تو اس وقت آپکے احساسات کیا ہوتے۔"

"مسٹر پریم چند آپ کا فلسفہ بہت یاس انگیز ہے۔"

"ہرگز نہیں، مَیں واقعات کو لیتا ہوں۔ آغازِ جوانی میں مجھے بھی بہت سی توقعات تھیں۔ خدا جانے کس بات کی۔ حتےٰ کہ مَیں شعر بھی کہا کرتا تھا۔"

"اوہو مسٹر پریم چند کیا وہ شعر اچھے ہوتے تھے۔"

"ہرگز نہیں۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ نئے نئے جذبات تمام شاعری سے افضل تر ہیں۔"

"جب آپ کے حواس جواب دے جائیں گے تو آپ کیا کرینگے۔"

"آہستہ آہستہ عدم میں تحلیل ہو جاؤنگا۔"

"کم از کم مجھے آپ کی صاف بیانی ضرور پسند ہے"

"شاید آپ سمجھیں کہ مَیں طنز یہ انداز میں باتیں کر رہا ہوں۔ طنزیات کے ماہر مغرور ہوتے ہیں مَیں مغرور نہیں ہوں۔ حتےٰ کہ میرے لئے صداقتِ کائنات میں بھی غرور کی کوئی وجہ موجود نہیں۔"

"اگر آپ غریب ہوتے۔"

"تو میرے حواس نسبتاً زیادہ عرصہ قائم رہتے اور جب وہ جواب دے دیتے تو مَیں بھوک کی وجہ سے جلدی مر جاتا۔ بس اور کیا۔"

"مسٹر پریم چند آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے"

"مَیں اب بھی محبت کے سنہری جال میں گرفتار ہوں"

"اور کیا آپ کی محبت میں اطاعت کی روحانیت کا کوئی نفیس پہلو نہیں۔"

"کوئی نہیں میری محبت داغ ناتمام ہے۔"

"مجھے کبھی کسی سے محبّت نہیں ہوئی۔ لیکن اگر ہوتی تو اپنے آپ کو محبوب میں گم کر دیتی۔ نہ یہ کہ اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔"

"مس جانکی مَیں آپ سے محبت کرتا ہوں۔"

"اوہو۔ آئیے مسٹر پریم چند چلیں۔ اب شام پڑنے لگی ہے۔"

مَیں نے ان دونوں کے قدموں کی چاپ سُنی۔ اور پھر مَیں اکیلا رہ گیا۔ سبحان اللہ مسٹر پریم چند نے کس سادگی سے اظہار تعشق کیا تھا۔ جذاک اللہ کیا فلسفہ ہے مَیں کوئی آدھ گھنٹہ انہیں خیالات میں مستغرق رہا ہونگا۔ کہ پھر قدموں کی آواز سُنائی دی۔ اور مس جانکی کی آواز۔

"آپ کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ اچھا اگر یہ صحیح ہے تو مجھے پکڑ کر دکھلایئے۔"

"اچھا دیکھئے۔"

ان دو الفاظ میں کچھ ایسا ہذیانِ مسرت پنہاں تھا کہ مَیں اپنے تخیّل میں پریم چند کو دیکھ سکتا تھا۔ چہرہ سُرخ۔ آنکھیں روشن۔ ہاتھ کانپتے ہُوئے۔ اور لب ذرا باہر کو نکلے ہُوئے۔ پھر ایک نہایت موسیقی نواز قہقہے کی آواز آئی۔ اُسی طرح موسیقی سے لبریز جس طرح چاندی کی گھنٹی ہوتی ہے۔ یکایک ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز آئی۔ پھر سبک قدموں کی تیز روی کی آواز اور پھر مسٹر پریم چند کے بھاری قدموں کی تھڈ تھڈ تھڈ۔ مَیں نے دُعا مانگی کہ وہ میری طرف نہ کہیں بھاگتے ہُوئے نکل آئیں۔ اور مجھے بیٹھے ہوئے دیکھ پائیں۔ میرے کانوں کو پھر ایک ہلکے سے قہقہے کی آواز سُنائی دی۔ مسٹر پریم چند ظاہر ہوئے۔ لڑکھڑاتے ہُوئے حیرت اور پریشانی سے زرد میری طرف دیکھا۔ اور ٹھہر گئے۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک پسینے میں غرق تھے۔ اُن کی توند حرکت کر رہی تھی —— ایک مضحک شکاری۔ وہ بڑبڑائے۔ جلدی سے مڑے۔ اور مجھے اُس مقام کی طرف حیرت سے تاکتا ہُوا چھوڑ گئے۔ جہاں مَیں نے اُن کی تمام بناوٹ کی خوبصورتی کو اپنے اصل رنگ میں دیکھا تھا۔ مَیں واپس گھر چلا آیا۔ اور مجھے محسوس ہُوا کہ مَیں نے ایسا واقعہ دیکھا ہے۔ جس میں بہت سے درد کے عناصر شامل ہیں۔ دوسرے دن ایک جلسے میں جانکی کو پھر دیکھا۔ لیکن پریم چند صاحب موجود نہ تھے۔ وہ ایک سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ اور اُس نے اپنے بالوں میں ایک سُرخ پھول پہن رکھا تھا وہ حسب معمول خنداں نظر آتی تھی۔

تھوڑے عرصے کے بعد مَیں نے پریم چند کو بھی دیکھا۔ مُنہ میں ایک سیگار لئے ہُوئے تھے بجلی کی روشنی میں ان کا چہرہ خلافِ معمول زرد نظر آ رہا تھا۔ وہ تمام دُنیا سے بیزار نظر آتے تھے۔ اب مجھے محسوس ہُوا کہ پریم چند صاحب کے فلسفے کے گلستانِ مسرت میں بھی کانٹے موجود ہیں۔ سبحان اللہ کیا فلسفہ ہے۔

"؟"

غزل

دیکھ کر لوگ مرے زخم جگر کی صورت
پھروں دیکھا کئے اُس رشک قمر کی صورت

بزم رنداں میں ہے ہر وقت مئے صاف کا دور
محتسب اُن میں ہو کیونکر کوئی شر کی صورت

کوئی آشفتہ مزاج آج گریباں اپنا
چاک کرتا تھا گریبانِ سحر کی صورت

نظر آجاتے خدا تجھ کو جو دیکھے اے شیخ
میری آنکھوں سے بتِ شعبدہ گر کی صورت

لطف جب حضرتِ شامی ہے سخن گوئی کا
شعر جو نکلے زباں سے ہو گہر کی صورت

شامی

غزل

دیباچہ محبت ۔ ترتیب دے رہے ہیں
ٹوٹے دلوں کے نغمے سازوں میں عاشقی کے

حق تلفیوں کا ان کو احساس ہی نہیں ہے
معصوم کسقدر ہیں ۔ قربان کمسنی کے

دنیا میں کر رہی ہے شبنم گلاب پاشی
مخمور ہیں فضائیں عالم ہیں میکشی کے

غنچوں کا مسکرانا تاروں کا جھلملانا
ہے کیا سماں سہانا عالم ہیں خامشی کے

بے چین جو ہوا ہے چھڑتے ہی ساز عشرت
ہیں درد میں ودیعت اسرار بیکلی کے

میر نذر علی درد

وادیِ گُل

باب اوّل

مَیں ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ جو اپنی متخیلہ کی شعلہ زائی اور جوش جذبات کے وفور کے لئے مشہور ہے۔ لوگ مجھ کو دیوانہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن تاایں حال یہ امر مسلمہ نہیں کہ دیوانگی اور اعلےٰ تریں حکمت میں کیا رشتہ و ربط ہے۔ کیا تخیل کی رفعت عموماً انتشار دماغ سے پیدا نہیں ہوتی؟ کیا عمیق جذبات اضطرار تخیّل کا باعث نہیں ہوتے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ رفعت اور عمق اُن دماغی کیفیات کے سبب سے دریافت ہوتے ہیں۔ جو دماغ کے ظاہری قویٰ اور ادراک عامی کے فنا ہو جانے کے بعد وجود میں آتی ہیں۔ جو لوگ روز روشن میں خواب دیکھتے ہیں۔ وُہ بسا اوقات ایسی کیفیات محسوس کرتے ہیں۔ جو رات کو خواب دیکھنے والوں کو کبھی نصیب نہیں ہوتیں۔ اس قسم کے انسان اپنے واہمے کی قوت سے عالم ناسوت کے وہ نقوش مشاہدہ کرتے ہیں۔ جن کو اس عالمِ اسباب سے کوئی نسبت نہیں۔ اس خود فراموشی سے بیدار ہو کر وُہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ رازِ ہستی سے ہمکنار ہو کر واپس آئے ہیں۔ اور اس طرح وہ فرداً فرداً علم باطن کے حامل بن جاتے ہیں۔ جس کی قوت جذب کے تاثر سے وُہ علوم ظاہری کے بھی ایک بڑے حصّے پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ عالم انوار کے ناپیدا کنار سمندر میں بغیر یار و مددگار ملاح و پتوار بےخوف گھس جاتے ہیں۔ اور اس کی نارسا گہرائیوں میں بے دھڑک غوطے لگا کر وہ گوہر ہائے آبدار نکال لاتے ہیں۔ جن کی آب و تاب سے عوام خواص کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں

خیر مَیں دیوانہ ہی سہی۔ مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے وجود دماغی کے دو مخصوص حصّے ہیں۔ اوّل وُہ حالت جن میں میرا دماغ ان دلائل منطقی کے مطابق تھا۔ جو ناقابل تردید خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ حالت اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جو میری زندگی کا دور اولیں کہا جا سکتا ہے میری حیات کا دوسرا پہلو زمانۂ حال ہے جو سائے کی مانند بے اصل اور مشتبہ ہے۔ پس جب مَیں اپنی ہستی کے پہلے رُخ کا ذکر کروں۔ تو ناظرین اس پر اعتقاد کریں

اور رُخِ ثانی کے واقعات کو ایک مناسب حد تک درست سمجھیں۔ اگر ان کے خیال میں دوسرے دور کے واقعات وہم وخیال پر مبنی ہیں۔ تو ان کو اختیار ہے۔ اور اس معاملے میں مَیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کہ کاش وہ میری آنکھوں سے دیکھیں اور میرے کانوں سے سُنیں

وہ ہستی جس سے مَیں عالم شباب میں عشق رکھتا تھا۔ میری حقیقی خالہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کا پیارا نام قمر تھا۔ خالہ کے انتقال کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے ہم دونوں عالمِ طفولیت ہی سے یکجا رہتے تھے۔ ہمارا ملک خطِ استوا پر واقع تھا۔ اور سورج ہمارے سر پر تیزی سے چمکا کرتا تھا۔ ہمارا مسکن "وادیٔ گل" میں واقع تھا۔ جس کے نوخیز جوبن کو مشاطۂ قدرت نے اپنے ہاتھوں سے نکھار بخشا تھا۔ اس کے قریب کبھی کسی بھولے بھٹکے مسافر کا قدم بھی نہ آیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ وادی ایک اُونچے پہاڑ کی بلند ترین سطح پر واقع تھی۔ چاروں طرف اُونچی اُونچی چوٹیاں بادلوں سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اور سورج کی روشنی کو وادی کے خوشگوار حصوں تک پہنچنے سے روکتی تھیں۔ کوئی راستہ تمام وادی میں ایسا نظر نہ آتا تھا۔ جو کبھی انسانی گزرگاہ رہ چکا ہو۔ اپنے گھر تک پہنچنے کے لئے ہم کو جنگل کے ہزاروں درختوں کے پتّوں کو ہاتھوں سے ہٹانا پڑتا تھا۔ اور خوبصورت۔ خوشبودار پھولوں کے سینکڑوں پودوں کے حُسنِ زمرّدیں کو روند کر ہم اپنے مسکن کی صورت دیکھ سکتے تھے۔ اِس طرح ہم اپنی پُرسکون زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بیرونی دُنیا کے مکروہات سے مطلق بے خبر اور مستغنی تھے۔

باب دوم

ہماری وادی کے مرتفع حصّے کی طرف پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں کی دوسری جانب دُنیا دُھندلی نظر آتی تھی۔ اور ان کے دامن سے ایک تنگ گہرا دریا رقص کرتا ہُوا نہایت آہستگی سے گنگناتا ہوا دُور ایک گھاٹی میں غائب ہو جاتا تھا۔ گھاٹی کے اردگرد کی پہاڑیاں اس پہاڑ سے بھی زیادہ دُھندلی تھیں۔ جس میں دریا کا منبع تھا۔ ہم اس کو خاموش دریا کہا کرتے تھے۔ اِس لئے کہ اس کے بہاؤ میں ایک عجیب سکون تھا۔ اس کی تہ سے کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔ وہ اسقدر نزاکت سے رواں تھا۔ کہ تہ کے آبدار سنگریزے جن کو ہم نظرِ شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ بالکل جنبش نہ کرتے تھے۔ اور ایک غیر متحرک اطمینان سے اپنی اپنی جگہ پڑے چمکتے رہتے تھے۔

اس دریا اور اُن چشموں کے کنارے جو خمدار راستوں میں خاموشی سے بہتے ہُوئے دریا میں آملتے تھے

اور تمام وہ زمین جو کناروں سے لیکر چشموں کی گہرائی تک پھیلی ہوئی پانی کی تہ میں اُن سنگریزوں سے جا ملتی تھی جو ہر چشمے میں موجود تھے۔ نیز وادی کی تمام زمین دریا سے لیکر ان پہاڑوں تک جن سے وادی محیط تھی ــــ اس تمام سطح پر سرسبز نرم۔ گنجان ہموار خوشبودار اور چھوٹی گھاس کا مخملیں فرش تھا۔ گھاس میں جگہ جگہ زرد سیوتی سفید چنبیلی۔ گلابی بنفشہ اور سُرخ گل اس انداز سے آویزاں تھے۔ کہ ان رعنائی ہمارے دلوں کو بے اختیار خدا کی عظمت۔ قدرت۔ اور صنعت کی یاد دلاتی تھی۔

اس سرسبز میدان میں مختلف جگہ عجیب الخلقت درختوں کے جھنڈ تھے۔ جو خیالی جنگلوں سے مشابہ تھے۔ درختوں کے تنے لمبے اور پتلے تھے لیکن سیدھے نہ تھے اور اُس روشنی کی طرف جو دوپہر کے وقت وادی کے مرکز میں جھانکتی تھی۔ ایک دلربا انداز سے جُھکے ہوئے تھے۔ درختوں کی چھال کہیں سفید براق اور کہیں آبنوسی تھی۔ اور سوائے قمر کے رخساروں کے سب چیزوں سے زیادہ شفاف اور نازک تھی۔ درختوں کی چوٹیاں سبز رنگ کے پتوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ پتے ہوا میں کانپتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نسیم عطر بیز سے اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں یا شام کے اُن اژدھوں سے مشابہ تھے جو سر جُھکا جُھکا کر شاہِ خاور کو اپنی اطاعت کا ثبوت دیا کرتے ہیں۔

جذباتِ عشق پیدا ہونے سے پہلے پندرہ سال تک میں اور قمر اپنی وادی میں دست بدست پھرا کرتے تھے قمر کی عمر پندرہ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور میں دُنیا میں بیس سال سے کچھ زیادہ گذار چکا تھا۔ ایک دن شام کے وقت ایک دوسرے سے ہمکنار ہم دونوں ایک جھنڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اپنا عکس "خاموش دریا" کی تہ میں دیکھ رہے تھے اس مسرت خیز دن میں ہم نے ایک دوسرے سے بالکل گفتگو نہ کی۔ اگلے دن بھی ہماری گفتگو مختصر تھی لیکن وفورِ جذبات سے ہمارے دل اسقدر پُر تھے کہ ہماری آوازیں کانپ رہی تھیں۔

دریا کی بلوریں موجوں پر سے سمندر کے دیوتا نے ہماری طرف نظر ڈالی۔ اور اُس کے آنسوؤں نے ہمارے دل میں تموج پیدا کر دیا۔ ہماری روحیں اپنے آباو اجداد کی طرح ولولہ انگیز ہوگئیں۔ جوش جذبات جو ہماری نسل کی خصوصیّت ہے۔ تلاطم پیدا کرتا ہوا ہمارے دماغ پر مسلط ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام تخیّلات بھی آموجود ہوتے۔ جو ہمارے خاندان کی دوسری خصوصیت ہے۔ جوش جذبات اور تخیل کی آمیزش سے وادی گل پر مسرت کا ایک عالمِ بیخودی طاری ہوگیا۔ گرد و پیش کی تمام اشیاء میں ایک سنسنی خیز تبدیلی واقع ہوئی۔ درخت جن پر کبھی پھول نظر نہ آئے تھے۔ زمردیں قالین سے زیادہ

خوشرنگ ہوگئے۔ ان پر لاتعداد ستاروں کی شکل کے شاندار پھول آنِ واحد میں کھل گئے۔ قالین کا رنگ زیادہ گہرا ہوگیا چنبیلی کے پھول غائب ہوگئے۔ اور ان کی جگہ گہرے سُرخ گل کھلنے لگے۔ سُرخ رنگ کے بڑے بڑے پرند اپنے ہمراہ چمکتے ہُوئے پروں والے پرندوں کو لیکر ہمارے سامنے اُڑنے لگے۔ طلائی اور نقرئی مچھلیاں دریا میں تیرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ دریا کی تہ سے آہستہ آہستہ ایک نغمے کی صدا بلند ہُوئی جس نے آخر ایک تسکین بخش ترانے کا آہنگ اختیار کر لیا۔ سوائے قمر کی آواز کے دُنیا کی کوئی موسیقیت اُس راگ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ابر کا ایک بڑا ٹکڑا جس کو اکثر ہم اپنی "بہشت" سے دیکھا کرتے تھے اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگا۔ اور فضائے آسمانی سے ہوتا ہُوا ـــــ سنہرے اور سُرخ رنگ سے مجلّا ـــــ دن بدن ہمارے قریب ہوتا گیا۔ ہمارے سروں پر آکر ٹھہرا اور نیچے اُترنے لگا۔ یہانتک کہ ابر کے کنارے اردگرد کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر آٹھہرے۔ پہاڑ جو پہلے تاریک اور دھندلے تھے۔ جگمگا اُٹھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابر نے ہمیشہ کے لئے ہم کو عظمت اور جلال کے پرتو میں ڈھانک کر ایک ساحرانہ قید خانے میں بند کر دیا۔

قمر فرشتہ حُسن تھی۔ وہ معصوم، پارسا اور بھولی بھالی تھی۔ اپنی اُس زندگی کی طرح جو اُس نے وادیٔ گل میں گزاری تھی۔ اس کے دل کا وفورِ عشق تصنّع سے پاک اور عیب سے بری تھا۔ اپنے دلوں کی اندرونی کیفیت اور اُن تغیرات کا بیان جو حال ہی میں پیدا ہُوتے تھے۔ ہم نے ایکدوسرے سے وادیٔ گل میں ٹہلتے ہُوئے بیان کیا۔

ایک دن قمر اس دلخراش واقعے کا ذکر کرنے لگی۔ جو ہر انسان کو آخر میں پیش آتا ہے۔ وہ بے اختیار روئی۔ اس کی زبان پر ہر وقت یہی ذکر رہنے لگا۔ اس کی گفتگو میں موت کا بیان مختلف پہلوؤں سے رہتا۔ اُن شاعروں کی مانند جو مختلف الفاظ میں ایک ہی مطلب کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔

وہ جانتی تھی کہ موت کا آہنی پنجہ اس کے نازک جسم پر ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اُس کیڑے کی طرح جسکو قدرت کی طرف سے ایک دن کی زندگی عطا ہوتی ہے۔ اسکا ظاہری حُسن اور نزاکت فنا ہونے والے ہیں۔ اس کو موت کی سختی اور قبر کی تنگی سے کچھ ہراس نہ تھا۔ موت سے ڈرنے کا فقط ایک سبب تھا۔ جس کا ذکر ایک دن اُس نے خاموش دریا کے کنارے شام کی تاریکی میں کیا۔ اُس کے لئے یہ خیال سوہانِ رُوح تھا کہ مرنے کے بعد مَیں اس کو وادیٔ گل کے کسی حصّے میں دفن کر دُونگا۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے اس جائے عافیت کو خیرباد کہدونگا۔ وہ تمام محبت جو اسوقت میرے دل میں موجزن ہے۔ بیرونی اور معمولی دُنیا کی

کسی اور دوشیزہ کی ملکیت ہو جائیگی۔ یہ سُنتے ہی میں قمر کے قدموں پر گر پڑا۔ اور خدا کے حضور میں اس کے سامنے قسم کھائی۔ کہ "میں کبھی دُنیا کی کسی دوشیزہ سے رشتۂ ازدواج قائم نہ کرونگا۔ اور اس کی یادگار سے کبھی بیوفائی نہ کرونگا نیز اس عشق کی یاد کو جس سے قمر نے مجھے سرفراز کیا ہے۔ کبھی محو نہ ہونے دُونگا۔" میں نے دُنیا کے طاقتور بادشاہ کو اپنی قسم کا گواہ کیا۔ اور دُعا کی۔ کہ اگر میں اپنے عہد کو پُورا نہ کروں۔ تو قمر کی رُوح مجھ کو ہمیشہ ملامت کرے۔

یہ الفاظ سُنکر قمر کی نرگسی آنکھیں زیادہ چمکدار ہوگئیں۔ اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک بار عظیم سے سبکدوش ہو گئی۔ وہ کانپی۔ تھرتھرائی روئی اور میری قسم کو سچ خیال کیا۔ اس طرح اس کا بستر مرگ اس کے لئے آرامگاہ بن گیا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی حالت ابتر ہو گئی۔ مرتے ہوئے۔ اُس نے مجھے یوں مخاطب کیا۔ "چونکہ تم نے اپنے الفاظ سے میری رُوح کو راحت پُہنچائی ہے۔ اِسلئے میری رُوح قالبِ عنصری سے پرواز کرنے کے بعد میں تمہیں دیکھنے کے لئے اکثر آیا کریگی۔ اور اگر مجھ کو اجازت الہٰی ہوگی تو رات کی تاریکی میں مجسم بنکر تمہارے پاس آیا کروں گی لیکن یہ بات اختیار رُوح سے بعید ہوگی تو کم از کم اپنی موجودگی تم پر اکثر ظاہر کیا کرونگی۔ شام کی خاموش فضا میں تمہارے لئے سرد آہیں بھرا کرونگی۔ یا ہوا کو عطر آسمانی کی خوشبو سے تمہارے لئے معطر کیا کرونگی۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی رُوح پرواز کر گئی۔ دُنیا میرے لئے اندھیر ہو گئی۔ اور اس طرح میری زندگی کا پہلا دور ختم ہُوا۔

باب سوئم

یہاں تک میرا بیان صحیح ہے۔ لیکن جب وقت کی اس حد سے گزر کر میں ایک نئے راستے پر پُہنچا جس پر میں نے اپنی معشوقہ کو بعد موت چلتے ہُوئے پایا تو میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہُوا۔ میرے دماغ کی تاریکی ترقی کرنے لگی۔ پس اپنی اس زمانے کی تحریر پر مجھے اعتبار نہیں دو سال بدشواری و آہستگی گزر گئے۔ لیکن وہی وادی میرا مسکن رہی۔ میرے اس مسکن میں پھر ایک تغیر پیدا ہُوا۔ ستاروں کی شکل کے پُھول درختوں کے تنوں میں غائب ہو گئے۔ سبز قالین مدھم پڑ گیا۔ سُرخ گلاب ایک ایک کرکے مرجھا گئے ان کی جگہ بیسیوں مدھم اور تاریک رنگ کے گل بنفشہ کھل گئے۔ جو اپنے سر کو برابر حرکت میں رکھتے تھے۔ اور شبنم کے بوجھ سے ہر وقت دبے رہتے تھے۔ میری وادی جاندار مخلوق سے خالی ہو گئی۔ سُرخ رنگ کے بڑے پرند غمگین انداز سے اُڑتے ہُوئے وادی کو چھوڑ کر پہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ تمام خوشرنگ پرند

بھی غائب ہو گئے۔ سنہری اور روپہلی مچھلیاں میری وادی کے نشیب کی طرف گھاٹی میں سے ہو کر چلی گئیں۔ اور دریا کی دلکشی کو ہمیشہ کے لئے غیر دلچسپ بنا گئیں۔ چشم حواس کو بند کر دینے والا نغمہ جو دنیا کی ہر موسیقیت سے سوائے قمر کی آواز کے برتر اور اعلےٰ تھا۔ آہستہ آہستہ خاموش ہوتا چلا گیا۔ دریا کی آواز دھیمی ہو گئی۔ یہانتک کہ آخر اس نے ابدی خاموشی اختیار کر لی۔ سب سے آخر میں ابر کا بڑا ٹکڑا اپنی جگہ سے اُٹھا۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں کو چھوڑ کر ان کو دھندلا بنا دیا۔ اور وادی کی زریں روشنی و درخشندگی تاریکی سے تبدیل ہو گئی۔

لیکن قمر نے اپنے وعدے فراموش نہ کئے۔ فرشتوں کے عود اکثر ہوا میں ترنم پیدا کیا کرتے تھے۔ اکثر جنّت کے عطر کی خوشبو سے وادی معطر ہو جاتی۔ رات کے وقت جب میرا دل زور سے دھڑکتا تو ہوا آکر میری عرق آلودہ پیشانی کو پنکھا جھلتی۔ اور اپنے ساتھ سرد سرد آہیں لاتی دھیمی دھیمی آواز سے کوئی ناتمام الفاظ بولتی۔ ایک مرتبہ ــــ آہ فقط ایک مرتبہ ــــ میں خواب گراں سے بیدار ہوا۔ تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی فرشتے کے لب میرے لبوں پر ہیں۔

میرے دل کو تسکین نہ ہوئی۔ مجھے عشق کی ضرورت تھی جس سے میرا دل لبریز ہو چکا تھا۔ وادی نے مجھے قمر کی یاد دلاتی۔ میری زندگی وبال ہو گئی۔ پس وادی کو خیرباد کہکر میں دنیا کی خود نما اور مستمر د کامیابیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ یکایک میں نے محسوس کیا۔ کہ میں ایک عجیب و غریب شہر میں ہوں۔ جہاں کی ہر چیز میرے حافظے سے اس خواب کے محو کر دینے کے لئے کافی تھی۔ جو میں وادی گل میں دیکھا کرتا تھا۔ ایک شاندار دربار کا جاہ و جلال۔ دولت و حشمت۔ تلواروں اور نیزوں کا دیوانہ وار شور و غل اور عورتوں کا نگاہ کو خیرہ کر دینے والا حُسن ان سب نے میرے دماغ کو مختل اور متحیر کر دیا۔ لیکن اس وقت تک میری رُوح دائرہ وفا سے باہر نہیں گئی تھی۔ رات کی خاموشی میں قمر کی موجودگی اکثر ظاہر ہوتی۔

دفعتاً انکشافات ختم ہو گئے۔ دُنیا میرے لئے اندھیر ہو گئی۔ میں حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگا۔ کہ میرے دل میں کس قدر ولولہ ہے۔ اور میرے راستے میں کس قدر خوفناک اشتغال۔ اسی اثنا میں کسی دور دراز اجنبی ملک سے میرے آقا کے دربار میں ایک دوشیزہ آئی جس کے حُسن نے میرے سخت دل کو مفتوح کر لیا۔ اس کے سامنے دوزانو ہو کر اپنے عشق کا اقرار کیا۔ اور اس طرح خود کو اسکی قربانگاہ حسن کا مزاور بنا لیا۔

"وادی کی دوشیزہ" کی محبت اس دیوانہ وار عشق اور رُوح افروز پرستش کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگی۔ آنسوؤں میں اپنی رُوح اس کے سامنے پیش کی۔ اور اس

کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ارجمند فرشتہ تھی۔ متجلی ہستی تھی میرے لئے اس سے زیادہ حسین دُنیا کی کوئی عورت نہ تھی۔ ارجمند کا حُسن آسمانی تھا۔ نور کا پرتو تھا۔ جب میں نے اس کی آنکھوں کے عمق پر غور کیا۔ تو میری تمام حسیات اُن آنکھوں اور اس مجسمہ کے سوائے اور کوئی چیز محسوس کرنے کے قابل نہ رہے۔

مَیں نے ارجمند سے شادی کرلی۔ اور اُس غضب سے بھی نہ ڈرا جس کی خود مَیں نے خُدا سے تمنّا کی تھی۔ لعنت خُدا میرے اُوپر نازل نہ ہوئی۔ ایک دفعہ پھر—لیکن فقط ایک دفعہ—میرے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے رات کے وقت آہستہ "آہ" کی آواز آئی۔ آہیں گویا الفاظ بن گئیں۔ مَیں مبہوت ہوگیا۔ ارجمند میرے پہلو میں خاموش سو رہی تھی۔ اس خوش الحان نغمے میں یہ الفاظ سُنائی دئے۔

"آرام اور چین سے سو۔ کیونکہ عشق کی رُوح کو حکمرانی اور فرمانروائی کا درجہ حاصل ہے۔ تونے ارجمند کو اپنے دھڑکتے ہُوئے دل سے لگالیا۔ لیکن تجھے تیری ان قسموں اور عہد و پیمان سے جو تونے قمر سے کئے تھے۔ بری کر دیا گیا۔ اس بریت کا سبب تجھ کو اُسوقت معلوم ہوگا۔ جب تو بھی قمر کی طرح دُنیا سے رُخصت ہوکر بہشت میں داخل کیا جائیگا۔"

(ترجمہ) محمد ذاکر

رُباعیات

ما مست الستیم در دِل گیریم
ما زندۂ دلیم بر درِ دل میریم

ما سوختہ ایم ز آتش جلوہ اوست
خاکسترِ ما دست دہد اکسیریم

ما واعظِ شہریم چہ بالغ نظریم
از نکتہ مرگ و زندگی باخبریم

بر صورت شیخانہ ما عشوہ مخور
بر منبر دیگر و بخلوت دیگریم

در صبح ازل اینست ہستم کردند
در جذبۂ عقل و عشق قسم کردند

در بیخودی عشق ز ہوشم بردند
در مستیِ عقل خود پرستم کردند

گرامی

زندگی زندان

(۱)

آرسین لوپن نے اپنا دوپہر کا کھانا ختم کر کے جیب سے ایک اعلیٰ سگار نکالا۔ اور اس کے سنہرے کنارے پر لکھے ہُوئے حروف کو بہت ہی مزے لے لیکر پڑھنے لگا۔ کہ عین اسی وقت اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھُلا۔ ایک سکنڈ سے کم وقفہ میں وہ اس سگار کو اپنی میز کی ایک دراز میں ڈالکر دوسری طرف سرک گیا۔ جیل کا محافظ سپاہی اس سے یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ اب اُس کی محنت کرنے کا وقت آگیا ہے۔ لہٰذا تیار ہو جانا چاہیے۔

"میاں پیر نا بالغ میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا"۔ لوپن نے حسب معمول اپنی خوش مذاقی سے کام لیتے ہُوئے کہا۔

یہ دونوں جھٹ باہر نکلے۔ انہیں گئے مشکل سے ہیں ہی سکنڈ ہُوتے ہونگے اور ان کی پشت روش کی موڑ پر پھری ہی تھی کہ دو آدمی اس کوٹھڑی میں داخل ہُوتے۔ اور ہر چیز کا نہایت باریکی سے معائنہ شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک تو انسپکٹر ڈیوزی اور دوسرا انسپکٹر فالنفانٹ تھا۔

وہ آج اس معاملہ کو حتمی طور پر ہمیشہ کے لئے طے کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ذرا کلام نہیں تھا۔ کہ آرسین لوپن بیرون جیلخانہ اپنے گرگوں سے برابر خط و کتابت کر رہا تھا۔ اور اس کو جملہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ایک روز قبل ہی گرانڈ جرنل اخبار کے مالک کے نام یہ چند سطور موصول ہُوئی تھیں جن کی عبارت یہ تھی۔

"حضرت۔ چند روز ہوئے کہ آپ نے اپنے اخبار نحوست بار میں میرے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ محض بے بنیاد اور نا قابل وثوق ذرائع پر مبنی ہیں۔ مَیں اپنے مقدمہ کی تاریخ سے دو ایک روز قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان اتہامات کا اصالتاً جواب طلب کرونگا۔

"مَیں ہوں جناب کا خادم آرسین لوپن"

تحریر خط آرسین لوپن ہی کے ہاتھ کی تھی۔ اس لئے اس میں کسی شک کی گنجائش نہ تھی۔ کہ وہ برابر خطوط روانہ کر رہا تھا۔ اور اسی طریق سے اُسے خطوط بھی موصول ہو رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں سرگرمی سے کام لے رہا تھا۔ جس کی بابت اُس نے نہایت دلیری سے اعلان بھی کر دیا تھا۔

صورت حال ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ بیان قلبند کرنے والے مجسٹریٹ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد ایم ڈوڈس محکمہ سراغرسانی کے افسر اعلےٰ بذات خود جیلخانہ سانٹی کے گورنر سے ملا۔ اور وہ ہدایتیں کیں جن کو احتیاطاً عمل میں لانا ضروری و مصلحت وقت تھا۔ اور اپنے ساتھ والے دو انسپکٹروں کو اُس نے قیدی کے کمرہ میں بغرض معائنہ و تفتیش بھیجا تھا۔

ان حضرات نے کمرہ کا کونہ کونہ۔ چپہ چپہ بستر پلنگ کی ہر چول دیٹی دیکھی۔ اور حتی الامکان کوئی بھی چیز بلا جانچ کے نہ چھوڑی۔ مگر نتیجہ خاک نہ نکلا۔ انہیں کوئی بھی ایسی بات نہ ملی۔ جس سے معلومات میں کچھ اضافہ ہوتا۔ یہ لوگ تھک کر اپنی تلاش سے دست بردار ہونے کا ارادہ ہی کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں جیل کا سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اور کہنے لگا

"حضور ذرا میز کا دراز دیکھئے۔ میرا خیال ہے کہ جس وقت مَیں یہاں داخل ہوا ہوں۔ تو وہ اُسے بند کر رہا تھا۔"

اُنہوں نے اسے کھول کر دیکھا۔ انسپکٹر ڈبرنی کی زبان سے حیرت میں آواز نکل گئی۔

"اللہ کا شکر ہے اس مرتبہ بیٹا لوپن کی ترکیب پکڑ لی گئی"

فالنفانٹ نے اُسے روک کر کہا۔

"میاں لڑکے نہ بنو۔ تم خود کچھ نہ کرو۔ اور اسے سردار اعلیٰ کے معائنہ کے لئے رہنے دو۔"

"پھر بھی یہ ہوا ناکا سگار"

"جہاں ہے وہیں پڑا رہنے دو۔ چلو سردار اعلےٰ کو اطلاع دے دیں۔"

دو ہی منٹ بعد ایم ڈوڈس دراز کی ہر چیز کا معائنہ کرتا نظر آیا۔ سب سے پہلی چیز جو اُسے ملی۔ چند کاغذ کے پرزے تھے۔ جو مختلف اخبارات میں آرسین لوپن کے متعلق شائع ہوئے تھے۔ انہیں کاٹ کر رکھ لیا گیا تھا۔ اس کے بعد تمباکو کی تھیلی ایک پائپ، چند غیر ملکی خط لکھنے کے کاغذات اور دو کتابیں برآمد ہوئیں۔

اُس نے ان کتابوں کے سرنامہ پر نظر ڈالی۔ پہلی کا نام "صاحبقران اور پرستش صاحبقران" از کارلائل تھا یہ بزبان انگریزی تھی۔ دوسری کتاب "الٹروبر" نامی بعینہٖ اسی جسامت کی جلد میں بندھی ہوئی تھی یہ ایکٹیٹی کی دستی کتاب کا ترجمہ تھا۔ جو جرمنی زبان میں بمقام لیڈن ۱۶۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ایم ڈوڈس نے ان دونوں پر نگاہیں دوڑائیں۔ اور معلوم کیا۔ کہ ان میں سے ہر صفحہ پر متعدد سطریں خط کشیدہ الفاظ اور نشانات موجود تھے۔ آخر یہ کیوں، ان کا کیا مطلب تھا۔ کہیں یہ کسی خاص بات کے متعلق اشارات تو نہ تھے۔ یا صرف ایسے نشانات تھے جن کو ناظر کتاب نے دلچسپ پاکر اپنے مذاق کیمطابق خط کشیدہ کر دیا تھا۔

ایم ڈوڈس نے کہا "اچھا۔ ہم ذرا تفصیل کے ساتھ ان کا مطالعہ کرینگے۔"

اُس نے تمباکو کی تھیلی، پائپ کا بھی معائنہ کیا۔ اسکے بعد یہ اعلیٰ سگار اُٹھا کر اُسکے سنہرے گوشہ کو دیکھنے لگا۔

"واللہ" یک بیک اس کے مُنہ سے نکلا۔ "ہمارا دوست جو ترکیب کرتا ہے۔ لاجواب کرتا ہے۔"

ایک ماہر تمباکو نوش کی طرح اس نے اس سگار کو کان کے پاس لیجا کر اس طرف اُس طرف دبایا۔ اُس کے مُنہ سے حیرت میں ہلکی چیخ سی نکلی۔ سگار اُنگلیوں کے دباؤ سے پلپلا ہوگیا۔ مکرر بغور معائنہ کرنے سے بہت جلد معلوم ہوگیا۔ کہ تمباکو کے پتوں کے درمیان کوئی سفید شے بھی ہے۔ چنانچہ ایک سوئی کی مدد سے اس نے بہت ہی باریک کاغذ کا ایک تہ شدہ پرزہ نکالا۔ یہ ایک خط تھا۔ اُس نے اُسے کھولا۔ اور دیکھا کہ مفصلہ ذیل الفاظ بہت ہی چھوٹے وزنانہ حروف میں درج ہیں۔

"میریا دوسری جگہ لگا دی گئی۔ دس میں آٹھ بالکل تیار ہیں۔ بیرونی پائیدان دبانے سے لوہے کا تختہ اُوپر اُٹھ جاتا ہے۔ ایچ۔ بی برابر روزانہ ۱۲ سے ۲ تک منتظر رہا کریگا۔ لیکن کہاں، اس کی بابت فوراً جواب دیجئے۔ گھبرائیگا نہیں۔ آپ کا دوست آپ کا ہر طرح محافظ ونگراں ہے۔"

ایم ڈوڈس نے ایک لمحہ غور کرنے کے بعد کہا

"تحریر تو بالکل صاف ہے۔ میریا جیلخانہ کی موٹر کا نام آٹھ خانے ۱۲ سے ۲ تک یعنی ۱۲ بجے سے ۲ بجے تک"

"مگر یہ ایچ بی کون بلا ہے۔ جو اسکا منتظر رہا کریگا۔"

"ایچ بی سے مطلب ہارس پاور (گھوڑوں کی طاقت) یقیناً یہی مطلب ہے۔ یعنے ایک عمدہ موٹر کار۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پُوچھا۔"

"کیا قیدی اپنا ناشتہ کھا چکا۔"

"جی ہاں"

"چونکہ اس وقت تک اسے اس تحریر کو پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا ہے۔ سگار کی حالت دیکھ کر تو یہی گمان ہوتا ہے۔ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ خبر اسے ابھی ابھی پہنچی تھی۔"

"آخر کس طرح کس ذریعہ سے۔"

"یہ میں کیا جانوں۔ ممکن ہے اس کے کھانے میں کسی روٹی کی تہ میں یا آلوؤں کے اندر رکھ کر۔"

"یہ بالکل ناممکن ہے۔ اُسے باہر سے کھانا منگا کر کھانے کی صرف اس لئے اجازت دی گئی تھی کہ ہم اُس کی ترکیبیں معلوم کر کے خوب مضبوطی سے پھانس لیں۔ مگر اس وقت تک ہمیں کچھ بھی نہ معلوم ہوسکا۔"

اب ہم آج شام کو دیکھینگے کہ لوپن اس رقعہ کا کیا جواب

دیتا ہے۔ کچھ عرصہ تک اُسے کوٹھڑی سے باہر رکھنا چاہیئے میں ذرا انشور بوور بیان قلمبند کرنے والے مجسٹریٹ کے پاس جاکر یہ تحریر دکھلاتا ہوں اگر اس نے اجازت دیدی تو ہم فوراً اس کا فوٹو لے لینگے۔ اور صرف ایک ہی گھنٹہ بعد یہ اور جملہ چیزیں تم بجنسہٖ اسی طرح دراز میں رکھ سکتے ہو۔ مگر ایک ایسا ہی سگار اور تلاش کرلو جس میں یہ تحریر بالکل اُسی طرح رکھ دی جائے۔ مگر ہاں۔ دیکھو۔ انتظام اس خوبی سے ہو کہ قیدی کو ہرگز ہرگز کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔"

جب شام کے وقت ایم ڈوڈس مع اپنے دو انسپکٹروں کے جیلخانہ سانٹی کے دفتر میں آئے۔ تو ان سب کا دل جواب کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ ایک گوشہ میں برقی چولھے پر تین طشتریاں رکھی ہوئی تھیں۔

"کیا وہ کھانا کھا چکا۔"

گورنر جیلخانہ نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

"ڈبزی، ان کھیرے کے ٹکڑوں کو ذرا پتلے پتلے ورقوں میں کاٹو۔ اور وہ روٹی کا ٹکڑا کاٹ کر دیکھو۔ وہاں کچھ ہے۔"

"نہیں حضور۔ کچھ نہیں۔"

ایم ڈوڈس نے ان طشتریوں کا معاینہ کیا۔ پھر کانٹے چمچہ اور چھری کو بھی دیکھا۔ چھری ایک گول دستے کی گھومنے والی تھی۔ اُس نے دستہ کو بائیں و داہنی جانب گھمایا۔ داہنی جانب گھمانے سے ہی وہ ڈھیلی پڑگئی۔ اور ایک خول سا پیدا ہو گیا۔ چھری کا یہ حصہ بالکل کھوکھلا تھا۔ جس میں کاغذ کا پرزہ بآسانی رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک پرچہ نکلا۔

"ہاتھ تیری دم میں نمدا" ایم ڈوڈس نے کہا۔ "آرسین لوپن ایسے شخص کے لئے یہ ترکیب چنداں قابلِ تعریف نہیں۔ خیر ہمیں زیادہ تضیع اوقات کرنے کی ضرورت نہیں۔ ڈبزی تم ہوٹل جاکر تحقیقات کرو۔ اور پتہ لگاؤ۔"

اسکے بعد اس نے اس پرچہ کو پڑھنا شروع کیا۔

"میں ان باتوں کا انتظام تمہیں پر چھوڑتا ہوں اینچ۔ بی روزانہ آکر کچھ فاصلہ پر کھڑی رہا کرے میں سامنے سے گزرا کرونگا۔ میرے پیارے و قابلِ تعریف دوست میں تم سے بہت جلد ملونگا۔"

"آخرکار" ایم ڈوڈس نے چیخ کر کہا۔ اور دونوں ہاتھ ملنے لگا۔ "میرے خیال میں معاملات بہت ہی اطمینان سے طے ہو رہے ہیں۔ صرف ہماری طرف سے ذراسی امداد کی ضرورت ہے۔ چلتے فرار ہونا کامیاب ثابت ہوگا۔ یہاں اس قابل بھی نہ ہونگے۔ کہ گرگوں کو بھی پکڑ سکیں۔"

اور فرض کیجئے کہ آرسین لوپن آپ ہی کے ہاتھوں فرار ہو۔" جیلخانہ کے گورنر نے کہا۔

"اگر اس نے بہت زیادہ چالاکی سے کام لینا شروع کیا۔ تو ہم اپنے جاسوسوں کی تعداد اور زیادہ بڑھا دیں گے۔ خیر یہ سب کچھ اسی کی مشکلات میں اضافہ کریگا۔ ہمارا کیا

نقصان ہے۔ رہ گیا اس کی جماعت کے لوگوں کا گرفتار ہونا۔ جب سردار ہی چپ ہو تو باقیماندہ لوگوں کو بھی خاموشی سے کام لینا چاہئے۔"

(۲)

امر واقعہ یہ تھا کہ آرسین لوپن بہت زیادہ بات چیت نہیں کرتا تھا۔ چند ماہ سے ایم جولیس بوور بیان قلمبند کرنے والا مجسٹریٹ خواہ مخواہ اس کا بیان لینے کی بیکار کوشش کر رہا تھا۔ تنقیحات مقدمہ نے مجبوراً مجسٹریٹ اور بیرسٹری ڈینول کے درمیان ایک غیر دلچسپ گفتگو کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بیسٹری ڈینول موجودہ بیرسٹروں میں بڑا شہرت یافتہ نامی وکیل تھا۔ اور جسے ملزم کی بابت اُتنا ہی کم علم تھا۔ جتنا ایک راہرو مسافر کو۔ اور اتنا ہی زیادہ علم تھا جتنا پولیس وسراغرسان کے افسران کو۔ گاہے گاہے محض اخلاقانہ طور پر بہ سبیل تذکرہ آرسین لوپن ان الفاظ کا اعادہ کیا کرتا تھا۔

"جناب، بالکل بجا ہے۔ دُنیا متفق ہے۔ کہ لائینوس بینک کا ڈاکہ۔ روڈی بیباوں کی نقب زنی تیس سکہ کا واقعہ۔ بیمہ کی پالیسیوں کا رد و بدل۔ قلعہ آرمینل کی واردات نقب زنی۔ ڈی گورٹ۔ ڈی ایملی۔ ڈی گراسلرز اور قلعہ ملاکس کی چوری۔ سب میری ہی تو کی ہوئی ہیں۔"

"تو پھر شاید تمہیں اس کی تفصیل دینا ہوگی۔"

"اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں تو ان سب کا ایکدم اعتراف کر رہا ہوں۔ اور یہی کیا بلکہ اس سے دس گنی زیادہ وارداتوں کا بخوشی اقبال کرتا ہوں۔"

آخرکار تھک کر مجسٹریٹ نے یہ طول طویل سوالات کا کرنا ہی چھوڑ دیا۔ مگران دو رقعوں کو دیکھنے کے بعد اس نے پھر ان کی بھرمار شروع کر دی۔ یہ قاعدہ تھا کہ روزانہ ٹھیک بارہ بجے آرسین لوپن دوسرے قیدیوں کے ساتھ ایک موٹر میں سوار کرا کر جیلخانہ سے پولیس اسٹیشن تک لیجایا جاتا۔ اور پھر تین بجے سب کے ساتھ اسی بند موٹر میں جیلخانہ واپس آتا۔

ایک روز سہ پہر کو واپسی کا سفر بہت ہی غیر معمولی احتیاطوں کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس لئے کہ جیلخانہ سانٹی کے دوسرے قیدیوں کے بیانات ختم ہوئے تھے اور یہ حکم مل چکا تھا۔ کہ آرسین لوپن کو پہلے واپس کر دیا جائے۔ پس اسے تن تنہا موٹر میں سوار کرا دیا گیا۔

یہ قید خانہ کی موٹریں فرانس میں ایپنرز ڈی سالیڈ' یعنی ترکاری کا ٹوکرا' کے نام سے اس طرح مشہور ہیں۔ جس طرح انگلستان میں سیاہ میریا ان گاڑیوں میں دونوں طرف بیٹھنے کے تختوں کے درمیان ایک روش سی ہوتی ہے اور ہر ایک تختہ میں پانچ خانے بنے ہوتے ہیں گویا ایک گاڑی میں دس آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ ان میں سے

ہرایک خانہ اس ترکیب سے بنایا جاتا ہے کہ اس میں بیٹھنے والا سوائے بیٹھنے کے اور کسی صورت سے ہل نہیں سکتا۔ ایک میونسپلٹی کا ملازم بطور محافظ بالکل سرے پر بیٹھ کر درمیانی روش کی نگہبانی کرتا رہتا ہے۔

آرسین لوپن کو داہنی جانب والے تختہ کے تیسرے خانہ میں بٹھلایا گیا۔ اور یہ بھاری بھرکم گاڑی روانہ ہوئی۔ آرسین لوپن نے معلوم کیا کہ گاڑی محلہ کوئے ڈی ہارلک سے گزر کر پیلس ڈی جسٹس میں چل رہی ہے۔ جب یہ چلتی ہوئی محلہ پانٹ سینٹ میچل کے درمیان پہنچی تو اس نے اپنے بیرونی پیر کو یعنے داہنے پاؤں کو اُس آہنی تختہ پر زور دیکر جو اس کے خانہ کو بند کئے ہوئے تھا۔ دابا۔ اور یہ بات اس کی عادت میں شمار کر لی گئی تھی۔ اس لئے محافظ نے بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ یکایک پچھلے پہیئہ کے قریب ایک کھٹکا ہوا اور تختہ بلا کسی آواز کے باہر کی جانب کھُل کر رہ گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ دونوں پہیوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ آرسین لوپن نے بہت ہی محتاط نظروں سے جائزہ لینا شروع کیا۔ موٹر بولیوارڈ سینٹ میچل کے قریب بالکل آہستہ چلنے لگی۔ اور کراؤ سینٹ جرمن کے قریب تو یکدم رُک گئی۔ ایک چھکڑے کا گھوڑا گر گیا تھا آمدورفت بند تھی۔ اور دونوں طرف صدہا گاڑیاں گھوڑے بگھی، تانگے و موٹر رُکے کھڑے تھے۔

آرسین لوپن نے اپنا سر باہر نکالا۔ اس جیل خانہ کی گاڑی سے ملی ہوئی ایک دوسرے جیلخانہ والی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ لوپن نے اس تختہ کو ذرا اور کھولا۔ اور پچھلے پہیئہ کے ایک ڈنڈے پر پیر رکھ کر باطمینان زمین پر کود گیا۔

ایک گاڑی والے نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی۔ مگر اول تو اس کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس نے آواز دینے کی کوشش کی کہ محافظ کو آگاہ کرے۔ مگر شدت ہنسی میں آواز گلے ہی میں پھنس کر رہ گئی یا اگر نکلی بھی تو اس ہنگامہ میں کون سُنتا تھا۔ دوسرے یہ کہ راستہ بند ہونے سے ہر شخص گھبرا رہا تھا۔ آرسین لوپن کی اچھل کود کو کون دیکھنے کی فرصت پیدا کرتا۔ بارے خدا خدا کر کے گاڑیوں وغیرہ کو آمدورفت کی اجازت ملی۔ اور ہر ایک نے فطرتاً آگے بڑھنے اور پہلے نکلنے کی کوشش کی اس قلیل وقفہ ہی میں آرسین لوپن خدا معلوم کہاں کا کہاں ہو رہا۔

وہ پہلے ذرا دُور تک تو بہت تیزی سے بڑھا مگر بائیں جانب کی پٹڑی پر آکر مُڑا۔ اپنے گرد ایک نگاہ ڈالی۔ اور ایک ایسے شخص کی طرح جو یہ نہ جانتا ہو۔ کہ اُسے اب کس طرف چلنا چاہیئے۔ اُس نے بڑے اطمینان کی سانس لی یکایک کوئی خاص رائے قائم کر کے اس نے اپنے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔ اور ایک ایسے شخص کی طرح جو بڑے

لطف و اطمینان سے سیر گشت لگا رہا ہو۔ روش پر چلنا شروع کر دیا۔

موسم لطیف و خوشگوار تھا۔ اور موسم خزاں کا یہ دن خاص طور پر تابناک و فرحت بخش تھا۔ ہر قہوہ خانہ میں لوگوں کا مجمع تھا۔ آرسین لوپن بھی ایک عمدہ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

اس نے ایک گلاس شربت اور سگرٹ کا ایک بکس طلب کیا۔ گلاس کو اس نے سونگھ سونگھ کر مزہ لے لیکر جس طرح پیا ہے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کے بعد بڑے ہی اطمینان سے ایک، اس کے بعد دوسرا سگرٹ نوش کیا۔ آخر کار وہاں سے اٹھ کر خادم سے کہا کہ ذرا مینجر کو بلا لائیے۔

جس وقت مینجر آ گیا۔ تو اس نے اتنی بلند آواز میں کہ گرد و پیش کا ہر شخص سن لے۔ اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

" حضرت مجھے سخت افسوس ہے کہ میں یہاں بلا نقدی کا بٹوا لئے چلا آیا ہوں۔ غالباً آپ میرے نام سے واقف ہونگے۔ اور دو ایک روز کے لئے میرا اعتبار کر لینگے۔ کمترین کو آرسین لوپن کہتے ہیں۔

مینجر نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا۔ گویا وہ اس کی بات کو مذاق سمجھ رہا ہو۔ مگر آرسین لوپن نے مکرر اعادہ کیا۔ " جی حضرت لوپن وہی جو جیلخانہ سانٹی میں قید تھا۔ مگر ابھی بچ کر چلا آ رہا ہے۔ اچھا میں سمجھ گیا۔ میرا نام سنکر آپ کو کافی سے زیادہ اطمینان ہو گیا ہے۔ اسلئے...."

قبل اس کے کہ مینجر اس کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالے۔ ہر طرف سے لوگوں نے وہ فرمائشی قہقہے لگائے کہ الہیٰ توبہ ... آرسین لوپن مزہ سے نفرو ہو کر چلتا بنا۔

وہ بڑے اطمینان سے رو سوفلٹ ہوتا ہوا روینیٹ جاکس پر مڑا۔ اس گلی میں پہنچکر دکانوں کی کھڑکیوں کو دیکھتا ہوا، سگرٹ پر سگرٹ اڑاتا ہوا۔ وہ برابر بڑھا چلا گیا۔ جب بولیوارڈ ڈی پورٹ رائل پر پہنچا۔ تو اس نے ذرا ہاتھ پیر ہلا کر سستی اُتاری۔ راستہ پوچھا اور سیدھا جیلخانہ سانٹی کی طرف چل دیا۔ بہت جلد قید خانہ کی بلند و سرکہ جبیں دیواریں نظر آنے لگیں۔ وہ انہیں طے کرتا ہوا یکدم اس میونسپلٹی کے محافظ کے سامنے پہنچا جو اس وقت پہرہ پر تھا۔ اور بڑے سکون کے ساتھ ٹوپی بغل میں داب کر کہنے لگا۔

" کیوں میاں سپاہی۔ کیا یہ جیلخانہ سانٹی ہے۔"

" ہاں۔ ہے تو"

" تو براہ مہربانی ذرا مجھے میری کوٹھڑی میں پہنچا دو۔ موٹر کی گاڑی نے مجھے تو راستہ میں پھینکدیا۔ اور خود چلی آئی۔ بھلا میں یہ کیسے کر سکتا تھا۔ کہ....."

محافظ نے سب دانت باہر نکال کر کہا۔

" ابے اے بھلے آدمی کے بچے جا اپنا راستہ لے۔ کیوں خواہ مخواہ بکواس لگائی ہے۔"

اچھا بھائی معاف کرو۔ میرا راستہ اسی دروازہ سے

ہو کر ہے۔ یاد رکھو اگر آرسین لوپن باہر رہ گیا تو تمہاری بھی گردن ناپی جائیگی۔ اپنی بھی خیر نہ سمجھو۔ دوست سمجھ لو۔"

"آرسین لوپن۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہاتیں۔۔۔ اسکا کیا مطلب؟"

"افسوس اس وقت میرے پاس کوئی کارڈ موجود نہیں" لوپن نے خواہ مخواہ جیبوں پر ہاتھ پھیر کر ٹٹولتے ہوئے کہا۔ محافظ کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور اس نے لوپن کو سر تا پا دیکھنا شروع کیا۔ اور زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر اس نے اس طرح عالم بیخودی میں گھنٹی بجائی۔ جس طرح کوئی پاگل غلطی سے کوئی چیز پکڑ لے۔ آہنی دروازہ کھل گیا۔

چند منٹ بعد دفتر میں گورنر صاحب کے حرکات و سکنات سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ سخت غصّہ کی حالت میں ہے۔ آرسین لوپن سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ مسکرا دیا۔

"حضرت۔ آپ بھی۔ غصّہ تھوک ڈالئے۔ آپ کیوں مجھ بیچارہ پر اتنی زیادتیاں کرتے ہیں۔ کیوں صاحب اس کا تو جواب دیجئے۔ کہ آپ مجھے احتیاطاً وہاں سے تنہا واپس لاتے ہیں۔ اور موٹر میں تنہا بٹھاتے ہیں۔ راستہ میں یہ چالاکی کی جاتی ہے۔ کہ وہاں گھوڑا گرا کر راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔ سب گاڑی و گھوڑے موٹر وغیرہ ذرا دیر کے لئے رک جاتے ہیں۔ موٹر راستہ میں مجھے گرا کر چلتی بنتی ہے۔ اور آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں وہاں سے فرار ہو کر اپنے ساتھیوں میں جا ملونگا۔ واہ صاحب واہ۔ وہ بیس سراغرساں حضرات کہاں۔ ہیں جو سائیکلوں و گاڑیوں پر سوار میری حفاظت کر رہے تھے۔ انہوں نے میری خاک نگہداشت نہیں کی میں بھلا کبھی زندہ رہ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس صورت سے مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے۔" اس نے اپنے شانوں کو ذرا حرکت دی۔ اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری حفاظت کے لئے انہیں اب تکلیف نہ دیں۔ اس لئے کہ جس وقت میں یہاں سے فرار ہونا چاہونگا۔ تو یقین جانئے مجھے کسی بھی شخص کی امداد کی ضرورت نہ ہوگی۔"

(۳)

دو روز بعد اخبار ایکوڈی فرانس میں جواب باقاعدہ طور پر آرسین لوپن کے کارنامجات کا سرکاری گزٹ شمار ہونے لگا تھا۔ اور جسے آرسین لوپن کا شریک کار بھی سمجھا جانے لگا تھا۔ اس فرار کے تفصیلی واقعات شائع ہوئے۔ قیدی اور اس کی پُراسرار رفیقہ کے درمیان خط و کتابت کا ماحصل خط و کتابت کے ذرائع۔ پولیس کی کارروائی بولیوارڈ سینٹ میچل سے موٹر کا گزرنا۔ قہوہ خانہ سوفلٹ کا واقعہ غرضکہ ہر امر پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی تھی اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ انسپکٹر ڈیبزی نے ہوٹل کے خدمتگاروں و ملازموں کی جانچ کی۔ اس کا کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب عوام کو اس مشہور و معروف بدمعاش کے وسیع

وسائل اور لامحدود مختلف تدابیر کا علم ہوگیا۔ کہ واقعی یہ بلا کی ہستی کیا کچھ کرسکتی ہے۔ وہ قید خانہ کی گاڑی جس میں آرسین لوپن کو برابر لایا جاتا تھا۔ شروع سے آخر تک ڈھیلی کر کے دیکھی گئی۔ مگر وہاں کیا پتہ چل سکتا تھا۔ اس لئے کہ چھ سرکاری موٹروں میں اُس کے ساتھیوں نے ایک کو نکال کر اپنی ساختہ موٹر اس خوبصورتی سے شامل کردی تھی۔ کہ آج تک کسی کو پتہ نہ چل سکا۔

اب ہر شخص کو آرسین لوپن کی مجوزہ فرار کا یقین کامل ہوگیا۔ جس کی بابت اُس نے خود بھی ایم بوور مجسٹریٹ سے سوال و جواب کے درمیان اس واقعہ کے ایک روز بعد علی الاعلان کہدیا تھا۔ مجسٹریٹ نے لوپن کے گرنے اور وہاں سے پاپیادہ آنے پر بہت کچھ مذاق اُڑایا اور اس طریقہ سے اپنی خفت کا خوب ہی خوب بدلہ لیا۔

یکایک لوپن نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور نہایت خشک لہجہ میں کہنے لگا۔

"جناب ذرا سنئے۔ میری بات کا یقین فرمائیے۔ یہ جو بندہ نے کوشش کی تھی۔ اس کو آخری فرار کے استحکام کا پیش خیمہ سمجھئے۔"

مجسٹریٹ نے ہنستے ہوئے کہا میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"اور نہ آپ کو زیادہ سمجھانے کی ضرورت ہے۔"

اسی سوال و جواب کے دوران میں جو ایکوڈی فرانس میں لفظ بہ لفظ درج تھی۔ مجسٹریٹ نے جرح کرنا شروع کی۔ لوپن نے بہت ہی لاپروائی سے کہا۔

"محب من، عزیز من شفیق من وغیرہ وغیرہ۔ بھلا اس تضیع اوقات سے کیا فائدہ۔ ان تمام سوالات سے کچھ بھی حاصل نہیں۔"

"اس سے تمہارا کیا مطلب کہ کچھ حاصل نہیں۔"

"مطلب تو واقعی کچھ نہیں۔ اس لئے کہ بندہ حاضر عدالت ہی نہ ہوگا۔"

"ہائیں۔ تم حاضر عدالت نہ ہوگے۔"

"جی نہیں، یہ رائے قائم ہوچکی ہے۔ اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ اب کوئی بھی شے اس میں تغیر نہیں کرسکتی۔"

اس یقین کے ساتھ اُن فروگذاشتوں نے مل کر جو روزانہ آئے دن واقعہ ہوتی رہیں۔ افسرانِ قانون کے دل میں عجیب مبہم شکوک پیدا کر دئے۔ اور سب کے سب ہراساں نظر آنے لگے۔ انتہائی راز کی باتیں بھی آرسین لوپن کو معلوم ہوجایا کرتیں۔ جنکا افشا کرنے والا سوائے اسکے اور کوئی بھی نہ ہوتا۔ لیکن سوال یہ تھا۔ وہ آخر کیوں اُنہیں ظاہر کرتا تھا۔ اور کس مقصد سے اور کن ذرائع سے یہ کوئی نہ جانتا تھا۔

اُنہوں نے آرسین لوپن کی کوٹھڑی تبدیل کردی۔

چنانچہ یہ دو مہینے اُس نے قطعی بستر پر پڑے پڑے اور اپنا مُنہ ہمیشہ دیوار کی طرف رکھ کر گزارے۔

کوٹھڑی کا تبدیل کرایا جانا نہایت ہولناک ثابت ہُوا۔ اُس کی ساری تیزی وطراری کافور ہوگئی۔ آرسین لوپن نے اپنے وکیل تک سے ملنا ترک کر دیا۔ اور بمشکل کسی جیل کے محافظ سپاہی سے گفتگو کرتا۔

جب اس کے مقدمہ کی تاریخ سماعت ۱۴ روز رہ گئے تو یک بیک پھر اُس میں چالاکی وچستی آنا شروع ہُوئی۔ اُس نے کمی ہوا کی شکایت کی۔ چنانچہ اُسے صحن میں ذرا دیر گھومنے کی اجازت دی گئی۔ کہ روزانہ بہت سویرے دو آدمیوں کی حفاظت میں وہ تھوڑی دیر تفریحاً چہل قدمی کرسکتا ہے۔

مگر اسی اثنا میں عوام کی دلچسپی برابر بڑھ رہی تھی۔ ہر روز لوگ یہ امید کر کے اُٹھتے کہ آج فرار کی خبر ملتی ہے لوگوں کو اس کی قوی امید تھی۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ آرسین لوپن کی ظرافت طبعی، خوش مزاجی، اختراع اور پُراسرار زندگی نے لوگوں کو اس درجہ محو دلچسپی بنا رکھا تھا کہ عام طور پر اُسے ہر جگہ ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ آرسین لوپن ضرور فرار ہوگا۔ یہ امر طے شدہ تھا۔ لوگوں کو اسی پر تعجب تھا۔ کہ اُس نے اتنی دیر کیوں لگائی۔ ہر روز پولیس کا افسر اعلےٰ اپنے سکرٹری سے سوال کیا کرتا۔

"کیا وہ ابھی تک فرار نہیں ہُوا"۔

"نہیں حضور"

"آج نہیں، تو کل سہی"

چنانچہ مقدمہ کی تاریخ سے ایک روز قبل ایک معزز شخص اخبار گرانڈ جرنل کے دفتر میں پہنچا۔ اور وہاں کے قانونی مشیر کو دریافت کر کے ایک کارڈ زور سے ان کے سر پر کھینچ مارا۔ اور وہاں سے بھاگ کر چلتا بنا۔ کارڈ پر یہ الفاظ تحریر تھے۔

"آرسین لوپن ہمیشہ اپنے وعدہ کو پورا کرتا ہے۔"

ان سب واقعات کے بعد مقدمہ کی سماعت شروع ہوگئی۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ کہ خدا کی پناہ، ہر شخص خواہشمند تھا۔ کہ مشہور و معروف آرسین لوپن کا چہرہ دیکھ لے۔ کہ یہ عجیب وغریب شخص کس طرح اپنے مجسٹریٹوں کو بیوقوف بناتا ہے۔ سارا کمرہ عدالت بیرسٹروں، وکیلوں، ماتحت مجسٹریٹوں اخبار کے رپورٹروں۔ مصوّروں، صحبت یافتہ معزز اشخاص اور خوش پوش خواتین سے بھرا پڑا تھا۔ غرضکہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سارا پیرس آج اسی طرف بھاگا چلا آرہا ہے۔

حُسن اتفاق سے آج بارش بھی ہو رہی تھی۔ اِسکی وجہ سے روشنی بھی دھندلی ہوگئی تھی۔ چنانچہ محافظ نے جس وقت آرسین لوپن کو کٹہرے میں لاکر کھڑا کیا ہے۔ تو اُسکی

صورت دیکھنا قطعی مشکل تھا۔ بہرحال اس کا مجہول انداز کرسی پر بیوقوفوں کی طرح بیٹھنا اور لاپروائی اور بے حسی اس کے موافق حال نہ تھی۔ اس کے وکیل ایم بیٹری ڈینول نے جو بذات خود ایک بڑی شخصیت کا آدمی تھا۔ متعدد مرتبہ جھک جھک کر اس سے کچھ سوالات پوچھنا چاہے۔ مگر ملزم نے محض سر کو جھٹکا دیا۔ اور زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔

پیشکار عدالت نے فرد جرم پڑھ کر سنایا۔ صدر جج نے کہا۔ "کٹہرے کا ملزم کھڑا ہو۔ اور اپنا نام، عمر، پیشہ بیان کرے۔"

جب کوئی جواب نہ ملا۔ تو اس نے دوبارہ پوچھا۔

"تمہارا نام، تمہارا نام کیا ہے۔"

"ڈزاتر باڈرو"

سارے کمرہ عدالت میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ مگر جج نے یوں بات ٹالی۔

"ڈزاتر باڈرو۔ کیا یہ بھی کوئی نیا جنم ہے۔ یہ غالباً آٹھواں فرضی نام ہے۔ جو تم اختیار کر رہے ہو۔ حتیٰ کہ یہ بھی پہلے ناموں کی طرح بالکل جعلی و فرضی ہے۔ مگر خیر ہم تم کو اسی نام سے پکارنا مناسب سمجھتے ہیں۔ جو بہت زیادہ مشہور ہے۔ اگر تم ہرج نہ سمجھو۔ تو آرسین لوپن کے نام سے بولو۔"

جج نے اپنی تحریرات کا کچھ دیر مطالعہ کرنے کے بعد یوں کہنا شروع کیا۔

"باوجود ہر ممکن تحقیقات کے تمہاری شخصیت کی شناخت ناممکن ثابت ہوتی۔ موجودہ زمانہ میں صرف تمہاری ہی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جو اپنا کوئی عہد ماضی ہی نہیں رکھتی۔ واقعی ایک لاجواب صفت ہے۔ ہمیں یہی نہیں معلوم کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے۔ اور تمہاری عمر کا ابتدائی حصہ کہاں گزرا۔ مختصر یہ کہ ہمیں تمہارے متعلق کوئی علم نہیں صرف تین سال ہوئے کہ تم یکایک خدا معلوم کہاں سے دنیا میں کود پڑے۔ اور اپنے آپ کو آرسین لوپن ظاہر کیا۔ یا بالفاظ دیگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہ عقل رسا۔ فطرت۔ جرائم و فیاضی کا مشترکہ مجسمہ بنکر نمودار ہوگئے۔ ہمیں تمہارے وجود کی جودت معلوم ہے۔ اس سے قبل کا حال محض خیال پر مبنی ہے۔ خیال اغلب یہ ہے کہ روسٹاٹ نامی ایک شخص جو آج سے آٹھ سال قبل ڈکسن وکیل کے مددگار کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ سوائے آرسین لوپن کے اور کوئی نہ تھا۔ غالباً یہ بھی سچ ہے۔ کہ ایک روسی طالبعلم جو آج سے چھ سال قبل سینٹ لوئی ہسپتال کے ڈاکٹر مسٹر ابلسٹر کے دواخانہ میں کام کرتا تھا۔ اور جسنے نسخہ نویسی اور دوا تجویز کرنے میں انتہائی اعلےٰ دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ اور جلدی امراض پر تجربہ کرنے میں بڑے بڑوں پر اپنی دستگاہ کے سکے جما دئے تھے۔ سوائے آرسین لوپن

کے اور کوئی نہ تھا۔ علیٰ ہذا جاپانی کشتی گیر جس نے تمام پیرس میں دھاک باندھ دی تھی۔ اور جیو جیٹو کی شہرت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ یہی آرسین لوپن تھا۔ علیٰ ہذا وہ مشہور سائیکل باز جس نے نمائش میں سب سے بڑا انعام حاصل کیا تھا۔ اور دس ہزار فرانک کا انعام لیکر ایسا غائب ہوا کہ پھر لوگوں کو نظر ہی نہ آیا۔ یہی آرسین لوپن تھا اور آخر میں وہ شخص جس نے چیری بازار میں آتشزدگی کے موقعہ پر صدہا آدمیوں کی جانیں بچائیں۔ مگر انہیں کھڑکی سے باہر نکالنے کے بعد یعنے اس صورت سے جان بچا دینے کے بعد اُن کا تمام قیمتی مال و متاع اپنے قبضہ میں کرکے چلتا بنا تھا یہی مشہور و معروف آرسین لوپن تھا۔"

جج رُک گیا اور ذرا دیر سانس لینے کے بعد پھر کہنے لگا۔

یہ وہ وقت تھا۔ جبکہ تم اس جدو جہد کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جو اب تم نے سوسائٹی کے خلاف اس تندہی سے شروع کی ہے۔ یہ وہ زمانہ امیدواری تھا۔ جبکہ تم اپنا تجربہ اپنی مہارت، اپنی مشق بڑھا رہے تھے۔ تم اپنی قوتِ ادراک ہنر، عقل رسا کو انتہائی بلندی تک پہنچانا چاہتے تھے۔ کیوں کیا تم ان تمام بیان کردہ واقعات کی صحت سے انکار کرسکتے ہو۔"

اس تمام گفتگو کے درمیان ملزم ٹانگ پر ٹانگ رکھے پشت خم کئے اور ہاتھ آگے کو لٹکائے خاموش بیٹھا رہا جب ذرا روشنی زیادہ ہوئی تو لوگوں نے اس کی شکل کو دیکھا اور اُنہیں اسکے بیٹھے ہوئے رُخسارے۔ گالوں کی اُلٹی ہوئی ہڈیاں۔ پتلا و بے گوشت، صدہا سُرخ داغوں اور گچھی ہوئی اُلجھی ہوئی ڈاڑھی سے پُر چہرہ اور بدقوق کی طرح ایک مجسمہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ قید خانہ کی سختیوں نے اس کی افسردہ دلی میں اتنا اضافہ کر دیا تھا۔ کہ وہ اپنی طبعی عمر سے بہت زیادہ معمر نظر آ رہا تھا۔ وہ بے ریش و بروت۔ کتابی، دلکش و پر شباب چہرہ کہاں گیا۔ جس کی تصویر متعدد مرتبہ اخباروں میں شائع ہو چکی تھی۔ اُس کو دیکھتے ہوئے یہ چہرہ قطعی ناقابل شناخت تھا۔

ایسا معلوم ہوا کہ قیدی نے جج کا سوال سُنا ہی نہیں پھر اس کا اعادہ کیا گیا۔ آخرکار اُس نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں ذرا دیر تک سوچا کیا۔ اور اس کے بعد بڑی مجبوری سے حلق کو جھٹکا دیکر اُس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"ڈزائر باڈرو"

جج ہنس دیا۔

"آرسین لوپن، تم نے صفائی کی جو یہ ترکیب سوچی ہے یہ کچھ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر تم اس طریقہ سے مخبوط الحواس بنکر بیوقوف بنانا چاہتے ہو۔ تو اس سے اطمینان رکھو۔ جہانتک میرا تعلق ہے میں اس چکمہ میں آنے والا نہیں۔ اور یہ میں تمہیں رائے دیتا ہوں۔ کہ تم خواہ مخواہ اپنے خیالات

کو سبزہ دکھلانے کی کوشش کرو۔"

اور اس کے بعد اس نے وہ تمام واردات نقب زنی چوری جعلسازی بیان کیں۔ جو آرسین لوپن سے منسوب کی جاتی تھیں۔ گاہے ماہے وہ ملزم سے سوال بھی کرتا جاتا موخرالذکر یا تو مُنہ کھولکر رہ جاتا یا کوئی جواب ہی نہ دیتا۔ گواہ یکے بعد دیگرے کٹہرے میں چلے آرہے تھے۔ ان میں سے بہت فضول گواہ تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جن کی شہادت نہایت اہم تھی۔ مگر ایک بات جو عام طور پر ہر گواہ اپنے بیان میں کہہ رہا تھا۔ ایسی تھی جس سے ہر ایک کے بیان میں اختلاف پڑجاتا۔ مقدمہ کی نوعیت لحظہ بہ لحظہ پراسرار اور ناقابل فہم ہوتی جاتی تھی۔ یہانتک کہ چیف انسپکٹر گینمارڈ کو طلب کیا گیا۔ اسکے آتے ہی تمام مجمع کی دلچسپی بڑھ گئی۔

تاہم اس ضعیف العمر و پختہ کار سراغرسان کی صورت ہی سے ناامیدی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے چہرہ پر کسی ندامت کے آثار نہ تھے۔ اس لئے کہ اس کی عمر ہی اُسے شرمندگی کی اجازت نہ دیتی تھی۔ بہرحال اس کے قلب کی بے چینی اور ملال بالکل عیاں تھا۔ وہ آنکھیں کھولے ہُوئے عجب بوکھلاہٹ کے ساتھ ملزم کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا غرضکہ اُس نے کٹہرے کی سلاخوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر وہ واقعات بیان کرنا شروع کئے کہ اُس نے آرسین لوپن کا سارے یُورپ میں تعاقب کیا۔ اور اُسکے پیچھے پیچھے امریکہ تک پُہنچا۔ چنانچہ عدالت میں جمع شدہ لوگوں نے ان واقعات کو بہت ہی انہاک و دلچسپی کے ساتھ سُنا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر گینمارڈ اسی طریقہ سے اور بھی طول طویل واقعات بیان کرتا رہتا۔ تو لوگوں کو قطعی انقباض طبیعت نہ پیدا ہوسکتا تھا۔ غرضکہ اپنے بیان کے آخری حصّہ پر پُہنچتے ہُوئے آرسین لوپن سے ملاقات کاحال بیان کرکے وہ یکدم ایک مبہم و غیر اطمینان بخش طریق پر رُک گیا۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ کسی بات کو زبان پر لانے ہچکچا رہا تھا۔ کہ جج نے کہا۔

"اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو آپ ذرا دیر باہر کی ہوا کھانے کے بعد اپنا بیان دیجئے گا۔"

"جی نہیں.... نہیں.... صرف"

وہ رُک گیا۔ اور ملزم کو بہت ہی گہری نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"کیا مَیں ملزم کو ذرا زیادہ قریب ہوکر دیکھ سکتا ہوں یہاں بھی ایک راز ہے جسے مَیں حل کرنا چاہتا ہوں"

وہ کٹہرے کو طے کرکے دوسری طرف پُہنچا۔ اور کافی دیر تک ملزم کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔ اس کے بعد وہ پھر اپنی جگہ پر چلا آیا۔ اور بہت ہی مستقل و سنجیدہ لہجہ میں کہنے لگا۔

کیا مَیں عدالت کے حضور یہ امر گزارش کر دوں کہ مَیں حلفیہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ شخص جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ ہرگز ہرگز آرسین لوپن نہیں۔"

ایک سنسنی خیز و طویل خاموشی نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے جج کے حواس پران ہوتے اور اس نے چلا کر کہا۔

"آپ کا کیا مطلب، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔"

انسپکٹر نے پھر اُسی سنجیدگی سے کہا۔

"بادی النظر میں ہر شخص دھوکا کھا سکتا ہے اس لئے کہ مَیں خود تسلیم کرتا ہوں۔ کہ اس میں اور آرسین لوپن میں گہری مشابہت ہے۔ مگر صرف ایک لمحہ غور سے دیکھنے کے بعد حقیقت کھل جاتی ہے۔ یہ ناک، یہ مُنہ، یہ بال، چہرہ کا رنگ، ہرگز آرسین لوپن کا نہیں۔ اور ذرا آنکھوں پر تو غور فرمائیے۔ یہ بدمستوں و نشہ بازوں کی طرح مخمور آنکھ بھلا آرسین لوپن کی ہو سکتی ہے۔ ناممکن قطعی ناممکن"

"ذرا آگے آئیے۔ اور صاف الفاظ میں کہئے کہ مطلب کیا ہے۔"

"مَیں یہ کچھ نہیں جانتا۔ بہت ممکن ہے اُس نے کسی غریب، بدبخت کو پکڑ کر اپنی جگہ بھیجدیا ہو۔ جو بجائے اس کے مجرم سمجھ کر پکڑ لیا گیا۔ یا پھر یہ کوئی اُس کا رفیق ہے۔"

اس غیر متوقع اعلان نے سارے کمرہ عدالت میں سنسنی پھیلا دی۔ قہقہوں کی آواز۔ کلمہ ہائے حیرت ہر طرف سے برپا ہو گئے۔ جج نے فوراً حکم دیا کہ بیان قلبند کرنے والا مجسٹریٹ جیلخانہ سانٹی کا گورنر، محافظ سپاہی طلب کئے جائینگے۔ بس اتنا کہکر اُسنے عدالت برخاست کر دی۔

دوسری پیشی پر ایم بوور گورنر جیلخانہ نے ملزم کا چہرہ دیکھ کر صاف تسلیم کر لیا۔ کہ اس شخص اور آرسین لوپن کے درمیان ذرا سی مشابہت ضرور ہے۔

"تو پھر ایسی صورت میں" جج نے چیخ کر کہا۔ "یہ آدمی کون ہے۔ کہاں سے آگیا۔ اور کس طرح عدالت میں پیش ہُوا۔"

جیلخانہ کے ہر دو محافظ پیش ہوتے۔ لوگوں کی حیرت کی کیا انتہا تھی۔ جب اُنہوں نے بھی ملزم کی شناخت کی۔ جس کی نگہبانی کرنا اُن کا فرض منصبی تھا۔ جج نے ایک لمبی سانس لی۔

محافظین میں سے ایک کہنے لگا۔

"ہاں ہاں، میرے خیال میں یہی وہ آدمی ہے۔"

"ہائیں۔ یہ خیال کیا معنے۔"

"جی ہاں، میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا یہ شخص رات کے وقت میرے سپرد کیا گیا تھا۔ اور دو مہینے ہوتے ہیں جب سے یہ برابر اپنے بستر پر پڑا رہتا تھا۔ اور اسکا چہرہ

ہمیشہ دیوار کی جانب رہتا تھا۔"

"مگر ان دو مہینوں سے قبل۔"

"جی حضور۔ اس سے قبل وہ کمرہ نمبر ۴۲ میں نہیں تھا۔"

گورنر جیلخانہ نے اس کی تفصیل بیان کی۔

"میں نے اس کے مجوزہ فرار کے باعث کمرہ بدل دیا تھا۔"

مگر آپ کو بہ حیثیت گورنر جیلخانہ ان دو مہینوں میں ایکبار تو اسے دیکھنا چاہئے تھا۔"

"جی ہاں مجھے سوءِ اتفاق سے اس کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس نے کوئی تازہ شرارت ہی نہیں کی۔"

"اچھا تو یہ وہ شخص نہیں۔ جس کی حفاظت آپ کے سپرد کی گئی تھی۔"

"جی نہیں۔"

"آخر وہ کہاں گیا۔"

"میں کیا عرض کروں۔"

تو گویا ہم دو ماہ سے برابر آرسین لوپن کے بجائے دوسرا شخص قید خانہ میں بند کئے ہوئے ہیں۔ اسکا آپ کے پاس کیا جواب ہے۔"

"میں اس کا کوئی معقول جواب عرض نہیں کر سکتا۔"

"پھر"

مایوس ہو کر جج نے ملزم کی طرف نگاہ کی۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ملزم کیا تم بیان نہیں کر سکتے۔ کہ تم کس طرح اور کیونکر قانون کے آہنی پنجہ میں گرفتار ہو گئے۔"

ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس عنایت آمیز لہجہ نے اس شخص کے شکوک کو برطرف کر دیا۔ اور اس کی سمجھ تیز ہو گئی اُس نے جواب دینے کی کوشش کی۔ آخر کار بہت ہی عنایت و مہربانی سے سوالات کرنے پر اُس نے بمشکل چند ٹوٹے پھوٹے جملہ زبان سے نکالے۔ جن کا مفہوم یہ تھا۔ کہ آج سے دو ماہ قبل آوارہ گردی کے جرم میں گرفتار ہو کر پولیس کے تھانہ میں گیا تھا۔ چنانچہ وہ وہاں ایک اور رات حوالات میں بند رہا۔ اس کی جامہ تلاشی لی گئی، تو اُس کے پاس صرف چند آنے پیسے نکلے۔ اس کے بعد وہ چھوڑ دیا گیا۔

مگر وہ بمشکل صحن سے باہر نکلا تھا۔ کہ دو افسروں نے اس کے بازو پکڑ کر جیلخانہ کی موٹر میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد سے وہ برابر نمبر ۲۴ کی کوٹھڑی میں بند ہے۔ وہ بڑے آرام میں تھا۔ اُسے خوب کھانے کو ملتا تھا۔ بڑے مزہ میں سوتا تھا۔ اور اس نے کبھی بھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔

اس میں سے ہر ایک بات قابل یقین تھی۔ ہر طرف قہقہہ کی آوازیں بلند تھیں۔ لوگ فرط ہنسی سے بیتاب تھے۔ آخرکار جج نے مقدمہ کو بغرض مزید تحقیقات دوسری تاریخ پر ملتوی کر دیا۔

(۴)

اس کے متعلق مزید تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ جیلخانہ کے رجسٹر میں ایک اندراج تھا جس سے واضح ہوتا تھا۔ کہ آٹھ ہفتہ قبل ڈزائر باڈرو نامی ایک شخص تھانہ کی حوالات میں ایک دن و رات قید رکھا گیا تھا۔ اُسے دوسرے دن رہا کیا گیا۔ اور وہ تھانہ سے ٹھیک ۲ بجے دن کو روانہ ہوگیا۔ یہی وہ دن تھا۔ جس دن آرسین لوپن اپنا آخری بیان قلمبند کرا کر جیلخانہ کی موٹر میں تنہا بٹھایا گیا تھا۔ اور اُسے تھانہ سے جیلخانہ لیجایا گیا تھا۔

اب یہ سوال قائم ہوگیا۔ کہیں غلطی سے محافظوں نے بجائے آرسین لوپن کے اسے تو پکڑ کر نہیں بٹھا لیا۔ ایک ذرا سی لاپرواہی سے یہ بات غیر اغلب نہ تھی کہ اُنہوں نے ظاہراً شکل و شباہت میں چنداں امتیاز نہ کر کے بجائے اصل قیدی کے اس غریب کو بند کر دیا ہو۔ مگر محافظوں کے تجربہ اور مدت ملازمت کو دیکھتے ہوئے یہ بات قابل یقین نظر نہ آتی تھی۔

آیا ایسا تو نہیں تھا۔ کہ کہیں اس تبدیلی کا انتظام قبل ہی سے کرا لیا گیا ہو۔ اس سے قطع نظر کہ امر واقعہ کیا تھا۔ اور اس کا وقوع میں آنا کتنا ناقابل فہم تھا۔ یہ بہرصورت ممکن تھا کہ باڈرو آرسین لوپن کا کوئی ساتھی ہو۔ اور اس نے اپنے کو محض اسی لئے گرفتار کرا دیا ہو۔ کہ عین موقعہ پر بجائے آرسین لوپن کے موٹر میں سوار ہو جاتے۔ کمال حیرت کا مقام تھا۔ کہ اس قسم کی تجویز اس عمدگی سے کامیاب ہو جاتے حتٰی کہ اس کے تمام اسباب محض ناممکن العمل صورتوں غیبی امداد اور معجزنما لوازم پر مبنی تھے۔

ڈزائر باڈرو کی شخصیت شناخت کرانے کا عمل برتا گیا۔ مگر اس کے حلیہ کا کوئی صحیح نشان نہ معلوم ہوا باقی اس کے بہت سے دیگر حالات معلوم ہوئے۔ اس محلہ جات کو بیوی۔ اکسنیرس اور لاوالس کے بہت سے لوگ جانتے تھے۔ اسکا پیشہ گداگری تھا۔ اور وہ رات کو اُنہیں ردی و منہدم جھونپڑیوں میں سے کسی میں سو رہتا تھا۔ جو بیری ڈی ٹرنس میں بکثرت موجود ہیں۔ اس کا گذشتہ ایک سال سے پتہ نہ تھا۔ اور نہ اُسے کسی نے دیکھا تھا۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ کہیں یہ آرسین لوپن کے گروہ میں تو شامل نہیں ہوگیا۔ مگر اس امر کی تائید میں کافی وجوہ نہ تھے۔ اور بفرض محال ایسا ہی ہوتا۔ تب بھی اس سے ملزم کے فرار کا کیا پتہ چل سکتا تھا۔ یہ راز بدستور عقدہ لاینحل رہا۔ بہرحال اسی قسم کے صدہا سوالات پیش کئے گئے۔

اور تفصیل پر بحث و مباحثہ کیا گیا۔ مگر کوئی اطمینان بخش نہ ثابت ہُوا۔ اس پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ کہ آرسین لوپن فرار ہوگیا۔ اور اپنی بجائے ایک دوسرے کو چھوڑ گیا۔ مگر یہ فرار ایسا ناقابل فہم، سنسنی خیز تھا جس نے عوام و حکام دونوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ انتظام کی خوبصورتی اور حیرت خیز، پُر پیچ ترکیبوں کی ترتیب عمل سے باہر تھی۔ غرضکہ ان تمام باتوں کا ماحصل یہ نکلا کہ لوگوں نے صاف صاف کہنا شروع کر دیا۔ آرسین لوپن نے بہت فخر کے ساتھ یہ پیشینگوئی کی تھی۔

"مَیں اپنی تاریخ مقدمہ پر حاضر عدالت نہ ہونگا۔"

(۵)

ایک ماہ کی مسلسل تفتیش کے بعد بھی یہ معمہ بدستور ناقابل حل رہا۔ اور اس طرف سے یہ بھی ناممکن تھا کہ اُس بیچارے غریب باڈرو کو بدستور حوالات میں بند رکھا جاتے اس پر مقدمہ چلانا بالکل بیہودگی تھا۔ اُس غریب کے خلاف کونسا جرم تھا۔ مجسٹریٹ نے اس کی رہائی کا حکم سُنا دیا۔ لیکن سراغرسانی کے افسر اعلےٰ نے پھر بھی اسکی نقل و حرکت کی سخت نگرانی مقرر کی۔ تاکہ جانچ جاری رہے۔

یہ ترکیب گینمارڈ نے سوجھائی تھی۔ اس کے خیال میں اس معاملہ میں کوئی سازش یا اتفاقی واقعہ شامل نہ تھا باڈرو محض ایک آلہ کار تھا۔ جس کو آرسین لوپن نے اپنی عدیم المثال فطرت سے کام لیکر اپنی جگہ قید کرا دیا تھا چنانچہ باڈرو کے ذریعہ اُنہیں اُمید تھی کہ اس کے تعاقب میں لگ کر وہ شاید آرسین لوپن یا اُس کے ساتھی کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو جاتیں گے۔

انسپکٹر ڈیزی و فالنفانٹ کا حکم ملا۔ کہ وہ گینمارڈ کی معیت میں مددگاروں کی طرح ساتھ رہیں۔ غرضکہ ماہ جنوری کی ایک کہر آلود صبح کو جیلخانہ کے دروازے کھول دیتے گئے۔ اور ڈزاتر باڈرو کو رہا کر کے رخصت کر دیا گیا۔

اوّلاً تو باڈرو کچھ پریشان سا نظر آیا۔ اور وہاں سے ایک ایسے شخص کی طرح نکلا۔ جسے یہ نہ معلوم ہو کہ اُسے کہاں جانا ہے اور وہ اپنا وقت کس طرح گزارے۔ وُہ روڈی لاسانٹی سے ہوتا ہُوا روسینٹ جاکس پر پہنچا۔ یہاں ایک پُرانے کپڑوں کی دُکان کے باہر کھڑے ہو کر اس نے اپنی جاکٹ اور ویسکوٹ اُتاری۔ ویسکوٹ چند آنے پیسہ میں فروخت کر کے جاکٹ پہن لی۔ اور چلتا بنا۔ اُس نے دریائے سین کے پُل کو طے کیا۔ چیٹلیٹ کے قریب ایک سفری گھوڑا گاڑی اُس کے قریب سے گزری۔ اس میں اُس نے سوار ہونے کی کوشش کی۔ مگر گاڑی مسافروں سے بھری ہُوئی تھی۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔ کہ وہ ٹکٹ خرید کر ویٹنگ روم میں انتظار کرے۔ باڈرو ویٹنگ روم میں داخل ہوگیا۔

گینمارڈ نے معاً اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ دفتر پر برابر نگاہ رکھی جائے۔ اور یہ حکم دیا۔

"ایک گاڑی، نہیں، نہیں، دور کو او۔ یہ زیادہ اچھا ہے۔ میں تم میں سے ایک کو اپنے ہمراہ رکھ کر اس کا تعاقب کروں گا۔"

اُس کے مددگاروں نے تعمیل حکم کی۔ مگر باڈرو پھر باہر نہیں نکلا۔ گینمارڈ بھی ویٹنگ روم میں گھس گیا۔ مگر کیا دیکھتا ہے۔ کہ وہاں کوئی موجود نہیں۔

"اوہ۔ میں بھی کس قدر بیوقوف ہوں۔" اُس نے خود ہی بڑبڑا کر کہا۔ "میں بھول گیا۔ شاید دوسرا دروازہ تھا۔" واقعی اسٹیشن روبینٹ مارٹن پر ویٹنگ روم سے ملحق ٹکٹ گھر بنا ہوا ہے۔ گینمارڈ درمیانی روش سے دوسری سمت جھپٹا۔ اور وہ ایسے موقعہ سے پہنچا۔ جبکہ باڈرو ایک گاڑی پر جو باٹگنولس سے جارڈی پلانٹس کی طرف جا رہی تھی۔ سوار ہو چکا تھا۔ گینمارڈ نے اُس کو دیکھ لیا۔ اور گاڑی کے پیچھے جھپٹا۔ اور اُسے پکڑ لیا۔ لیکن اس کے دونوں مددگار پیچھے چھوٹ گئے۔ اور اُسے خود تن تنہا تعاقب کرنا پڑا۔

غصّہ میں اُس کا دل چاہا۔ کہ بلا کسی گفتگو یا رسمی تعارف کے وہ باڈرو کا گلا پکڑ کر دبا دے۔ اس لئے کہ اُسے یہ خیال ہوا۔ کہ اس بیوقوف نما شخص کی یہ کسقدر اعلیٰ عیاری و ہوشیاری تھی۔ کہ ایک ذرا سی ترکیب میں اُس نے اس کے دونوں مددگاروں کا ساتھ چھوڑوا دیا۔ گینمارڈ نے باڈرو کو پھر ایکبار دیکھا۔ باڈرو بڑے مزہ سے اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا اُونگھ رہا تھا۔ اور اس کا سر داہنی اور بائیں جانب ہلتا جاتا تھا۔ اُس کا مُنہ بھی تقریباً نصف کھلا تھا۔ اور چہرہ سے بالکل بیوقوفوں کی طرح آثار نمایاں تھے۔ اب اُسے مکرر یہ خیال ہوا۔ نہیں۔ واقعی یہ شخص گینمارڈ ایسے ماہرِ فن کے مقابلہ کے قابل نہیں۔ محض اتفاق تھا کہ بات بن گئی۔

محلہ کرافور میں پہنچکر باڈرو اس گاڑی سے اُتر کر لاموٹی کی ٹرام میں سوار ہو گیا۔ گینمارڈ نے بھی یہی کیا۔ یہ دونوں اسی طرح برابر بولیوارڈ ہوزن اور ریونیو وکٹر ہوگو تک چلے گئے۔ لاموٹی پر ٹرام کے کھڑا ہوتے ہی باڈرو نیچے اُتر گیا۔ اور بہت ہی سہل رفتاری سے چلتا ہوا باٹس ڈی بولون میں داخل ہو گیا۔ وہ عرصہ تک اس گلی سے اس گلی اور اس کوچہ سے اُس کوچہ میں بلاوجہ چکّر لگاتا رہا۔ پھر لوٹا، اور پھر واپس ہوا۔ آخر یہ کیا دیکھ رہا تھا۔ کیا کوئی خاص مقصد اس کے پیش نظر تھا؟

ایک گھنٹہ تک اسی طرح قدمبازی کرنے کے بعد وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک بینچ پڑی ہوئی تھی۔ اُس پر ٹانگیں پھیلا کر باطمینان دراز ہو گیا۔ یہ مقام آتیل کی جھیل سے (جو ہمیشہ گھنے درختوں کے درمیان پوشیدہ

رہتی ہے) زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا۔ یہاں ہر وقت تنہائی رہتی تھی۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ آخرکار جھک مار کر گینارڈ نے خود ہی سلسلہ گفتگو چھیڑنے کی ٹھانی۔

وہ بھی جاکر اسی بنچ پر باڈرو کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ایک سگرٹ نکال کر جلائی۔ اور چھڑی کی نوک سے زمین پر لکیریں بناتے ہوئے کہنے لگا۔

"آج بھی کیسی خنکی ہے۔"

خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ یکایک اس خاموشی کے درمیان ہنسی کی ایک چیخ، مسرور و بشاش قہقہہ کی آواز بچہ کے مانند بیتابانہ فرمائشی قہقہے کی صدا جسے سنکر خواہ مخواہ دوسرے کو بھی ہنسی آجائے۔ سنائی دی گینارڈ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ کیوں؟ اف یہ ہنسی، یہ شیطانی ہنسی کیسی تھی، وہ جس کو وہ صدہا مرتبہ سن چکا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ ہنسنے والا کون ہے؟

کسی فوری جذبہ کے زیر اثر اس نے باڈرو کی جاکٹ کا دامن پکڑ کر سخت جھٹکا دیا۔ اور اس پر بری طرح نظریں جما دیں۔ اور کمرہ عدالت میں جس طرح قریب سے دیکھا تھا۔ اس سے بھی زیادہ نسبتاً قریب ہو کر اس نے چہرہ کا معائنہ کیا۔ اور اب کیا دیکھتا ہے۔ کہ یہ وہ شخص نہیں۔ جس کو اس نے کمرہ عدالت میں دیکھا تھا۔ مگر... مگر تھا یہ وہی آدمی لیکن کس صورت میں۔ ایک دوسری شکل میں، وہاں کچھ اور تھا، یہاں کچھ اور

سچ ہے۔ خواہش و آرزو خیال کی ماں ہیں۔ اسے پھر ان آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی۔ چہرہ پر گوشت بھی آگیا۔ خشک چہرہ و نکلی ہوئی ہڈیاں بھی غائب ہو گئیں۔ اب اصلی چہرہ سامنے تھا۔ اور پہلے بنا ہوا۔ خدایا کسقدر حیرت کی بات تھی۔ یہ آنکھیں بھی دوسری تھیں۔ منہ بھی دوسرا، اور سب پر طرہ یہ کہ خوش طبعی، مذاق، منہ چڑانا، شگفتگی، سب کچھ پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک نوجوان شخص موجود تھا۔

"آرسین لوپن، آہ آرسین لوپن" اس نے گلوگیر لہجہ میں کہا۔

فرط غضب میں دیوانہ ہو کر اس نے اس کا گلا پکڑا۔ اور اس طرح زور کیا۔ کہ اب اٹھا کر زمین پر ٹپک دیگا۔ گو اس کی عمر پچاس سال سے زائد تھی۔ تاہم اس کے قویٰ بہت مضبوط تھے۔ اس کے مقابل اس کا حریف بہت ہی کمزور معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہ کونسا کرتب تھا کہ نوجوان حریف بدستور اپنی جگہ پر رہا۔

زور و مقابلہ آناً فاناً ختم ہو گیا۔ آرسین لوپن نے اپنی حفاظت میں ذرا بھی ہاتھ پیر نہیں ہلائے گینارڈ نے جس تیزی سے حملہ کیا تھا اسی تیزی سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اس کا داہنا ہاتھ مفلوج و بے جان ہو کر لٹک پڑا۔

" اے میاں گینمارڈ صاحب۔ اگر آپ نے بھی جو جیٹو کے مانند کسی اکھاڑے میں پہلوانی کرتب سیکھے ہوتے" لوپن کہنے لگا۔" تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اس گھات کو جاپانی زبان میں اودی شی گی کہتے ہیں۔" اس کے بعد کسی قدر خشک لہجہ میں کہنے لگا۔" اگر ایک سکنڈ بھی آپ اور دیر کرتے۔ تو یقیناً" میں آپ کا یہ نازک ہاتھ شانہ سے علیحدہ اکھاڑ کر رکھ دیتا۔ بس پھر آپ قطعی ٹھیک ہوجاتے اور اگر سچ پوچھتے۔ تو آپ ایک ہی ہاتھ کے مستحق ہیں۔ کیوں حضرت۔ آپ مجھ جیسے پرانے دوست . . . . کی جو آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور جو آپ کے سامنے اپنی تبدیل ہیئت کا اظہار کر دیتا ہے۔ بالکل پروا نہیں کرتے اور میری دوستی و اعتماد کی قدر نہیں کرتے۔ واقعی یہ آپ کا صریح ظلم ہے۔ اوہو۔ کہئے۔ آپ کے ہاتھ کی کیا کیفیت ہے؟"

گینمارڈ بالکل خاموش تھا۔ اس فرار کا ذمہ دار وہ خود اپنے کو سمجھ رہا تھا۔ کیا یہ اُسی کی خطا نہ تھی۔ کہ اس نے اپنی سنسنی خیز شہادت سے عدالت کو شک میں ڈال دیا تھا۔ اب اُسے ایسا احساس ہو رہا تھا۔ کہ آرسین لوپن کا اس طرح فرار ہونا۔ واقعی اس کے عہد ملازمت میں ایک بدنما داغ ہے جو کبھی دھوتے نہ دُھلے گا۔ افسوس اُسے اسقدر رنج ہوا کہ ایک موٹا آنسو اس کے رخساروں پر بہکر سفید مونچھوں پر آرہا۔

" آہ گینمارڈ صاحب یہ کیا۔ خدارا یہ نہ کہئے۔ اس سے تو میرے دل کو سخت قلق ہوتا ہے۔ اگر آپ نے خود اپنی زبان سے نہ کہا ہوتا تو شاید میں گفتگو کا بھی موقعہ نہ آنے دیتا۔ اور کسی دوسرے کو بھڑا دیتا۔ آیئے۔ آیئے بھی بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں غریب ڈزایر باڈرو کے خلاف اُن کو کسی فیصلہ کرنے کی اجازت دیتا۔"

" تو کیا تم ہی کمرہ عدالت میں موجود تھے۔" گینمارڈ نے نے رُک کر پوچھا۔ " اور کیا تم ہی یہاں بھی موجود ہو۔"

" جی ہاں۔ وہاں بھی میں یہاں بھی میں یقین جانئے بندہ کے سوائے کوئی نہیں۔"

" کیا یہ ممکنات سے ہے۔"

" اوہ۔ افسوس۔ کیا اس کے لئے بھی کسی سحر و جادو کی ضرورت ہے۔ کیا فاضل جج نے جو کچھ بیان کیا تھا۔ وہ آپ کے لئے کافی نہ تھا۔ جو شخص متواتر دس بارہ برس مشق کرنے کے بعد میدان میں کودے۔ اس سے یہ امر چنداں بعید نہیں۔"

" لیکن تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں۔"

" آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کہ میں نے سینٹ لوئی میں ڈاکٹر الیسٹر کے پاس رہ کر جو اٹھارہ مہینہ گزارے تھے۔ وہ اس لئے نہیں کہ مجھے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ اُس شخص کے لئے جو ایک روز جناب کے

سامنے باعزت آرسین لوپن کی صورت میں جلوہ گر ہونیوالا
ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی شکل وصورت کا ہو۔
اور ہر کس و ناکس اُسے پہچان لے۔ آپ بھی اگر چاہیں، تو
شکل تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور مزہ یہ کہ جیسی مزاج چاہے ویسی
سفوف آب نقرہ کو سوئی کے ذریعہ جلد میں بھرنے سے
جہاں پر جتنا پھیلانا مقصود ہو۔ بے تکلف پھیلا لیجئے۔
محرور ترشی کے استعمال سے آپ رنگت اسقدر تبدیل کرسکتے
ہیں کہ حبشی مات کہا جاتے۔ عرق سنلڈین کے جلد پر ملنے سے
وہ اعلےٰ داغ دو دھبے اور چھالے پیدا ہو جاتے ہیں کہ سارا
چہرہ بنجر بن جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بہت سے مرکب ایسے
ہیں جن سے حسب مرضی بال داڑھی و مونچھ جسقدر چاہے
بڑھا لیجئے۔ بعضوں کے استعمال سے آواز بھی بدل جاتی
ہے۔ خیر۔ اس قطع نظر کمرہ نمبر ۲۴ میں دو مہینہ تک پڑے
پڑے کھانا۔ برابر مُنہ کھولے رکھنے کی مشق کرنا۔ برابر مُنہ چڑھانے
کی کوشش اور کمر کو ایک ہی سمت جھکا رکھنے کی سعی۔ کچھ
ہوتی ہی نہیں۔ سب سے آخر میں مَیں آپ کو یہ بھی بتلاتے
دیتا ہوں کہ صرف اسّراپین کے پانچ قطرے آنکھوں کی
حالت کو بالکل مخمور و نشہ باز کی طرح بنا دیتے ہیں۔ چلئے
قصّہ ختم اور بھیس مکمل۔"

مگر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ محافظوں ....."

"جی .... یہ تبدیلی بہت ہی بتدریج ہو رہی تھی۔
اُنہیں روزانہ دیکھنے سے کچھ بھی احساس نہ ہو سکتا تھا۔"

"لیکن وہ ڈزائر باڈرو"

"باڈرو واقعی ایک شخصیت ہے۔ یہ کون ہے۔ وہ
بھی سن لیجئے۔ یہ ایک بہت ہی غریب اور بے ضرر گداگر
ہے۔ جس سے مَیں گوشتہ سال ملاقی ہوا تھا۔ اور اس کی
شکل وصورت بعینہ میرے مانند ہے۔ ہمیشہ یہ خیال
پیش نظر رکھ کر کہ میری گرفتاری ہر وقت ممکن ہے۔ مَیں
نے اُسے پکڑ کر بہ حفاظت رکھا۔ اور مَیں نے شروع سے
ان باتوں کو دیکھنا شروع کیا۔ جو میرے اور اُس کے
درمیان غیر مشابہ تھیں۔ تاکہ مَیں اُن کو کم از کم اپنی شکل
سے کم کرنے کی کوشش کروں۔ میرے دوستوں نے
اُسے پکڑ کر تھانہ کی حوالات میں ایسے موقعہ سے بند کرا دیا۔
کہ اُس کی رہائی ٹھیک اس موقعہ پر ہوئی جبکہ مَیں بھی تھانہ
سے موٹر میں روانہ ہو رہا تھا۔ چلتے ترکیب چل گئی۔ اب
ذرا سمجھئے۔ یہ ضروری تھا کہ اُس کے مزید حالات کا پتہ
لگایا جائیگا۔ ورنہ حکام یہ جاننے کی کوشش ضرور کرتے
کہ آخر میں کون تھا۔ چنانچہ اس ترکیب سے باڈرو کا نام
پیش کر کے مَیں نے ان تمام باتوں کو بالکل آسان کر دیا
دیکھئے آپ سُن بھی رہے ہیں۔ مَیں نے اسے بالکل آسان
بنا دیا۔ اس واسطے کہ تمام مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوتے
وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ یہ دھوکے سے تبدیلی

ہوگئی۔ آخر تبدیلی میں جو شخص گرفتار ہوا۔ وہ کیا تھا کون تھا۔ یہ پتہ لگانا ضروری تھا۔ نہ یہ کہ محض لاعلمی میں اُس گرفتار شدہ شخص کو چھوڑ دینا۔"

گینمارڈ نے کہا۔ "ہاں۔ ہاں یہ بالکل ٹھیک کہتے ہو۔"

"اچھا اب ...." آرسین لوپن نے کہا۔

"اس کے علاوہ میرے پاس ایک اور بھی مصالحہ تھا وہ کیسے کیا۔ وہ تجویز جسے مَیں شروع سے تیار کر رہا تھا اور جس کا مقصد میرا فرار ہونا تھا۔ اب وہ فاش غلطی جس میں آپ اور سب کے سب افسران مبتلا ہو گئے اِس سنسنی خیز بازی میں جو مَیں اور قانون اپنی اپنی طاقت سے میرے فرار کی شرط پر کھیل رہے تھے۔ یہ تھی۔ کہ آپ حضرات کو پھر یہ خیال پیدا ہوگیا۔ کہ مَیں لاف زنی کر رہا تھا۔ اور ایک بیوقوف بارہ سنگھے کی طرح نشۂ کامیابی میں مست ہو رہا تھا۔ ذرا خیال تو کیجئے۔ آرسین لوپن اور ایسی فاش غلطی کر سکے۔ ذرا یاد کیجئے۔ کاہرن والے مقدمہ میں آپ پھر دل میں یہ سوال کرنا بھول گئے۔" اگر آرسین لوپن بہانگ دہل یہ پکار کر اعلان کر دے کہ وہ فرار ہونا چاہتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ضرور کوئی ایسی مجبوری ہے جس سے اُسے اس اعلان کی حاجت پیش آئی خیر ان تمام قصوں کو برطرف کیجئے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے

کہ اپنے فرار کو کامیاب بنانے کے لئے۔ بلا اس کے کہ مَیں فرار ہوں۔ یہ ضروری نہ تھا کہ لوگوں کو اس امر کا یقین کامل دلا دیا جائے۔ کہ آرسین لوپن فرار ہوگا۔ اور اس یقین کو روزِ روشن کی طرح ایک دینی جذبہ کے مانند مکمل طریق پر لوگوں کو ذہن نشین کرا دیا جائے۔ کہ لوپن کا فرار ہونا لازمی و لابدی ہے۔ چنانچہ مَیں اس معاملہ میں بھی اپنی حسب مرضی کامیاب ہوا۔ آرسین لوپن نے فرار کا ارادہ کر لیا تھا آرسین لوپن نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ حاضر عدالت نہ ہوگا۔ یاد کیجئے آپ ہی تو تھے۔ کہ لوگ فوراً اس اشارہ کو نہ لے اُڑاتے۔ چونکہ اثر پہلے ہی سے موجود تھا۔ معاً سب کو گمان ہوگیا۔ کہ آرسین لوپن نکل گیا۔ اب اگر اسی وقت کسی بھی شخص کو شک ہو جاتا۔ اور ایک متنفس بھی اتنا کہہ دیتا۔ فرض کرو کہ یہی آرسین لوپن ہو۔ بس میرا کھیل خراب، اور مَیں تباہ و برباد ہوگیا ہوتا۔ مگر نہیں آپ کے ان چند الفاظ نے جادو نما اثر کیا۔ وہ سب کے سب مجھے یہ دیکھنے کے لئے جھک گئے کہ میری شکل و صورت دیکھیں۔ اس خیال سے نہیں کہ مَیں آرسین لوپن تھا۔ بلکہ محض اس خیال سے کہ آرسین لوپن کے بجائے جو شخص پکڑا آیا ہے۔ اس کے خط و خال سے لوپن کی صورت کا اندازہ کریں۔ چنانچہ آپ نے اور جملہ اشخاص نے اسی نیت سے میرا معائنہ کیا۔ اور یقین جانئے میری لاکھ تدبیروں کے

باوجود میں بآسانی پہچانا جاسکتا تھا۔ مگر اس موقعہ پر کس چیز کی ضرورت تھی۔ ظاہری اطمینان اور حواس برقرار رکھنے کی چنانچہ میں نے ان دونوں باتوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی موجودگی میں کسی شخص کا شک کرنا قطعی ناممکن تھا۔"

اتنا کہکر اس نے فوراً گینمارڈ کی کلائی پکڑلی۔

"گینمارڈ صاحب واللہ ذرا خیال تو کیجئے جیلخانہ سانٹی میں ملاقات کرنے کے بعد صرف ایک ہفتہ میں نے عرض کیا تھا۔ کہ آپ اس عرصہ کے بعد ۴ بجے میرا انتظار کریں۔ آپ کو یاد ہے۔"

"ہاں تو تمہاری موٹر گاڑی" گینمارڈ نے بات ٹالتے ہوئے سوال کیا۔

"محض دھوکا، جعل، فریب میرے دوستوں نے اس سڑیل موٹر کار کو اڑا کر اس کی بجائے ایک دوسری تبدیل کردی۔ اور انہوں نے اُس کا تجربہ کرنا چاہا لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ امر بلا غیر معمولی واقعات کے عمل میں نہیں آسکتا۔ تاہم میرا تجربہ خالی نہیں گیا۔ اب میں نے یہ خیال کیا۔ کہ اگر اس معجزہ فرار کو لوگوں پر ظاہر کردیا جائے تو میرا آئندہ فرار ہونا بہت ہی مکمل صورت اختیار کرے گا۔ وہ پہلی کوشش جو اس درجہ دلیری پر مبنی ہو۔ دوسری کوشش کی پختگی و کامیابی کا بیّن ثبوت تھی۔ جس میں کسی کو شک ہی نہ ہوسکتا تھا۔"

"اور وہ سگار"

"خود میں نے کھو کھلا کردیا تھا۔ اور وہی کیا۔ چاقو کا دستہ بھی۔"

"اور وہ دونوں تحریریں۔"

"بندہ ہی نے لکھی تھیں۔"

"اور وہ پُراسرار کاتب"

"جی وہ رفیقہ بھی یہی کمترین۔ اور میں تو پھر میں ہی ہوں۔ کیا آپ کو یہ علم نہیں کہ میں جس طرح اور جس خط میں تحریر لکھنا چاہوں بلا تامل اور بلا تکلف لکھ سکتا ہوں"

گینمارڈ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"اچھا یہ عجیب بات کس طرح ظہور میں آئی۔ کہ جس وقت حکام نے ہاڈرو کے جسم کی پیمائش کی تو اس کے جسم کا تناسب آرسین لوپن کے اعضا کی صحیح پیمائش کسے معلوم ہے۔"

"بیہودہ بکتے ہو۔"

"اچھا، اگر ہے تو وہ بالکل غلط و نامکمل، اس موضوع پر میں نے خود بھی عرصہ تک غور کرلیا تھا۔ برٹیلن کا طریقہ محض آنکھوں پر مشتمل ہے۔ اور آپ جانتے ہیں۔ کہ اس میں بہت کم دھوکا ہوتا ہے۔ رہ گیا دوسرا طریقہ۔ بدن کے اعضاء، اونچائی وغیرہ کی پیمائش، سر کا چھوٹا و بڑا ہونا، انگلیوں، ناک و کان کی لمبائی وغیرہ اس کے

خلاف توکسی طرح کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔"

" پھر تم نے کیسے۔"

" جی جناب۔ مجھے اس کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑا تھا۔ امریکہ سے واپسی پر دفتر کے ایک کلرک نے معقول رقم رشوت لیکر شروع ہی میں بالکل غلط پیمائش درج کردی۔ چلیئے جب بسم اللہ ہی غلط ہو گئی تو سارا معاملہ بگڑ گیا۔ کل پیمائش غلط ہو کر رہ گئی۔ ہونا کچھ چاہتے تھا۔ درج کچھ اور ہے۔ پھر آپ ہی بتایئے۔ باڈرو کا حلیہ آرسین لوپن کے حلیہ و پیمائش سے کیسے مطابقت کرسکتا تھا۔"

پھر ایک مرتبہ خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد گینمارڈ نے سوال کیا۔

" اچھا اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔"

" اب" آرسین لوپن نے بہت زور دے کر کہا۔ " میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ذرا کچھ کھا پی کر پھر اپنی اصلی حالت پر آجاؤں۔ دیکھئے باڈرو یا کوئی دوسرا شخص بن جانا تو اسی قدر آسان ہے جس طرح آپ اپنے جوتے کو بدل ڈالیں۔ یا اپنی آواز، اپنے انداز، تحریر خط بدل ڈالیں۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ آپ ان تبدیلیوں کے درمیان خود اپنی ہی ہستی کو بھول جاتے ہیں۔ اور یہ موقعہ نہایت حسرتناک ہوتا ہے۔ اُس وقت مجھے بھی بعینہ اسی طرح احساس ہو رہا ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے اصلی سایہ کو کھو کر دوبارہ تلاش میں لگا ہو۔ اس لئے بندہ خود اپنی تلاش میں جا رہا ہے۔ تاکہ میں خود اپنے کو ڈھونڈ لوں۔"

آرسین لوپن نے ادھر اُدھر قدمبازی شروع کردی دن کی روشنی قطعی غائب ہوتی جاتی تھی کہ یک بیک وہ گینمارڈ کے سامنے رُک کر کھڑا ہو گیا۔

" میرا خیال ہے کہ اب ہر ایک بات جو آپ کی سمجھ میں نہ آسکتی تھی۔ یا آپ مجھ سے سوال کرسکتے تھے۔ ہمارے درمیان تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی۔"

" نہیں" انسپکٹر نے گلوگیر آواز میں کہا۔ " ابھی ایک بات باقی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا تم اپنے اس فرار کے متعلق لوگوں پر جملہ حالات ظاہر کروگے یا نہیں۔ اور یہ غلطی جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ اسکا۔"

" اوہ۔ آپ اطمینان رکھیں۔ یہ کبھی کسی کو معلوم نہ ہوگا۔ کہ رہا شدہ شخص آرسین لوپن تھا میں اپنی ہستی کو انتہائی پُراسرار بنانے اور انتہائی حیرت خیز باتوں سے آلودہ کرنے کا جس درجہ شائق ہوں۔ آپ سے مخفی نہیں۔ پھر بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اپنی معجزنما رہائی کو لوگوں پر ظاہر کرتا پھروں۔ اس لئے میرے کرمفرما آپ قطعی خوف نہ کریں۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں

اچھا... تسلیم.. مجھے آج ایک دوسری جگہ شام کا کھانا کھانا ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ وقت زیادہ گزر گیا ہے۔ مشکل سے کپڑے بدلنے کا وقت باقی رہ گیا ہے۔"

"میں تو یہ خیال کر رہا تھا کہ تم آرام کرنے کی فکر میں ہو گے۔"

"افسوس۔ ان جلسہ ہائے صحبت سے احتراز کرنا اخلاقی گناہ ہے۔ جو کم از کم مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میرے آرام کا زمانہ کل سے شروع ہو گا۔"

"ہاں تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں۔ کہ تم کھانا کہاں کھاؤ گے۔"

"اوہ یہ بھی کوئی چھپانے کی بات ہے۔ برطانوی سفارت خانہ میں۔"

شمیم بلہوری

انقلابِ دل

دل ہی اب وقف امتحاں نہ رہا — آسماں میرا آسماں نہ رہا

حُسن کی دلفریبیاں نہ رہیں — لب پہ ہنگامۂ فغاں نہ رہا

دشت پیمائیِ جنوں نہ رہی — فاقہ مستی کا وہ سماں نہ رہا

جس سے بزمِ جہاں میں رونق تھی — آہ! وہ دل ہی شادماں نہ رہا

دل میں جب کوئی آرزو نہ رہی — میں بھی منت کشِ بیاں نہ رہا

جل کے میں ہو گیا ہوں خاکستر — آتشِ عشق کا نشاں نہ رہا

زیست ہے انقلاب ہی تو اثرؔ
ایک حالت پہ یہ جہاں نہ رہا

اثرؔ

ارشاداتِ عزیز

کیوں نہ ہو شوق ترے در پہ جبیں سائی کا
اس میں جوہر ہے مری آئینہ سیمائی کا

طور کشتہ ہے اسی نازِ خود آرائی کا
برق کی لہر ہے نقشہ تری انگڑائی کا

اشک جو آنکھ سے ٹپکا ہے دمِ سرمہ کشی
ایک ٹوٹا ہوا تارا ہے خود آرائی کا

آج اِک خاک کا ذرّہ بھی نہیں ہے باقی
دلِ برباد نتیجہ ہے یہ خود رائی کا

عشق اِک تبصرہ ہے حُسن کی رعنائی پر
حُسن اِک فلسفہ ہے عشق کی رسوائی کا

یادِ ایّام کہ تھی لب پہ مرے مہرِ سکوت
اب تو ماتم ہے بپا دل میں شکیبائی کا

اس طرف بھی نظرِ مہر ہوائے جلوہ فروش
دل بھی محتاج ہے اِک عینکِ بینائی کا

موج در موج رواں بادہ سرِ جوشِ شباب
عالمِ کیف ہے عالم تری انگڑائی کا

تیرگی شامِ لحد کی بھی ڈراونی ہے مگر
ہے یہ اُترا ہُوا جامہ شبِ تنہائی کا

اُس کی دزدیدہ نگاہوں سے کرو اندازہ
حال پوچھو نہ مرے زخم کی گہرائی کا

جزر و مدِ حسن کے دریا میں نظر آتا ہے
قابلِ دید ہے عالم تری انگڑائی کا

تیرے دیدار سے محروم ہیں جب آنکھیں
کوئی مصرف ہی نہیں پھر میری بینائی کا

نیند اُن کی اگر جائے تو کچھ دور نہیں
سو گیا جاگنے والا سبِ تنہائی کا

عالمِ گورِ غریباں کا یہ غمناک سکوت
اِک نمونہ ہے مرے دل کی شکیبائی کا

شعر دلکش ہو اگر صفحۂ کاغذ پہ عزیزؔ
ہے یہ معیار کمالِ سخن آرائی کا

سُندری سہاگ ہیر آئیل



نواب صاحب۔ بیگم!
آجکل کون سا تیل لگا رہی ہو؟ خوشبو اچھی آ رہی ہے!
بال بھی تمہارے ماشاء اللہ پہلے سے اب بہت لانبے اور گھنے نظر آرہے ہیں!

بیگم صاحبہ۔ پیارے نواب! آج تین چار ہفتہ سے برابر سُندری سہاگ لگا رہی ہوں، ہاں، تم سچ کہہ رہے ہو۔ پہلے سے اب میرے بال بہت اچھی حالت میں ہیں!

سندری سہاگ ہیر آئیل۔ دماغ کو قوت بخشتا ہی اس لئے مرد اسے اپنا مونس قرار دیتے ہیں۔ **سندری سہاگ ہیر آئیل۔** بالوں کی جڑوں کو خوب مضبوط کر دیتا ہے۔ جسکی وجہ سے بال چمکدار، لانبے، گھنے اور گھونگر والے ہو جاتے ہیں اس لئے عورتیں اسکو بڑی چاہ سے لگاتی ہیں۔

سندری سہاگ ہیر آئیل کا رنگ اور خوشبو دونوں کے دونوں بڑے ہی دلربا ہیں اس لئے عام پبلک اس کو نہایت درجہ پسند کرتی ہے۔

سندری سہاگ ہیر آئیل۔ خالص بیلہ کے تیل میں تیار ہوتا ہی اور اول درجہ کی فائدہ مند اور قیمتی دوائیں ڈالی جاتی ہیں اسلیے اسکے لگاتے ہی درد سر کو سکون ہو جاتا ہی اور مسلسل استعمال سے یہ شکایت ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتی ہی **سندری سہاگ ہیر آئیل** بالوں کو قبل از وقت گرنے یا سفید ہونے سے روکتا ہے تمام لوگ سوداگر، طالب علم اور مصور اسکو بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں **بیماری** سے اٹھا ہوا نحیف و ناتوان دماغ سندری سہاگ کے استعمال سے ترو تازہ ہو جاتا ہی، دماغ کو فرحت ہوتی ہی، اور روح کو مسرت ہوتی ہی۔ **سندری سہاگ ہیر آئیل** کے ثنا خوان سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نکتہ فہم اور سمجھدار مرد اور عورتیں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل نامی گرامی شامل ہیں:- **ہز ہائینس** مہاراجہ ادھیراجہ بہادر آف دربھنگہ۔ **ہر ہائینس** مہارانی ادھیرانی بہادر آف بردوان۔ **ہر ہائینس** نواب بیگم صاحبہ آف مالیر کوٹلہ۔ حضور **رانی** صاحبہ آف جہانگیر آباد۔ **ہز ہائینس** مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب **میجر** جنرل ہز ہائینس سر بابر شمشیر جنگ رانا بہادر (نیپال) حضور راجہ محمد اکبر صاحب (جہلم)۔ **جو** سندری سہاگ کے لیئے باعث فخر و ناز ہیں:- **قیمت** فی شیشی ایک روپیہ تین شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ محصول علاوہ۔

ملنے کا پتہ:- ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی اینڈ کو، کوٹھی نمبر ۷، کولوٹولہ اسٹریٹ، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، کلکتہ